چونکا دینے والی کہانیاں
ماہنامہ
ڈر
ڈائجسٹ
کراچی
جون 2012
ایم اے راحت کی نئی تحریر
سنہری تابوت

16 — عمران قریشی
اذیت پسند
جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتی اور رگوں میں لہو منجمد کرتی خوفناک ڈراؤنی کہانی

35 — عامر ملک
قتل موذی
دل و دماغ اور عقل کو حیران کرتا ایک عجیب و غریب وحشت ناک اور حیرت انگیز شاخسانہ

39 — زوہیب حسن
ناگن کا انتقام
انتقام کا ایک خوفناک اور لرزہ خیز واقعہ جو پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دے گا

46 — اے وحید
رولوکا
وہ وحشی پراسرار قوتوں کا مالک تھا اس کی جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

73 — ذیشان اقبال عظمی
دولہا دلہن
عشق و محبت اور چاہت و خلوص کی لازوال کہانی مرنے کے بعد بھی دلوں کا ساتھ نہ چھوٹا

81 — ایس امتیاز احمد
بزدل روح
ایک چھوٹی انوکھی عجیب و غریب اور اچنبھے میں ڈالتی دلفریب اور پُرفریب کہانی

89 — قاسم رضا
فالج زدہ
قدرت کے نافذ کردہ قوانین کو نہ ماننے والوں کے لئے اپنی نوعیت کی منفرد عبرتناک کہانی

101 — ساجدہ راجا
جادوئی گڑیا
خوفناک جنگل میں جنم لینے والی ناقابل فراموش دہشت اور وحشت سے لبریز حقیقت

110 — ایم اے راحت
سنہری تابوت
شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچنبھے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تحیر انگیز کہانی

131 — سجاد حسین نوی
ناگ نقش
ماورائی مخلوق کے وجود سے انکاری لوگوں کے لئے حقیقت پر مبنی ایک عجیب شاخسانہ

137 — محمد عثمان علی
خوف
وحشت و دہشت سے لبریز خونی واقعہ جسے دیکھ کر لوگ انگشت بدنداں ہو کر دہل گئے تھے

149 — ایس حبیب خان
پیاسی دوستی
خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی ہوئی ایک دلخراش حیرت انگیز تحیر انگیز لہو منجمد کرتی کہانی

158 — ذوالقرنین خان
موت کا سفر
نادیدہ قوت کے نرغے میں پھنسے ہوئے نوجوانوں کی ایک لرزہ خیز انجام کرتی.......خوفناک کہانی

175 — ناصر محمود فرہاد
شکاری
ہر اچھائی برائی قسمت میں نہیں لکھی ہوتی بلکہ اس کا ذمہ دار انسان خود ہوتا ہے

182 — ڈاکٹر اختر ہاشمی
شمیکا
اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کیلئے دل پر اثر کرنے والی ایک زبردست اور حیرت انگیز روداد

208 — ایم الیاس
رقص موت
لفظ لفظ.......سطر سطر دل و دماغ کو مبہوت کرتی.......ڈراؤنی اور تحیر انگیز کہانی

ایڈیٹر و پبلشر آصف علی نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کتاب مارکیٹ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

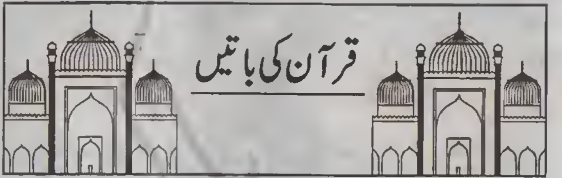

قرآن کی باتیں

☆ اور وہی تو ہے جو اپنی رحمت یعنی مینہ سے پہلے ہواؤں کو خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے، یہاں تک کہ جب وہ بھاری بھاری بادلوں کو اٹھا لاتی ہے تو ہم اس کو ایک مری ہوئی بستی کی طرف ہانک دیتے ہیں پھر بادل سے مینہ برساتے ہیں پھر مینہ سے ہر طرح کے پھل پیدا کرتے ہیں اسی طرح ہم مردوں کو زمین سے زندہ کر کے باہر نکالیں گے یہ آیات اس لئے بیان کی جاتی ہیں تاکہ تم نصیحت پکڑو۔ (سورۃ اعراف 7 آیت 57)

☆ وہی تو ہے جو تم کو جنگل اور دریا میں چلنے پھرنے اور سیر کرنے کی توفیق دیتا ہے یہاں تک کہ جب تم کشتیوں میں سوار ہوتے ہو اور کشتیاں پاکیزہ ہوا کے نرم نرم جھونکوں سے سواروں کو لے کر چلنے لگتی ہیں اور وہ ان سے خوش ہوتے ہیں تو ناگہاں زناٹے کی ہوا چل پڑتی ہے اور لہریں ہر طرف سے ان پر جوش مارتی ہوئی آنے لگتی ہیں اور وہ خیال کرتے ہیں کہ اب تو لہروں میں گھر گئے۔ تو اس وقت خالص اللہ ہی کی عبادت کر کے اس سے دعا مانگنے لگتے ہیں کہ اللہ اگر تو ہم کو اس سے نجات بخشے تو ہم تیرے بہت ہی شکر گزار ہوں۔ (سورۃ یونس 10 آیت 22)

☆ اور ہم ہی ہوائیں چلاتے ہیں جو بادلوں کے پانی سے بھری ہوئی ہوتی ہیں اور ہم ہی آسمان سے مینہ برساتے ہیں اور ہم ہی تم کو اس کا پانی پلاتے ہیں اور تم تو اس کا خزانہ نہیں رکھتے۔ (سورۃ حجر 15 آیت 22)

☆ اور وہی تو ہے جو اپنی رحمت کے مینہ کے آگے ہواؤں کو خوشخبری بنا کر بھیجتا ہے اور ہم آسمان سے پاک اور نتھرا ہوا پانی برساتے ہیں۔ (سورۃ حجر 15 آیت 48)

☆ اور اسی کی نشانیوں میں سے ہے کہ ہواؤں کو بھیجتا ہے کہ خوشخبری دیتی ہیں تاکہ تم کو اپنی رحمت کے مزے چکھائے اور تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کے فضل سے روزی طلب کرو عجب نہیں کہ تم شکر کرو۔ (سورۃ روم 30 آیت 46)

☆ مومنو، اللہ کی اس مہربانی کو یاد کرو جو اس نے تم پر اس وقت کی جب فوجیں تم پر حملہ کرنے کو آئیں تو ہم نے ان پر ہوا بھیجی اور ایسے لشکر نازل کیے جن کو تم دیکھ نہیں سکتے تھے اور جو کام تم کرتے ہو اللہ ان کو دیکھ رہا ہے۔ (سورۃ احزاب 33 آیت 9)

☆ اور اللہ ہی تو ہے جو ہوائیں چلاتا ہے اور وہ بادل کو ابھارتی ہیں۔ پھر ہم اس کو ایک بے جان شہر کی طرف چلاتے ہیں پھر اس سے زمین کو اس کے مرنے کے بعد زندہ کر دیتے ہیں۔ اسی طرح مردوں کو جی اٹھنا ہوا۔ (سورۃ فاطر 35 آیت 9)

☆ اور اسی کی نشانیوں میں سے سمندر کے جہاز ہیں جو گویا پہاڑ ہیں اگر اللہ چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے۔ اور جہاز اس کی سطح پر کھڑے رہ جائیں تمام صبر اور شکر کرنے والوں کے لئے ان باتوں میں قدرت اللہ کے نمونے ہیں۔ (سورۃ شوریٰ 42 آیت 32 سے 33)

☆ ثمود اور عاد نے اس اچانک ٹوٹ پڑنے والی آفت کو جھٹلایا۔ تو ثمود ایک سخت حادثہ سے ہلاک کیے گئے اور عاد ایک بڑی شدید طوفانی آندھی سے تباہ کر دیئے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو مسلسل سات رات اور آٹھ دن ان پر مسلط رکھا۔ تم وہاں ہوتے تو دیکھتے کہ وہ وہاں اس طرح پچھڑے پڑے ہیں، جیسے وہ کھجور کے بوسیدہ تنے ہوں۔ اب کیا ان میں سے کوئی تمہیں باقی بچا نظر آتا ہے۔ (سورۃ حاقہ 69 آیت 6 سے 8)

☆ اور اللہ ہی کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ بناؤ اور والدین اور قرابت والوں اور یتیموں اور محتاجوں اور رشتہ دار ہمسایوں اور اجنبی ہمسایوں اور رفقائے پہلو یعنی پاس بیٹھنے والوں اور مسافروں اور جو لوگ تمہارے قبضے میں ہوں سب کے ساتھ احسان کرو کہ اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے اور تکبر کرنے والے بڑائی مارنے والے کو دوست نہیں رکھتا۔ (سورۃ نساء 4 آیت 36)

☆ مومنو! جب تم نماز پڑھنے کا قصد کیا کرو تو منہ اور کہنیوں تک دھو لیا کرو اور سر کا مسح کر لیا کرو اور ٹخنوں تک پاؤں دھو لیا کرو اور اگر نہانے کی حاجت ہو تو نہا کر پاک ہو جایا کرو اور اگر بیمار ہو یا سفر میں ہو یا کوئی تم میں سے بیت الخلا سے ہو کر آیا ہو یا تم عورتوں سے ہم بستر ہوئے ہو اور تمہیں پانی مل سکے تو پاک مٹی لو اور اس سے منہ اور ہاتھوں کا مسح یعنی تیمم کر لو اللہ تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک کرے اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کرے تاکہ تم شکر کرو۔ (سورۃ مائدہ 5 آیت 6)

☆ اور وہی تو ہے جس نے رات کو تمہارے لیے پردہ اور نیند کو آرام بنایا اور دن کو اٹھ کھڑے ہونے کا وقت ٹھہرایا۔ (سورۃ فرقان 25 آیت 47)

☆ اور اسی کے نشانات میں سے ہے تمہارا رات اور دن میں سونا اور اس کے فضل کا تلاش کرنا۔ جو لوگ سنتے ہیں ان کے لیے ان باتوں میں بہت سی نشانیاں ہیں۔ (سورۃ روم 30 آیت 23)

☆ اور نیند کو تمہارے لیے موجب آرام بنایا اور رات کو پردہ مقرر کیا اور دن کو معاش کا وقت قرار دیا۔ (سورۃ نبا 78 آیت 9 سے 11)

☆ اے بنی اسرائیل، ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی اور تورات دینے کے لئے تم سے کوہ طور کی داہنی طرف مقرر اور تم پر من و سلویٰ نازل کیا اور حکم دیا کہ جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو دی ہیں ان کو کھاؤ اور اس میں حد سے نہ نکلنا ورنہ تم پر میرا غضب نازل ہوگا اور جس پر میرا عذاب نازل ہوا، وہ ہلاک ہو گیا۔ (سورۃ طٰہٰ 20 آیت 80 سے 81)

(کتاب کا نام "قرآن مجید کے روشن موتی" بشکریہ شمع بک ایجنسی کراچی)

خطوط

قارئین کرام! ایک طویل عرصہ سے ہمارے ملک پاکستان میں چیزیں لانے اور لے جانے کے لئے پلاسٹک شاپرز استعمال ہورہے ہیں اور اب تو پیمپرز کا استعمال بھی بہت عام ہوگیا ہے، شاپرز کا استعمال تو بہت اچھا لگتا ہے لیکن وہ کیا وجوہات ہیں کہ جس ملک میں یہ شاپرز بنائے گئے اور اس کے لئے بڑی بڑی مشینیں بنائی گئیں، اس ملک میں شاپرز کا استعمال ممنوع ہے اور ساتھ ہی دیگر مغربی ممالک میں بھی شاپرز کا استعمال بالکل بینڈ ہے، جو بات عام طور پر سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ پلاسٹک کے یہ استعمال شدہ شاپرز کسی صورت بھی تلف نہیں ہوتے اور مٹی میں دب کر بھی سالوں سال اپنی اصلی شکل میں موجود رہتے ہیں۔ زمین میں دبنے کے بعد یہ شاپرز زمین کے اوپر کے پانی کو زمین کے اندر جانے سے روک دیتے ہیں اور اس لئے زمین کے اندر وقت کے ساتھ پانی کی مقدار کم ہوتی جارہی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ شاپرز گلی محلے اور کوڑے دان میں باعث گندگی ہوتے ہیں۔ جس کی وجہ سے مضر صحت خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور انہی تمام وجوہات کو سامنے رکھتے ہوئے مغربی ممالک میں شاپرز کا استعمال ممنوع ہے اور اب شاپرز ہمارے لئے وبال جان بن گئے ہیں۔ آج کل پیمپرز کا استعمال بھی عام ہورہا ہے جو کہ حقیقت میں مضر صحت ہے۔ ننھے اور شیر خوار بچے کو پیمپر باندھ دیا جاتا ہے اور پھر وہ پیمپر رات بھر بندھا رہتا ہے اور جو بھی گندگی نکلتی ہے وہ رات بھر بچے کے جسم سے چپکی رہتی ہے جو کہ بچے کی صحت کے لئے ٹھیک نہیں کیونکہ پورے جسم میں جو مسام ہیں ان مساموں کے ذریعہ گندگی کا اثر اندر چلا جاتا ہے۔ پہلے وقتوں میں مائیں بچے کو صاف ستھرے کپڑے باندھتی تھیں جسے پیشاب پاخانے کے بعد فوراً کپڑے بدل دیتی تھیں جس کی وجہ سے گندگی رات بھر بچے کے جسم سے چپکی نہیں رہتی تھی۔ ہمارے بہ نسبت مغرب والے زیادہ سوجھ بوجھ کے ساتھ قدم اٹھاتے ہیں، زیادہ تر معاملے میں وہ سمجھدار ہیں اور ان کے پاس شعور ہے اور باشعور قومیں ہی ترقی کرتی اور فلاح پاتی ہیں اور جو قومیں ترقی یافتہ اور باشعور ہوتی ہیں ان کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھ جاتا ہے۔ سمجھدار اور باشعور قومیں ہی سکھ چین اور امن وشانتی کی زندگی گزارتی ہیں۔ جن قوموں میں احساس نہیں ہوتا وہ احکام خداوندی کو بھلا دیتی ہیں اور یہی وجہ ان کی تباہی و بربادی کی بنتی ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ بلکہ قرآن میں بھی احکام خداوندی کو بھلانے والی قوموں کی اذیت ناک اور خوفناک بربادی کا تذکرہ موجود ہے، قرآن میں اللہ تعالیٰ بے شمار چیزوں کی قسم کھا کر کہتا ہے کہ ”انسان کے لئے میں نے دنیا میں بے شمار نعمتیں پیدا کر رکھی ہیں، جس سے انسان فائدہ اٹھائے اور اپنے تصرف میں لائے، اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہ پہنچائے۔ مخلوق خدا کے ساتھ بھی نرمی کا برتاؤ کرے، مگر نافرمان اور میرے احکام سے انکار کرنے والے اور منہ موڑنے والے کسی صورت بھی بچ نہیں سکتے اور ایسے لوگوں کے لئے جہنم کی آگ تیار ہے۔“
قارئین! ہمیں چاہئے کہ ہم من وعن احکام خداوندی پر عمل کریں اور سوجھ بوجھ سے قدم اٹھائیں اور جب ہر آدمی فرداً فرداً راہ راست پر چلنے لگے گا تو اجتماعی طور پر ہم باشعور قوم کہلائیں گے، اور ہم خوشحال قوم بن جائیں گے۔

(ادارہ)

صبا پنڈ دادنخان سے، ڈر ڈائجسٹ کے بارے میں جیسا سنا تھا بالکل ویسا ہی پایا۔ یہ ڈائجسٹ بے حد اعلیٰ معیار کا حامل ہے۔ میری والدہ محترمہ کو مجھ سے زیادہ انتظار رہتا ہے ہر ماہ اس کے آنے کا۔ مگر بہت تاخیر سے ملتا ہے۔ حمیرا صاحبہ بہت اچھا اور معیاری لکھتی ہیں۔ ویسے تو سبھی رائٹرز بہت محنت سے کام کررہے ہیں اور یہ محنت صرف اس وجہ سے ہے کہ آپ لوگ انہیں بہت اچھا رسپانس دیتے ہیں۔ ایڈیٹر صاحب! ایک ریکوسٹ ہے آپ سے۔ میری اس تحریر کو ماہ جون کے شمارے میں پلیز شائع کردیجئے گا۔ میرا برتھ ڈے جون میں آرہا ہے۔ میں پھر سب کو فخر سے بتاؤں گی کہ ڈر ڈائجسٹ کی انتظامیہ نے میری کہانی شائع کرکے مجھے سالگرہ کا تحفہ دیا ہے۔
آخر میں سب کو السلام علیکم۔

☆☆ صبا صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، آپ کو سالگرہ اور زندگی کی خوشیاں مبارک ہوں۔ آپ کی کہانی بہت لیٹ موصول ہوئی اور پرچہ چھپنے کے لئے تیار تھا۔ اگلے ماہ آپ کی کہانی ضرور جلوہ گر ہوگی۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی خط لکھنا بھولیں گی نہیں۔ آپ کی والدہ کا بھی شکریہ کہ وہ ڈر ڈائجسٹ پسند کرتی ہیں۔

فرزانہ عابد لاہور سے، مئی کا ڈر ڈائجسٹ پڑھ کر خوشی بلکہ بہت خوشی ہوئی، میں ڈر ڈائجسٹ لے کر اپنے کمرے میں بیٹھ گئی اور فوراً ورق گردانی شروع کردی مگر ہائے افسوس کہ لائٹ چلی گئی۔ لائٹ کا جانا تھا کہ زبان میں تیزی آگئی، لائٹ کے ذمہ داروں کے لئے خود غرضی، مطلب پرستی اور بے حسی کا تمام ریکارڈ ٹوٹ گیا۔ شاید دنیا کے کسی ملک میں ایسا نہیں ہوتا ہوگا جو کہ ہمارے ملک پاکستان میں ہورہا ہے۔ ہمارے ملک میں ایسے ایسے وسائل موجود ہیں کہ کوئی پریشانی نہ ہو مگر صرف اور صرف لاپرواہی اور بے حسی کی وجہ سے پورا ملک اذیت کا شکار ہوگیا ہے، مخلوق خدا کو دکھ اذیت اور تکلیف پہنچانے والوں کو ایک نہ ایک دن خدا کے حضور ضرور جوابدہ ہونا پڑے گا۔ کاش! کہ ہمارے ملک کے کرتا دھرتا لوگ اپنی آخرت کے متعلق سوچ کر مثبت قدم اٹھانے لگیں۔ انسان سب کچھ یہیں چھوڑ کر چلا جاتا۔ اپنے ساتھ صرف اپنے اعمال لے کر جاتا ہے۔ خیر ڈر ڈائجسٹ ترقی کی راہ پر گامزن ہے اور میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ مزید ترقی کرے۔

ایس حبیب خان کراچی سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر ڈائجسٹ کا پورا اسٹاف اور اس کے چاہنے والے خیریت سے ہوں گے۔ مئی 2012ء کا شمارہ موسم گرما کی چلچلاتی دھوپ میں ٹھنڈک کا احساس دلاتا پوری آب و تاب کے ساتھ ہاتھوں میں موجود ہے سرورق انتہائی شاندار لگا۔ ادارے کی ارض پاک کے سنگین حالات کے تناظر میں فکر انگیز اور حقیقت پر مبنی باتوں نے احساسات کو جھنجھوڑ دیا۔ خطوط کی محفل میں قدم رکھتے ہی دل دھک سے رہ گیا۔ اور اپنا خط نہ پا کر دکھ ہوا۔ رضیہ عارف اور فرزانہ عابد کے تبصرے پسند آئے۔ کہانیوں میں ”نہلے پہ دہلا“ اچھے اینڈ لئے دلچسپ رہی، ایس امتیاز احمد حسب سابق ایک بہترین تحریر کے ساتھ حاضر تھے، شائستہ سحر کی ”شکست“ معاشرے کے حقیقی رنگوں سے سجی بہت جاندار تحریر تھی۔ ”انوکھی کہانی“ اور ”پراسرار حویلی“ بھی کافی پسند آئیں۔ ”چندرا دیوی“ اختتام پذیر ہوئی۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔ امید ہے اب کوئی اچھی تحریر پڑھنے کو ملے گی۔ ”رولوکا“ کے چاروں حصے جو شائع ہوئے ہیں۔ میں نے لے لئے ہیں۔ اس تحریر کے بارے میں تو الفاظ کم پڑ جاتے ہیں۔ ”اے وحید صاحب“ کے قلم سے لکھی ہوئی یہ تحریر ایک مکمل شاہکار ہے۔ ایک Request ہے کہ ڈر کا کوئی خاص نمبر نکالئے۔ آخر میں دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کی مشکلیں آسان کرے اور ہمارے ملک کو اندرونی اور بیرونی دونوں دشمنوں سے بچائے۔ (آمین)

☆☆ ایس صاحب: پچھلے ماہ غلطی سے آپ کا خط مس ہوگیا تھا اس کے لئے معذرت۔ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ کسی کسی ماہ آپ کی کہانی بروقت پہنچ نہیں پاتی۔ اس کے لئے تجویز ہے کہ آپ دو کہانیاں ارسال کردیں تاکہ ہر ماہ ایک کہانی موجود رہے گی، امید ہے آپ غور فرمائیں گی۔ کہانیوں کی پسندیدگی اور آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنے کے لئے شکریہ قبول کریں۔

دردانہ ملک فیصل آباد سے، ڈر ڈائجسٹ میں یہ میرا پہلا خط ہے۔ مئی کا رسالہ آیا اور چھا گیا۔ سبھی کہانیاں ایک سے بڑھ کر ایک تھیں۔ ڈر ڈائجسٹ پڑھ کر اب تو دن میں بھی یوں لگتا ہے جیسے ہمارے پیچھے روح یا جن کھڑا ہو۔ شاعری ہمیشہ کی طرح بے مثال اور لاجواب تھی۔ اگر شاعری کے صفحات کچھ زیادہ کردیئے جائیں تو زیادہ اچھا ہوگا۔ کہانیوں میں نہلے پہ دہلا، انوکھا انجام، شکست، قاتل روح اور انوکھی کہانی پسند آئیں۔ یہ اچھا ہوا کہ چندرا دیوی بائے بائے۔ امید ہے اب الیاس صاحب کوئی اچھی سی کہانی لے کر حاضر ہوں گے۔ کہانی وہی اچھی ہوتی ہے جو اپنے پڑھنے والوں کو متاثر کرسکے۔ ہر رائٹر کی کوشش ہونی چاہئے کہ پڑھنے والے کس طرح کی کہانیوں کی ڈیمانڈ کرتے ہیں۔ خیر میں ڈر ڈائجسٹ کے لئے شب وروز دعا گو ہوں۔

☆☆ دردانہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید۔ خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ آپ کی باتیں درست ہیں، امید ہے رائٹر حضرات اس پر غور فرمائیں گے۔ خیر آئندہ ماہ بھی آپ کے خط کا انتظار رہے گا۔

سیدہ شمائلہ ظفر کراچی سے، میں ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کئی سالوں سے پڑھ رہی ہوں۔ اس ڈائجسٹ کی ساری کہانیاں مجھے اچھی لگتی ہیں۔ خاص طور پر رولوکا اور چندرا دیوی میری پسندیدہ ہیں۔ انہی کہانیوں سے Inspire ہوکر میں نے پہلے ایک کہانی ”لفٹ ملے گی؟“ بھیجی تھی اب ایک اور بھیج رہی ہوں۔ برائے مہربانی شائع کردیں میری حوصلہ افزائی ہوگی اور میں آئندہ مزید کہانیاں بھیجوں گی۔ اپنی رائے ضرور دیجئے گا۔

☆☆ شمائلہ صاحبہ: آپ کو ڈر ڈائجسٹ پسند ہے اور اس کی کہانیاں اچھی لگتی ہیں۔ اس کے لئے Thanks۔ آپ کی کہانی بہت جلد

شائع ہوگی۔ امید ہے آپ آئندہ ماہ بھی اپنا خلوص نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گی۔

افشاں رمضان سرگودھا سے، مئی 2012ء کا شمارہ ہمیشہ کی طرح سپرون تھا۔ کہانیاں بہت اعلیٰ تھیں۔ ایک گزارش ہے کہ ڈر ڈائجسٹ میں رائٹرز کے انٹرویو کا سلسلہ شروع کریں۔ اس طرح سے ریڈرز کو اپنے رائٹرز کے متعلق جاننے کا موقع ملے گا۔ اس کے علاوہ سلسلہ وار کہانیوں کو پلیز کم کر دیجئے گا۔ آج کل کے مصروف دور میں سلسلہ وار کہانیاں پڑھنا، پھر اسے ایک ماہ تک یاد رکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ ہاں مگر دو یا تین اقساط والی سلسلہ وار کہانیاں تو چلیں گی۔ میری ڈر ڈائجسٹ میں فرسٹ انٹری ہے پلیز اتنا مت ڈرایئے گا کہ میں پلٹ کر یہاں نہ آسکوں۔ ویسے آپس کی بات ہے۔ میں ڈرتی کم کم ہی ہوں۔ میری کاوش کے بارے میں پلیز انفارم کر دیجئے گا۔ سب پڑھنے والوں کو سلام۔

☆☆ افشاں صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں موسٹ ویلکم، آپ کی تجویز زیر غور ہے، آئندہ صرف تین کہانیاں ہی سلسلے وار شائع ہوں گی۔ آئندہ ماہ بھی آپ کے خلوص نامہ کا شدت سے انتظار رہے گا۔

رضیہ عارف کراچی سے، مئی کا ڈر ڈائجسٹ اپنا خوب صورت انداز لئے ہاتھوں میں آیا تو سب سے پہلے قرآن کی باتوں سے دل میں ٹھنڈک پہنچی اور دماغ میں آیا کہ اللہ تعالیٰ ہر انسان پر کس قدر رحم و کرم کرتا ہے اور انسان کی بھلائی کے لئے دنیا میں تمام نعمتیں پیدا کر کے انسان کے تصرف میں دے دیا ہے کیسے کیسے خزانے زمین میں انسان کے لئے چھپا دیئے ہیں اور بتلا بھی دیا ہے کہ اپنی عقل سے ان خزانوں کو نکالو اور فیض پاؤ، مگر اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی انسان کتنا ناشکرہ ہے کہ اپنے رب کی بندگی نہیں کرتا اس کے بتائے ہوئے احکام سے منہ موڑ کر اپنی من مانی کرنے لگتا ہے، مگر نافرمانی کرنے والے بھول جاتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن اللہ کی پکڑ ضرور ہوتی ہے اور اس سے اس کا بچنا محال ہو جاتا ہے۔ خیر اپنے اپنے ضمیر اور دل کی بات ہے کہ ہم اپنے لئے کون سا راستہ اختیار کریں۔ مئی کے شمارے کی تمام کہانیاں ویسے تو اچھی تھیں مگر ردلوکا کے بعد جو مجھے اچھی لگیں وہ ہیں۔ شکست، نہلے پہ دہلا، انوکھا انجام اور درندگی، یہ تمام کہانیاں ایسی ہیں جو کہ دل و دماغ کو متاثر کرتی ہیں اور کہانی وہی اچھی ہوتی ہے جو کہ دل و دماغ پر چھا جائے۔ چندرا دیوی ختم ہو گئی اب دیکھتے ہیں کہ الیاس صاحب کیا پیش کرتے ہیں لیکن امید ہے کہ اچھی کہانی پیش کریں گے۔ ایم اے راحت کی نئی کہانی کا بھی انتظار ہے۔ میں اکثر دعا کرتی ہوں کہ ہمارا ڈر ڈائجسٹ ترقی کرے بلکہ خوب ترقی کرے۔

☆☆ رضیہ صاحبہ: کاش کہ ہم سارے انسان اپنے اختتام کے بارے میں سوچ لیں اور ساتھ یہ بھی کہ جس طرح بھاگ دوڑ کر کے دوسروں کو اذیت پہنچا کر مال جمع کرتے ہیں وہ سارا یہیں رہ جائے گا تو...... آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے، السلام علیکم، امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ ماہ مئی 2012ء کا ''ڈر ڈائجسٹ'' کا خوبصورت شمارہ ہمارے سامنے ہے۔ دلکش ٹائٹل کے ساتھ تمام تر سلسلے خوب رہے...... اسٹوریز اور غزلوں کا انتخاب لاجواب رہا۔ ہمارے آرٹیکلز لگانے کا شکریہ۔ مزید میٹرز آپ کے پاس ہیں۔ پلیز دیکھئے گا...... مزید میٹر میں۔ روح کا انتقام، شوخ سطریں، مراسلے، ارسال خدمت ہیں۔ پلیز قریبی اشاعت میں جگہ دیں۔ اعزازی کاپی کا شکریہ۔ ہماری طرف سے آپ کو اور دیگر اسٹاف اور ''ڈر ڈائجسٹ'' کے تمام خوب صورت لکھنے والے لے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے ویورز کو دعا سلام۔ پلیز اپنا خیال رکھئے گا۔

☆☆ امتیاز صاحب: کہانی روح کا انتقام موصول ہو چکی ہے اس کے لئے شکریہ، آئندہ ماہ کے لئے بھی شکریہ قبول کریں۔

رانا ظفر اقبال جنڈانوالہ سے، السلام علیکم! امید ہے ڈر ڈائجسٹ کا پورا اسٹاف اور تمام دوست قارئین خوش باش اور خیریت سے ہوں گے۔ مئی کا ڈر ڈائجسٹ 26 اپریل کو نیوز ایجنسی سے خریدا۔ اس دفعہ ٹائٹل کا تو جواب ہی نہیں۔ ڈر ڈائجسٹ کا مطالعہ شروع کیا تو سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں۔ دلی سکون ملا۔ پھر خطوط کی محفل میں پہنچا تو ''ادارہ'' کا خط پڑھا اور کچھ سوچ کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ ہمیں خود کو زندہ اور پائندہ قوم کہلوانے کے لئے اپنے گریبان میں جھانکنا پڑے گا۔ کیونکہ جب تک ہم خود کچھ نہیں کریں گے تو دوسروں کو نصیحت کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ ہم خود تو چوری، کرپشن اور رشوت جیسے کام کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کام سے روکتے ہیں۔ خود جھوٹ بولتے ہیں اور اپنے بچوں کو جھوٹ بولنے سے روکتے ہیں۔ اس کے لئے ایک مثال ہے کہ ایک شخص نے کسی آدمی کا قرض دینا ہے۔ لیکن وہ نہیں دے سکتا اور چھپ کر گھر بیٹھا ہے۔ جب وہ آدمی اپنا قرض لینے اس کے دروازے پر آتا ہے تو وہ شخص

اپنے بیٹے کو دروازے پر بھیجتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں آدمی ہو تو کہنا کہ ابو گھر پر نہیں، تو کیا اس شخص نے اپنے بیٹے کو نیکی کی بات بتلائی؟ ہمیں خود سوچنا پڑے گا کہ جب تک ہم خود اپنے گریبان میں نہیں جھانکتے، خود اپنا مقام پیدا نہیں کرتے۔ تب تک ہم زندہ و پائندہ قوم نہیں کہلا سکتے۔ اس کے بعد رضیہ عارف اور محمد علی صاحب کا تفصیلی خط پڑھا بہت اچھا لکھا تھا۔ اس کے بعد ''ردلوکا'' کی قسط نمبر 84 پڑھی۔ بہت اچھی تھی اور بہت خوشی ہوئی کہ ''ردلوکا'' نے کامیابی کے ساتھ اپنے سات سال پورے کئے ہیں۔ اے وحید صاحب کے لئے مبارکباد کے پھول پیش کرتا ہوں اس کے بعد چندرا دیوی کی آخری قسط پڑھی۔ اچھا اینڈ ہوا۔ شمیکا کی قسط نمبر 3 بھی اچھی تھی۔ اس کے علاوہ اور کہانیاں بھی اچھی تھیں۔

☆☆ ظفر صاحب: آپ کا خط پڑھ کر بڑی خوشی ہوئی، آپ نے ساری باتیں بہت اچھی لکھی ہیں۔ امید ہے دل پر لگنے والی ایسی باتیں آئندہ بھی خط میں لکھ کر خوشی پہنچائیں گے۔

منیر احمد ساغر میاں چنوں سے، السلام علیکم! سب سے پہلے تو آپ سب کی خیریت نیک مطلوب چاہتا ہوں۔ پچھلے ماہ حاضری نہیں دے سکا۔ وجہ معقول ہے۔ میرے والد صاحب کی صحت کچھ ناساز تھی۔ جس کی وجہ سے انہیں ساہیوال اور ملتان لے جانا پڑا تھا۔ اب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ان کی صحت بہتر ہے۔ اس ماہ کا نیا شمارہ 28 تاریخ کو مارکیٹ سے مل گیا۔ فہرست پر نظر ڈالتے ہوئے قرآن کی باتیں پڑھیں۔ پھر اداریہ کا مطالعہ کیا اور خطوط کی محفل میں گئے۔ ابھی چند ہی کہانیاں پڑھی ہیں۔ جن میں محمد عثمان علی کی ''راز'' ایم الیاس کی چندرا دیوی کی آخری قسط، ردلوکا، شمیکا اور انوکھی کہانی۔ تمام کہانیاں اچھی تھیں۔ بقیہ بھی اچھی ہوں۔ میری شاعری پسند کرنے پر رانا ظفر اقبال، محمد بشیر احمد پرواز، محمد اسحاق انجم اور دیگر قارئین کا بے حد شکریہ، ایک بات پوچھنا تھی کہ ''عجائب دنیا'' ''روح کا عشق'' ''حصار'' ''ناگ دیوتا'' ''روح بیتی'' ''غیبی آواز'' اور ''شکنجہ'' ناول کب کتابی شکل میں دستیاب ہوں گے۔ جواب ضرور دیجئے گا۔

☆☆ منیر صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد کی صحت اور آپ کے تمام اہل خانہ پر اپنا فضل و کرم رکھے۔ یہ تمام کتابیں کتابی صورت میں موجود ہیں۔ خیر امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

اسلم جاوید فیصل آباد سے، السلام علیکم! آپ سب کی خیریت، خداوند کریم سے نیک چاہتا ہوں کسی دوست سے ملاقات کے لئے شہر جانے کا اتفاق ہوا وہاں بک اسٹال پر اپنے محبوب پرچے ڈر ڈائجسٹ ماہ مئی 2012ء سے ملاقات ہو گئی جسے دیکھ کے میرا دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا۔ اس بار سرورق بہت دلکش تھا۔ خطوط اور قوس قزح اور غزل شائع کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ آپ جس خلوص اور محبت سے ہمیں یاد کرتے ہیں اس کے لئے میں آپ کا بے حد ممنون ہوں آپ ہزاروں میل دور ہونے کے باوجود میرے دل کی دھڑکنوں میں رہتے ہیں۔ تمام سلسلے یادگار ہیں۔ مثلاً قرآن کی باتیں، خطوط، غزلیں، قوس قزح وغیرہ، اگر آپ اسلم راہی کی تحریروں جیسا کوئی سلسلہ شروع کریں تو بہتر ہوگا۔ میری شاعری ملک کے تمام رسالوں میں شائع ہوتی ہے۔ آپ کا بھی میرے ساتھ بھرپور تعاون ہے۔ کہانیوں سے میں بے حد متاثر ہوا۔ مثلاً بدروح، راز، شکست، قاتل روح، انوکھی کہانی، خونخوار، درندگی وغیرہ تمام رائٹروں کو میری طرف سے عمدہ تحریریں لکھنے پر دلی مبارکباد قبول ہو۔ موسم بدل گیا۔ مگر ملکی حالات نہیں بدلے شدید معاشی بحران ہے، ہر انسان کسی نہ کسی الجھن کا شکار ہے اور ذہنی طور پر کسی کو سکون نہیں۔ مزدور کی زندگی بھی عجیب ہوتی ہے۔ غزل ارسال کر رہا ہوں، کسی قریبی شمارے میں جگہ دے دیں بشرطیکہ آپ کا تعاون ساتھ رہے۔

☆☆ اسلم صاحب: ہر ماہ آپ کا خلوص بھرا خط پڑھ کر خوشی کے ساتھ ساتھ دلی سکون بھی ملتا ہے۔ غزل شامل اشاعت ہے۔ آئندہ بھی خلوص نامہ کا انتظار رہے گا۔ شکریہ۔

بشیر احمد پرواز جنڈانوالہ سے، السلام علیکم امید کرتا ہوں ڈر ڈائجسٹ کا پورا اسٹاف اور تمام پیارے قارئین سب خیر خیریت سے ہوں گے۔ اپریل کا ڈائجسٹ جلدی پڑھ لیا تھا تو اس دفعہ کافی انتظار کرنا پڑا۔ مئی کا رسالہ ویسے تو اپنے روٹین کے مطابق 26 اپریل کو مل گیا تھا پر ایسے لگتا تھا کہ اس دفعہ انتظار کی گھڑی کچھ زیادہ لمبی ہو گئی تھی۔ خیر۔ ڈر ڈائجسٹ ملا۔ ٹائٹل بہت اچھا تھا۔ قرآن کی باتیں پڑھ کر دلی سکون ملا۔ خطوط میں رضیہ عارف کا تفصیلی خط پڑھا۔ میں بھی رضیہ صاحبہ کی بات کی حمایت کرتا ہوں اس کے بعد ''چندرا دیوی'' کی آخری قسط کا مطالعہ کیا جو کہ بہت اچھی تھی۔ اچھا اینڈ ہوا۔ اس کے بعد ''ردلوکا'' کا مطالعہ کیا۔ کہانی بہت اچھی تھی۔ پر اس ماہ

”رولوکا“ نے اپنے سات سال مکمل کئے جس کی اور بھی زیادہ خوشی ہوئی۔ اس کے بعد ثمیکا اور دیگر کہانیوں کا مطالعہ کیا۔ جو سب کی سب اپنی مثال آپ تھیں۔ قوس قزح میں سب نے اچھا لکھا تھا۔ پر ”شعیب شیرازی“ ”آسیہ شاہین“ اور ”خلیل دیوانہ“ کے شعر پسند آئے۔ غزلیات میں راغب عثمان کیانی، ایس امتیاز احمد، حمیرا راحت اور منیر احمد ساغر نے اچھا لکھا۔ مئی کا رسالہ اپنی مثال آپ تھا۔ اب اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ اللہ تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ کو دن دگنی رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔ آمین۔

☆☆ بشیر صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی پسندیدگی کے لئے شکریہ بلکہ بہت بہت شکریہ۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔ آپ کی تمام باتیں اچھی ہیں۔

بشیر احمد بھٹی بہاول پور سے، السلام علیکم، اس دفعہ 29 اپریل بروز اتوار کو مئی 2012ء کا ڈر مارکیٹ سے خریدا۔ ڈر کا ٹائٹل ماہ بہ ماہ خوب صورت ہوتا جا رہا ہے۔ قرآن پاک کی باتیں ایمان افروز سلسلہ ہے۔ باسی ہوتا ایمان تازہ ہو جاتا ہے۔ خطوط میں ادارہ کی طرف سے بلو کی ماں نازی بن گئی۔ بہت اچھا ہوا۔ خطوط کی محفل میں پہنچ کر سب کے تبصرے پڑھے۔ اچھا لگا۔ کہانیوں میں عبدالحمید ساگر کی قاتل روح پڑھی، سرکٹا گھڑ سوار کی مظلوم روح اپنی بیٹی کا انتقام لیتی پھر رہی تھی۔ جن کی آنکھیں نکال لی گئی تھیں۔ کہانی سنسنی خیز رہی۔ جنات کا قبضہ، نہلے پہ دہلا سے ہوتے ہوئے رولوکا کی قسط نمبر 84 میں داخلہ ہوا۔ اس کہانی میں رمیش سے ملاقات ہوئی۔ الوکھا انجام کے بعد جب خونی بت پڑھی تو اس میں بھی رمیش سے ملاقات ہوئی۔ 1942ء کی لکھی گئی یہ کہانی پراسرار رہی۔ ملوت رات نے مندر کی صفائی کا ٹھیکہ لیا۔ راجن پور کا رمیش ایک بھاری بھرکم پتھر کی بھینٹ چڑھ گیا۔ راز کے بعد چندرا دیوی کی آخری قسط پڑھی۔ آخری صفحات کے لئے اس دفعہ ایس امتیاز احمد صاحب خونخوار لائے ہیں۔ جو طویل کہانی ہے (انگریزی سے ماخوذ) ثمیکا کی تیسری قسط پر تجسس رہی۔ ابھی مختصر کہانیوں کا مطالعہ جاری ہے۔ اگلے ماہ تک کے لئے خدا حافظ۔

☆☆ بشیر صاحب خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی خط بھیج کر شکریہ کا موقع دیں گے۔

عمر فاروق نور پور تھل سے، السلام علیکم ڈر ڈائجسٹ کا رواں ماہ کا شمارہ 12 تاریخ کو جبکہ اگلے ماہ کا شمارہ صرف گیارہ دن بعد 23 تاریخ کو ملا، بے حد خوشی ہوئی، اپریل کا شمارہ بھی لاجواب تھا۔ مئی کے شمارے میں سب سے پہلے قرآن کی باتیں، پڑھ کر ایمان تازہ کیا۔ خطوں کی انجمن میں اپنا خط پا کر بہت مسرت ہوئی، کہانیوں میں قاتل روح، الوکھا انجام، راز، خیبر کی فتح، درندگی، شکست اور خونخوار بہت پسند آئیں، قسط وار کہانیاں بھی بہت اچھی جا رہی ہیں، رولوکا کا تو جواب نہیں۔ تمام رائٹرز بہت محنت اور لگن کے ساتھ کہانیاں لکھتے ہیں اللہ ان کے زور قلم کو اور ترقی دے۔ محمد عثمان علی، ایس حبیب خان، ایس امتیاز احمد، ایم الیاس اور اے وحید میرے پسندیدہ رائٹرز ہیں۔ باقی بھی بہت اچھا لکھتے ہیں۔ اللہ انہیں اور بھی توفیق دے۔ قوس قزح بھی اچھا سلسلہ ہے۔ شہر وحشت اور چندرا دیوی کا اختتام بہت اچھا ہوا۔ اب ان کی کتابی شکل کا انتظار شدت سے رہے گا۔ پہلے خط میں جو غلطیاں ہوئیں ان کے لئے معذرت خواہ ہوں، بہر حال آپ نے شائع کر دیا یہی عنایت بہت کم نہیں۔ ڈر ڈائجسٹ ایک معیاری رسالہ ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ ڈر کے تمام اسٹاف، رائٹرز حضرات اور قارئین کو خوش رکھے۔ آمین! اب اجازت چاہوں گا۔ خدا حافظ۔

☆☆ عمر صاحب: آپ کا خط پڑھ کر خوشی ہوئی، کہانیوں اور رائٹرز کی تعریف کے لئے ویری تھینکس، امید ہے آئندہ بھی ڈر ڈائجسٹ کو خط لکھنا بھولیں گے نہیں۔

قدیر رانا راولپنڈی سے، مئی کا ڈر ڈائجسٹ دیکھ کر خوشی ہوئی، خیریت کا طالب ہوں، غزلوں کی اشاعت پر شکریہ قبول فرمائیں، امید ہے تعاون کا یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ دو غزلیں ارسال ہیں۔ اگلی اشاعت میں جگہ دے کر مشکور فرمائیں۔ میری دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ دن دگنی رات چوگنی ترقی کرے۔

☆☆ قدیر صاحب: غزلوں کی اشاعت اور تعاون کا سلسلہ یونہی جاری رہے گا۔ اگر آپ کا تعاون ڈر ڈائجسٹ کے ساتھ رہا۔

غلام نبی نوری کنڈیاں خاص سے، پہلے تو ماہنامہ ڈر کے تمام قارئین کو میری طرف سے سلام، میں اس رسالے کو کافی عرصہ سے پڑھ رہا ہوں۔ اب اس میں کچھ لکھنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ مئی 2012ء کا پیارا شمارہ میرے ہاتھوں میں ہے۔ امید ہے کہ سارا

ڈائجسٹ بڑا اچھا ہوگا۔ میں ایک کہانی ”کفن چور گورکن“ بھیج رہا ہوں۔ اس کے علاوہ کچھ لطیفے اشعار اور غزل بھیج رہا ہوں، امید ہے کہ شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔ آئندہ شمارہ تک کے لئے خدا حافظ۔

☆☆ غلام نبی صاحب: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، ابھی کفن چور گورکن پڑھی نہیں، اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔ آئندہ ماہ بھی آپ کے نوازش نامہ کا انتظار رہے گا۔

عامر ملک راولپنڈی سے، آداب، خدا کرے آپ سب خیریت سے ہوں۔ مئی کا شمارہ خریدا سرورق شاندار اور بھلا لگا۔ کہانیوں میں خونخوار جاندار رہی۔ ایس امتیاز احمد کو مبارکباد، اس کے علاوہ خونی ڈاکٹر، شکست، خیبر کی فتح اور الوکھا انجام خوب رہیں۔ تمام قلم کاروں کو مبارکباد۔ اس ماہ پرچہ بہت دیر بعد ملا۔ خیریت تو تھی ناں؟ اس بار ایک ترجمہ کہانی ”تیسری انگلی“ ارسال کر رہا ہوں اللہ کرے۔ آپ کو پسند آ جائے۔ تمام کارکنان اور اسٹاف کو سلام۔

☆☆ عامر صاحب: خلوص نامہ اور کہانی ارسال کرنے کا شکریہ۔ آپ کی کہانی اس شمارے میں شامل اشاعت ہے اور امید ہے شکریہ کا موقع آئندہ بھی دیتے رہیں گے۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈو الہ یار سے، السلام علیکم، امید ہے ادارہ کے سارے لوگ خیریت سے ہوں گے، مئی کا ڈر ڈائجسٹ پڑھ کر دلی خوشی ہوئی، قرآن کی باتوں سے لے کر خونخوار تک پورا رسالہ حسب معمول زبردست ہے۔ اللہ ہمارے ملک پر رحم کرے کہیں فضائی حادثے، کہیں دھماکے اور سب سے بڑھ کر مہنگائی کا بوتل میں بند جن باہر نکل کر دندناتا پھر رہا ہے۔ شبانہ ملک اور انتظار خان بلوچ کی غزل پڑھ کر آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے۔ دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ زیادہ ترقی کرے۔

☆☆ شرف الدین صاحب: خط لکھنے اور مکمل ڈائجسٹ کی تعریف کے لئے شکریہ، آپ یقیناً ایک حساس دل کے مالک ہیں کہ غزل پڑھ کر بہت متاثر ہوئے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا فضل و کرم رکھے۔

پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی کراچی سے، ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ کا شمارہ مئی 2012ء قارئین کے دست مبارک میں جلوہ افروز ہے۔ کلبلاتی اور چلبلاتی گرم ہوائیں سکون قلب کی حرکت میں نمایاں کردار ادا کر رہی ہیں۔ سرد اور ٹھنڈے برفیلی مشروبات حلق کی زینت ہیں۔ اور بقول قدیم اور عظیم شاعر اسماعیل میرٹھی، آن پہنچا مئی کا مہینہ بہا چوٹی سے ایڑی تک پسینہ۔ ایک طویل عرصے سے ڈر کی محفل میں شرکت کر رہا ہوں۔ امید ہے جلد یا بدیر میری ایک مدت پہلے ارسال کردہ کہانی آپ کی منظور نظر نگاہ سے گوش گزار ہونے والی ہوگی۔

☆☆ واجد صاحب: آپ کی کہانی کسی کے اچھے اخلاق و اطوار، رحم دلی اور دل میں نرم گوشہ اٹھنے سے متعلق ہے، یہ کہانی نہیں، ڈر کے موضوع پر کہانی ارسال کریں، اور اگر آپ اپنا موبائل نمبر ارسال کر دیں تو نوازش ہوگی۔

رضوان قیوم راولپنڈی سے، میں خیریت سے ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا۔ دیگر احوال یہ ہے کہ سب سے پہلے تو آپ کا شکریہ کہ آپ نے میری کہانی خونی بت شائع کی ہے۔ آپ گاہے بگاہے میری تحریریں شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں۔ اس امر کا بھی خصوصی شکریہ قبول کریں۔ آپ کی خدمت میں اپنی ایک نئی منفرد و پراسرار تخلیق آپ بیتی بھیج رہا ہوں۔ امید ہے کہ اسے شائع کریں گے۔ زیر نظر کہانی کا عنوان میں نے تجربہ دکھا ہے۔ آپ اسے بے شک بہتر سمجھیں تو اس کا عنوان تبدیل کر دیں۔ نیز جہاں آپ اس کہانی میں قلم چلانا چاہیں اس کی نوک پلک ٹھیک کر لیجئے گا۔ آپ کے پاس میری ایک اور کہانی ”معاوضہ“ ہے۔ مہربانی کر کے اسے بھی دیکھ لیجئے گا۔

☆☆ رضوان صاحب: آپ کی کہانی معاوضہ کمپوز ہو چکی ہے، اس شمارے میں شامل اشاعت نہ ہو سکی، اگلے شمارے میں ضرور شامل اشاعت ہوگی۔

☆☆

نوٹ:۔ تمام رائٹر حضرات سے التماس ہے کہ اپنی کہانی پر مکمل ایڈریس اور Cell,No ضرور لکھا کریں، دھیان سے کیونکہ اعزازی کاپی بھیجنے یا پھر رابطہ کرنے میں آسانی ہو۔ قوی امید ہے کہ رائٹر حضرات عملی قدم اٹھا کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

ازیت پسند

عمران قریشی-کوئٹہ

شیرنی کی غضبناک دھاڑیں جاری تھیں کہ اچانک درخت سے نوجوان نیچے گرا تو بپھری ہوئی شیرنی نے جھپٹ کر نوجوان کو دبوچ لیا اور پلک جھپکتے ہی نوجوان کا نرخرہ ادھیڑ کر رکھ دیا کہ اچانک......

جسم و جاں پر سکتہ طاری کرتی اور رگوں میں لہو منجمد کرتی خوفناک ڈراؤنی کہانی

اس سنسنی خیز اور ہیبت ناک کہانی کا آغاز ایک ہفتہ پیشتر آنے والے خط کے بعد ہوا۔ خط کے الفاظ کم وبیش پانچ سطروں پر مشتمل تھے اور لکھنے والے کا نام کرنل سائی تھا۔ فوجی ملازمت کے دنوں میں ہم دونوں کا چولی دامن کا ساتھ رہ چکا تھا۔ وہ ایک اذیت پسند اور خوفناک شخصیت کا حامل انسان تھا۔ اپنے ماتحتوں کو خطرناک قسم کی سزائیں دینے میں خوشی محسوس کرتا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد پڑتا ہے۔ ایک دفعہ اس نے ماتحت کی غفلت پر اسے چھت پر موجود سن روم میں تین دن بھوکا پیاسا بند کئے رکھا۔ یہ سن روم سردیوں میں پھولوں کے گملوں کو محفوظ رکھنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ سن روم کی چاروں دیواریں شیشے سے بنی ہوئی تھیں۔ علاوہ ازیں چھت بھی شیشے کی موٹی تہہ سے مزین تھی۔ گرمیوں میں دھوپ مکمل طور پر سن روم کا محاصرہ کر لیتی تھی اور سن روم کسی تپتے ہوئے تندور کا منظر پیش کرنے لگتا تھا۔ کرنل سائی نے اپنے ماتحت کو تین دن تک کمرے میں قید کئے رکھا۔ رات کو اسے مختصر کھانا اور پانی کا ایک گلاس دیا جاتا۔ جو تمام دن کی بھوک اور پیاس کے لحاظ سے ناکافی ہوتا تھا۔ چوتھے دن جب کرنل سائی کے ماتحت کو سن روم سے باہر نکالا گیا۔ تب وہ بہکی بہکی باتیں کر رہا تھا۔ اور چلنے پھرنے سے تقریباً معذور ہو چکا تھا۔ ایک ہفتے کے علاج کے بعد اس کی حالت قدرے بہتر ہوئی۔

بہر حال فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد میں نے پولیس کے محکمے میں ملازمت کر لی۔ لیکن کرنل سائی اپنی اذیت پسند فطرت کی بدولت شکاری بن گیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد ہماری دوبارہ ملاقات نہیں ہو سکی۔ لیکن اخبارات میں اکثر اوقات اس کے شکاری کارنامے پڑھنے کو ملتے رہتے تھے۔ اب اس کا خط میرے ہاتھوں میں موجود تھا۔ اور تحریر مختصر تھی۔

کرنل جے بی!

طویل عرصہ گزر جانے کے بعد خط کے ذریعے تم سے ہمکلام ہو رہا ہوں۔ معاملہ کچھ ایسا ہے۔ میں اپنی زندگی کے آخری ایام افریقہ کے جنگل میں بنی وسیع و عریض رہائش گاہ میں گزار رہا ہوں۔ مرنے سے پہلے چند اندوہناک انکشافات کرنا چاہتا ہوں تا کہ میرا دل ہلکا ہو جائے۔ تم سے بہتر اور کوئی شخص نگاہوں میں موجود نہیں۔ اس لئے تمہیں خط لکھ رہا ہوں۔ جتنی جلدی ممکن ہو سکے۔ میری رہائش گاہ کا رخ کرو۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے۔ رہائش گاہ کا ایڈریس مندرجہ ذیل ہے۔

نیچے افریقہ کے کسی گمنام ٹاؤن کے قریب واقع جنگلات کا ایڈریس تحریر تھا۔

اس مختصر تحریر کے بعد لرزہ خیز واقعات کے متعلق سوچتے ہوئے مجھ پر آج بھی کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔ بہر حال میں نے جب خط چیف ٹیرل کے سامنے رکھا۔ تب اس نے مجھے فوراً گمنام ٹاؤن کی جانب روانگی کا حکم صادر کر دیا۔ وہاں موجود انسپکٹر جون ہمارا نمائندہ خاص تھا۔ میں نے اس سے رابطہ قائم کیا اور دوسرے دن جیپ میں بیٹھ کر افریقہ کے گاؤں...... ڈونگا ٹاؤن کا رخ کیا۔ راستے کی پیچیدگیوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں جب ٹاؤن پہنچا۔ تب رات کا اندھیرا مسلط ہو چکا تھا۔ وہ رات میں نے انسپکٹر جون کے ہمراہ تھانے میں گزاری۔ اور صبح سویرے کرنل سائی کی رہائش گاہ کا رخ کیا۔ جنگل کے درمیان گھری اس کی رہائش گاہ ہر لحاظ سے مکمل تھی۔ وہاں بجلی کے علاوہ پانی اور گیس کا بھرپور انتظام موجود تھا۔ حتیٰ کہ کرنل سائی کے کمرے میں ایئر کنڈیشن بھی لگا ہوا تھا۔ وہ کمرے کے درمیان لگے وسیع و عریض بیڈ پر دراز تھا۔ اس کے ماتحت بیڈ کے چاروں کونوں کے قریب کھڑے حکم کے منتظر تھے۔ کرنل سائی کی حالت ناساز تھی اور وہ واقعی زندگی کی آخری سانسیں لے رہا تھا۔ اسے معدے کے کینسر کی بیماری لاحق تھی۔ وہ کچھ بھی ہضم کرنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچا بن چکا تھا۔ ڈاکٹر بیماری کی اسٹیج کو دیکھنے کے بعد اسے لاعلاج قرار دے چکے تھے۔ مجھے اور انسپکٹر جون کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر وہ بیڈ پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

بمشکل مسکراتے ہوئے بولا۔ ”مجھے یقین تھا کہ تم ضرور آؤ گے۔ اپنی زندگی کی غلطیوں کا ازالہ کرنے کے لئے میں تمام جرموں کا اعتراف کرنا چاہتا ہوں۔ حالانکہ میرے خیال میں اس کا کچھ بھی فائدہ نہیں ہونے والا...... لیکن دل کا بوجھ ہلکا کرنا بھی بہت ضروری ہے۔“ وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ بات چیت کرنے کے دوران اس کے منہ سے بدبو کا ایسا بھبکا اٹھتا تھا۔ جسے قبول کرنا مشکل ہوتا تھا۔ معدہ با آہستگی گلتا سڑتا جا رہا تھا۔ کرنل نے سامنے کھڑے دو نوکروں میں سے ایک کو اشارہ کیا اور وہ مشروبات کا انتظام کرنے کمرے سے باہر کی جانب چلا گیا۔ میں اور انسپکٹر جون خاموشی کے ساتھ بیڈ کے ساتھ موجود کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

”تمہیں بیمار دیکھ کر مجھے افسوس محسوس ہو رہا ہے تم ایسے کبھی بھی نہیں تھے۔“ میری آنکھیں افسوس اور تاسف کا پیش خیمہ دکھائی دیتی تھیں۔

”لیکن مجھے افسوس نہیں ہے۔“ کرنل سرد لہجے میں بولا۔ ”میں نے جو کچھ بویا تھا۔ وہی کچھ پایا۔ اپنی تمام زندگی لوگوں کو اذیت دینے میں گزار دی۔ اب زندگی کے آخری چند پل ان اذیت ناک لمحوں کو بیان کر کے سکون حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ اگر تم دونوں سننے کے لئے تیار ہو۔ تو کرسیوں کو آگے کھینچ لو۔ اونچی آواز میں بات چیت کرنا میرے لئے مشکل ثابت ہوتا ہے۔“

میں نے اور انسپکٹر جون نے کرسیاں آگے کھسکا لیں۔ اور کرنل سائی کی جانب استفہامیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ نوکر مشروبات کی ٹرے لئے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے مشروبات کا جگ اور گلاس ہمارے سامنے میز پر رکھ دیئے اور خاموشی کے ساتھ ایک جانب کھڑا ہو گیا۔ میں نے جگ میں سے مشروب گلاس میں انڈیلا اور ایک گلاس انسپکٹر جون کو تھمانے کے بعد دوسرا اپنے سامنے میز پر رکھ لیا۔ کرنل سائی نے طویل سانس لیتے ہوئے اپنے دہشت ناک واقعات کا آغاز کیا۔

”تم جانتے ہی ہو کہ میں بچپن سے اذیت ناک فطرت کا حامل رہا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اسکول کے دور میں ایک دفعہ ٹیچر نے کسی بات پر مجھے مارا پیٹا تھا۔ تب میں نے اس کی آنکھوں پر موجود عینک کا نشانہ لے کر مکا مارا تھا۔ عینک ٹوٹ گئی اور شیشے کی کرچیاں اس کی آنکھوں میں جا گھسیں۔ تب میرے دل میں پہلی دفعہ خیال آیا کہ اگر انسان کی آنکھوں کو انگلیوں کے ذریعے باہر نکال دیا جائے۔ تب وہ کیسا لگے

گا۔ اور کیسے تڑپے گا۔ میرے دل میں موجود اس خواہش نے شدت اختیار کرنا شروع کر دی۔ میں انسانوں کے وجود کو فنا ہوتے دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن ایسا ممکن نہیں تھا۔

میں نے نیشنل جیوگرافک کی سی ڈیز کا بندوبست کیا۔ ان میں ایسی سی ڈیز موجود تھیں۔ جن میں انسانوں اور جانوروں کو فنا ہوتے ہوئے دکھایا گیا تھا۔ لیکن میں کچھ ہی دنوں میں ان سی ڈیز سے اکتا گیا۔ مجھے حقیقت میں سب کچھ دیکھنا تھا۔ تب ایک اچھوتے منصوبے کا تانا بانا میرے دماغ کے پردے پر نمودار ہوا۔ ہمارے گھر کے قریب جنگلات کا لامتناہی سلسلہ موجود تھا۔ جہاں انسانوں کی مختصر آبادی کے علاوہ جنگلی حیات کی بھی بہتات تھی۔ ان دنوں والد صاحب نے مجھے شاٹ گن خرید کر دی تھی۔ میں شاٹ گن کے ذریعے ننھے منے پرندوں اور جانوروں کا شکار بخوبی کر لیتا تھا۔ اسکول سے چھٹی کے بعد میرا واحد مشغلہ یہی تھا۔ ہاتھوں میں شاٹ گن تھامے میں جنگلوں میں آوارہ پھرتا رہتا تھا۔ ایسی ہی آوارہ گردی کے دوران ایک دفعہ میں شیرنی کی کچھار تک جا پہنچا۔

شیرنی نے دو بچے دیئے ہوئے تھے۔ بچے بلی کے بچوں سے کچھ بڑے تھے۔ وہ دونوں اپنی ماں کے ہمراہ کچھار کے باہر بیٹھے سردیوں کی دھوپ سے محظوظ ہو رہے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ وہ تینوں دھوپ میں بیٹھے رہے۔ میں ان تینوں کی نگاہوں سے پوشیدہ درختوں کے جھنڈ کے درمیان کھڑا انہیں بغور دیکھتا رہا۔ ہم دونوں نے انہیں اغوا کرنے کا پروگرام مرتب کیا اور شاٹ گن کے علاوہ والد صاحب کا کیمرہ ہمراہ لے کر شام کے قریب کچھار تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ ہماری قسمت اچھی تھی۔

شیرنی کچھار میں موجود نہیں تھی۔ وہ ہمارے کچھار تک پہنچنے سے کچھ دیر پہلے کچھار سے نکل کر باہر چلی گئی تھی۔ ہم نے اسے گھنے جنگلات کی جانب جاتے ہوئے بخوبی دیکھتا رہا۔ کچھار کے پاس پہنچ کر میں نے لڑکے کو باہر کھڑے ہونے کا اشارہ کیا۔ اور خود کچھار کے اندر گھس گیا۔ کچھار کا دہانہ باہر سے مختصر ہونے کے علاوہ اندر سے بہت کشادہ تھا۔ دونوں بچے خشک گھاس پر لیٹے خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہے تھے۔ میں نے جب انہیں اٹھانے کی کوشش کی۔ تب انہوں نے بری طرح چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ میری کمر پر اسکول کا بیگ موجود تھا۔ میں نے بیگ کو نیچے اتارا اور زپ کھول کر پہلے ایک بچے کو بیگ کے اندر گھسیڑا پھر دوسرے کو گھسیڑنے کے بعد زپ کو جھٹکے کے ساتھ بند کر دیا۔ پھر کچھار سے باہر نکل آیا۔ لڑکا میرا منتظر تھا۔ وہ بیگ کو کھول کر بچوں کو دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن میں نے طے شدہ منصوبے کے مطابق اچانک ہی جنگلات کی جانب دیکھتے ہوئے چلانا شروع کر دیا۔ ”شیرنی آ رہی ہے سامنے درختوں کے جھنڈ کی جانب چلو۔ ورنہ چیر پھاڑ کر رکھ دے گی۔“ لڑکا بدحواس ہو گیا۔ اور جنگل کی جانب دیکھے بغیر درختوں کے جھنڈ کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ اس کی بدحواسی کو دیکھتے ہوئے میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ جسے میں نے کمال ہوشیاری کے ساتھ چھپا لیا۔

جھنڈ کے قریب پہنچ کر میں نے اسے درخت پر چڑھنے میں مدد دی۔ وہ کمال ہوشیاری کے ساتھ پھرتی کے ساتھ درخت پر چڑھتا چلا گیا۔ درخت نہایت گھنا اور بلند قامت تھا اس پر چڑھنا مشکل ثابت نہیں ہوا۔ شیرنی کے بچے میری کمر پر موجود اسکول بیگ کے اندر چیخنے چلانے میں مصروف تھے۔ ہم نے درخت کے ایک دوشاخ کا انتخاب کیا۔ اور اس پر ٹانگیں پھنسا کر بیٹھ گئے۔ لڑکے کی سانس پھولی ہوئی تھی اور چہرے پر زلزلے کے اثرات نمایاں تھے۔ اس کی شکل کو دیکھ کر مجھ پر دوبارہ ہنسی کا غلبہ مسلط ہونے لگا۔ پھر میں قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ اس نے میری جانب حیرت بھری نگاہوں سے دیکھا۔ پھر حالات کو جانچنے کے بعد غصیلے لہجے میں گالیاں دیتے ہوئے بولا۔

”تو یہ سب جھوٹ تھا۔ مجھے تم سے یہی توقع تھی۔ لیکن ٹائم ضائع کرنے کا بھلا کیا فائدہ؟ ہم دونوں

ابھی تک گاؤں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے ہوتے۔"
میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "گاؤں واپس جانا میرے منصوبے میں شامل نہیں ہے۔" وہ حیرت بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگا۔

"میں نے مختصر تفریح کے لئے شیرنی کے بچوں کو اغوا کیا ہے۔" پھر میں نے اس کا جواب سنے بغیر جیب میں سے رسوں کے دو ٹکڑے باہر نکالے۔ اور کمر پر موجود تھیلے کی زپ کھول کر شیرنی کے معصوم بچے کو باہر نکالا۔ لڑکا حیرت بھری نگاہوں سے مجھے ایسا کرتے دیکھ رہا تھا۔

میں نے ایک بچہ اسے تھمادیا۔ اور دوسرے بچے کی گردن کے گرد رسی باندھنے لگا۔ شیرنی کے بچے نے حیل وحجت کرنے کی کوشش کی۔ لیکن میں نے رسی باندھ ہی دی۔ پھر دوسرے سرے کو درخت کے دو شاخ کے ساتھ باندھ کر بچے کو درخت کی چوڑی شاخ پر بٹھادیا۔ لڑکے نے سوالیہ لہجے میں پوچھا۔ "یہ تم کیا کر رہے ہو؟"

میں نے پراسرار لہجے میں جواب دیا۔ "بس تم خاموشی کے ساتھ دیکھتے جاؤ۔ میرا تمام منصوبہ بے ضرر ہے۔" لڑکا خاموش ہو گیا۔ تب میں نے دوسرا بچہ اس کے ہاتھوں سے چھینا اور اسے بھی رسی کے ساتھ باندھنے لگا۔ ایک سرا گلے میں اور دوسرا سرا درخت کے ساتھ...... لیکن میں نے اسے درخت کے دو شاخے پر نہیں رکھا۔

ہاتھوں میں تھامے مسکراتے ہوئے لڑکے کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

"مجھے اذیت ناک منظر کی طلب ہے۔ سسکنا اور تڑپنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ چاہے وہ جانور ہوں یا پھر انسان......" میں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اور درخت کی موٹی شاخ پر اچھلتے کودتے دونوں بچوں کو درخت سے نیچے دھکیل دیا۔ لڑکے کے منہ سے بے اختیار چیخ نکل گئی۔ رسی سے بندھے ہوئے دونوں بچے شاخ کے ساتھ لٹک گئے۔ ان کے گلوں میں موجود رسی نے پھندے کی صورت اختیار کر لی۔ دونوں درد کی شدت سے تڑپنے لگے۔ ان کے منہ سے بے اختیار درد بھری چیخیں نکلنے لگیں۔ لڑکے نے اپنی دونوں آنکھوں پر بے اختیار ہاتھ رکھ لئے۔ میں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ پھر لڑکے سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

"ڈرپوک انسان...... دیکھو کتنا دلفریب منظر ہے۔" لڑکے نے آنکھوں پر ہاتھوں کی گرفت اور بھی مضبوط کر لی۔ میں نے جھٹکے کے ساتھ اس کے ہاتھوں کو آنکھوں سے ہٹانے کی کوشش کی۔ لیکن اس کی گرفت بے حد مضبوط تھی۔ پھر جنگل کا ماحول شیرنی کے دھاڑنے کی آواز سے گونج اٹھا۔ وہ یقیناً دونوں بچوں کی ماں شیرنی تھی۔ اور بچوں کے چیخنے چلانے کی آواز سن کر اس جانب چلی آئی تھی۔ اس دن میں نے پہلی دفعہ شیرنی کے غیض و غضب کا دل دہلا دینے والا منظر دیکھا۔

شیرنی نے غصے سے دھاڑتے ہوئے درخت پر چڑھنے کی کوشش شروع کی۔ لیکن درخت کا تنا کافی اوپر تک سپاٹ تھا۔ اس لئے وہ اپنی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ تنے پر کافی اوپر تک چڑھنے کے بعد بے اختیار زمین پر گر جاتی۔ پھر دوبارہ دھاڑتی ہوئی اوپر چڑھنے کی کوشش کرتی۔ اس کے غیض و غضب کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے محسوس ہونے لگے۔ قریب کی شاخ پر بیٹھے ہوئے لڑکے کا پیشاب خطا ہو گیا اور اس کا جسم خزاں رسیدہ پتے کی مانند تھر تھر کانپنے لگا۔ شیرنی کے بچوں نے تڑپنا بند کر دیا۔ ان دونوں پر نزع کی کیفیت طاری تھی۔ باقی جسم تقریباً بے سدھ ہو گئے تھے۔ شیرنی درخت پر چڑھنے میں ناکام ہونے کے بعد اب زمین کو پنجوں کے ذریعے ادھیڑنے میں مصروف تھی۔ اس کی دھاڑ سے تمام جنگل ہل رہا تھا۔ ایسے مواقع کے دوران نجانے کیسے میری اذیت پسند فطرت جاگ اٹھی۔ یہ سب میرے منصوبے کے برخلاف تھا۔ میرا ارادہ تو صرف شیرنی کے بچوں کو پھانسی لگا کر تصویریں کھینچنے کا تھا۔ لیکن تصویریں نہ کھینچنے کی بنا پر منصوبہ تبدیل کرنا پڑا۔ میں نے ساتھ والی شاخ پر بیٹھے ہوئے لڑکے کی جانب سرسری نگاہوں سے دیکھا۔ وہ بے چارہ بدحواس ہو کر بے سدھ ہو چکا۔ میں

نے اپنے جسم کو مضبوطی کے ساتھ درخت کی شاخ پر ایڈجسٹ کیا۔ پھر شاخوں پر سے با آہستگی اپنے دونوں ہاتھوں کو اٹھایا۔ اس کے بعد لڑکے کو درخت سے نیچے دھکا دینا مشکل ثابت نہیں ہوا۔

لڑکا چیختا چلاتا ہوا درخت سے نیچے شیرنی کے بالکل سامنے جا گرا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا میں بتانے سے قاصر ہوں۔ صرف اتنا بتائے دیتا ہوں۔ غصے میں بھری ہوئی شیرنی نے منٹوں میں لڑکے کے نرم و نازک جسم کو ادھیڑ کر رکھ دیا۔ پھر درخت کے نیچے بیٹھ کر گوشت کھانا شروع کر دیا۔ میری جگہ کوئی اور شخص وہاں ہوتا تو شاید دہشت کی بدولت درخت پر بیٹھے بیٹھے اس کی جان نکل گئی ہوتی لیکن مجھے تو ایسے ہی مناظر کی طلب تھی۔ اس لئے میں مکمل انہماک کے ساتھ شیرنی کو چیر پھاڑ کرتے ہوئے دیکھتا رہا۔ اس دوران میں نے مختصر زاویوں سے تصاویر بھی کھینچیں۔ جو اس وقت بھی میری تصاویر کی گیلری میں موجود ہیں۔

بہر حال تقریباً آدھے گھنٹے کے دوران شیرنی نے لڑکے کا تمام گوشت ہڑپ کر لیا۔ اب وہاں صرف بچی کچی ہڈیوں یا کپڑوں کے چیتھڑوں کے علاوہ اور کچھ موجود نہیں تھا۔

شیرنی نے منہ اٹھا کر اپنے بچوں کی لاشوں کی جانب دیکھا۔ پھر میری جانب دیکھ کر غرانے لگی۔ لیکن اس دفعہ اس نے درخت پر چڑھنے کی کوشش نہیں کی بلکہ درخت کے نیچے تنے کے پاس بیٹھ گئی۔ یقیناً وہ میرے نیچے اترنے کا انتظار کر رہی تھی۔ اب پریشان ہونے کی باری میری تھی۔ اس کے درخت کے نیچے بیٹھنے کی بدولت میں درخت سے نیچے نہیں اتر سکتا تھا۔ اور درخت پر یوں بیٹھے رہنا آسان نہیں تھا۔ لیکن مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق چپ کر کے بیٹھا رہا۔

رات ہو گئی...... لیکن شیرنی نے درخت کے نیچے سے ہٹنے کا نام نہیں لیا۔ وہ بت بنی درخت کے نیچے بیٹھی اوپر درخت کی شاخوں سے لٹکے ہوئے اپنے بچوں کے مردہ وجود کو دیکھتی جاتی تھی۔ میرا جسم خصوصاً ٹانگیں سن ہو کر تقریباً مردہ ہونے والی تھیں۔

اچانک جنگل میں شور سنائی دیا۔ کچھ لوگ درختوں کی جانب آتے دکھائی دیئے۔ ان کے ہاتھوں میں روشن مشعلیں موجود تھیں۔ شور سن کر شیرنی اپنی جگہ سے کھڑی ہوئی۔ پھر تیر کی مانند اپنے کچھار کی جانب بھاگ گئی۔ میں نے طویل سانس لیا۔ پھر شیرنی کے مردہ بچوں کی رسیاں کھولنے لگا۔ لوگ ابھی کچھ دور تھے۔ میں نے بندر کی سی پھرتی کے ساتھ درخت سے نیچے اترنے کے بعد شیرنی کے بچوں کو درخت سے کچھ دور موجود کھائی میں پھینک دیا۔ پھر چہرے پر خوف اور گھبراہٹ کے تاثرات لئے لوگوں کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔

ہجوم اب قریب آ چکا تھا۔ سب سے آگے والد صاحب ہاتھوں میں رائفل تھامے چہرے پر پریشانی لئے چلے آ رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات ابھرے۔ اور انہوں نے بے اختیار مجھے گلے لگا لیا۔ میں نے کمال ہوشیاری کا ثبوت دیتے ہوئے دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ تمام گاؤں والے حیرت بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھنے لگے۔ میں نے روتے ہوئے انہیں حالات سے آگاہ کیا۔ لیکن شیرنی کے بچوں کو اغوا کرنے اور پھر انہیں مارنے والے تمام حالات گول کر دیئے۔ گاؤں والوں کے چہرے پر خوف طاری ہونے لگا۔ اور انہوں نے واپس گاؤں کی جانب جانے کے لئے اصرار شروع کر دیا۔ والد صاحب نے انکار کیا۔ پھر گاؤں والے میرے ہمراہ اس درخت کی جانب چل دیئے۔ جس کے نیچے لڑکے کی لاش کے بقایاجات پڑے تھے۔ ہم نے بقایاجات اکٹھے کئے۔ اس کے بعد والد صاحب نے کچھار کا بھی معائنہ کیا۔ جس میں شیرنی کی رہائش تھی۔ وہاں سناٹا طاری تھا۔ رات کے اس پہر کچھار کے اندر جانا سراسر حماقت ہو سکتی تھی۔ اس لئے والد صاحب گاؤں والوں کے ہمراہ واپس گاؤں کی جانب چل دیئے۔"

کرنل سائی سانس لینے کے لئے رکا۔ واقعات

سننے کے دوران میں اور انسپکٹر جون مشروبات سے محظوظ ہوتے رہے تھے۔ لیکن میرے چہرے پر اب بےزاری کے تاثرات ابھرنے لگے تھے۔ مجھے ڈونگا ٹاؤن میں اپنی موجودگی کی وجہ معلوم نہیں ہو پارہی تھی۔ کرنل سائی نے دوبارہ میری جانب دیکھا۔ پھر چہرے کے تاثرات پڑھنے کے بعد بولا۔

”ابھی کہانی کا کچھ حصہ باقی ہے۔ مہربانی کرکے سنتے جاؤ۔ مجھے یقین ہے کہ تم دونوں مایوس نہیں ہوگے۔“

میں گمبیر لہجے میں بات کاٹ کر بولا۔ ”کرنل سائی ہم تمہاری کہانی سننے کے لئے بخوشی تیار ہیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھنا کہ ہمارا وقت بہت قیمتی ہے۔ ہم بمشکل اپنی مصروفیات میں سے وقت نکال کر یہاں آئے ہیں۔“

کرنل سائی کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر بولا۔

”میں جانتا ہوں۔ تم ہمیشہ وقت کے پابند رہے ہو، لیکن میرے پاس بھی وقت کی بہت کمی ہے۔ میں نہیں جانتا ہوں کہ کتنا عرصہ جی پاؤں گا۔ میری آخری خواہش ہے کہ اپنے گناہوں کا اعتراف کروں...... بعد ازاں اپنے آپ کو قانون کے حوالے کردوں۔“

”تو پھر شروع ہو جاؤ۔“ میں بےتابی کے ساتھ بولا۔ کرنل سائی نے طویل سانس لیا۔ پھر تکیے کے ساتھ ٹیک لگاتے ہوئے بولا۔

”یہ کچھ واقعات میری جوانی کے اذیت ناک لمحوں کے تھے۔ اس کے بعد بھی میری فطرت میں تبدیلی واقع نہیں ہوسکی۔ وقت کی کمی کی بدولت بہت سے واقعات سے پردہ کشی کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس لئے اصل واقعات کی جانب آتا ہوں۔ سیکنڈری اسکول تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں نے اپنی فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے فوج کو جوائن کیا۔ جنگ کے دوران میری بہادری قابل تعریف تھی۔ یہاں بھی زیادہ عمل دخل اذیت پسندی کا ہی رہا۔ لیکن بہر حال موقع بھی تھا اور دستور بھی تھا۔ اس لئے کامیابی کی سیڑھیاں با آسانی چڑھتا چلا گیا۔ فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد میں نے اپنی خاندانی بندوق اٹھائی اور جنگلات کا رخ کیا۔ فوج کی طرح میری شکاری زندگی بھی کامیاب ترین رہی...... اور میں نامور شکاری بنتا چلا گیا۔

یہ تیس سے لے کر پینتالیس تک کی دہائی کی بات ہے۔ سوانا ٹاؤن کے قریب کے جنگلات میں ایک شیر مردم خوری کی وبا میں مبتلا ہوتا چلا گیا۔ اس نے ایک سال کے دوران لگ بھگ پینتیس سے زائد انسانوں کو لقمہ اجل بنا ڈالا۔ ٹاؤن والوں نے پریشان ہوکر حکومت سے مدد کی اپیل کی۔ تب حکومت کی درخواست پر مجھے خصوصی مراعات کے ہمراہ سوانا ٹاؤن بھیجا گیا۔ خصوصی مراعات لینے سے میں نے صاف انکار کردیا۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں تھی۔ جس چیز کی مجھے ضرورت تھی۔ وہ سوانا ٹاؤن میں بکثرت پائی جاتی تھی۔ انسانوں کو تلف ہوتے ہوئے دیکھنا میری فطرت کا لازمی جزو بنتا چلا جارہا تھا۔ جنگ کے دنوں میں اپنی خواہش پر با آسانی عمل درآمد کرلیا کرتا تھا۔ لیکن جنگ کے بعد مجھے مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے میں نے فوراً سوانا ٹاؤن کا رخ کیا۔ سوانا ٹاؤن سے دس میل کے فاصلے پر چھوٹا سا گاؤں ساسولی واقع تھا۔ وہ آدم خور شیر کی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ ساسولی گاؤں کے قریب ہی گورنمنٹ کا ریسٹ ہاؤس بنا ہوا تھا۔ جو کہ میری رہائش گاہ کے لئے مختص کردیا گیا۔ یہاں میری خدمات کے لئے ایک خانساماں اور دو نوکر موجود تھے۔ جن کا تعلق ساسولی گاؤں سے تھا۔ مجھے نوکروں کی قطعاً ضرورت نہیں تھی۔ اس لئے میں نے ان میں سے ایک کو فارغ کردیا۔ باقی دو کا تعارف یوں ہے۔

خانساماں پینتالیس سالہ ادھیڑ عمر اور قدرے بےوقوف آدمی دکھائی دیتا تھا۔ اس کا نام گانو تھا۔ نوکر کا نام ڈیپی تھا۔ اور اس کی عمر پچیس سے تیس سال کے درمیان تھی۔ بہر کیف میں نے ریسٹ ہاؤس پہنچتے کے فوراً بعد گزشتہ روز ہونے والی جائے واردات کا معائنہ کیا۔

آدم خور شیر نے بیس سال کے لڑکے پر اس وقت حملہ کیا تھا۔ جب وہ کھیتوں سے کام کر کے سرِ شام واپس آرہا تھا۔ شیر نے لاش کو کھینچ کر کھیتوں سے پرے ہٹایا پھر وہیں جنگلی جھاڑیوں کے عقب میں بیٹھ کر کھالیا تھا۔ پنجوں کے نشانوں سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ کہ وہ ایک بوڑھا ببر شیر تھا۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ وہاں اس کے قدموں کے نشانات صرف تین کی صورت میں پائے گئے تھے۔ یقیناً اس کا ایک پنجہ زخمی رہا ہوگا۔ جسے وہ زمین پر رکھنے سے انحراف کرتا ہوگا۔ یہی زخمی پنجہ اس کے آدم خور بننے کی وجہ رہا ہوگا۔ لاش پر سے گوشت چٹ کرلیا گیا تھا۔ اب وہاں سوائے ہڈیوں یا پھر کپڑوں کے چیتھڑوں کے علاوہ اور کچھ بھی موجود نہیں تھا۔ مچان باندھنے کا بھی فائدہ نہیں تھا۔ اس لئے میں نے رات کے گشت کا آغاز کردیا۔

شیر کی وارداتوں کی وجہ سے گاؤں میں چھ سات بجے ہی الو بولنے لگ جاتے تھے۔ انسان تو درکنار جانور اور پرندے بھی اپنی رہائش گاہوں میں جا چھپتے تھے۔ میرا دماغ ان دنوں ایک اچھوتے آئیڈیا پر کام کرنے میں مصروف تھا۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میں سوانا ٹاؤن آنے سے پہلے مکمل طور پر کیل کانٹے سے لیس ہو کر آیا تھا۔ شیر کو مارنا میرے لئے مشکل کام نہیں تھا۔ لیکن میں اسے اتنی جلدی مارنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ میرے منصوبے کا خاص کردار تھا۔

رات بارہ بجے تک گاؤں کے اردگرد گھومنے پھرنے کے بعد میں نے کمر پر موجود بیگ کو نیچے اتارا پھر پھرتی کے ساتھ کپڑے تبدیل کرنے لگا۔ بیگ میں سیاہ رنگ کا ریچھ کی کھال سے بنا ہوا لباس موجود تھا۔ یہ لباس مجھے افریقہ کے ایک وحشی قبائل سے دستیاب ہوا تھا۔ اس کے ساتھ چہرے پر چڑھانے والا ماسک موجود تھا۔ لباس پہننے اور ماسک چڑھانے کے بعد کوئی بھی یہ یقین نہیں کرسکتا تھا کہ سامنے موجود مخلوق جانور ہے یا پھر انسان...... کم از کم اندھیرے میں پہچاننا تو تقریباً ناممکن تھا۔ لباس زیب تن کرنے کے بعد میں نے اتارا ہوا لباس تھیلے کے اندر ڈالا۔ پھر تھیلے اور بندوق کو قریبی درخت کی گھنی شاخوں میں چھپانے کے بعد ریسٹ ہاؤس کی جانب چل دیا۔ ریسٹ ہاؤس اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میرے پاس گیسٹ ہاؤس کے دروازے کی چابی موجود تھی۔ میں نے گیٹ کھولا اور باآہستگی اندر داخل ہوگیا۔ سامنے برآمدے کے ساتھ کمروں کی مختصر قطار موجود تھی۔ ڈیپی کا کمرہ برآمدے سے کچھ ہٹ کر بائیں باغ کے قریب واقع تھا جبکہ خانساماں باورچی خانے میں ہی ہوتا تھا۔ میں نے ڈیپی کے کمرے کا رخ کیا۔ ہلکی دستک سے اس کے کانوں پر جوں بھی نہیں رینگی۔ اس لئے میں نے دروازہ دونوں ہاتھوں کے ساتھ دھڑ دھڑا دیا۔ اس کی نیند میں ڈوبی ہوئی آواز سنائی دی۔

”گانو کیا بات ہے؟ تمہیں رات کے اس پہر بھی چین نہیں۔ جو آدم خور کی موجودگی کے باوجود میرے کمرے تک چلے آئے ہو۔“

میں نے آواز کو بارعب بناتے ہوئے کہا۔

”ڈیپی دروازہ کھولو۔ میں تمہارا افسر تم سے ہمکلام ہوں۔ گانو کو شیر اٹھا لے گیا ہے۔“

اندر سے حیرت بھری بڑبڑاہٹ سنائی دی۔ پھر جھٹکے کے ساتھ دروازہ کھل گیا۔ وہ چڑ مڑ کپڑوں میں ملبوس نیند بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ جب اس کے حواس کچھ بحال ہوئے تب میرے لباس پر نظر پڑتے ہی اس نے چیخنے کے لئے منہ کھولا۔ میں نے پھرتی کے ساتھ اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر الٹے ہاتھ کا مکا اس کی کنپٹی پر جمادیا۔ وہ لڑکھڑا کر میرے ہاتھوں میں جھولتا چلا گیا۔ میں نے اسے اٹھا کر کاندھے پر ڈالا اور دبے قدموں ریسٹ ہاؤس سے باہر کی جانب چل دیا۔ ریسٹ ہاؤس کے جالی والے گیٹ کو تالا لگانے کے بعد میں نے اس درخت کا رخ کیا۔ جہاں میری رائفل اور بیگ موجود تھے۔ میں نے ڈیپی کے بےہوش وجود کو درخت کے نیچے لٹایا۔ اور پھرتی کے ساتھ درخت پر چڑھ کر بیگ اور رائفل نیچے اتار لایا۔

بیگ کے اندر موٹی زنجیر اور مضبوط تالا موجود تھا۔ میں نے زنجیر ڈیبی کے پاؤں میں باندھی اور اسے اٹھا کے گاؤں سے کچھ دور موجود جنگل کی جانب چل دیا۔

ایک ویران اور اجڑی ہوئی جگہ کا انتخاب کرنے کے بعد میں نے ڈیبی کو زمین پر لٹایا۔ پھر بیگ میں سے ہتھوڑا اور کھونٹا نکال کر زمین پر کھونٹا نصب کیا اور اس کے ساتھ زنجیر کا مخالف سرا باندھنے کے بعد تالا لگا دیا۔ وہاں سے پانچ چھ فٹ کے فاصلے پر چیڑ کا درخت موجود تھا۔ میں نے بیگ سنبھالا اور درخت پر چڑھ کر بیگ کو قریبی شاخ کے ساتھ لٹکا دیا۔ پھر بیگ میں ہاتھ ڈال کر مہنگا اور جدید کیمرہ باہر نکال کر اسے سیٹ کرنے لگا۔ یہ کیمرہ رات کے وقت تصاویر کھینچنے کی بخوبی صلاحیت رکھتا تھا۔"

کرنل سائی سانس لینے کے لئے مختصر وقت کے لئے چپ ہوا۔ پھر ہماری جانب دیکھتے ہوئے دوبارہ ہمکلام ہوا۔

"آپ لوگ منظر کشی کی بدولت بخوبی اندازہ لگا چکے ہوں گے کہ میرا اگلا لائحہ عمل کیا ہوسکتا تھا۔ اگر نہیں تو میں بتائے دیتا ہوں۔ میں ٹونی کو چارے کی صورت میں استعمال کرنا چاہتا تھا۔ یہی نہیں بلکہ آٹو میٹک کیمرے کی بدولت اس منظر کی تصویر کشی بھی کرنا چاہتا تھا۔ میرا ارادہ ایک ایسی لائبریری قائم کرنے کا تھا۔ جہاں ہیبت ناک تصویروں کے علاوہ جانوروں کے بھس بھرے لاشے بھی نصب ہوں۔ میرے خیال میں ایسی لائبریری کا انعقاد ہر شہر میں ہونا چاہئے تھا۔ لیکن ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ اس لئے اپنی ذات کی تسکین کے لئے گھر میں اس کا قیام باآسانی ممکن تھا۔

بہر حال وہ تمام رات میں نے درخت پر گزار دی۔ لیکن شیر نہیں آیا۔ ڈیبی کو میرے درخت پر چڑھنے کے پندرہ منٹ کے بعد ہی ہوش آ گیا تھا۔ وہ تمام رات چیختا چلاتا رہا۔ اپنے آپ کو زنجیر سے آزاد کروانے کی کوشش بھی کرتا رہا۔ لیکن مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ صبح کے قریب میں نے دوبارہ ریچھ والا لباس زیب تن کیا۔ اور درخت سے نیچے اتر کر ڈیبی کی جانب چلا آیا۔ اس نے خوف بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ پھر احتجاجاً ہاتھ آگے بڑھائے، میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ اور دوبارہ کن پٹی پر مکا جما دیا۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا اور بے ہوش ہوتا چلا گیا۔ میں نے ایک دفعہ پھر لباس تبدیل کیا۔ اور بیگ رائفل کو کاندھے پر لٹکانے کے بعد ڈیبی کو بھی کاندھوں پر منتقل کیا۔ اس کے بعد واپس ریسٹ ہاؤس کی جانب چل دیا۔ گالنو ابھی تک سو کر نہیں اٹھا تھا۔ میں نے ڈیبی کے بے ہوش وجود کو بستر پر منتقل کیا۔ پھر کمرے کے دروازے کو اندر سے لاک کرنے کے بعد خود روشن دان کے ذریعے کمرے سے باہر نکل آیا۔ میرے لبوں پر شرارت آمیز مسکراہٹ رقص کر رہی تھی۔ اپنے کمرے میں آنے کے بعد میں نے غسل کیا۔ پھر کپڑے تبدیل کرنے کے بعد سونے کے لئے لیٹ گیا۔

دوپہر کے ڈیڑھ بجے میری آنکھ کھلی۔ میں نے باہر نکل کر صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کی۔ وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔ ڈیبی کے کمرے کا دروازہ چوپٹ کھلا تھا۔ اور وہ کمرے میں نہیں تھا۔ گالنو بھی غائب تھا۔ میں نے مسکراتے ہوئے اپنے لئے کافی تیار کی۔ پھر ڈبل روٹی کے ساتھ کھانے کے بعد کپڑے تبدیل کئے اور ریسٹ ہاؤس کے گیٹ کی جانب تھے۔ ڈیبی کی داہنی کنپٹی سوجی ہوئی تھی۔ اور چہرے پر بے چارگی کے تاثرات تھے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ آگے بڑھا۔ اور گزشتہ رات کے واقعات تفصیل کے ساتھ سنانے لگا۔ واقعات میں سیاہ ریچھ نما انسان کا ذکر نمایاں تھا۔ میں نے طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس کی جانب دیکھا۔ پھر پوچھا۔

"جب صبح تمہاری آنکھ کھلی۔ تب تمہارے کمرے کا دروازہ اندر سے لاک تھا۔ یا پھر چوپٹ کھلا ہوا تھا۔" اس نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد جواب دیا۔ "دروازہ اندر سے لاک تھا۔ لیکن جناب آپ یقین کیجئے۔ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں۔ وہ حقیقتاً سچ ہے۔ وہ کوئی

خونخوار مخلوق تھی۔ جو ریچھ نما ہونے کے علاوہ دو پاؤں پر چل رہی تھی۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

پھر گاؤں والوں کی جانب دیکھتے ہوئے دلاسہ دینے والے لہجے میں کہا۔ "آپ سب کو فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے ہوتے ہوئے وہ مخلوق زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتی۔ لیکن بہر حال احتیاط ضروری ہے۔ اگر آپ لوگ رات کو باہر نکلنے سے مکمل پرہیز کیجئے۔ اگر ایمرجنسی میں باہر نکلنا مقصود ہو۔ تب مجمعے کی صورت میں باہر نکلے گا۔ میں نے رات کو گشت پر نکلنا شروع کر دیا ہے۔ لیکن علاقہ وسیع ہونے کی بدولت مکمل طور پر کور نہیں کر پا رہا ہوں۔ پھر بھی میری پوری کوشش یہی ہے کہ دوبارہ حادثہ نہ ہونے پائے۔"

گاؤں والوں کے چہروں پر اطمینان کے نمایاں تاثرات ابھرے۔ پھر وہ میرے حق میں نعرے لگاتے ہوئے گاؤں کی جانب چل دیئے۔ ڈیبی اور گالنو نے میرے ہمراہ ریسٹ ہاؤس میں رہنے سے صاف انکار کر دیا۔ لیکن میرے لئے کوئی مشکل مرحلہ نہیں تھا۔ میں اپنے زیادہ تر کام بخوبی کر سکتا تھا۔ جن میں کھانا پکانا اور کپڑے دھونا سر فہرست تھے۔

گاؤں والوں کے جانے کے بعد میں نے کپڑے تبدیل کئے۔ اور رائفل اٹھائے باہر کی جانب چل دیا۔ اسے اتفاق کہہ لیجئے۔ یا پھر میری خوش قسمتی...... کہ بالکل اچانک ہی میری نگاہ ریسٹ ہاؤس سے باہر کی جانب جاتی پگڈنڈی کی بھربھری زمین پر پڑی۔ وہاں میرے قدموں کے نشانات موجود تھے۔ لیکن حیرت کی بات یہ تھی کہ میرے قدموں کے تعاقب میں آدم خور شیر کے نشانات بھی موجود تھے۔ وہ ریسٹ ہاؤس کے گیٹ تک میرے پیچھے آیا تھا۔ پھر میرے ریسٹ ہاؤس کے اندر جانے کے بعد اس نے عمارت کے گرد چکر لگایا۔ اس کے بعد دوبارہ جنگل کی جانب چلا گیا۔ میں نے نشانات کا تعاقب شروع کیا۔ ریسٹ ہاؤس کے پاس سے ہوتے ہوئے نشانات جنگل میں موجود ندی کی جانب دکھائی دیئے۔ ندی سے اس نے پانی پیا۔ پھر جنگل کی مخالف جانب واقع پہاڑی کی جانب چل دیا۔ پہاڑی کی پتھریلی زمین تک پہنچنے کے بعد نشانات یکلخت غائب ہو گئے تھے۔ پہاڑی سے کچھ اوپر بڑے دہانے کا غار دکھائی دیا۔ وہ آدم خور کے لئے محفوظ مقام ہوسکتا تھا۔ میں غار کی جانب چل دیا۔ وہ واقعی آدم خور کی رہائش تھی۔ لیکن وہ وہاں موجود نہیں تھا۔ غار میں پتھر پھینکنے کے بعد جب مجھے اس کی غیر موجودگی

نمک پارے

☆ انسان وہی ہے جو دوسروں کی فکر کرے، صرف اپنی پرواہ کرنے والا آدمی کہلاتا ہے۔

☆ دوسروں کی عیب جوئی کرنے سے پہلے خود کو ایک بار ضرور دیکھو کیونکہ تم میں بھی کوئی نہ کوئی عیب ضرور ہوگا۔

☆ احساس کمتری اور احساس برتری دونوں ہی میں مبتلا انسان کبھی کامیاب نہیں ہوتا۔

☆ کوئی شک نہیں کہ میرے کپڑے پھٹے پرانے ہیں لیکن یہ میرے اپنے ہیں۔

☆ جانے سے پہلے آنے کا انتظار کرلو اگر نہ آسکو تو جانا بے فائدہ ہے۔

☆ پرامید ہو کر سفر کرنا منزل پر پہنچنے سے بہتر ہے۔

☆ ٹوٹی ہوئی دوستی جڑ سکتی ہے مگر ثابت نہیں ہوسکتی۔

☆ ایک لمبی زبان زندگی کو چھوٹا بنا سکتی ہے۔

☆ اس مسلمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے جو نہ استاد ہے نہ طالب علم۔

☆ وہ تھوڑا سا عمل اس بڑے عمل سے بہتر ہے، جو اکتا کر چھوڑ دیا جائے۔

☆ بہت سارے دوست نما دشمن بنانے سے کہیں بہتر ہے کہ انسان صرف ایک دشمن بنا لے۔

(ایس امتیاز احمد۔کراچی)

کا یقین ہوگیا۔ تب میں نے غار کا معائنہ کیا۔ وہاں غلاظت کے علاوہ انسانی ہڈیاں بکھری پڑی تھیں۔ اس کے علاوہ نرم زمین پر آدم خور کے پاؤں کے نشانات بھی موجود تھے۔ میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور ریسٹ ہاؤس واپس چلا آیا۔

تمام دن ریسٹ ہاؤس میں سوتے ہوئے گزرا۔ رات دس بجے کھانے وغیرہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اپنی رائفل اور بیگ کو سنبھالا۔ پھر گیٹ کو بند کرنے کے بعد گاؤں کی جانب چل دیا۔ گاؤں مکمل طور پر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ میں نے گاؤں کا مختصر چکر لگایا۔ اور گاؤں کے ساتھ موجود جنگل کی جانب چلا آیا۔ ڈینی اور گانو کی بے وفائی کے بعد اب میں اپنے اگلے لائحہ عمل کے متعلق سوچنے میں مصروف تھا۔ مجھے جیتے جاگتے انسانوں کی ضرورت تھی۔ ظاہر ہے ان کے حصول کے لئے مجھے گاؤں کے گھروں کی دیواروں کو پھلانگنا پڑتا تھا۔ یہ ایک مشکل اور خطرناک عمل ثابت ہوسکتا تھا۔ لیکن مجھے اس کی پرواہ نہیں تھی۔ میں اپنی اذیت پسند فطرت کی تسکین کے لئے سب کچھ کرنے کے لئے تیار تھا۔ جنگل کے درمیان میں پہنچنے کے بعد اب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔ یہاں جنگل بے حد گھنا اور دشوار گزار تھا۔ آدم خور کی رہائش گاہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھی۔ میرا ارادہ آدم خور کی رہائش گاہ تک جانے کا تھا۔ وہ یقیناً اس وقت رہائش گاہ میں موجود تھا۔ شیروں کے اپنے کچھار سے باہر نکلنے کا وقت عموماً ایک سے چار بجے کے درمیان ہوتا ہے۔ یہ وقت آدم خوری کے بعد یقیناً تبدیل ہوجاتا۔

آدم خور شیر انسانوں پر حملے کرنے کے بعد بزدل اور چالاک ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کی نگاہ میں وقت کی اہمیت ختم ہوتی چلی جاتی ہے۔ جب اسے مناسب اور محفوظ وقت میسر آتا ہے۔ تب وہ حملہ کرنے سے گریز نہیں کرتا۔ میں ابھی آدم خور کے غار سے کچھ دور تھا۔ کہ اچانک مجھے کسی لڑکی کے کھلکھلا کر ہنسنے کی آواز سنائی دی۔ میں چونک کر جہاں تھا وہیں کھڑا ہوگیا۔ فوراً بعد کسی لڑکے کی سرگوشیانہ آواز ابھری۔ میں نے جگہ کا تعین کیا اور مکمل احتیاط کے ساتھ آوازوں کی جانب چل دیا۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ جب میں نے گھنی جھاڑیوں کے پیچھے ایک لڑکے اور لڑکی کو نہایت غیر موزوں لباس میں دیکھا۔ وہ ہنس ہنس کر ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کرنے میں مصروف تھے۔ گھپ اندھیرے میں ان کے چہرے دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ لیکن آوازوں کی بدولت اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا۔ کہ ان دونوں کی عمریں سترہ سے بیس سال کے درمیان تھیں۔ اب مجھے گاؤں کے گھروں میں گھسنے کی ضرورت نہیں تھی۔ میرا مطلوبہ سامان جنگل کے درمیان میں شیر کے کچھار کے پاس ہی دستیاب ہوگیا تھا۔ میرے رگ و پے میں خوشی کی لہر دوڑتی چلی گئی۔ ایک بھی نہیں دو شکار...... لیکن مجھے نہایت احتیاط کا مظاہرہ کرنا تھا۔ ان دونوں میں سے ایک بھی بھاگنے نہیں پائے۔ میں نے کمر پر موجود بیگ کو زمین پر رکھا اور مکمل احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے ریچھ والا لباس اپنے کپڑوں کے اوپر ہی پہننے لگا۔ مجھے لباس پہننے میں دو منٹ سے زیادہ کا عرصہ نہیں لگا۔ اس دوران میں ان دونوں کے وجود سے بے خبر نہیں رہا۔ میری نگاہیں ان کے وجود پر مرتکز تھیں۔ اور ہاتھ لباس کی منتقلی میں مصروف تھے۔ آدم خور کی وارداتوں کے بعد کسی بھی ہوش و حواس میں مبتلا انسان کا جنگل تو درکنار گھر سے باہر نکلنا بھی ناممکن تھا۔ اس لئے میں مطمئن تھا۔ لباس پہننے کے بعد میں نے رائفل کو دونوں ہاتھوں میں تھاما۔ بیگ کو ایک جانب درخت کی جڑ کے پاس رکھ کر میں دوبارہ ان محبت کے سمندر میں ڈوبے نوجوان جوڑے کی جانب چل دیا۔ وہ دونوں کپڑے پہننے میں مصروف تھے۔ میں نے اندازے کے مطابق لڑکے کے سر کو نشانہ بنایا۔ اور رائفل کا بٹ پوری طاقت کے ساتھ اس کے سر پر دے مارا۔

چیخ کی آواز کے ساتھ جنگل کا ماحول گونج اٹھا۔ اور مجھے اندازے کی غلطی کا فوراً احساس ہوگیا۔ کیونکہ

آواز لڑکے کی نہیں تھی۔ بلکہ لڑکی کی تھی۔ وہ تیورا کر زمین پر گرتی چلی گئی۔ میں نے بوکھلا کر رائفل کا بٹ دوبارہ بلند کرنے کی کوشش کی۔ لیکن اس اثناء میں لڑکا سنبھل چکا تھا۔ اس نے نا صرف رائفل کے بٹ کو دونوں ہاتھوں پر روک لیا بلکہ میری ٹانگوں کے درمیان گھٹنا بھی دے مارا۔ مجھے حلق میں سانس رکتا ہوا محسوس ہوا اور میں غوں...... غوں کی آواز نکالتا ہوا اکڑوں بیٹھتا چلا گیا۔ لڑکے نے میرے چہرے پر مکا رسید کیا۔ مجھے اپنے چودہ طبق روشن ہوتے محسوس ہونے لگے۔ پھر اس نے میری رائفل پر ہاتھ ڈال دیا۔ میں نے سر کو جھٹکا دیا اور رائفل کا بٹ اس کے گھٹنوں پر دے مارا۔ وہ زمین پر اکڑوں بیٹھتا چلا گیا۔ اس کا سر میرے سینے کے سامنے تھا۔ میں نے فوراً موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے رائفل کا بٹ اس کے سر پر رسید کردیا۔ وہ تیورا کر زمین پر گر گیا۔ میں نے دوسرے وار کے لئے رائفل کو اونچا کیا۔ لیکن وہ بے ہوش ہوچکا تھا۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے لڑکی کی جانب دیکھا۔ اس کے جسم میں حرکت کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ میں نے پھرتی کے ساتھ آگے بڑھ کر اسے کاندھے پر ڈالا۔ اور ریسٹ ہاؤس کی جانب روانہ ہوگیا۔ میرا ارادہ یوں تھا کہ لڑکی کو ریسٹ ہاؤس میں قید کرنے کے بعد دوبارہ جنگل کا رخ کروں گا۔ پھر بے ہوش لڑکے کو بھی ریسٹ ہاؤس میں منتقل کردوں گا۔ لیکن ایسا نہیں ہوسکا۔

لڑکی کو ڈینی کے کمرے میں بند کرنے کے بعد جب میں نے دوبارہ اس جگہ کا رخ کیا۔ جہاں لڑکے کو بے ہوش حالت میں چھوڑ کر گیا تھا۔ تب میں نے اسے وہاں نہیں پایا۔ وہ یقیناً ہوش میں آنے کے بعد فرار ہوگیا تھا۔ یہ میرے لئے پریشانی کی بات تھی۔

میں گھبراہٹ کے عالم میں ریسٹ ہاؤس کی جانب چل دیا۔ ریسٹ ہاؤس لڑکی کے چیخنے چلانے کی آوازوں سے گونج رہا تھا۔ وہ ہوش میں آگئی تھی۔ لیکن ہاتھ پاؤں بندھے ہونے کی وجہ سے صرف چیخنے چلانے پر اکتفا کر رہی تھی۔ میں نے اس کی کنپٹی پر مکا مار کر اسے بے ہوش کردیا۔ مکا کچھ زیادہ ہی شدت سے لگا تھا۔ کیونکہ اس کی کنپٹی سے خون بہنے لگا۔ میں نے پرواہ نہیں کی اور اس کے وجود کو کاندھے پر ڈال کر جنگل کے قریب واقع پہاڑی علاقے کی جانب چل دیا۔ میں جب علاقے کا تفصیلی جائزہ لے رہا تھا۔ تب میں نے مختصر پہاڑی علاقے میں متعدد ایسے غار دریافت کئے تھے۔ جن کے دہانے بڑے تھے۔ اور وہ اندر سے کشادہ ہونے کے علاوہ آگے سے بند تھیں۔ ایسی ہی ایک غار کا انتخاب کرنے کے بعد میں نے لڑکی کے ہاتھ پاؤں رسی کے ساتھ باندھنے کے بعد اسے غار کے فرش پر لٹایا۔ پھر غار کے دہانے کو پہاڑی پتھروں کے ساتھ اچھی طرح بند کرنے کے بعد ریسٹ ہاؤس کی جانب چل دیا۔ مینا اچھی طرح اندازہ لگا سکتا تھا۔ کہ لڑکے نے گاؤں پہنچتے ہی لڑکی کی گمشدگی کی اطلاع اس کے والدین کو دینی ہے۔ پھر تلاش کا نا ختم ہونے والا سلسلہ چل نکلنا تھا۔ اور ظاہر ہے اس سلسلے میں میرا ریسٹ ہاؤس بھی مستثنیٰ نہیں رہتا۔ اب میں اطمینان کے ساتھ لڑکی کے متعلق لاعلمی کا اظہار کرنے کے بعد گاؤں والوں کو ریسٹ ہاؤس کی تلاشی کی دعوت دے سکتا تھا۔ جب میں نے مطمئن قدموں کے ساتھ ریسٹ ہاؤس کے احاطے میں قدم رکھا۔ تب کافی دیر سے بے چینی کے تاثر نے شدت اختیار کرلی۔ میں اس کیفیت سے کافی دیر سے دوچار تھا۔ لیکن سمجھنے سے قاصر تھا کہ ایسا کیوں ہے؟

بہرحال کمرے میں داخل ہونے کے بعد میں نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ رات کے چار بجنے والے تھے۔ میں نے جسم پر موجود ریچھ کی کھال اور چہرے پر موجود ماسک کو اتار کر ایک جانب رکھا۔ میری بے چین طبیعت میں یکدم شدت کے ساتھ اضافہ ہونے لگا۔ فوراً بعد وجہ کا پہلو سامنے آتا چلا گیا۔ میرا سیاہ رنگ کا بیگ اور رائفل کمرے میں موجود نہیں تھی۔ میں نے آخری بار انہیں جنگل میں موجود جوڑے کے پاس دیکھا تھا۔ مجھے بخوبی یاد تھا کہ میں نے لباس تبدیل

کرنے کے بعد بیگ کو درخت کی جڑ کے پاس رکھ دیا تھا۔ لیکن رائفل...... وہ تو لڑکے اور لڑکی کے ساتھ لڑنے کے دوران شاید لڑکی کو زمین سے اٹھاتے ہوئے میں نے زمین پر رکھ دی تھی۔ لیکن جہاں تک مجھے یاد پڑتا تھا۔ لڑکی ریسٹ ہاؤس میں منتقل کرنے کے بعد جب میں نے دوبارہ جنگل کا رخ کیا تھا۔ تب وہاں رائفل موجود نہیں تھی۔ ورنہ لاشعوری طور پر میں ضرور اٹھا لیتا۔ اگر صبح گاؤں والوں نے جائے واردات کا رخ کرلیا؟ تب حالات میرے منافی بھی جاسکتے تھے۔ میں نے فوراً لباس تبدیل کیا۔ اور ریسٹ ہاؤس کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

خوف کے احساس نے میرے جسم کے رونگٹے کھڑے کردیئے۔ میں اس وقت بالکل خالی ہاتھ تھا۔ اور جنگل میں آدم خور شیر نا صرف موجود تھا۔ بلکہ مجھے اس کی رہائش گاہ کے قریب تک جانا تھا۔ رائفل کے علاوہ میرے پاس اور کسی بھی قسم کا ہتھیار موجود نہیں تھا۔ بہرحال سوچنے سمجھنے کا وقت بھی نہیں تھا۔ اس لئے میں نے تیز قدموں کے ساتھ سفر کا آغاز کردیا۔ میری توقع کے برخلاف کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آیا۔ اور میں اس جگہ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔ جہاں میری یادداشت کے مطابق بیگ اور رائفل کو موجود ہونا چاہئے تھا۔ بیگ درخت کی جڑ کے پاس موجود تھا۔ لیکن رائفل غائب تھی۔ میں نے سوچا کہ ہوسکتا ہے۔ میں نے جگہ کا تعین صحیح نہیں کیا ہو۔ لیکن صبح کی ملگجی روشنی میں وہاں قدموں کے واضح نشان بخوبی دکھائی دیتے تھے۔ ان میں سے کچھ نشانات میرے تھے۔ اور کچھ نوعمر لڑکے اور لڑکی کے تھے۔ میں نے درخت کی ایک شاخ اتاری۔ اور ان نشانات کو منہدم کرنے لگا۔ میری کوشش یہی تھی کہ وہاں کوئی بھی نشان باقی نہ رہنے پائے۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد میں نے فوراً ریسٹ ہاؤس کا رخ کیا۔ صبح کی روشنی تیزی کے ساتھ پھیلتی چلی جارہی تھی۔ اور گاؤں والے کسی بھی وقت جائے واردات کا رخ کرسکتے تھے۔ ریسٹ ہاؤس میں پہنچ کر میں نے غسل کیا۔ پھر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ میں بالکل بھی سو نہیں پایا۔ میری سوچوں کا مرکز آئندہ حالات کے مطابق لائحہ عمل کی تیاری تھا۔

صبح دس بجے کے قریب لوگوں کی چہ میگوئیوں کی آواز سن کر میں بستر سے باہر نکلا۔ لباس تبدیل کرنے کے بعد باہر کی جانب چل دیا۔ میری توقع کے عین مطابق گاؤں کے تقریباً تمام مرد ریسٹ ہاؤس کے گیٹ کے سامنے موجود تھے۔ گزشتہ رات والا نوعمر لڑکا سب سے آگے کھڑا تھا۔ اور اس کے ہاتھوں میں میری رائفل پکڑی ہوئی تھی جبکہ چہرے پر نفرت کے تاثرات ثبت تھے۔ مجھے گیٹ سے باہر نکلتے دیکھ کر اس لڑکے نے چلاتے ہوئے زہریلے لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ رائفل تمہاری ہے؟'' میں نے فوراً اثبات میں سر ہلادیا۔ پھر سنگین شکل بنا کر گاؤں والوں کی جانب دیکھتے ہوئے بولا۔

''کل رات آدم خور شیر کے انتظار میں درخت پر بیٹھے ہوئے سوگیا تھا۔ رائفل درخت سے نیچے گر گئی۔ یہ شر پسند اسے اٹھا کر یہاں لے آیا ہے۔ یقین جانیے میں صبح سے بہت پریشان ہوں۔'' لڑکے کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ پھر وہ بولا۔

''میرا تمہارے ساتھ کوئی ذاتی مفاد وابستہ نہیں ہے۔ جس کی بنا پر میں تمہارے خلاف کسی سازش کا تانا بانا بن سکوں۔ یہ تو تمہاری بدقسمتی ہے کہ میں نا صرف تمہاری رائفل کو پہچانتا ہوں۔ بلکہ تمہارے بوٹوں کے نشانات میں بھی تمیز کرسکتا ہوں۔ جو تم نے کل رات پہن رکھے تھے۔ میں نے آگے بڑھ کر سرگوشیانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے کھا جانے والے لہجے میں اس سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''لڑکی میری گرفت میں ہے۔ اگر تم نے زیادہ چوں و چرا کی۔ تب میں اسے قتل کرکے الزام آدم خور شیر پر لگا دوں گا۔ سادہ لوح گاؤں والوں کو رام کرنا

میرے لئے مشکل نہیں ہے۔''

لڑکا چلاتے ہوئے بولا۔ ''تم مجھے دھمکی دے رہے ہو۔ لیکن میں تمہاری دھمکیوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ مجھے معلوم ہے۔ لڑکی ریسٹ ہاؤس کے اندر موجود ہے۔ تم ہمیں تلاشی کی اجازت دے دو۔ ورنہ ہم زبردستی تلاشی لیں گے۔''

''مجھے تلاشی دینے سے انکار نہیں ہے۔ تم لوگ بخوشی تلاشی لے سکتے ہو۔ لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ میں تمہارے لئے راتوں کو جاگتا پھر رہا ہوں۔ اور تم لوگ مجھ پر ہی شک کررہے ہو۔ میں کل صبح یہاں سے چلا جاؤں گا۔ یہ میرے لئے بہت ذلت کا مقام ہے۔'' مجمع میں چہ میگوئیوں کا آغاز ہوگیا۔ سب کچھ میری پلاننگ کے مطابق ہورہا تھا۔ بہرحال گاؤں والوں کے متفقہ فیصلے کے بعد ریسٹ ہاؤس کی تلاشی کا آغاز ہوا۔ لیکن ناکامی کے بعد جائے وقوعہ کا رخ کیا گیا۔ وہاں پر بھی قدموں کے نشانات نہیں پائے گئے۔ تب لڑکے پر لعن طعن کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے بعد مجھ سے معافیاں مانگی گئیں اور میرے گاؤں کو چھوڑنے کے خلاف احتجاج کیا گیا۔ میں نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ اور رائفل تھامے ریسٹ ہاؤس واپس چلا آیا۔

دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد میں نے پہاڑوں میں موجود غار کا رخ کیا۔ میں اپنے ہمراہ کافی اور سینڈوچ تیار کرکے لایا تھا۔ تاکہ لڑکی کی پیٹ پوجا کی جاسکے۔ غار کے دہانے کے آگے سے پتھر ہٹانے کے بعد جب میں نے اندر قدم رکھا۔ تب لڑکی کو رسیوں سے باندھے ہوئے نہایت غیر فطری انداز میں پڑے ہوئے پایا۔ پہلی نگاہ میں...... میں جان گیا کہ وہ مرچکی ہے۔ یہ میرے ارادے کے خلاف تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے رسیوں سے آزاد کیا۔ اس کی نازک کنپٹی سے خون بہہ کر غار کی پتھریلی زمین کو سرخ کررہا تھا۔ یقیناً اس کی موت کنپٹی پر لگنے والے گھونسے کی بدولت واقع ہوئی تھی۔

اچانک مجھے اپنے پیچھے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ میں نے پھرتی کے ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھا۔ لڑکا غار کے دہانے پر کھڑا حیرت بھری نگاہوں سے لڑکی کی لاش کی جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے با آہستگی کاندھے پر سے رائفل اتاری اور لڑکے کے سینے کا نشانہ لے کر فائر کردیا۔ وہ گیند کی مانند اپنی جگہ سے اچھلا اور غار کے دہانے سے باہر جاگرا۔ گولی اس کے سینے پر لگی تھی۔

میں نے طویل سانس لیتے ہوئے رائفل کو زمین پر رکھا۔ اور آگے بڑھ کر لڑکے کی لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ گولی سینے پر لگی تھی۔ وہاں مختصر سوراخ موجود تھا۔ لیکن کمر کی جانب کافی سے زیادہ گھاؤ موجود تھا۔ میں نے کچھ دیر سوچتے رہنے کے بعد لڑکی کی لاش کو بھی غار کے اندر منتقل کیا۔ پھر دہانے کو پتھروں کے ساتھ بند کرنے کے بعد ریسٹ ہاؤس واپس چلا آیا۔

آدھی رات کو میں نے رائفل کاندھے کے ساتھ لٹکائی۔ اور ایک دفعہ پھر غار کا رخ کیا۔ میں نے یکے بعد دیگرے دونوں لاشوں کو ریسٹ ہاؤس میں منتقل کیا۔ لڑکی کی لاش مکمل تھی۔ لیکن لڑکے کی لاش کے گہرے گھاؤ میں سے متواتر خون بہتا چلا جارہا تھا۔ میں نے اپنے کمرے میں موجود فرسٹ ایڈ بکس کو اٹھایا اور لڑکے کی لاش کا آپریشن شروع کردیا۔ نہایت مہارت کے ساتھ میں نے زخموں کو دھویا پھر ٹانکے لگادیئے۔ میرے پاس لاش کو محفوظ کرنے والا مسالہ موجود تھا۔ جو مجھے افریقہ کے مسائی قبیلے سے دستیاب ہوا تھا۔ میں نے لاشوں پر مسالہ لگایا اور انہیں کپڑوں کے تھیلوں میں لپیٹ کر ڈبی کے کمرے میں منتقل کردیا۔ دروازے کو تالا لگانے کے بعد میں نے غسل کیا۔ پھر کافی بنانے کے بعد آرام دہ کرسی پر بیٹھ کر اپنے منصوبے کو اگلے پیچیدہ پہلوؤں پر نظر ثانی کرنے لگا۔''

کرنل سائی نے طویل سانس لیتے ہوئے ہم دونوں کی جانب دیکھا۔ ہماری آنکھوں میں دلچسپی کی لہر دوڑنے لگی تھی۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر موجود گولی کی شیشی اٹھائی اور پانی کے ساتھ گولی نگلنے کے بعد دوبارہ ہمکلام ہوا۔

''میری رہائش گاہ کے نیچے تہہ خانے میں

میرے شکار کردہ جانوروں کے بھوس بھرے لاشوں کے لاتعداد جسم موجود ہیں۔ لیکن میری زندگی کا اصل مقصد کچھ اور ہے۔ تم دونوں یقین نہیں کروگے۔ لیکن ایسا ہی ہے۔ میری رہائش گاہ کے نیچے جانوروں والے تہہ خانے کے علاوہ ایک تہہ خانہ اور بھی موجود ہے۔ جہاں انسانوں کے ایسے لاشے موجود ہیں۔ جن پر مسالہ لگا کر انہیں محفوظ کردیا گیا ہے۔ لاشے تیار کرنے کے لئے جن تکنیکی مراحل کو عبور کرنا پڑتا ہے۔ میں نے اس کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے۔ بلکہ اس علم میں خاصی مہارت بھی حاصل کی۔ آج میری رہائش گاہ کے تہہ خانے میں ایسے نادر نمونہ جات موجود ہیں۔ جنہیں دیکھ کر انسانی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ لیکن آپ دونوں کو تہہ خانے میں جانے سے پہلے میری مکمل آپ بیتی سننی ہوگی۔'' اس نے دوبارہ لمبا سانس کھینچا۔ پھر بولا۔

''لڑکے اور لڑکی کی لاش کو مسالہ لگانے کے بعد میں نے ڈیپی کے کمرے میں منتقل کرنے کے بعد کافی کا پیالہ تھاما اور آرام دہ کرسی پر آبیٹھا۔ یہی وہ وقت تھا۔ جب میرے دماغ میں انسانوں کے لاشوں سے مزین گیلری بنانے کے منصوبے نے جنم لیا۔ جانوروں کے لاشے تیار کرنے کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنے شکاری دوست احباب کو شکاری زندگی کے واقعات نمک مرچ لگا کر بیان کرنا۔ ظاہر ہے انسانوں کے لاشے میں کسی بھی شکاری دوست کے سامنے شکاری کارناموں کے طور پر سامنے نہیں لاسکتا تھا۔ لیکن میرا مقصد ایسا تھا بھی نہیں..... میں تو صرف اتنا چاہتا تھا کہ میرے مرنے کے بعد لوگ مجھے ایک اذیت پسند شکاری کے نام سے منسوب کریں۔ تم دونوں کو یہاں بلانے کا مقصد بھی کچھ ایسا ہی ہے۔

بہرحال ابھی میں کافی کا پیالہ مکمل پینے بھی نہیں پایا تھا کہ اچانک ریسٹ ہاؤس کے دروازے کو زور زور سے دھڑ دھڑایا گیا۔ میں ہڑبڑا کر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ کافی کا پیالہ میرے ہاتھوں سے گرتے گرتے بچا۔ یہ ایک غیر یقینی بات تھی۔ رات کے اس پہر بھلا کون ریسٹ ہاؤس کا رخ کرسکتا تھا۔ گاؤں والوں میں سے کوئی بھی ایسی جرأت نہیں کرسکتا۔ پھر باہر کون تھا؟ جو لگاتار دروازے کو کھٹکھٹائے چلا جارہا تھا۔ میں نے کافی کا پیالہ میز پر رکھا۔ اور رائفل ہاتھ میں تھامے باہر کی جانب چل دیا۔ دروازہ کھولنے پر میں نے انکل بون کو خوفزدہ چہرہ لئے سامنے کھڑے پایا۔ انکل بون کی ٹاؤن میں کریانے کی دکان تھی۔ میں بھی ضرورت کی اکثر اشیا اس کی دکان سے ہی لاتا تھا۔ اس وقت اس کی موجودگی میری سمجھ سے بالاتر تھی۔ میں نے تفہیمی نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا۔ تب وہ پریشان کن لہجے میں بولا۔

اس وقت تکلیف دہی کی معافی چاہتا ہوں۔ لیکن معاملہ غیر معمولی نوعیت کا ہونے کے باعث اپنے آپ کو روک نہیں پایا۔ اس لئے مجبوراً چلا آیا۔ میں نے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ لیکن اس نے انکار کردیا۔ پھر بے چین لہجے میں بولا۔

''میرا نوکر ٹونی رات بھر سے غائب ہے۔ میرے اندازے کے مطابق شاید وہ دکان کے اندر بند ہوگیا ہے۔ بات کچھ یوں ہے کہ وہ میرے ساتھ دکان میں کام کررہا تھا۔ میں نے کسی بات پر اسے سرزنش کی۔ پھر سزا کے طور پر چاولوں کا مکمل پارسل صاف کرنے کے لئے دکان سے ملحقہ گودام میں بھیج دیا۔ سر شام میں نے دکان کو بند کر کے دروازے کو تالا لگادیا۔ ٹونی پانچ بجے چھٹی کرکے گھر چلا جاتا تھا۔ جبکہ میں دکان چھ بجے بند کرتا ہوں۔ کل کام کی زیادتی کے باعث میں محسوس نہیں کرپایا۔ وہ دکان کے پیچھے موجود گودام میں چاول صاف کرتا رہا اور میں دکان بند کرکے گھر چلا آیا۔ اب سے کچھ دیر پہلے ٹونی کی والدہ نے گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ میرے پوچھنے پر اس نے ٹونی کے متعلق دریافت کیا۔ تب میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ میری دکان کے پیچھے گھنے جنگل کا آغاز ہوتا ہے۔ آدم خور کے لئے دکان کا ناتواں دروازہ توڑنا کچھ مشکل ثابت نہیں ہوسکتا۔ ریسٹ ہاؤس میری رہائش گاہ سے قریب ہے۔ اس لئے میں مدد کے لئے آپ کے پاس چلا آیا۔''

''ہوں.....'' میں نے ہنکارہ بھرا..... پھر اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ لڑکے کی ماں کہاں ہے؟

''وہ میرے گھر میں موجود ہے۔ میں نے اپنی بیوی کو خاص تاکید کی ہے کہ میرے واپس آنے تک اسے باہر نہ نکلنے دے۔ لیکن وہ بہت پریشان دکھائی دیتی تھی۔ بچے کی تلاش میں کچھ بھی کرسکتی تھی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور انکل بون کے ہمراہ دکان کی جانب چل دیا۔ اس کی دکان گاؤں سے باہر کچھ ہٹ کر گھنے درختوں کے جھنڈ کے درمیان واقع تھی۔ ہر جانب ہو کا عالم طاری تھا۔ دکان کے پاس پہنچتے ہی میری شکاری حس نے خطرے کا اعلان کردیا۔ وہاں غیر معمولی خاموشی اور ویرانی طاری تھی۔ جھینگر کے بولنے کی آواز بھی معدوم تھی۔ میں نے انکل بون کو جھنڈ کے پاس کھڑے ہونے کی ہدایت کی اور خود رائفل تھامے دکان کی جانب چل دیا۔ دکان دو حصوں پر مشتمل تھی۔ پہلا حصہ پرچون کا تھا۔ جس کا سامنے لکڑی کا برآمدہ بنا ہوا تھا۔ اور پچھلا حصہ گودام کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ لڑکا دکان کے پچھلے حصے میں موجود گودام میں مقید تھا۔ برآمدے کے دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر احتیاط کے ساتھ حالات کا جائزہ لیا۔ لیکن کوئی بھی غیر معمولی بات دکھائی نہیں دی۔ میں نے دکان کے دروازے کے ساتھ کان لگادیئے۔ دکان کے اندر خاموشی طاری تھی۔ میں برآمدے سے باہر نکل کر دکان کے پچھلے حصے کی جانب موجود گودام کی پچھلی دیوار کی جانب چل دیا۔ ابھی میں گودام سے کچھ دور ہی تھا کہ مجھے ہڈیاں چٹخنے کی آواز سنائی دی۔ میں ٹھٹک کر رک گیا۔ میں اس آواز کو لاکھوں آوازوں میں بھی پہچان سکتا تھا۔ کئی دفعہ جنگل میں شکار کے دوران ان آوازوں سے میرا واسطہ پڑچکا تھا۔ میں نے آواز کا تعین کیا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر دکان کی دیوار دائیں جانب مڑرہی تھی۔ میں نے نہایت احتیاط کے ساتھ دبے قدموں آگے بڑھ کر دیوار کے ساتھ چپکتے ہوئے دکان کے پچھواڑے کی طرف دیکھا۔ لیکن کچھ بھی دکھائی نہیں دیا۔

آوازوں کی شدت میں نمایاں زیادتی واقع ہوئی۔ اور اب ان کی سمت کا تعین کرنا میرے لئے مشکل نہیں تھا۔ میں دیوار کی آڑ سے باہر نکل آیا۔ دکان کی پچھلی دیوار کا مکمل حصہ میری نگاہوں کے سامنے موجود تھا۔ یہاں گودام کی کھڑکی موجود ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب وہاں بہت بڑا خلا کے علاوہ کھڑکی کا نام ونشان بھی موجود نہیں تھا۔ آدم خور شیر کے ہتھوڑے نما پنجوں کی بدولت کھڑکی جو کہ لکڑی کی دیوار میں نصب تھی۔ دیوار سمیت گودام کے اندر جاگری تھی۔ خلاء کے اندر گھپ اندھیرا موجود تھا۔ میں دبے قدموں خلاء کی جانب بڑھنے لگا۔ میری انگلیاں رائفل کے گھوڑے پر موجود تھیں۔ اور میں ہر قسم کے حالات سے مقابلہ کرنے کے لئے بخوبی تیار تھا۔

اچانک میری اذیت پسند فطرت اود کر جاگ اٹھی۔ اس کے ساتھ ہی میری آنکھوں میں شیطانیت کی چمک لہرائی۔ میں آدم خور کو باآسانی اپنی بندوق کا نشانہ بنا سکتا تھا۔ لیکن بھلا کیوں.....؟ ابھی میرے جذبے کی تسکین نہیں ہو پائی تھی۔ میری اذیت پسند فطرت کا الاؤ بھڑکتا چلا جارہا تھا۔ نہایت آہستگی کے ساتھ میں دوبارہ دکان کے داخلی دروازے کی جانب چل دیا۔ درختوں کے جھنڈ کے پاس انکل جون بت بنا کھڑا میرا منتظر تھا۔ میں نے اس کے پاس پہنچ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔

''لڑکا دکان کے اندر موجود ہے۔ دروازے کا تالا کھولو۔ اور اسے باہر نکالو۔'' انکل بون کے لبوں سے اطمینان کا طویل سانس خارج ہوا۔ اور وہ خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے میرے ہمراہ دکان کے دروازے کی جانب چل دیا۔ تالے کی چابیاں اس کے ہاتھوں میں موجود تھی۔ دروازے کے پاس پہنچ کر اس نے تالا کھولا۔ اور دروازے کو دھکا دے کر کھول دیا۔ ابھی اس نے کمرے میں قدم بھی نہیں رکھا تھا کہ میں نے پھرتی کے ساتھ اسے دکان کے اندر دھکیل کر دروازے کے پٹ کو بند کرکے کنڈی لگادی۔ اس نے چلاتے ہوئے دروازہ پیٹنا شروع کردیا..... یکلخت شیر کے دھاڑنے کی آواز سے ماحول گونج اٹھا۔ میں پھرتی کے ساتھ

برآمدے کے ستونوں کے اوپر سے چڑھتا ہوا چھت تک جا پہنچا۔ وہاں وسیع وعریض روشن دان موجود تھا۔ میں نے سر تقریباً روشن دان کے اندر گھسیڑ دیا۔ تمام دکان سامنے موجود تھی۔ انکل بون نے اندھیرا دور کرنے کے لئے ماچس جلائی تھی۔ لیکن اسے ماچس کے علاوہ اور کچھ جلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ آدم خور نے انکل بون کو مہلت دیئے بغیر ان پر حملہ کردیا۔

ماچس کی تیلی مٹی کے تیل سے بھرے ڈرم پر جاگری۔ ڈرم نے آگ پکڑلی۔ آگ کی بدولت ماحول روشن ہوگیا اور مجھے تصاویر کھینچنے کا موقع مل گیا۔ میں نے غیر متوقع حالات کی بہترین منظر کشی کی۔ آدم خور نے کس طرح انکل بون کو گردن کے پاس سے پکڑا۔ پھر انہیں زمین پر گرایا۔ انکل بون کے چہرے پر دہشت ناک تاثرات...... علاوہ ازیں ہاتھ اور پاؤں سے آدم خور کی گرفت سے باہر نکلنے کی سعی...... لیکن کوششوں میں ناکامی...... یہ سب کچھ میری رہائش گاہ کے نیچے موجود وسیع وعریض تہہ خانے کی دیوار پر لگیں تصویروں میں نمایاں ہے۔

انکل بون کو مارنے کے بعد آدم خور نے خون کو چاٹا پھر لاش کے قریب بیٹھ کر اپنے پنجے چاٹنے لگا۔ اس کا پیٹ انکل بون کے نوکر ٹونی کی لاش سے بھر چکا تھا۔ اب وہ صرف ستانا چاہتا تھا۔ میں نے کاندھے سے لٹکی ہوئی رائفل کو احتیاط کے ساتھ نیچے اتارا۔ پھر اس کی نال کو روشن دان میں سے اندر داخل کردیا۔ آدم خور پنجے چاٹنے کے بعد اب لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے ہانپ رہا تھا۔ میں نے رائفل کے گھوڑے پر انگلی رکھ دی۔ یک لخت شیر نے چونک کر روشن دان کی جانب دیکھا۔ خدا کی پناہ...... مجھے اس کی آنکھوں میں ناچتی دحشت و بربریت آج بھی یاد کرکے کپکپی محسوس ہوتی ہے۔ سیکنڈ سے کم عرصے کے دوران اس نے حالات کی سنگینی کو جانچا۔ پھر جیسے بجلی کوندتی ہے۔ ویسے اپنی جگہ سے اچھلا اور میں نے فائر کردیا۔ لیکن اتنی دیر میں وہ اپنی جگہ چھوڑ چکا تھا۔ گولی زمین پر لگی۔ مٹی کا بھبکا سا اڑا۔ شیر اچانک غائب ہوگیا۔

دکان کی آگ نے شدت پکڑلی تھی۔ شیر یقیناً دکان سے ملحقہ گودام کے اندر جا چھپا تھا۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ میں نے چھت سے نیچے چھلانگ لگائی اور آندھی وطوفان کی مانند بھاگتا ہوا۔ دکان کے پچھواڑے میں موجود گودام کی دیوار میں موجود خلاء کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ یہاں کسی بھی قسم کا کوئی درخت موجود نہیں تھا۔ چھپنے کے لئے بھی کوئی جگہ موجود نہیں تھی۔ مجھے شیر کا مقابلہ زمین پر کھڑے ہو کر کرنا تھا۔ میں گودام کی اکھڑی ہوئی کھڑکی سے تقریباً تیس چالیس قدموں کے فاصلے پر کھڑا ہوگیا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ شیر اس مختصر وقت کے دوران فرار ہو چکا تھا۔ جس وقت کے دوران میں چھت سے نیچے کود کر گودام کی کھڑکی کے سامنے آیا تھا۔ میں زمین پر لیٹ کر رائفل تانے نظریں کھڑکی کے خلاء پر جمائے ساکت وجامد ہوگیا۔ آگ نے پہلے دکان کے فرنٹ کو مکمل گھیرے میں لیا۔ پھر بڑھتے بڑھتے گودام تک آ پہنچی۔ اب کسی بھی لمحے شیر گودام کی ٹوٹی ہوئی کھڑکی سے باہر آسکتا تھا۔ میری نگاہیں پتھر کی مانند کھڑکی کے خلاء پر مرکوز تھیں۔

آگ کے شعلے آسمان کو چھو رہے تھے۔ لیکن وہ باہر نہیں آیا۔ ابھی تک گودام کا کچھ حصہ جلنے سے بچا ہوا تھا۔ یقیناً وہ حصہ دھوئیں سے بھر چکا ہوگا۔ اگر شیر وہاں ہوتا۔ تب دھوئیں سے گھبرا کر باہر آجاتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ دکان کے گودام کے راستے فرار ہوگیا تھا۔

میں کپڑے جھاڑتا ہوا زمین سے اٹھ کھڑا ہوا۔ میری کمر پر موجود بیگ میں وہ کیمرہ موجود تھا۔ جس میں ناقابل یقین مناظر فلمبند تھے۔ شیر کے فرار ہونے سے کچھ خاص فرق نہیں پڑتا تھا۔ میرا وہ مقصد پورا ہو چکا تھا۔ جس کے لئے میں جنگلوں کی خاک چھانتا پھر رہا تھا۔ میں نے رائفل کو سیدھے ہاتھ میں تھاما۔ اور فخریہ قدروں کے ساتھ گودام کی کھڑکی کی جانب چل دیا۔ ابھی میں کھڑکی سے دس قدم کے فاصلے پر ہی تھا کہ وہ موذی

دھاڑتا ہوا باہر نکلا۔ میں سچویشن سے نمٹنے کے لئے تیار تھا۔ اس کا چہرہ غیض وغضب کی صورت بنا دکھائی دیتا تھا۔ میں نے رائفل کو سیدھا کیا اور بے دریغ گولی چلادی۔ وہ چیختا دھاڑتا زمین پر گرا۔ پھر پھرتی کے ساتھ پلٹنی کھا کر اٹھا۔ جب تک میں بندوق کو دوبارہ لوڈ کرتا۔ وہ دھاڑتا ہوا دکان کے پیچھے موجود جنگل میں غائب ہوگیا۔ میں نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ اور بندوق اٹھا کر گاؤں کی جانب چل دیا۔ دکان مکمل طور پر آگ کے قابو میں آ چکی تھی۔ اسے بجھانا اب ممکن نہیں تھا۔

دوسرے دن صبح سویرے گاؤں والوں کے ہمراہ جب میں نے دکان کا رخ کیا۔ تب دکان جل کر کوئلہ بن چکی تھی۔ وہاں کسی بھی قسم کا کوئی سامان موجود نہیں تھا۔ آدھے گھنٹے کی جدوجہد کے بعد راکھ سے ٹونی اور انکل بون کے جسموں کی ہڈیاں دستیاب ہوئیں۔ گاؤں کے مرد انہیں دفنانے کے لئے گاؤں لے گئے۔ تب میں نے دکان کے پچھواڑے کی زمین کا جائزہ لیا۔ وہاں زمین پر خون کے قطرے موجود تھے۔ اور آدم خور کے قدموں کے نشانات بھی...... میں نے نشانات کا تعاقب شروع کیا۔ ان کا رخ جنگل کی جانب تھا۔ خون کے قطرے اب لکیر کی صورت اختیار کرنے لگے۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ زخم کاری تھا۔ موذی کی موت کا باعث بن سکتا تھا۔ موذی کا رخ جنگل کے ساتھ موجود پہاڑی کی جانب تھا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دشواری محسوس نہیں ہوئی کہ گولی کھانے کے بعد اس نے اپنے کچھار کا رخ کرنا بہتر جانا تھا۔ خون کی لکیر موٹی ہونے لگی۔ ایک درخت کے نیچے خون تالاب کی صورت میں موجود تھا۔ یہاں شاید آدم خور ستانے کے لئے بیٹھا رہا ہوگا۔ بہرکیف کچھار کے قریب پہنچنے کے بعد میں نے کچھار کے اندر متعدد بڑے پتھر پھینکے۔ لیکن کسی قسم کا ردعمل ظاہر نہیں ہوا۔ تب اللہ کا نام لے کر میں غار کے اندر داخل ہوگیا۔ آدم خور سامنے ہی مردہ حالت میں یوں موجود تھا کہ اس کا منہ ایک بڑے پتھر پر ٹکا ہوا تھا۔ جبکہ باقی ماندہ دھڑ زمین پر تقریباً بچھا ہوا تھا۔ میں نے اس کے جسم کا معائنہ کیا۔ میری چلائی ہوئی گولی اس کے سینے کو پھاڑ کر دل کو چھوتی ہوئی گزر گئی تھی۔ یقیناً گولی نے دل کو بھی کسی حد تک نقصان پہنچایا ہوگا۔ جس کی بدولت آدم خور کی موت واقع ہوئی۔"

وہ یکدم خاموش ہوگیا۔ میں نے انسپکٹر جون کی جانب دیکھنے کے بعد کرنل سائی سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔

"تمہارے کارنامے قابل تحسین ہیں۔ اور میں کسی حد تک کارناموں کے پیچھے پوشیدہ مقصد سے آگاہی بھی حاصل کرچکا ہوں۔ لیکن مجھے یہ سمجھنے میں دقت پیدا ہورہی ہو کہ تم نے مجھے اور انسپکٹر جون کو یہاں کیوں بلایا ہے؟ کیا تم اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کرنا چاہتے ہو۔ اگر بات ایسی ہی ہے تو تم انسپکٹر جون کو بلا کر ایسا کرسکتے تھے۔"

کرنل سائی طویل سانس لے کر بولا۔ "میں انسانیت کا مجرم ہوں۔ مجھے سزا تو ملنی ہی چاہئے۔ لیکن اس سے پہلے میں تم دونوں کو اپنی آرٹ گیلری کی سیر کروانا چاہتا ہوں۔" اس نے اپنے نوکر کو اشارہ کیا۔ وہ پھرتی کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔ جب واپس آیا۔ تب اس کے ہمراہ وہیل چیئر موجود تھی۔ کرنل سائی کو اس پر بیٹھایا گیا۔ پھر ہم دونوں کے ہمراہ رہائش گاہ کے نچلے حصے میں موجود تہہ خانے میں لے جایا گیا۔

خدا کی پناہ...... میری آنکھیں نفرت اور حیرت کی شدت سے پھٹنے لگیں۔ وہاں انسانوں کے بھس بھرے ایسے لاشے موجود تھے۔ جن کو مسالے لگا کر انہیں محفوظ کرلیا گیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ان کی حالت مخدوش تھی۔ کم وبیش آٹھ کے قریب لڑکیاں اور پندرہ کے قریب جوان مردوں کی لاشیں تہہ خانے کے اندر موجود تھیں۔ وہاں بجلی کا خاطر خواہ بندوبست کیا گیا تھا۔ فانوس کے علاوہ ٹیوب لائٹیں دیواروں پر لگائی گئی تھیں۔ ان لائٹوں کے نیچے کشادہ دیواروں پر کیمرے سے کھینچی گئی متعدد تصاویر موجود تھیں۔ جن کو دیکھنے کے بعد بدن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے تھے۔ درمیان

والی دیوار پر انکل یون کی تصویر موجود تھی۔ شیر نے انہیں گردن کے پاس سے پکڑ رکھا تھا۔ ان کی آنکھوں میں وحشت اور خوف کا ایسا تاثر موجود تھا۔ جو آج سے پہلے میں نے کبھی بھی کسی انسانی چہرے پر نہیں دیکھے تھے۔

بلاشبہ کرنل سائی ایک ماہر فوٹوگرافر کا درجہ رکھتا تھا۔ مین اس نے اپنے فن کو انسانیت کے خلاف استعمال کیا تھا۔ تہہ خانے کی دیوار پر اس معصوم بچے کی تصاویر بھی موجود تھیں۔ جسے کرنل سائی نے بچپن کے دنوں میں شیرنی کی بھینٹ چڑھایا تھا۔ یہ تصاویر کچھ غیر واضح تھیں۔ کچھ گردش ایام نے تحلیل کرنے کی کوشش کی تھی اور کچھ بچپن کی ناتجربہ کاری نے...... شاید انہی دنوں میں کرنل سائی نے اپنی اذیت ناک زندگی کا آغاز کیا ہوگا۔ اور ناتجربہ کاری کی بنا پر مکمل اور مفصل تصاویر نہیں اتار پایا ہوگا۔

میں نے نفرت بھری نگاہ کرنل سائی پر ڈالی۔ پھر بے اختیار میرا ہاتھ فضا میں اٹھا۔ اور تہہ خانے کا ماحول تھپڑ کی گونج سے جھنجھنا اٹھا۔ تھپڑ کی شدت کی بدولت وہیل چیئر پر بیٹھے کرنل سائی کا منہ بے اختیار مخالف سمت کو گھوم گیا۔ پھر حیرت انگیز طور پر تہہ خانہ اس کے گلا پھاڑ کر رونے کی آواز سے گونج اٹھا۔ میں نے حیرت بھری نگاہوں سے اپنے سامنے بیٹھے اذیت پسند انسان کی جانب دیکھا۔ جو میرے ایک تھپڑ کی بدولت بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا۔ پھر اچانک ہی اس نے اپنی جگہ سے حرکت کی اور وہیل چیئر کے اوپر سے ہوتا ہوا نیچے زمین پر آ گرا۔ میں نے گھبرا کر پیچھے ہٹنے کی کوشش کی۔ لیکن اس نے پھرتی کے ساتھ میرے پاؤں کو تھام لیا۔ اور گڑگڑاتے ہوئے بولا۔

"مجھ پر رحم کرو...... میں ایسی بیماری میں گرفتار ہوں۔ جس کا علاج ممکن نہیں اور میں تڑپ تڑپ کر مرنا نہیں چاہتا۔ مجھے پھانسی پر چڑھا دو۔ یہی میرے حق میں بہتر ہوگا۔"

میں نے نفرت کے ساتھ اس پر تھوک دیا۔ پھر غصیلے لہجے میں کہا۔

ایک اذیت پسند انسان کی موت بھی اذیت ناک ہونی چاہئے۔ میں تمہیں قطعاً گرفتار نہیں کروں گا حالانکہ جو جرائم تم نے کئے ہیں۔ ان کی سزا پھانسی کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔ لیکن یہ موت تم جیسے اذیت پسند انسان کے لے ناکافی ہوگی۔ اس لئے تمہارے لئے سزا کا انتخاب میں خود کروں گا۔ تمہیں کم و بیش ایک سال کے لئے اپنی رہائش گاہ میں نظر بند رہنا ہوگا۔ باہر پولیس کے اہلکار تعینات ہوں گے۔ اس لئے تم باہر قدم نہیں رکھ پاؤ گے۔ میرے اندازے کے مطابق کچھ ایام میں تمہاری موت واقع ہو جائے گی۔ لیکن یہ کچھ ایام تمہارے لئے اذیت کے باعث بنیں گے۔ تم نے جس مقصد کے لئے مجھے یہاں بلایا تھا۔ میں اس کے متعلق بخوبی جان چکا ہوں۔ تمہاری زندگی اس وقت خارش زدہ کتے کی زندگی سے بھی بدتر ہو چکی ہے۔ کھانا پینا ہضم ہونا موقوف ہو چکا ہے۔ ایسی حالت میں تمہارے لئے مر جانا آسان ہے۔ اس لئے تم نے اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دینا بہتر جانا اور مجھے خط لکھ دیا۔ لیکن میں تمہیں تمہارے مقصد میں کامیاب نہیں ہونے دوں گا۔ تمہیں اپنی رہائش گاہ میں تڑپ تڑپ کر موت کا انتظار کرنا ہوگا۔ یہی تمہارے کرتوتوں کی سزا ہے۔"

آخری الفاظ کہنے سے پہلے میں تہہ خانے سے باہر جانے کے لئے مڑ گیا۔ اس نے ہڑبڑائے ہوئے چہرے کے ساتھ میری جانب دیکھا۔ پھر گھبرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "یہ قانون کی خلاف ورزی ہے۔ تم ایسا نہیں کر سکتے۔"

میں نے پیچھے دیکھے بغیر طنزیہ لہجے میں جواب دیا۔ "اور تم جو کچھ آج تک کرتے رہے ہو۔ وہ قانون کی خلاف ورزی نہیں تھا۔ اب اپنے کئے کا انجام بھگتو۔" تہہ خانہ اس کے احتجاج بھری چیخوں سے گونج اٹھا۔ لیکن میں نے پرواہ نہیں کی۔ اور تیز قدموں کے ساتھ چلتا ہوا تہہ خانے سے باہر نکل گیا۔

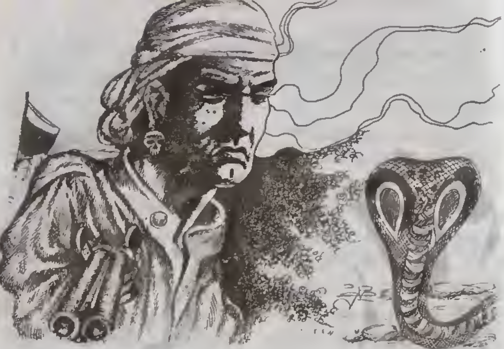

قتل موذی

عامر ملک۔ راولپنڈی

اچانک مسجد میں نماز پڑھتے ہوئے ایک نمازی کے دونوں پاؤں کے درمیان ایک کالا خوفناک ناگ پھن پھیلائے نمودار ہوا۔ چشم زدن میں کسی غیبی طاقت کے بل بوتے پر نمازی کا ایک پاؤں ناگ کے سر پر اور دوسرا پاؤں اس کی دم پر پڑ گیا تو......

دل و دماغ اور عقل کو حیران کرتا ایک عجیب و غریب دہشت ناک اور حیرت انگیز شاخسانہ

یہ واقعہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کے ساتھ پیش آیا تھا۔ کالا سیاہ ناگ تڑپ رہا تھا۔ مچل رہا تھا۔ بل کھا رہا تھا۔ سانپ اپنی زندگی بچانے کی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔ لیکن ایک جوان مرد کی گرفت۔ ہاتھ کی ہو یا پاؤں کی۔ اس سے چھٹکارا پانا ناممکن نہیں تو انتہائی مشکل ضرور ہوتا ہے۔ اور جب اس گرفت میں کوئی جذبہ بھی شامل ہو تو پھر یہ گرفت ایک شکنجہ بن جایا کرتی ہے...... کالا ناگ میرے دونوں پاؤں کے نیچے دبا ہوا اپنی پوری طاقت سے فرار کی جدوجہد میں مصروف تھا۔

بات دراصل یوں تھی کہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ اچانک رکوع میں جاتے وقت میری نگاہ ٹانگوں کے درمیان گئی...... ایک سیاہ سانپ پھن اٹھائے جھوم رہا تھا...... اوہ! اس کی نگاہوں کی چمک سے میں مبہوت ہو کے رہ گیا۔

موت مجھ سے اس قدر قریب تھی اور میرے اعضاء مفلوج ہو گئے تھے۔ دوسرے ہی لمحے سرور کائنات ﷺ کا فرمان میرے ذہن میں گھوم گیا اور میں خوف کے عالم سے عالم ہوش میں آ گیا۔ پھر مجھے پتہ نہ چلا کہ کون سی طاقت مجھ میں در آئی اور کس طرح وہ سب کچھ ہو گیا۔

ایک پاؤں سانپ کے سر پر تھا اور دوسرا اس کی دم پر۔ اور میں نے پوری طاقت سے اسے دبا رکھا تھا۔ یہ سب کچھ پلک جھپکتے میں ہوگیا تھا۔ سانپ کے منہ کو میں پاؤں کی ایڑی سے کچلنے میں منہمک تھا۔ ہتھیار کوئی بھی پاس نہ تھا۔ ورنہ اس کا تیا پانچہ فوراً کردیتا۔

سانپ کو بل کھاتے دیکھ کر میں حیرت زدہ بھی تھا۔ پتہ نہیں میرے جی میں کیا آیا کہ نیچے جھک کر میں نے سانپ کے بل کھاتے ہوئے جسم پر انگلیاں پھیرنی شروع کردیں۔ کتنا ملائم تھا اس کا وجود۔ لیکن اس وجود میں انسان کے لئے کینہ۔ بغض۔ انتقام اور ہلاکت بھری ہوئی تھی...... اور پھر اچانک ہی میرا بایاں پاؤں ذرا سا...... بالکل ذرا سا اپنی جگہ سے ہل گیا۔ فوراً سانپ کی دم آزاد ہوگئی اور پھر...... اپنی نرم و نازک اور ملائم وجود میری دائیں ٹانگ کے گرد لپٹ چکا تھا۔ مجھے اپنی پنڈلی کی ہڈی ٹوٹتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ لیکن میں نے انتہائی صبر اور ہمت سے کام لیتے ہوئے سانپ کے سر کو پوری قوت سے کچل دیا۔ ملائم وجود کی گرفت میری ٹانگ پر ڈھیلی پڑگئی۔ اور چند لمحوں بعد ایک سیاہ سانپ...... کینہ پرور دشمن میرے قدموں میں مردہ پڑا تھا۔ میں نے خدا کا شکر ادا کیا اور باہر آکر ہاتھ پاؤں دھوئے۔ پھر وضو کیا اور ایک چھڑی لے کر واپس کمرے میں آیا کہ سانپ کو اٹھا کر باہر پھینک دوں۔

میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ سانپ اندر کمرے میں موجود نہیں تھا۔ اور جہاں میں اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ وہاں کی زمین جلی ہوئی سی محسوس ہوئی تھی۔ میں چند لمحے حیرت زدہ کھڑا رہا۔ اور پھر نماز میں مشغول ہوگیا۔ فرض تو فرض ہوتا ہے تمام دنیاوی کاموں کو پس پشت ڈال کر انسان اس فرض کی ادائیگی کے لئے خدا کے حضور میں جھک جائے یہی سعادت ہے اور یہی انسان کی پیدائش کا مقصد ہے۔

ترجمہ: ”ہم نے انسانوں اور جنوں کو اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری عبادت کریں۔“ (سورۂ ذاریات۔ آیت نمبر ۵۶)

☆......☆......☆

میری عادت ہے کہ میں کسی بھی جاندار کو دکھ دینا پسند نہیں کرتا اور موذی کو زندہ دیکھنا پسند نہیں کرتا۔ خدا اور رسولؐ کے احکام حتیٰ المقدور بجالاتا ہوں، اپنے فرائض میں کوتاہی نہیں کرتا...... ایک انسان...... بلکہ مسلمان کا یہی شیوہ ہونا چاہیے۔

موذی قتل ہوچکا تھا۔ اور دل مطمئن ہوچکا تھا۔ مگر کچھ دیر بعد ہی ایک عجیب سی بے چینی، بے کلی سی محسوس ہونے لگی۔ دل گھبرا نہیں رہا تھا، مگر مچل بھی رہا تھا۔ جی میں آرہا تھا کہ باہر نکل جاؤں...... دور کہیں دور...... جہاں کوئی متنفس نہ ہو۔ شہر کا شور نہ ہو۔ سکون ہو...... مکمل سکون اور سکوت ہو...... مکمل سکوت...... دل کی باتوں پر کبھی دھیان نہیں دینا چاہیے۔ صرف ان باتوں پر جن میں خدا اور رسولؐ کے احکام کی خلاف ورزی جھلک رہی ہو۔ میرے دل کی خواہش میں مجھے کوئی نافرمانی نظر نہ آئی۔

شام دھیرے دھیرے چلی آرہی تھی، سورج بھی غروب ہورہا تھا۔ شفق کے لہریئے آسمان کی پہنائیوں میں مچل رہے تھے، رات ابھی دور تھی۔ ملگجا ملگجا سا اجالا بھی موجود تھا اور میں بغداد کے مشرقی علاقے کو پیچھے چھوڑتا ہوا مٹی کے اونچے اونچے ٹیلوں کے کھلے میدان کی طرف جارہا تھا۔ میرے قدم خود ہی خود اس طرف اٹھ رہے تھے۔ اس سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ میں دل کے ہاتھوں مجبور ہوکر کسی طرف بے مدعا ہی چل پڑوں۔

آج کا دن شاید ایک عجیب دن تھا۔ میں اپنے دھیان میں گم تھا۔ شہر کی آبادی بہت دور رہ گئی تھی۔

اچانک ہی میری نگاہیں خیرہ ہوگئیں سامنے بہت سے خیمے لگے ہوئے تھے۔ انتہائی بیش قیمت اور خوش نما خیمے اور ان کے درمیان کافی اونچائی پر ایک بہت بڑی شمع روشن تھی۔ جس کی روشنی چاروں طرف پھیل رہی تھی اور سارا علاقہ منور ہورہا تھا۔ میری آنکھوں کو خیرہ کردینے والی روشنی اسی شمع سے پھوٹ رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ اتنی تیز ہوا کے باوجود شمع کی لو پھڑ پھڑا نہیں رہی تھی۔ بلکہ ساکت۔ بالکل ساکت ایک ہی جگہ جمی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔

ابھی میں حیرت کے جھٹکے سے سنبھل نہیں پایا تھا کہ

دو آدمی جو دربانوں جیسی وردی پہنے ہوئے تھے۔ میرے دائیں بائیں آگئے۔ انہوں نے میرے بازوؤں کو اپنی گرفت میں جکڑ لیا اور بولے۔

”چلو تمہیں بادشاہ سلامت بلا رہے ہیں۔“

میں حیرت زدہ رہ گیا...... کیسا بادشاہ...... اور کیسا بلاوا......؟“ لیکن ان کی مضبوط گرفت میں، میں ان کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد ہی ہم ایک آراستہ و پیراستہ خیمے میں پہنچ گئے۔ خیمے میں کرسیوں کی قطاریں لگی تھیں اور ان پر بہت سے لوگ بیٹھے تھے، خیمہ بہت بڑا تھا۔ خیمے کے سامنے والے سرے پر ایک زرنگار کرسی پر ایک عظیم الجثہ شخص بیٹھا تھا۔ اس کی صورت سے اس قدر جلال اور رعب ہویدا تھا کہ میں اس سے نظر نہ ملا سکا اور نیچے دیکھنے لگا، اچانک وہ گونج دار آواز میں گویا ہوا۔

”مقدمہ پیش کیا جائے۔“

اور دوسرے ہی لمحے دو شخص میرے قریب آکھڑے ہوئے۔ دربان مجھے چھوڑ کر ہٹ چکے تھے۔ ایک شخص کہنے لگا۔

”جہاں پناہ! اس آدم زاد نے ہمارے ایک بھائی کو قتل کردیا ہے۔ ہم خود اس وقت وہاں موجود تھے لیکن اس کی کوئی مدد نہ کرسکے۔“

”تم نے کیوں اپنے بھائی کی مدد نہ کی؟ جواب دو۔“ جہاں پناہ غضب بھری آواز میں بولے۔

میں حیران حیران سا سب کی صورتیں دیکھ رہا تھا اور ان کے مکالمات سن رہا تھا۔ میں تعجب میں تھا کہ میں نے تو کسی کو قتل نہیں کیا۔ پھر یہ لوگ کیوں مجھے مورد الزام ٹھہرا رہے ہیں اور خواہ مخواہ ہی مجھے گرفتار کر رکھا ہے۔

”عالی جاہ! یہ اس وقت مسجد میں تھا۔“ دوسرا شخص بولا۔ ”اور شاہ سلیمانؑ کا حکم ہے کہ کسی آدم زاد کو مسجد کے اندر کوئی گزند نہ پہنچایا جائے۔“

شاہ سلیمان کا نام لیتے وقت اس کی گردن جھک گئی تھی اور تمام حاضرین نے بھی اپنے سر جھکا لئے تھے۔

”جہاں پناہ گرجے۔“ تم حق بجانب ہو! اس شخص نے واقعی قتل کیا ہے، اسے سزا ضرور ملنی چاہیے۔“ حاضرین پکار اٹھے۔ ”لازماً سزا ملنی چاہیے۔“

اچانک ان میں سے ایک کرسی نشین اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے دونوں اشخاص سے سوال کیا۔

”ایک آدم زاد کیسے ہمارے بھائی کو قتل کرسکتا ہے؟ آدم زاد تو بڑی کمزور نسل سے تعلق رکھتا ہے۔“ اور اسی لمحہ جہاں پناہ بھی سیدھے ہوکر بیٹھ گئے اور بولے۔ ”ہاں...... ہاں...... اس نکتے پر تو ہماری نظر نہیں گئی۔ ایک آدم زاد میں بھلا اتنی جرأت اور طاقت کہاں کہ وہ ہمارے ساتھی کو جان سے مار سکے۔“

دونوں اشخاص میں سے ایک بولا۔

”حضور وہ اس وقت سانپ کی صورت میں تھا اور اس انسان نے اسے آسانی سے ہلاک کردیا۔“

”لیکن وہ سانپ کی صورت بن کر مسجد میں کیوں گیا تھا؟“ جہاں پناہ کی آنکھیں شعلہ بار ہوگئیں۔

”یہ تو ہم نہیں جانتے کہ وہ کیوں گیا تھا۔“ دونوں کی آواز ڈوب سی گئی۔

”مقتول کی لاش حاضر کی جائے۔“ حکم دیا گیا۔

اور فوراً ہی ایک طشت میں ایک مردہ سانپ پیش کردیا گیا...... میں ششدر رہ گیا۔ وہ وہی سانپ تھا جسے میں نے آج نماز عصر کے وقت مسجد میں ہلاک کردیا تھا۔ اب معاملہ کچھ کچھ میری سمجھ میں آنے لگا۔

وہ سانپ دراصل سانپ نہیں بلکہ جن تھا اور یہ لوگ بھی انسان نہیں تھے بلکہ جن تھے اور اپنے ایک ساتھی کو ہلاک کردینے کے جرم میں مجھے ہلاک کرنا چاہتے تھے۔ میں زندگی میں خدا کے علاوہ کسی سے خوفزدہ نہیں ہوا تھا۔ اس وقت بھی میرے ذہن میں یہی بات تھی کہ۔ ”میں نے حفاظت خود اختیاری کے طور پر سرور کائنات ﷺ کے فرمان کی روشنی میں موذی کو ہلاک کیا تھا۔ مجھ پر کوئی جرم عائد نہیں ہوتا......“ اور اب ان کی بحث ایک نیا موڑ مڑ چکی تھی۔ سردار پوچھ رہا تھا۔

”وہ سانپ بن کر مسجد میں کیوں گیا تھا؟ یہ اس کا بہت بڑا جرم ہے۔ اس آدم زاد نے مغالطے میں اسے ہلاک کیا تھا۔“ سردار کی بات سن کر مجھے کچھ حوصلہ ہوا۔ میں نے

جھجکتے ہوئے سوال کیا۔

"کیا میں کچھ پوچھنے کی جرأت کرسکتا ہوں؟"

سردار بولا۔ "کہو۔ کیا پوچھنا چاہتے ہو......؟"

میں نے پوچھا...... "کیا آپ مسلمان ہیں؟"

سردار نے جواب دیا۔ "الحمدللہ۔ ہم سب اسلام کے شیدائی ہیں۔" میں نے کہا۔ "اگر آپ دین اسلام کے پیروکار ہیں تو میری بات غور سے سنیے۔

"میں نے آپ کے ساتھی کو کسی ذاتی دشمنی کی بنا پر ہلاک نہیں کیا۔ اگر مجھے علم ہوتا کہ وہ درحقیقت وہ نہیں جو نظر آرہا ہے تو میں اسے قطعی طور پر جان سے نہ مارتا۔ مگر وہ ایک سانپ کی صورت میں تھا۔ اور سانپ انسان کا جانی دشمن ہے۔ اور موذی کے لئے سردار کائنات ﷺ کا حکم یہی ہے۔ میں نے اپنے ایک دشمن کو ہلاک کیا تھا۔ اگر آپ مجھے قصور وار سمجھتے ہیں تو میں ہر قسم کی سزا بھگتنے کو تیار ہوں۔"

میں نے دیکھا۔ سردار میری بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ پھر وہ حاضرین سے مخاطب ہوا۔

"سب بزرگوں کو اکٹھا کیا جائے۔ میں ان سے اس بارے میں مشورہ لینا چاہتا ہوں۔ کیونکہ معاملہ بڑے نازک موڑ پر آگیا ہے۔"

تھوڑی دیر بعد ہی میدان میں بہت سی کرسیاں اور بچھ گئیں۔ اور ہزاروں سفید ریش اشخاص ان پر براجمان ہوگئے۔ جب سب اطمینان سے بیٹھ گئے تو سردار اپنی زرنگار کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہوا۔ اور اس نے اونچی آواز سے کہنا شروع کیا۔

"آج آپ کو اس لئے تکلیف دی گئی ہے ایک عجیب مقدمہ پیش ہوا ہے۔ اس آدم زاد نے ہمارے ایک ساتھی کو ہلاک کردیا ہے۔ ہمارے ساتھی اس وقت ایک سانپ کی صورت میں تھا اور بلاوجہ مسجد میں گھس گیا تھا۔ آدم زاد کا کہنا تھا کہ...... وہ نماز پڑھ رہا تھا۔ جب وہ سانپ اس کی ٹانگوں کے درمیان آگیا۔ ہم اس بات کی تصدیق کرچکے ہیں کہ آدم زاد سچا ہے۔ آدم زاد نے سارے واقعات بیان کرکے کہا ہے کہ اگر وہ قصوروار سمجھا جاتا ہے تو وہ ہر قسم کی سزا بھگتنے کے لئے تیار ہے، ہم آپ سب سے پوچھتے ہیں کہ کیا ہمارا ساتھی قصوروار تھا یا آدم زاد۔ اگر آدم زاد قصوروار ہے تو اسے کیا سزا دی جائے گی۔" یہ کہہ کر سردار بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر تک سب لوگ آپس میں سرگوشیاں کرتے رہے۔ پھر ایک سیاہ ریش اٹھ کر کہنے لگا۔

"ہمارا سب کا متفقہ خیال ہے کہ قصوروار ہمارا ساتھی ہی تھا۔ وہ کیوں ایک سانپ کی صورت میں مسلمانوں کی عبادت گاہ میں جا گھسا تھا۔ یہ اس کا بہت بڑا جرم ہے۔ آدم زاد کا قصور بہت کم ہے تاہم اسے کوئی نہ کوئی سزا ملنی ہی چاہیے تاکہ آئندہ کسی آدم زاد کو ایسی جرأت نہ ہو کہ وہ ہمارے کسی ساتھی کو ہلاک کرسکے۔"

یہ کہہ کر وہ بیٹھ گیا۔ ابھی وہ بیٹھا ہی تھا کہ آخری صفوں میں سے ایک بے حد بوڑھا شخص جس کی بھنویں سفید ہوچکی تھیں اور جس کی داڑھی سینے پر پھیلی ہوئی تھی۔ اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور بولا۔

"عالم پناہ! آدم زاد کو چھوڑ دیا جائے۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سرورکائنات حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا تھا کہ "اگر کوئی انسان کسی جن کو اس وقت ہلاک کردے۔ جب کہ وہ جن کسی دوسری بدلی ہوئی شکل میں ہو تو اس پر کوئی گناہ نہیں۔ کوئی کفارہ نہیں۔" یہ کہہ کر وہ بیٹھ گیا......

میں نے اونچی آواز میں کہا......"آپ یہاں آجائیں۔ میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔"

وہ سفید ریش شخص چل کر میرے پاس آگیا۔ میں نے اس سے مصافحہ کیا۔ اس کے چہرے پر جو تقدس جو جلال اور جو نور برس رہا تھا۔ میں بیان نہیں کرسکتا۔

سردار نے اعلان کردیا...... آدم زاد! تم بے قصور ہو۔ ہم تمہیں باعزت بری کرتے ہیں جاؤ تم آزاد ہو۔"

اور دوسرے ہی لمحے میں نے دیکھا...... سارا میدان خالی پڑا تھا۔ میں بیان نہیں کرسکتا کہ میں کس قدر خوش تھا۔ مجھے اپنی جان بچ جانے کی اتنی خوشی نہیں تھی۔ جتنی ایک صحابی جن سے مل کر مجھے مسرت ہوئی تھی۔ اور پھر کچھ دیر بعد میں بڑے اطمینان اور سکون کے ساتھ گھر کا رخ کررہا تھا۔

ناگن کا انتقام

زوہیب حسن۔ احمد نگر

رحم! کیا تجھے اس حقیت پر رحم آیا تھا جب تو نے میرے ناگ کو مار دیا اور مجھے بھی زخمی کردیا تھا، دوشیزہ کے روپ میں ناگن نے کہا اور پھر ساری حویلی چوہدری کی چیخوں سے گونج اٹھی۔

انتقام کا ایک خوفناک اور لرزہ خیز واقعہ جو پڑھنے والوں کو حیرت میں ڈال دے گا

پرانے وقتوں کی بات ہے ایک گاؤں کنگن پور تھا جو اپنے نام کی مناسبت سے سدابہار، بہت خوبصورت اور ہرا بھرا تھا۔ اس گاؤں کے اردگرد پہاڑوں نے اس کی خوبصورتی میں چار چاند لگا دیئے تھے۔ اور پھر اس گاؤں کے اردگرد ہرے بھرے لہلہاتے کھیت بھی تھے جو اس کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے تھے گاؤں کے تمام لوگوں میں بہت محبت تھی جیسے شیر و شکر، اگر اس گاؤں کے کسی ایک آدمی کو بھی تکلیف ہوتی تو پورا گاؤں اس کی مدد کو آجاتا تھا۔

اس گاؤں کے اردگرد جنگلوں میں بہت زیادہ سانپ تھے جو کسی کو تنگ نہیں کرتے تھے اور نہ ہی گاؤں کا رخ کرتے تھے لیکن رات کے وقت وہ اپنے اپنے بلوں سے باہر نکل آتے تھے۔ اس لیے گاؤں کے لوگ دن کے وقت ہی جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لے آتے تھے اور رات کے وقت کوئی بھی جنگل کا رخ نہیں کرتا تھا۔

گاؤں کا چوہدری حیات خان بہت ہی ظالم تھا۔ وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر گاؤں والوں پر ظلم کرتا۔ گاؤں کے لوگ اس کے ظلم سے بہت تنگ تھے۔ وہ گاؤں کے لوگوں سے اپنے کھیتوں میں سخت سے سخت محنت کرواتا اور اجرت

کے طور پر صرف اتنے پیسے دیتا کہ جس سے ان کو دو وقت کی روٹی مشکل سے نصیب ہوتی تھی۔

چوہدری کو شکار کھیلنے کا بہت شوق تھا۔ ایک دن وہ جنگل میں شکار کھیلنے کے لئے گیا۔ راستے میں تیز آندھی کے ساتھ بارش بھی شروع ہوگئی۔ بارش سے بچنے کے لئے وہ ایک گھنے درخت کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ جب بارش کا زور کچھ کم ہوا تو اس نے دیکھا کہ ناگ اور ناگن کا ایک جوڑا پانی میں اٹکھیلیاں کرتے ہوئے دونوں جارہے ہیں۔ چوہدری کے گھوڑے نے جب ناگ اور ناگن کو دیکھا تو وہ بدک گیا اور چوہدری کو زمین پر گرا کر گاؤں کی طرف بگٹٹ دوڑ گیا۔ زمین پر گرنے کی وجہ سے چوہدری زخمی ہوگیا تھا، اور اس نے اپنے زخمی ہونے کا ذمہ دار اس ناگ اور ناگن کو ٹھہرایا۔ اس نے بندوق سنبھالی اور نشانہ باندھ کر فائر کردیا۔ گولی سیدھی جا کر ناگ کے سر میں لگی اور سر کے پرخچے اڑ گئے اور وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔

چوہدری نے اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے ناگن کا نشانہ باندھا اور فائر کیا۔ گولی ناگن کو لگی مگر ناگن مری نہیں بلکہ زخمی ہوگئی۔ ناگن نے یکدم پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر بھاگ کر جھاڑیوں میں غائب ہوگئی۔

چوہدری ناگن کی آنکھوں کی چمک دیکھ کر ڈر گیا اور جلدی جلدی گھر کی طرف دوڑ لگادی۔ گھر پہنچ کر گھبراہٹ کے عالم میں بستر پر دراز ہوگیا۔

"چوہدری صاحب خیریت تو ہے بہت پریشان لگ رہے ہیں؟" چوہدری کی بیوی رفیہ بانو نے پوچھا۔

خیریت ہی تو نہیں ہے۔" چوہدری نے جواب دیا۔

"کیوں کیا ہوا؟" رفیہ بانو نے پوچھا۔

"جس جنگل میں میں شکار کھیلنے گیا تو وہاں میرا سامنا ایک ناگ اور ناگن سے ہوگیا۔ جس کی وجہ سے میرا گھوڑا بدک گیا، اور مجھے گرا کر وہ بھاگ کھڑا ہوا نیچے گرنے کی وجہ سے میں زخمی ہوگیا تو غصے کی وجہ سے میں نے ناگ کو گولی مار کر ختم کردیا۔ لیکن ناگن زخمی ہوئی اور بھاگ گئی اب مجھے ڈر ہے کہ کہیں ناگن اپنا بدلہ لینے نہ پہنچ جائے۔" چوہدری نے سارے واقعات بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"کوئی بات نہیں چوہدری صاحب، آپ ویسے ہی پریشان ہو رہے ہیں وہ ناگن زخمی ہو کر بھاگ گئی ہے، اور اس کا واپس آنا ممکن نہیں، ہوسکتا ہے زخموں کی تاب نہ لا کر مر بھی جائے، آپ تو خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہیں، چلئے منہ ہاتھ دھو کر بلکہ میں تو کہتی ہوں کہ جلدی سے نہا لیں تاکہ تھکن دور ہوجائے، آپ جلدی سے نہا لیں میں کھانا لگواتی ہوں۔" بیوی نے کہا۔

☆......☆......☆

دوسری طرف ناگن زخمی ہونے کے بعد سنبھلتی ہوئی بلکہ اذیت ناک تکلیف میں مبتلا جنگل کے کنارے بنے ایک مندر میں پہنچی اور ناگ دیوتا کے مجسمے کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا۔

"ارے ناگ دیوتا ہم ناگ ناگن نے تو کبھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا، پھر کس لئے اس ظالم نے میرے ناگ کو مار ڈالا اور مجھے بھی زخمی کردیا۔ ہماری تو کسی سے کوئی دشمنی نہیں ہم دونوں نے تو ہمیشہ منش سے دور رہ کر اپنا وقت گزارا، پھر کس گناہ کی سزا ملی ہے مجھے میرے ساتھ بہت انیائے ہوا ہے، اب میرا جیون اس سنسار میں بے کار ہے، میں کس کے سہارے جیوؤں گی، دیوتا مجھے انصاف اور آپ کی دیا چاہئے نہیں تو میں آپ کے چرنوں میں سر مار مار کر اپنا جیون تیاگ دوں گی۔" ناگن گڑگڑاتے ہوئے ناگ دیوتا کے مجسمے سے مخاطب ہوئی۔

اچانک ناگ دیوتا کے مجسمے کی آنکھیں روشن ہوگئیں اور اس کی آنکھوں سے شعاعیں نکل کر ناگن کے جسم پر پڑیں اور اسی وقت ناگن کے جسم سے تمام زخم مندمل ہوگئے۔

"چوہدری نے تیرے ناگ کو ختم کیا ہے اور اسی نے تجھے بھی زخمی کردیا ہے اس کا ارادہ تجھے مارنے کا تھا لیکن تیری قسمت اچھی تھی اس لئے تو بچ گئی۔" ناگ دیوتا کے مجسمے سے آواز آئی۔

"ناگ دیوتا مجھے آپ سے ایسی شکتی چاہئے کہ میں اس چوہدری سے اپنے ناگ کا بدلہ لے سکوں اور اسے اس کے انجام تک پہنچاؤں دیوتا مجھے ترنت شکتی چاہئے

تاکہ میرے بیاکل منی کو شانتی ملے، اور میں اس پاپی کا انت کردوں۔" ناگن نے کہا۔

"فی الحال میں تجھے اتنی شکتی دیتا ہوں کہ تو اس کے خوابوں میں آ کر اس کو ڈرا سکے اگر تم نے دو سال تک بلاناغہ یہاں آ کر میری پوجا کی تو میں تجھے اتنی شکتی دے دوں گا کہ تو جو روپ چاہے بدل سکتی ہے۔ اور پھر اس چوہدری سے اپنے ناگ کا بدلہ لے سکتی ہے۔ ناگ دیوتا کے مجسمے سے آواز آئی۔

☆......☆......☆

اچانک چوہدری حیات گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اور چیخنے چلانے لگا۔ "وہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ وہ اپنا بدلہ ضرور لے گی۔"

"کیا ہوا چوہدری صاحب کیوں چلا رہے ہیں؟" قریب سوئی ہوئی چوہدری کی بیگم نے پوچھا جو چوہدری کا شور سن کر جاگ چکی تھی۔

"وہ مجھے کہہ رہی تھی میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی، تم نے میرے ناگ کو مار ڈالا اب میں تمہیں بھی مار ڈالوں گی۔" چوہدری حیات نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔

"کون کہہ رہی تھی کہ آپ کو مار ڈالے گی؟" بیگم رضیہ بانو نے پوچھا۔

"وہ ناگن جس کے ناگ کو میں نے مارا تھا اور اس ناگن کو بھی زخمی کردیا تھا۔" چوہدری نے کہا۔ اس دن کے بعد چوہدری حیات کی راتوں کی نیند حرام ہوگئی جب بھی وہ سوتا ناگن پھن پھیلائے اس کے سامنے آجاتی اور زور زور سے چلاتے ہوئے کہتی۔ "نہیں چھوڑوں گی تمہیں تم نے میرے ناگ کو مار ڈالا، اس لئے اب میں تمہیں بھی نہیں چھوڑوں گی۔" اور چوہدری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھ جاتا اور پھر اس کو ساری رات نیند نہ آتی تھی۔

اس طرح نیند نہ پوری ہونے کی وجہ سے چوہدری کی طبیعت دن بدن بگڑنے لگی اور اس کا سکون برباد ہوگیا۔

☆......☆......☆

بھگوان تیرا دھنے باد کہ آج میری پوجا پوری ہوگئی، آج میری پوجا کا پھل مجھے ملنے والا ہے، دو سال تک میں نے ناگ دیوتا کی پوجا کی ہے، آج مجھے میری پوجا کی بدولت ناگ دیوتا مجھے اتنی شکتی دے دیں گے کہ میں جو روپ چاہے بدل سکتی ہوں" ناگن خوشی سے سوچنے لگی۔ "دو سال تک چوہدری تو نے جتنا جینا تھا جی لیا، اب تیری موت بن کر آؤں گی اور اس دنیا سے تمہیں دوسری دنیا میں بھیج دوں گی جہاں سے تم کبھی واپس نہیں آسکو گے۔"

اس کے بعد ناگن ناگ دیوتا کے مجسمے کی طرف مخاطب ہوئی۔ "ناگ دیوتا تم نے مجھے جو شکتی دی تھی، اس سے میں نے چوہدری کو خوابوں میں جا کر اسے ڈرایا اور دھمکایا اب مجھے روپ بدلنے کی شکتی دے" تاکہ میرے بدن میں جو آگ برسوں سے بھڑک رہی ہے وہ ٹھنڈی ہوجائے میں اپنے ناگ کی موت کا بدلہ چوہدری حیات خان سے لے سکوں، آج چوہدری کو اس کے انجام تک پہنچا سکوں، آج مجھے میری دو سال کی تپسیا اور محنت کا پھل مجھے دے دو کیونکہ جب تک وہ چوہدری زندہ ہے میں اس وقت تک سکون سے نہیں رہ سکتی۔ مجھے اس وقت تک چین نصیب نہیں ہوگا جب تک میں چوہدری کو اس کے انجام تک نہیں پہنچاؤں گی، آج میں نے اپنی پوجا ختم کردی ہے، مجھے شکتی دو ناگ دیوتا تاکہ میں اپنے ناگ کی موت کا بدلہ چوہدری سے لے سکوں۔" ناگن نے گڑگڑاتے ہوئے کہا اور ناگ دیوتا کے مجسمے کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا۔

عین اسی وقت ناگ دیوتا کے مجسمے کی آنکھوں سے شعاعیں نکلیں اور ناگن کے جسم میں داخل ہوگئیں۔ ناگن زمین پر لیٹ کر تڑپنے لگی اور کچھ دیر تڑپنے کے بعد اس نے ایک خوبصورت دوشیزہ کا روپ دھار لیا۔ ناگن اپنا یہ نیا روپ دیکھ کر بہت خوش ہوئی اور بے اختیار ناگ دیوتا کے مجسمے کے سامنے جھک گئی۔ "اب تو جو چاہے روپ دھار سکتی ہے۔ اور جب چاہے کسی بھی انسان، جانور، پرندے وغیرہ کا روپ دھار سکتی ہے۔ میں تیری پوجا سے بہت خوش ہوا ہوں اور میں نے تجھے اتنی شکتی

دے دی ہے جو آج سے پہلے کسی سانپ کو نہیں دی، ناگ دیوتا نے کہا۔

ناگ دیوتا کی پوجا سے فارغ ہو کر ناگن جنگل کی طرف نکل گئی۔ وہ جنگل میں سیر کی غرض سے گئی تھی۔ تھوڑی دور جا کر اسے گھوڑوں کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی ناگن ایک خوبصورت لڑکی کا روپ دھار کر راستے میں ایک درخت کے پاس بیٹھ گئی۔ اور گھڑ سوار کے آنے کا انتظار کرنے لگی۔

☆......☆......☆

"چوہدری صاحب آپ کی طبیعت دن بدن بگڑتی جارہی ہے۔ کچھ تو بتایئے کیا ہوتا جارہا ہے آپ کو؟" رضیہ بانو نے چوہدری سے پوچھا۔

"پتا نہیں جب سے وہ ناگن مجھے خوابوں میں آکر ڈراتی ہے تب سے کسی کام میں جی نہیں لگتا، صحیح طریقے سے بھوک بھی نہیں لگتی، تب سے میری طبیعت بھی خراب رہنے لگی ہے۔" چوہدری نے تھکے ماندے لہجے میں کہا۔

"آپ شکار پر کیوں نہیں چلے جاتے آپ کا دل بھی بہل جائے گا۔" رضیہ بانو نے چوہدری سے کہا۔

"تم ٹھیک کہتی ہو شاید اس طرح میری طبیعت کچھ سنبھل جائے۔" چوہدری نے کہا۔

"میں آپ کے سب سے خاص نوکر بختو سے کہہ کر آپ کا گھوڑا تیار کروا دیتی ہوں۔" رضیہ بانو نے کہا۔ اور پھر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ کچھ دیر بعد چوہدری اپنے گھوڑے پر سوار ہو کر جنگل کی طرف شکار کی غرض سے نکل گیا۔ وہ اپنے گھوڑے پر بیٹھا اپنی ہی دھن میں جارہا تھا کہ اسے کسی عورت کے رونے کی آواز سنائی دی۔ اس نے اپنے گھوڑے کی رفتار کم کردی۔ کچھ دور درخت کے نیچے اس کو ایک لڑکی روتی ہوئی دکھائی دی۔ چوہدری اس لڑکی کے پاس جا کر رک گیا۔ اتنی خوبصورت لڑکی کو روتے ہوئے دیکھ کر چوہدری کی نیت میں فتور آ گیا۔ "اس لڑکی کو اپنے ساتھ حویلی میں لے جانا چاہیے۔" چوہدری نے سوچا۔

"تم یہاں اکیلی بیٹھ کر کیوں رو رہی ہو؟" چوہدری نے لڑکی سے پوچھا۔

"میرا نام نیلم ہے۔ اور میرا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ رات کے اندھیرے میں میری عزت کے لٹیروں نے میرے گھر پر حملہ کردیا۔ بوڑھی ماں کو قتل کردیا۔ اندھیرے میں میں اپنی جان اور عزت بچا کر بھاگ نکلی، ماں نے میری منگنی کردی تھی۔ میرا ہونے والا پتی شراب میں دھت رہنے لگا ہے، دن رات نشے اور شراب پینے کے علاوہ اور اسے کچھ نہیں سوجھتا، اس کی خواہش ہے کہ شادی کے بعد میں اس کے اشارے پر چلوں یعنی وہ مجھ سے برا کام کرائے تاکہ بنا ہاتھ پیر ہلائے میری کمائی پر عیش کرتا رہے، اس وجہ سے میں بھاگ آئی ہوں۔ اور میرا اب کوئی ٹھکانہ نہیں ہے۔" ناگن جو نیلم کے روپ میں تھی اس نے جواب دیا۔

"کون کہتا ہے کہ تمہارا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے، میں کنگن پور گاؤں کا چوہدری حیات خان ہوں، میں تمہیں اپنی حویلی میں رانی بنا کر رکھوں گا، تم میرے ساتھ چلو۔" چوہدری نے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ سجائے ہوئے کہا۔

"چوہدری صاحب آپ بہت اچھے ہیں میں آپ کا یہ احسان جیتے جی پوری زندگی نہیں بھولوں گی۔" نیلم ناگن نے ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔ اور اس طرح ناگن جو نیلم کے روپ میں تھی چوہدری کے ساتھ اس کی حویلی میں آ گئی۔

چوہدری نیلم ناگن کو لے کر حویلی میں آ گیا۔

"چوہدری صاحب آپ کے ساتھ یہ کون ہے؟" چوہدری کی بیوی رضیہ بانو نے حیرانی سے پوچھا۔

"یہ بیچاری جنگل میں بیٹھی رو رہی تھی اس کا اس دنیا میں کوئی نہیں ہے زمانے کی ستائی ہوئی یہ بہت دکھی ہے۔ اس لئے میں اس کو ساتھ لے آیا ہوں آج سے یہ یہیں حویلی میں رہے گی۔" چوہدری نے کہا۔

"آپ نے بہت اچھا کیا جو اس کو اپنے ساتھ لے آئے، حویلی کی تنہائی مجھے ہر وقت کاٹتی رہتی تھی۔ اب

مجھ سے باتیں کرنے والی آ گئی ہے، اب میرا دل بہل جائے گا، میں اکیلی بیٹھی بیٹھی بور ہو جاتی ہوں۔" رضیہ بانو نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"تمہارے ساتھ کوئی زبردستی نہیں ہے نیلم، تم جب چاہو اپنے شوہر کے پاس واپس جا سکتی ہو اگر تم سمجھو کہ تمہارا منگیتر صحیح ہو گیا ہے یا پھر ہم تمہاری شادی کہیں اور کردیں گے تاکہ تمہاری زندگی آرام و سکون سے گذرے۔" چوہدری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

چوہدری صاحب میں اب کہیں نہیں جاؤں گی، اگر آپ مجھے اس حویلی میں ایک کمرہ دے دیں گے تو میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں گی۔" نیلم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ضرور تم جب تک چاہو اس حویلی میں رہ سکتی ہو۔" چوہدری نے چہرے پر شیطانی مسکراہٹ سجاتے ہوئے کہا۔

چوہدری صاحب آپ منہ ہاتھ دھو کر آئیں، میں آپ کے لئے کھانا لگاتی ہوں اور نیلم کو بھی کپڑے دیتی ہوں۔ تاکہ یہ کپڑے بدل لے۔" رضیہ بانو نے کہا۔

کچھ دیر بعد سب کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ نیلم نئے کپڑوں میں بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ چوہدری کھانا کھاتے کھاتے بار بار سر اٹھا کر نیلم کی طرف دیکھتا اور جواب میں نیلم بھی مسکرا دیتی۔

کھانا کھانے کے بعد رضیہ بانو نے نیلم کو اس کا کمرہ دکھا دیا اور خود اپنے کمرے میں آ کر سو گئی چوہدری بھی کمرے میں آ کر لیٹ گیا، اور سونے کی کوشش کرنے لگا مگر چوہدری کو نیند کہاں آنے والی تھی کیونکہ جب بھی وہ سونے کی کوشش کرتا تو نیلم کا خوبصورت اور دلکش سراپا اس کی آنکھوں کے سامنے آ جاتا تھا۔ اور اس کی آنکھوں سے نیند اڑ جاتی۔ اچانک وہ اٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا اور غور سے اپنی بیوی کی جانب دیکھا جو گہری نیند میں تھی، اطمینان کرنے کے بعد وہ اٹھ کر نیلم کے کمرے میں چلا گیا۔ چوہدری کو دیکھ کر نیلم چونک گئی۔ "چوہدری صاحب آپ اور اس وقت؟" نیلم نے حیرانگی سے پوچھا۔

"ہاں نیلم! تم نے مجھ پر نہ جانے کیا جادو کردیا

خوشخبری

طلسماتی انگوٹھی ایک عظیم تحفہ ہے۔ ہم نے سورۃ یاسین کے نقش پر فیروزہ، یمنی، عقیق، پکھراج، لاجورد، نیلم، زمرد، یاقوت پتھروں سے تیار کی ہے۔ انشاءاللہ جو بھی یہ طلسماتی انگوٹھی پہنے گا اس کے تمام بگڑے کام بن جائیں گے۔ مالی حالات خوب سے خوب تر اور قرضے سے نجات مل جائے گی۔ پسندیدہ رشتے میں کامیابی، میاں بیوی میں محبت، ہر قسم کی بندش ختم، رات کو تکیے کے نیچے رکھنے سے لاٹری کا نمبر، جادو کس نے کیا، کاروبار میں فائدہ ہوگا یا نقصان معلوم ہو جائے گا۔ آفیسر اپنی طرف مائل، نافرمان اولاد، نیک، میاں کی عدم توجہ، جج یا حاکم کے غلط فیصلے سے بچاؤ، مکان، فلیٹ یا دکان کسی قابض سے چھڑانا، معدے میں زخم، دل کے امراض، شوگر، یرقان، جسم میں مرد و عورت کی اندرونی بیماری، مردانہ کمزوری، ناراض کو راضی کرنے یہ سب کچھ اس انگوٹھی کی بدولت ہوگا۔ یاد رکھو سورۃ یاسین قرآن پاک کا دل ہے۔

رابطہ: صوفی علی مراد

0333-3092826-021-2446647

M-20A الرحمان ٹریڈ سینٹر

بالمقابل سندھ مدرسہ کراچی

ہے کہ میں جب بھی سونے کی کوشش کرتا ہوں تو تمہارا خوبصورت چہرہ میرے سامنے آجاتا ہے؟" چوہدری نے محبت بھرے لہجے میں کہا۔

"چوہدری صاحب آپ کا گرو جوان جسمانی انداز شاید میرے دل دماغ پر بھی چھا گیا ہے جس کی وجہ سے مجھے بھی نیند نہیں آرہی ہے، اور میں آپ سے پیار کرنے لگی ہوں۔ میں نے جب سے آپ کو دیکھا ہے مجھے چین نہیں آرہا دل چاہتا ہے بس ہر وقت آپ کو ہی دیکھتی رہوں۔" نیلم نے ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں نیلم! شاید میں بھی تم سے پیار کرنے لگا ہوں اور تم سے شادی کرنا چاہتا ہوں چوہدری نے بیقراری کے عالم میں کہا۔

"مگر چوہدری صاحب آپ کی بیگم کو اگر ہم دونوں کے پیار کے بارے میں پتہ چل گیا تو وہ طوفان کھڑا کردیں گی، شادی کرنا تو دور کی بات ہے۔" نیلم نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"اس کا حل بھی نکالنا ہی پڑے گا۔" چوہدری نے کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا۔

"کیا حل نکالیں گے آپ اس مسئلے کا؟" نیلم پریشانی کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں نا ہم دونوں مل کر اسے قتل کردیں اور اس قتل کو حادثے کا روپ دے دیں۔" چوہدری نے کہا۔

"کیا کہہ رہے ہیں چوہدری صاحب اگر کسی کو شک ہوگیا تو ہم دونوں پھانسی چڑھ جائیں گے۔" نیلم نے حیران ہوتے ہوئے کہا۔ میں کل رات گھر سے باہر رہوں گا اور تم اپنے کمرے میں اکیلی رہو گی اور رضیہ اپنے کمرے میں اکیلی ہوگی۔ میں نے اپنے دو خاص بندوں سے بات کرلی ہے، وہ بہت اعتماد والے ہیں۔ وہ چور بن کر حویلی میں داخل ہوں گے، اور الماری سے رضیہ کا زیور ساتھ لے جائیں گے اور ساتھ ہی رضیہ کا کام تمام کردیں گے۔ اور اس طرح یہ قتل ہم دونوں پر نہیں آئے گا۔" چوہدری نے تدبیر سوچتے ہوئے کہا۔

"ہاں چوہدری صاحب یہ ترکیب ٹھیک رہے گی۔" نیلم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔ پھر دونوں اپنے اپنے کمروں میں جاکر سو گئے۔

دوسری صبح چوہدری رات گھر سے باہر رہنے کا کہہ کر چلا گیا۔ دن بھر نیلم اور رضیہ بانو ایک دوسرے سے باتیں کرتی رہیں۔ اور رات کا کھانا کھا کر دونوں اپنے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ آدھی رات کے قریب رضیہ بانو کی چیخیں سنائی دیں۔ تو نیلم نے چیخ چیخ کر سر پر آسمان اٹھا لیا، نیلم کی چیخ سن کر کافی لوگ حویلی کے پاس جمع ہوگئے تو نیلم نے رو رو کر سب کو بتانے لگی کہ چور آئے اور رضیہ بانو کے زیور چوری کرکے لے گئے اور جاتے جاتے رضیہ بانو کو قتل بھی کر گئے۔ جب لوگوں نے رضیہ بانو کے کمرے میں جاکر دیکھا تو پلنگ پر رضیہ بانو کی لاش خون میں لت پت پڑی تھی۔

صبح کا اجالا پھیلتے ہی چوہدری حویلی میں آگیا اور بیوی کی لاش دیکھ زار وقطار رونے لگا۔ بہرحال رضیہ بانو کے کفن دفن کا انتظام کیا گیا۔ شام تک رضیہ بانو کو گاؤں کے قبرستان میں سپرد خاک کردیا گیا۔ سب لوگ چوہدری کے پاس افسوس کے لئے آتے رہے۔

رات کے وقت نیلم اور چوہدری بہت خوش ہوئے۔ اب ہمارے راستے کا کانٹا نکل گیا ہے ہمیں ملنے سے اب کوئی نہیں روک سکتا۔ چوہدری نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"ہاں چوہدری صاحب! اب ہمیں ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔" نیلم نے بھی چوہدری کی ہاں میں ہاں ملاتے ہوئے کہا تو چوہدری نے بے اختیار نیلم کو اپنی بانہوں میں بھینچ لیا اور اسی وقت نیلم نے منتر پڑھا اور چوہدری غش کھا کر اپنے قریب پلنگ پر گرا اور بے ہوش ہوگیا۔ نیلم نے چوہدری کے منہ پر پانی چھڑکا تو ہوش آگیا تو اس نے خود کو اپنے پلنگ پر بندھا ہوا پایا۔ "نیلم۔ نیلم کہاں ہو تم؟" چوہدری نے بے اختیار نیلم کو آوازیں دینا شروع کردیں۔ کچھ دیر بعد نیلم کمرے میں داخل ہوئی۔

"کیوں چیخ رہے ہیں چوہدری صاحب۔" نیلم نے چوہدری سے پوچھا۔

"یہ مجھے پلنگ پر کس نے باندھ رکھا ہے؟" چوہدری نے نیلم سے پوچھا۔

"میں نے۔" نیلم نے جواب دیا۔

"مگر کیوں؟" چوہدری نے گھبراہٹ کے عالم میں پوچھا۔

"ابھی بتاتی ہوں۔" یہ کہہ کر نیلم نے آنکھیں بند کیں اور کچھ دیر کے بعد وہ ناگن کے روپ میں چوہدری حیات خان کے پلنگ کے کنارے بیٹھی ہوئی تھی۔

"نہیں! تم نیلم نہیں ہوسکتی۔" چوہدری نے حیرانی اور گھبراہٹ کے ملے جلے لہجے میں کہا۔

کچھ دیر بعد ناگن دوبارہ نیلم کے روپ میں آگئی۔

میں ہی تمہاری نیلم ہوں۔ "چوہدری حیات۔" نیلم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اور اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی، ختم کردوں گی تمہیں۔"

مگر میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے جو تم میری جان کے درپے ہوگئی ہو۔" چوہدری نے گھبراہٹ کے عالم میں کہا۔

یاد کر، وہ دن جب تو شکار کھیلنے کے لئے جنگل میں گیا تھا۔ بارش ہورہی تھی، تھوڑی دوری پر میں اور میرا ناگ، ہم دونوں بارش میں خوشی سے اچھل کود رہے تھے اور تو نے بندوق سے میرے ناگ پر فائر کیا تو وہ وہیں ڈھیر ہوگیا پھر تو نے میرا نشانہ لے کر فائر کیا مگر میری قسمت اچھی تھی کہ میں بچ گئی۔ وہیں میں نے عہد کرلیا کہ تجھے نہیں چھوڑوں گی، پھر میں ناگ دیوتا کے پاس پہنچی، میں نے اس کی پوجا کی تو ناگ دیوتا نے مجھے اتنی شکتی دی کہ میں خوابوں میں آکر تجھے ڈرا سکوں پھر میں نے تجھے خوابوں میں آکر ڈرانا شروع کردیا۔ ناگ دیوتا نے مجھے روپ بدلنے کی شکتی اس شرط پر دینے کا وعدہ کیا کہ میں دو سال تک اس کی پوجا کروں پھر دو سال تک میں نے ناگ دیوتا کی پوجا کی تو ناگ دیوتا نے مجھے روپ بدلنے کی شکتی دے دی اور میں اپنی چالاکی کی مدد سے تجھے اپنے پیار میں پھنسا کر اس حویلی میں آگئی اور پھر تیری بیوی کا خون کروادیا۔

آج میں تجھ پر اپنی سچائی کھول رہی ہوں، اب تو بتا کہ میں نے اور میرے ناگ نے تیرا کیا بگاڑا تھا، جو تو نے میرے ناگ کو مار ڈالا اور مجھے بھی زخمی کردیا تھا۔" ناگن نے چوہدری کی طرف قہر آلود نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھے معاف کردو مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوگئی تھی۔" چوہدری حیات خان نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"معاف کردوں! تو نے میرے ناگ کو مار ڈالا اور اب مجھ سے معافی مانگتا ہے۔" نیلم نے غصہ سے کہا۔

"مجھ پر رحم کرو...... مجھ پر رحم کرو" چوہدری گڑگڑانے لگا۔

"رحم! کیا تجھے اس وقت ہم پر رحم آیا تھا جب تو نے میرے ناگ کو مار دیا اور مجھے بھی زخمی کردیا تھا۔" نیلم نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے غلطی ہوگئی...... مجھے معاف کردو۔" چوہدری نے روتے ہوئے کہا۔

"نہیں اب تجھے معافی نہیں ملے گی، آج تیرا آخری دن آگیا ہے۔" نیلم نے کہا اور اسی وقت ناگن کے روپ میں آگئی اور چوہدری کے جسم پر چڑھنے لگی اور پھر اس نے چوہدری کے ماتھے پر آنکھوں سے قہر برساتے ہوئے ڈس لیا۔

ساری حویلی چیخوں سے گونج اٹھی۔ چوہدری بلبلانے لگا پھر ناگن کے روپ میں نیلم آگئی اور چوہدری کو رسیوں سے کھول دیا۔ چوہدری کی حالت بہت اذیت ناک تھی۔ چوہدری ادھر ادھر لڑکھڑا کر بھاگنے لگا، اور پھر وہ حویلی کے صحن میں گر گیا۔ تو فوراً نیلم نے ناگن کا روپ دھار لیا، اور چوہدری کی ٹانگوں پر کئی جگہ ڈس لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے چوہدری کا سارا جسم نیلا پڑ گیا، اور چوہدری موت کی آغوش میں پہنچ گیا، نیلم نے اسے قہر آلود نظروں سے دیکھا، اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی حویلی سے باہر نکل گئی۔

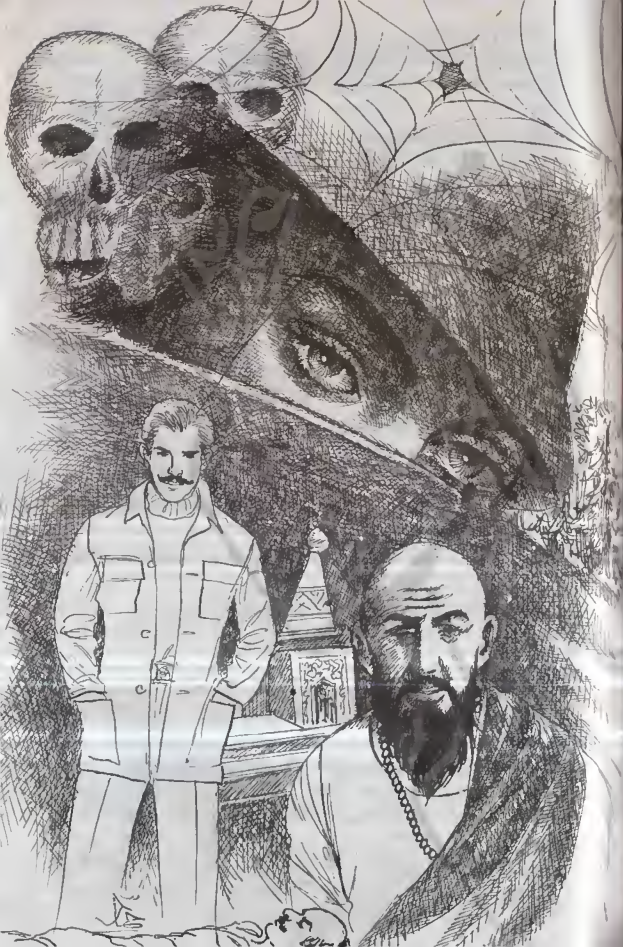

رولوکا

تحریر: اے وحید

قسط نمبر: 85

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کردیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

چند لمحے میں دودھ کا رنگ ہلکا نیلا ہوگیا، اس کے بعد سانپ ناند سے نکلا اور اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ رولوکا تیاں پانچا کردیتا، پھر رولوکا کے اشارے پر وہ آگے بڑھا اور رامو کے انگوٹھے پر اپنا منہ رکھ دیا اور پھر وہ نڈھال ہوکر الگ ہوگیا تو رولوکا نے اسے اٹھا کر دودھ سے بھرے تیسرے ناند میں ڈال دیا۔ اس مرتبہ دودھ کا رنگ نیلا نہیں ہوا۔ سانپ بغیر رولوکا کی مرضی کے حصار سے نکل نہیں سکتا تھا۔ اب دونوں کوڑیاں جو کہ سانپ کی کنپٹی میں چپکی پڑی تھیں وہ اڑتی ہوئی اپنی جگہ پر آگئیں، اس کے بعد حصار کے چاروں طرف آگ کے شعلے بھڑک اٹھے اور سانپ جل کر خاکستر ہوگیا، پھر رولوکا نے بتایا کہ ساری موت کے ذمہ دار یہی ناگن تھی اس کے ناگ کو کسی نے مار دیا تھا لہٰذا غضبناک ہوکر اس نے لوگوں کو اپنے غضب کا نشانہ بنایا۔ اب آپ لوگ بے فکر ہوجائیں، آئندہ ایسا نہیں ہوگا، اور رولوکا اجازت لے کر اس جگہ سے دلی آگیا☆رات کا اندھیرا پھیلنے لگا تھا، ایک لڑکی گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر رامپور گاؤں کے لئے روانہ ہوئی۔ رامپور میں اس کا محبوب رمیش موجود تھا۔ دو گھنٹے بعد گھوڑا گاڑی رامپور پہنچ گئی۔ وہ گاڑی سے نیچے اتری۔ اس کا نام مالنی تھا۔ اس جگہ پارک میں چار اوباش قسم کے نوجوان موجود تھے۔ مالنی نے ان سے رمیش کا پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ہم رمیش بابو کو جانتے ہیں اور اس طرح مالنی ان کے ساتھ چلنے لگی مگر جب وہ لوگ پرانا مندر برگد کے درخت کے پاس پہنچے تو انہوں نے زبردستی مالنی کی عزت لوٹ لی۔ مالنی کے دھمکی دینے پر انہوں نے مالنی کا گلا گھونٹ کر مار دیا۔ مالنی کے بیگ میں موجود روپے نکال لئے اور پھر مالنی کو مندر کے پیچھے جھاڑیوں میں گڑھا کھود کر اس گڑھے میں دبا دیا۔ مالنی کے گھر والے پریشانی کے عالم میں مالنی کو ڈھونڈتے ہوئے رامپور آگئے مگر افسوس کہ کہیں بھی مالنی کا پتہ نہ چلا۔ گھر والے اور رمیش رو پیٹ کر خاموش ہوگئے۔ تین ماہ گزر گئے۔ ایک رات ان چاروں میں سے ایک جس کا نام چندر تھا۔ وہ اپنے اندھیرے کمرے میں سویا تھا کہ ایک آواز گونجی۔ ”چندر میں آگئی ہوں، میں تمہارے بنا بیاکل ہوں۔ اٹھو چلو میرے ساتھ۔“ چندر کی حالت بہت غیر ہوگئی، چندر خوف کے شکنجے میں جکڑا ہوا تھا اور پھر ایک رات چندر اپنے کمرے میں سویا تھا کہ کسی ان دیکھی طاقت کے سہارے اٹھا اور برگد کے درخت کے نیچے آگیا۔ جھاڑیوں میں سے ایک ہیولہ نکلا اور مندر میں چلا گیا پھر وہ ہیولہ باہر نکلا اور اس جگہ آگیا جہاں چندر بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ ہیولہ نے اوپر کو دیکھا تو برگد کی داڑھی اوپر سے نیچے آکر چندر کے گلے میں لپٹ گئی اور پھر آناً فاناً داڑھی اوپر کو اٹھتی چلی گئی اور اس میں چندر لٹک گیا۔ چند منٹ میں ہی چندر کی آتما اس کا جسم چھوڑ چکی تھی۔ چندر کے بعد دوسرا رامو بھی موت کا شکار ہوگیا۔ رمیش کے لئے مالنی کی آتما بہت بے قرار تھی۔ ایک رات مالنی کی آتما رمیش کے کمرے میں آگئی۔ رمیش آنسو بہاتے بہاتے نیند میں مدہوش تھا۔ مالنی اپنی نرم و نازک انگلیاں اس کے بالوں میں پھیرنے لگی کہ اچانک آنسو کا ایک بڑا سا گرم قطرہ رمیش کے چہرے پر گر پڑا......

(اب آگے پڑھیں)

رمیش ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا اور فوراً اس کا ہاتھ اپنے گال پر اس جگہ پہنچ گیا جہاں کہ آنسو کا قطرہ گرا تھا۔ اس نے اپنی سیدھی انگلی پر پانی کو محسوس کیا اور پھر اچنبھے میں پڑ گیا۔ ”اس رات سے میرے گال پر جیسے گرم پانی کا قطرہ کیا معنی رکھتا ہے؟“ اور پھر اسے اپنے بالوں میں کسی کی نرم و نازک انگلیوں کا پھرنا یاد آگیا۔ اب تو اس کی نیند اچاٹ ہوکر رہ گئی تھی، وہ سوچ کی اتھاہ گہرائیوں میں ہچکولے کھانے لگا کیونکہ اس نے بہت واضح طور پر نیند کی غنودگی میں محسوس کیا تھا کہ کوئی اپنی نرم و نازک انگلیوں سے اس کے سر میں انگلیوں کا لمس پہنچا رہا تھا۔

اور پھر مالنی کی یادوں نے اسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ”وہ دن کتنے اچھے اور سہانے تھے جب وہ دونوں لندن میں مستقبل کے پروگرام بناتے تھے۔“ وہ دونوں الگ الگ کمپارٹمنٹ میں تھے مگر کالج کے وقت

دونوں کا ساتھ، کالج کے بعد دونوں اپنے اپنے کمپارٹمنٹ میں چلے جاتے اور پھر شام سے پہلے پہلے دونوں اپنی جگہوں سے نکل پڑتے اور پھر پروگرام کے تحت مطلوبہ جگہ پر آن ملتے۔ زیادہ تر وہ دونوں سیر سپاٹے کی جگہوں پر ملتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے کے پہلو میں بیٹھے کئی کئی گھنٹے گزارتے تھے۔

اور ایسے موقع پر رمیش کچھ زیادہ ہی جذباتی ہوجایا کرتا تھا۔ ''مالنی اب مجھ سے تمہارا دور رہنا برداشت نہیں ہوتا، یہ دوری کی گھڑیاں مجھے بہت اذیت پہنچاتی ہیں۔ کاش! میرے بس میں ہوتا تو میں تمہیں لے کر ایسی جگہ چلا جاتا جہاں ہم دونوں کے علاوہ کوئی اور نہ ہو۔ کالج کے وقت اور پھر وہ سے جب تک تم میرے قریب رہتی ہو خوشی خوشی کٹ جاتا ہے مگر رات کا سے ایسے ہوجاتا ہے میرے لئے جیسے بن جل مچھلی تڑپتی ہے۔''

یہ سن کر مالنی مسکرانے لگتی اور اس کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولتی۔ ''رمیش ذرا صبر سے کام لو، دن اور رات کا زیادہ سے میں تمہارے ساتھ گزارتی ہوں۔ نہانے دھونے اور پھر رات میں سونے کے لئے تھوڑا سا ہی تو سے تم سے دور رہتی ہوں، اور اگر میں ان سے بھی تم سے دور نہ رہوں تو تم احتیاط کی ساری حدیں پھلانگ جاؤ، اور یہ اس وقت تک کے لئے بہت ضروری ہے جب تک ہم شادی کے منڈپ میں سات پھیرے نہ لگالیں۔''

''یہ تمہارے سات پھیرے میرے لئے سات جنموں سے بھی بڑھ کر ہوگئے ہیں، میں تو رات بھر بھگوان سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ ''بھگوان جلد از جلد ہماری سن لے اور میرے بیاکل من کو شانتی دے یعنی مالنی کل چھوڑ آج ہی مجھے مل جائے۔'' رمیش بولتا۔

''رمیش شادی کرنے کو تو میں لندن میں بھی کرسکتی ہوں، مگر تم ذرا ان لوگوں کے متعلق سوچو جو ہمیں یہاں بھیج کر ایک ایک دن کس بیاکل پن سے گزارتے ہوں گے، ان کے بھی سپنے ہیں ان کی بھی خوشیاں ہیں کہ میں پڑھ لکھ کر واپس جاؤں اور پھر وہ لوگ میری خوشیوں کو آٹھ چاند لگادیں۔ تمہارے اپنوں نے بھی ایسا ہی سوچا ہوگا۔

اب دیکھو نا ہمارے اپنوں کو ہمارے فیصلے پر کوئی اعتراض نہیں وہ بھی ہماری خوشی میں خوش ہیں، بس اب آخری مرحلہ رہ گیا ہے، اس کے بعد موج ہی موج، ذرا من کو شانت رکھو۔'' مالنی اکثر رمیش کو ان الفاظ میں سمجھاتی رہتی تھی۔

''مالنی مجھے اکیلا چھوڑ کر کہاں چلی گئیں، تم کس جہاں میں کھو گئیں، کچھ تو مجھے بتایا ہوتا، کیا میں تمہارے معیار پر پورا نہیں اتر سکتا تھا؟ کیا میں نے کبھی تم سے بے وفائی کی تھی؟ کیا میرے لئے تمہارے دل میں کوئی بدگمانی ہوگئی تھی؟ میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں، کس سے تمہارا پتہ معلوم کروں۔ تمہیں احساس نہیں کہ تمہارے بن میرا اپنا جیون کتنا بوجھ بن گیا ہے، مالنی تم میرے پاس آجاؤ، نہیں تو میں اپنا جیون تیاگ دوں گا، میں کیا کروں، میں ہر پل تمہاری یادوں کے سہارے ہی تو جی رہا ہوں، اب تو لوگ میری حالت کے پیش نظر مجھ سے دور ہونے لگے ہیں۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کون کسی کو برے حالات میں اور پھر کب تک سہارا دیتا ہے۔ کاش!......'' اور پھر وہ بلکنے لگا۔

کمرے میں گھٹا ٹوپ اندھیرا تھا کہ اچانک اس نے کسی کی سسکیوں کی آواز سنی تو وہ تڑپ کر اٹھا اور جھٹ سے لالٹین جلادی۔ مگر کمرے میں کوئی بھی انسانی وجود موجود نہیں تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھنے لگا مگر کمرے میں کوئی ہوتا تو اسے نظر آتا۔ اور پھر وہ دھپ سے اپنی چارپائی پر گر پڑا اور اپنا چہرہ تکیے میں چھپا کر زاروقطار رونے لگا۔ وہ کب تک روتا رہا سسکتا رہا اسے پتہ نہ چلا اور جب اس کی آنکھ کھلی تو کافی دن چڑھ آیا تھا۔ اس کی ماتا اسے جگا رہی تھی۔

''بیٹا رمیش! کیا بات ہے آج تو بہت دیر تک سوتا رہا، میں کئی مرتبہ تیرے پاس آئی مگر تو بے سدھ پڑا تھا۔ اب جا کے میں نے تجھے جگایا ہے۔ تیرے بابو جی

بول کر گئے ہیں کہ رمیش سے بولنا وید صاحب سے دوا لے آئے۔ اب جا کر نہا دھولو، میں ناشتہ تیار کرتی ہوں۔'' ماں نے اس کے بالوں میں اپنی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

''جی ماں! میں ابھی اٹھتا ہوں، آپ جائیں، میں ترنت نہا دھو کر آتا ہوں۔'' رمیش نے کہا تو اس کی ماں اس کے پاس سے اٹھ کر چلی گئی۔

رمیش اٹھا اور اپنے کپڑے لے کر گاؤں میں بنے بڑے تالاب کی طرف جانے لگا۔ (گاؤں دیہات میں ویسے بھی لوگ زیادہ تر تالاب، نہر یا پھر کنوئیں پر نہاتے ہیں)

تھوڑی دور ہی وہ گیا تھا کہ اسے مندر کے پنڈت جی آتے ہوئے مل گئے۔ پنڈت کو دیکھ کر رمیش نے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا۔ پنڈت نے بہت شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا، پھر پنڈت نے کہا۔ ''رمیش بیٹا! کیا بات ہے تمہاری حالت بتا رہی ہے کہ تم رات میں سوئے نہیں، تمہاری آنکھیں سوجی ہوئی ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ تم اندرونی طور پر کچھ زیادہ ہی بیاکل رہنے لگے ہو، کسی سوچ نے تمہیں بیاکل کردیا ہے۔ ایک ہفتہ سے تم مندر میں بھی نہیں آئے، لگتا ہے تم نے گاؤں میں ہونے والے حالات کا زیادہ اثر لے لیا ہے، ظالم اور پاپی لوگ بہت بھیانک انجام سے دوچار ہوتے ہیں وہ جو دونوں مرے ہیں بہت زیادہ پاپی اور آوارہ تھے، انہوں نے گاؤں والوں کے ناک میں دم کر رکھا تھا۔ زیادہ تر لوگ ان سے پریشان تھے، ہر وقت نشے میں رہنا ان کا شیوہ تھا۔ یہاں تک کہ چوری چکاری سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ گاؤں کی کئی ناریوں کو بے عزت کردیا تھا چونکہ کھاتے پیتے گھرانے سے تھے اس لئے لوگ ان کے معاملے میں خاموش رہتے تھے۔ یہ تو اچھا ہوا کہ خود بھگوان نے انہیں ان کی کرنی کی سزا دی۔ اور یہ بھی کتنے اچنبھے کی بات ہے کہ اس جگہ ان کی مرتیو ہوئی جہاں ماتا کا مندر ہے۔ ماتا کبھی بھی انیائے کو برداشت نہیں کرتی۔ ماتا بہت دیالو ہے۔

رمیش پتر تم مندر میں آیا کرو، تمہارے من کو شانتی ملے گی۔''

''پنڈت جی! آپ کی بات ٹھیک ہے، میرا من ہر وقت بیاکل رہنے لگا ہے، آپ تو جانتے ہی ہیں کہ مالنی میری خاطر اس گاؤں میں آئی تھی، وہ مجھے بہت چاہتی تھی اور یہ کس قدر ظلم و زیادتی کی بات ہے کہ وہ یہاں تک اچھی بھلی آئی اور پھر راتوں رات غائب ہوگئی۔ کسی کے متعلق اگر پتا لگ جائے کہ وہ......'' اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''بات تمہاری بھی ٹھیک ہی ہے، اگر کسی کے بارے میں پتا چل جائے کہ وہ کہیں چلا گیا، کسی نے اغوا کرلیا یا پھر اس کے ساتھ کوئی اور حادثہ ہوگیا تو من بیاکل نہیں رہتا...... میرا تو مشورہ ہے کہ تم بھگوان سے پرارتھنا کرو، میرا من کہتا ہے کہ کسی نہ کسی روز مالنی کے بارے میں معلوم ہوجائے گا، لیکن تم اپنے آپ کو سنبھالو، اگر تم ٹھیک رہو گے تو مالنی کے لئے پرارتھنا بھی تو کرسکو گے۔'' پنڈت نے کہا۔

''ٹھیک ہے پنڈت جی! میں اپنے آپ کو ٹھیک رکھنے کی کوشش کروں گا، آپ کی باتیں من کو لگتی ہیں۔ میں کل سے مندر میں ضرور آیا کروں گا۔'' اور یہ بول کر رمیش آگے کو بڑھ گیا۔

رمیش تالاب پر پہنچا، نہایا دھویا اور پھر واپس آگیا۔ اس کی ماں نے اسے ناشتہ دیا، ناشتہ کے بعد ماں نے کہا۔ ''بیٹا حکیم صاحب کے پاس چلے جاؤ، تمہارے بابو جی بول کر گئے ہیں کہ رمیش کو بول دینا حکیم صاحب کے پاس چلا جائے، انہوں نے حکیم صاحب سے بات کرلی ہے۔ بیٹا اب تم ترنت چلے جاؤ۔'' ماں نے کہا۔

''ٹھیک ہے ماں، میں جا رہا ہوں۔'' اور رمیش حکیم صاحب کے پاس جانے کے لئے گھر سے نکل پڑا۔ تھوڑی دیر میں رمیش حکیم کے پاس پہنچ گیا۔ حکیم نے رمیش کی نبض دیکھی تو کہا۔ ''رمیش بیٹا؟ تم اندرونی طور پر بہت کمزور ہو رہے ہو، تمہاری نبض کی رفتار بہت

زیادہ سست ہورہی ہے، اور اگر یہی کیفیت رہی تو تم بستر کے ہو کر رہ جاؤ گے، میرا مشورہ ہے کہ تم خود کو سنبھالو، اور باقاعدگی سے دوا لیتے رہو، نہیں تو تمہاری صحت اور زیادہ گر جائے گی۔"

"ٹھیک ہے حکیم صاحب! میں آپ کی باتوں پر ضرور عمل کروں گا، آپ دوا دیں۔" رمیش نے کہا۔ اور پھر دوا لے کر گھر آ گیا۔

دن کا سمے بیت گیا، شام کا اندھیرا ہر طرف پھیلنے لگا، ویسے بھی گاؤں دیہات میں رات بہت جلدی ہو جاتی ہے۔ اس لئے کہ گاؤں میں بجلی کا انتظام نہیں ہوتا، لوگ سرے شام ہی کھانا کھا کر اپنے اپنے بستروں میں دبک جاتے ہیں، لیکن شہری زندگی میں کہاں ایسا ہوتی ہے، لوگ آدھی رات سے بھی زیادہ سمے تک دھما چوکڑی مچاتے رہتے ہیں۔

رمیش اپنے کمرے میں آ کر بستر پر لیٹ گیا، دوا اس نے پہلے ہی کھا لی تھی۔ بستر پر لیٹتے ہی نیند کی دیوی نے اسے فوراً ہی اپنی آغوش میں لے لیا۔ لیکن لگتا تھا کہ حکیم نے دوا میں نیند کی بھی دوا دی تھی جس کی وجہ سے ایسا ہوا تھا، ورنہ بستر پر لیٹنے کے بعد ہر روز رمیش بستر پر کروٹیں بدلتا رہتا تھا اور مالنی کی یادوں میں کھویا رہتا تھا۔

رات کا ایک پہر بیت گیا تھا۔ اندھیرا ہر طرف مسلط تھا۔ ویسے بھی آج کل اماوس کی راتیں شروع ہو چکی تھیں۔

جب اماوس کی راتیں شروع ہوتی ہیں تو آسمان سے چاند غائب ہو جاتا ہے۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والا اندھیرا اپنا راج قائم کر لیتا ہے۔

آج تو سرے شام سے ہی ہلکی بوندا باندی شروع تھی۔ گاؤں میں موجود کتے بھی نہ جانے کہاں دبک گئے تھے۔ نہیں تو کتوں کے بھونکنے کی آوازیں تو سنائی دیتی ہی رہتی تھیں۔ ایسا لگتا تھا کہ پورے گاؤں پر کسی بھیانک عفریت نے اپنا تسلط جما لیا ہو وقفے وقفے سے زوردار بجلی بھی اپنی گھن گرج آواز کے ساتھ دماغ کو جھنجھنا دیتی تھی۔ جب بجلی چمکتی تو ایسا لگتا کہ اب بجلی گر کر پورے گاؤں کو جلا کر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل کر دے گی۔

سنیل اپنے کمرے میں محوِ خواب تھا۔

کمرے میں اس نے دروازے کو بھیڑ دیا تھا۔ ایک کالی بلی بہت بڑے جسامت کی اس کے کمرے میں تھی۔ اس بلی کی دونوں آنکھیں اندھیرے میں کچھ زیادہ ہی چمک رہی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے نکلتی سبز رنگ کی روشنی عجیب پرہیبت نظارہ پیش کر رہی تھی۔ بلی کی آنکھیں جس طرف کی ہوتیں اس طرف کی جگہ سفید روشنی سے چکا چوند ہو جاتی۔ کمرے میں بلی چاروں طرف گھوم گھوم کر نہ جانے کیا دیکھ رہی تھی۔ جب وہ کمرے کے چاروں طرف گھوم پھر کر تھک گئی تو سنیل کی چارپائی کے سامنے بیٹھ کر سنیل کو غضبناک نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

بلی کی آنکھوں سے نکلی سبز روشنی سنیل پر بدستور پڑ رہی تھی۔ سنیل گہری نیند میں غرق تھا۔ تھوڑی دیر بعد اچانک بلی کی آنکھوں سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ پھر چند ساعت بعد بلی کی غراتی ہوئی میاؤں...... میاؤں...... کی آواز کمرے کی فضا کو منتشر کرنے لگی۔ جیسے جیسے وقت گزرتا گیا بلی کی غراہٹ اور چیخ میں اضافہ ہوتا گیا...... پھر کیا تھا بلی کی فلک شگاف چیخیں کمرے کی در و دیوار کو دہلانے لگیں۔

اچانک سنیل کی آنکھ کھل گئی۔ اندھیرے میں اس نے دو سبز چھوٹے گولے دیکھے تو وہ تھرا کر رہ گیا کہ اچانک وہ دونوں سبز گولے غائب ہو گئے مگر بلی کی چیخ بدستور جاری رہی۔ سنیل چارپائی پر بیٹھا تھرانے لگا۔ اندھیرے میں وہ آنکھیں پھاڑے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ مگر گھپ اندھیرے میں اسے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔

پہلے تو ایک بلی کی چیخ سنائی دیتی رہی اس کے بعد ایک دو...... تین...... اور پھر بے شمار بلیوں کی دل و دماغ پر لرزہ طاری کرتی آسمان کو دہلاتی چیخیں سن کر

سارا گھر اٹھ بیٹھا۔ اس کے ساتھ ہی سنیل کی بھی وحشت ناک چیخیں ان بلیوں کی چیخوں میں شامل ہو گئیں۔ اس کے کمرے کا دروازہ اب خود بخود بہت مضبوطی سے بند ہو چکا تھا۔ "ماں...... بابو جی...... جلدی آؤ...... بچاؤ...... بچاؤ......" سنیل کی کربناک چیخیں در و دیوار کو دہلانے لگیں۔ گھر والے جلدی سے اس کے کمرے کی طرف لپکے مگر دروازہ تو اندر سے بند تھا۔

"سنیل دروازہ کھولو......" اس کی ماں نے چیخ کر کہا۔ مگر باہر والوں کی آوازیں سنیل تک نہیں پہنچ رہی تھیں۔ پھر اس پر ہی موقوف نہیں رہا۔ اب سارے کمروں سے بلیوں کی خوفناک غراہٹ اور دہشت ناک چیخیں سنائی دینے لگی تھیں۔ بلیوں کی چیخوں سے پورا گھر دہلنے لگا۔ چیخیں اس قدر تیز تھیں کہ گھر والوں نے اپنے اپنے کانوں پر اپنے ہاتھ رکھ لئے تھے۔

گھر کے سارے افراد افراتفری میں حال سے بے حال ہو کر رہ گئے تھے، بلیوں کی اتنی خوفناک چیخیں ان لوگوں نے اب تک اپنی زندگی میں نہیں سنی تھیں۔ سنیل کا کمرہ بدستور بند تھا مگر اور دیگر کمرے کے دروازے کھلے پڑے تھے۔ پورے گھر میں گھپ اندھیرے کا راج تھا۔ اور آوازیں ہر کمرے میں گونج رہی تھیں۔

"سنیل کی ماں...... جلدی سے چراغ جلاؤ۔" سنیل کے بابو نے چیخ کر کہا۔

"ماچس نہیں مل رہی...... ماچس اپنی جگہ سے غائب ہے......" "ارے کہیں اور دیکھو...... گنگا جلدی سے رسوئی میں دیکھو...... ماچس وہاں بھی ہوتی ہے۔" سنیل کی ماں کی بدحواس آواز سنائی دی۔

"رسوئی میں بھی ماچس نہیں ہے۔" سنیل کی بہن گنگا چیخ کر بولی۔

اب تو گھر میں موجود چھوٹے بچے بھی خوف و ڈر کی وجہ سے دہاڑیں مار مار کر چیخنے چلانے لگے تھے۔

"او تلسی...... اور اماننڈ...... جلدی کرو...... تلسی جلدی کرو...... تلسی...... تلسی۔" سنیل کے بابو اپنے پڑوسیوں کو آواز دینے لگے تھے۔ وجہ یہ تھی کہ باہر کا دروازہ بھی بند تھا۔ کسی نے باہر سے کنڈی لگا دی تھی۔ گھر کے سارے افراد گھر میں جیسے قید ہو کر رہ گئے تھے۔

اب تو سارے گھر والے چیخ و پکار کرنے لگے تھے، گھر والوں کی فلک شگاف چیخیں اور بلیوں کی سر پر آسمان اٹھاتی خوفناک چیخیں دل کو پھاڑے دے رہی تھیں۔ گھر والے گلا پھاڑ کر چیخ رہے تھے، لوگوں کو اپنی مدد کے لئے بلا رہے تھے۔ اور بلیاں ہر کمرے میں اس قدر چیخ رہی تھیں کہ اب گھر کی دیواریں زمین بوس ہو جائیں مگر مجال ہے کہ ان آوازوں کو باہر والے سن رہے ہوں۔ باہر کے افراد بھی کسی کی کوئی آواز نہیں سن رہے تھے۔

اپنے کمرے میں مقید سنیل کی آواز اب تو گلے میں پھنسنے لگی تھی۔ اس کی فلک شگاف چیخیں اب دم توڑتی محسوس ہو رہی تھیں۔ "ماں جی...... بابو...... ماں جی...... مجھے بچاؤ...... میں مر رہا ہوں...... بابو...... جلدی...... بابو...... بابو...... بلی مجھے نوچ رہی ہے...... بابو...... بابو...... با...... ہا...... بابو...... ں...... بلی مجھے مار دے گی۔"

"بھ...... بھگ...... بھگوان کرپا کرو...... بھگوان ہم پر دیا کرو...... بھگوان ہمیں بچا لو...... کالی ماتا ہم پر دیا کرو......" اس قسم کی زوردار آوازیں سنیل کے بابو کی تھیں۔

اچانک سنیل کے کمرے کا دروازہ دھڑام سے کھلا...... اور ایک بکری کی جسامت کی بلی اپنی انگارہ برساتی آنکھوں کے ساتھ باہر نکلی...... جسے دیکھ کر سارے گھر والے سہم کر لرزنے لگے۔ وہ بلی گھر والوں کے سامنے بہت زوردار آواز میں غرائی اور پھر گھر والوں نے دیکھا کہ باہر کا دروازہ بھی خود بخود کھل گیا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ کالی بلی دروازے سے باہر کو نکلتی چلی گئی۔

سنیل کی ماں دوڑ کر رسوئی میں گئی اور تختے پر ہاتھ مارا تو اب اس جگہ ماچس موجود تھی۔ سنیل کی ماں نے جلدی سے رسوئی میں موجود جلتے چراغ کو لے کر

باہر کو آئی تو جھٹ سے سارے گھر والے سنیل کے کمرے کی طرف بڑھے۔

کمرے میں سنیل فرش پر پڑا تھا۔ وہ بے ہوش ہو چکا تھا۔ وہ اکثر اپنے کمرے میں نیکر پہن کر سویا کرتا تھا۔ گھر والوں کی اس پر نظر پڑتے ہی سارے گھر والے لرز کر رہ گئے۔

سنیل خون میں لت پت تھا۔ اس کے سارے جسم سے خون بہہ رہا تھا۔ بلی نے اس کے ہاتھ پاؤں چہرہ اور جسم کو اپنے ناخنوں سے نوچ ڈالا تھا۔ زخم بہت گہرے تھے اور ان سے بڑی تیزی سے خون بہہ رہا تھا۔

سنیل کے بابو دوڑ کر باہر نکلے اور اپنے پڑوسیوں کا دروازہ دھڑ دھڑا دیا۔ پڑوسی بدحواسی کی حالت میں باہر نکلے۔ ”شیام بھائی خیریت تو ہے۔“ پڑوسی نے کہا۔

”ارے تلسی...... میرا سنیل مر رہا ہے...... جلدی چلو...... سنیل کو بچا لو...... ارے میں کیا کروں...... میرا سنیل مر جائے گا...... جلدی چلو......“ اور ان کے ساتھ سارے پڑوسی دوڑتے ہوئے ان کے گھر میں داخل ہوئے۔

سنیل کی حالت بہت ہی ابتر تھی۔ ابھی تک وہ بے ہوش تھا۔ سنیل کو دیکھ کر پڑوسی تھرا کر رہ گئے۔ ان کی آنکھیں جیسے پتھرا کر رہ گئی تھیں۔ ان میں خوف سوار ہو گیا تھا۔

”ارے دیکھو...... یہ مر جائے گا...... اب میں کیا کروں...... میری بدھی تو ختم ہو کر رہ گئی ہے۔ بھائی تلسی تم ہی کچھ بتاؤ......“ سنیل کے بابو سسکتے ہوئے بولے۔

”شیام بھائی...... یہ سب ہوا کیسے؟“ تلسی داس نے پوچھا۔

”ارے میں تو تم لوگوں کو آوازیں دیتے دیتے تھک گیا۔ میں تو گلا پھاڑ کر چیخ رہا تھا۔“ سنیل کے بابو نے کہا۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے......؟ ہم نے تو کوئی آواز نہیں سنی۔ آواز اگر ہم سنتے تو ضرور آتے...... اور اس سے پہلے کیا کبھی ایسا ہوا ہے۔“

تلسی داس نے کہا۔ ”اچھا تم جلدی سے پانی اور ایک صاف کپڑا لے آؤ۔ میں کچھ کرتا ہوں۔“

یہ سن کر گنگا دوڑتی ہوئی گئی اور مٹی کے کونڈے میں پانی لے آئی ساتھ ہی ایک بڑا سا ململ کا ٹکڑا بھی اٹھا لائی۔ تلسی داس نے کپڑے کو پانی میں بھگو کر سنیل کے زخم سے نکلتے خون کو صاف کرنا شروع کر دیا۔ سنیل کی سانسیں بہت ہلکی چل رہی تھیں۔ مگر وہ ابھی بھی بے سدھ ہوش و حواس سے بیگانہ پڑا تھا۔

”شیام بھائی یہ سب ہوا کیسے؟ سارے جسم پر اتنے زخم، ایسا لگ رہا ہے کہ سارے جسم کو نوچا گیا ہے۔“ تلسی داس نے کہا۔

اتنے میں گاؤں کی مسجد سے ”اللہ اکبر“ کی آواز سنائی دی۔ اذان فجر ہونے لگی تھی۔ اذان کی آواز سن کر اس جگہ موجود لوگوں کے جسم میں جیسے چین کی لہر دوڑ گئی۔

”صبح ہونے والی ہے۔ اجالا پھیلتے ہی وید صاحب کو بلا کر لاتے ہیں، وہ سارے جسم پر کوئی مرہم لگا دیں گے اور اسے دوا بھی دیں گے۔“ تلسی داس نے کہا۔

اور پھر تھوڑی دیر میں صبح کا اجالا آہستہ آہستہ پورے گاؤں پر پھیل گیا۔ سنیل کے بابو نے سنیل کے چھوٹے بھائی راجیش کو ترنت حکیم صاحب کی طرف دوڑایا۔ وہ بولے۔ ”حکیم صاحب سے کہنا۔ حکیم صاحب بابو نے جلدی سے بلایا ہے۔ سنیل بھائی کی زندگی اور موت کا سوال ہے۔ سنیل بھائی کو رات سے بلیوں نے اپنے ناخنوں سے نوچ ڈالا ہے۔ آپ جلدی سے چلیں دوا اور مرہم لے کر، سنیل بھائی اپنے ہوش میں نہیں ہیں، آپ جلدی چلیں...... سنیل بھائی کو بچا لیں۔ اگر دیر ہو گئی تو سنیل بھائی مر جائیں گے، سارے جسم سے خون بہہ رہا ہے، ان کی حالت دیکھی نہیں جا رہی۔“

اور راجیش حکیم صاحب کے پاس پہنچ گیا۔

”بلیوں نے نوچا!“ حکیم صاحب اچنبھے کی حالت میں بڑبڑائے۔ ”اچھا میں چلتا ہوں، دوا وغیرہ لے لوں۔“ وہ جلدی سے گھر کے اندر چلے گئے اور پھر چند منٹ میں باہر آ گئے۔ ان کے ہاتھ میں دواؤں کا ایک چھوٹا سا لکڑی کا بکس تھا اور ایک ہاتھ میں روئی کا ایک بنڈل بھی تھا۔

راجیش کے ساتھ حکیم صاحب چند منٹ میں آ گئے۔ جب وہ کمرے میں داخل ہوئے تو سنیل کی حالت دیکھ کر ششدر رہ گئے، ان کا ذہن یہ ماننے سے قاصر تھا کہ بلیوں نے اس قدر سنیل کے سارے جسم پر اپنے ناخن مارے ہوں۔ انہوں نے زمانہ دیکھا تھا۔ بڑے بڑے حادثے ان کے سامنے آئے تھے، وہ زمانہ شناس تھے، وہ کیسے مان سکتے تھے کہ ایک ہٹے کٹے جوان آدمی کو بلیوں نے نوچا تھا۔ جبکہ سنیل کی دونوں آنکھیں ٹھیک ٹھاک تھیں۔

بہرحال حکیم صاحب نے اپنا علاج شروع کر دیا۔ فوراً انہوں نے پانی گرم کرایا۔ پہلے گرم پانی میں ایک رقیق دوا ڈالی اور پھر اس پانی میں روئی بھگو کر آہستہ آہستہ سنیل کے زخم پر سے خون صاف کرنا شروع کیا۔ خون صاف کرنے سے سنیل کسمسا بھی رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ دوا اسے لگ رہی ہے۔

سارا خون صاف کرنے کے بعد حکیم صاحب نے ایک گہرا پیلا مرہم سارے جسم پر لگا دیا۔ یہ کرنے کے بعد انہوں نے ایک لال رنگ کی دوا سنیل کے منہ میں انڈیل دی۔ چند ساعت ہی گزرے تھے کہ سنیل نے اپنی سہمی ہوئی آنکھیں کھول دیں۔ اور خوف کھائے ہوئے لرزیدہ آواز میں بولا۔ ”وہ مجھے مار دے گی...... وہ مجھے مار دے گی۔“ اور پھر اس نے بھرپور نگاہوں سے اپنے گرد کئی لوگوں کو دیکھ کر اچنبھے میں پڑ گیا۔

حکیم صاحب نے جھٹ ایک دوسری دوا اس کے منہ میں ڈال دی۔ سنیل کرب و اذیت سے تکلیف دہ انداز میں منہ بناتا رہا۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھوں کی پلکیں بند ہونے لگیں اور وہ بے سدھ ہو کر سو گیا۔ اسے اس حالت میں دیکھ کر حکیم صاحب بولے۔ ”اسے آرام کرنے دیں۔ جب یہ خود بخود سو کر اٹھے گا تو اسے گرم دودھ میں ہلکی سی ہلدی کے ساتھ چینی ملا کر دودھ پلا دینا۔ میں شام سے پہلے آ کر ایک مرتبہ اور دیکھ لوں گا اور دوسری دوا بھی دوں گا، مگر اس کی یہ حالت ہوئی کیسے؟“ حکیم صاحب نے پوچھا۔

سنیل کے باپو بولے۔ ”حکیم صاحب ہماری آنکھ کھلی تو ہم نے دیکھا کہ سنیل کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ یہ اندر سے چیخ رہا تھا اور ساتھ ہی کمرے سے بے شمار بلیوں کے چیخنے کی خوفناک آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ ہم کمرے کی طرف بڑھے تو سارے کمروں سے بلیوں کے چیخنے کی آوازیں آنے لگیں۔ باہر کا دروازہ بھی بند تھا۔ کسی نے باہر کی کنڈی لگا دی تھی۔ پورے گھر میں ماچس جل کے نہیں دے رہی تھی۔ پھر میں نے بہت زوردار آواز میں بھگوان اور کالی ماتا کو پکارا تو ایک بہت بڑی کالی بلی سنیل کے کمرے سے باہر نکلی اور ہم سب پر غراتی ہوئی نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر دروازے سے نکل گئی، اچنبھے کی بات یہ تھی کہ بلی جب باہر کو نکلی تو باہر کا دروازہ بھی خود بخود کھل گیا تھا۔ گھر میں بلیاں چیخ رہی تھیں اور ساتھ ہی ہم سارے گھر والے بھی چیخ چیخ کر پڑوسیوں کو پکارتے رہے، سنیل کی آوازیں

غلط فہمی

باپ نے اپنے بیٹے کی جامہ تلاشی لی۔ جیب سے سگریٹ، چرس اور کسی دوست کا نمبر برآمد ہوا۔

باپ نے بیٹے کو بہت مارا اور کہا۔ ”کب سے کر رہے ہو یہ سب کچھ۔“

بیٹا روتا ہوا بولا۔ ”ابا جان!!! میں نے آپ کی قمیض پہنی ہے۔“

(رانا ظفر اقبال۔ جنڈالوالہ)

بھی در و دیوار کو دہلاتی رہیں مگر گھر سے باہر کسی کی بھی آواز نہیں گئی۔ یہ سوچ سوچ کر تو میرا دماغ پھٹا جا رہا ہے کہ ایسا کیا تھا، وہ بلی کیسی تھی اور اس بلی نے ایسا کیوں کیا؟"

یہ سن کر حکیم صاحب بولے۔ "شیام داس یہ تو مجھے کوئی ہوائی چکر لگتا ہے۔ وہ بلی کوئی عام بلی نہیں ہو سکتی۔" حکیم صاحب کی اس بات کو سن کر اس جگہ موجود سارے لوگ سہم کر رہ گئے۔ "شیام داس میں چلتا ہوں اور پانچ بجے آ کر دوبارہ دیکھوں گا۔" یہ بول کر حکیم صاحب چلنے لگے تو شیام داس نے کہا۔ "حکیم صاحب کتنے پیسے ہونے بتا دیں۔"

حکیم صاحب بولے۔ "پیسوں کی فکر نہ کرو، میں شام میں بتا دوں گا۔" اور یہ بول کر حکیم صاحب نے اپنا چھوٹا سا بکس اٹھایا اور گھر سے باہر نکل گئے۔

یہ عجیب و غریب اور خوفناک خبر پورے گاؤں میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ گاؤں بھر کے سارے لوگوں کا تانتا بندھ گیا۔ جس کو دیکھو منہ اٹھائے آنے لگا۔ تمام لوگوں کے چہروں پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ ہر آدمی اچنبھے میں تھا، کسی کو بھی یقین نہیں آ کر دے رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ اس سے پہلے گاؤں میں کبھی بھی ایسا نہ ہوا تھا۔ اور نہ ہی کبھی اس قسم کا واقعہ سننے میں آیا تھا۔ پورے گاؤں میں دہشت تھی۔ اس سے پہلے گاؤں کے دو نوجوانوں کی دہشت ناک موتیں ابھی بھی لوگوں کے ذہن میں تازہ تھیں۔ اور اب پھر یہ خوفناک واقعہ، لوگ سہم کر رہ گئے تھے۔

گاؤں کے زیادہ تر لوگ دوڑ کر مندر میں پہنچ گئے اور پنڈت کے سامنے دست سوال بن گئے۔

"پنڈت جی! گاؤں میں یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ آپ ہی کچھ بتائیں، اس سے پہلے تو کبھی گاؤں میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ہمارا گاؤں تو سکھ شانتی سے بھرا پڑا تھا۔ مگر اب اچانک دل دہلاتا ایسے حالات؟......"

"بھائیو! مجھے لگتا ہے ضرور کوئی نہ کوئی کٹھن بات ہوئی ہے اور اس کارن کالی ماتا بھی ناراض لگتی ہے، سارے گاؤں والے مل کر ماتا کے چرنوں میں پرارتھنا کریں، ماتا اپنا کرپا کرے گی۔" پنڈت نے کہا۔

کچھ لوگ گاؤں کی مسجد میں پیش امام کے پاس پہنچ گئے اور بولے۔ "پیش امام صاحب آپ اللہ سے دعا کریں کہ اب اچانک یہ سب کچھ گاؤں میں کیوں ہونے لگا۔ ہمارا گاؤں تو ہمیشہ ہمیشہ سے سکھ چین کا گہوارہ رہا ہے۔ گاؤں میں ایسی ایسی خوفناک لرزہ خیز موتیں، اور یہ رات میں خوفناک بلیوں کا حملہ...... آپ دعا کریں۔ اللہ کے حضور!"

"آپ لوگ گھبرائیں نہیں...... مجھے تو لگتا ہے کہ گاؤں کے کسی فرد سے ضرور کوئی ایسا گناہ سرزد ہوا ہے، یا پھر ضرور کوئی ایسی نافرمانی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے اس وقت سارا گاؤں دہشت زدہ ہے، جبکہ یہ معاملہ ہر کسی کے ساتھ پیش نہیں آ رہا ہے، اللہ بہتر جانتا ہے، میں دعا کروں گا، آپ لوگ اللہ پر بھروسہ رکھیں۔ اللہ بڑا رحمٰن رحیم اور اپنے بندوں پر فضل کرنے والا ہے۔"

شام پانچ بجے حکیم صاحب سنیل کے گھر آئے۔ دوپہر کے وقت سنیل کو ہوش آ چکا تھا۔ مگر کسی نے بھی اس سے باز پرس نہیں کیا تھا۔ وہ اپنی چارپائی پر خاموش پڑا تھا۔ ماں نے ہوش میں آنے پر گرم دودھ میں چینی اور ہلدی ڈال کر پلا دیا تھا۔

حکیم صاحب سنیل کے قریب ایک چھوٹے مونڈھے پر بیٹھ گئے اور انہوں نے اپنا دایاں ہاتھ سنیل کے سر پر رکھا تو سنیل نے اپنی آنکھیں کھول کر حکیم صاحب کو دیکھا۔

"سنیل بیٹا! اب طبیعت کیسی ہے؟" حکیم صاحب نے پوچھا۔

سنیل کے منہ سے آوازیں نہیں نکل رہی تھیں۔ وہ بہت زیادہ سہما ہوا نظر آ رہا تھا، اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں واضح طور پر نظر آ رہی تھیں۔ حکیم صاحب نے سنیل کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور اس کی نبض پر اپنی انگلی رکھ دی اور پھر اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ ایک

منٹ اپنی انگلی نبض پر رکھنے کے بعد انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں اور پھر بکس میں سے ایک شربت نکالا اور ایک گلاس منگوا کر اس شربت کو گلاس میں ڈالا اور اسے سنیل کو پلا دیا۔ جب سنیل شربت پی چکا تو حکیم نے کہا۔ "سنیل بیٹے! اب تم لیٹو نہیں بلکہ تکیہ کے سہارے بیٹھے رہو۔"

حکیم صاحب کی بات سن کر سنیل تکیہ کے سہارے بیٹھ گیا۔ چند منٹ ہی گزرے تھے کہ سنیل نے ایک بہت لمبا سانس کھینچا۔ حکیم صاحب بدستور اس پر نظریں جمائے بیٹھے تھے۔ اب سنیل اپنی آنکھیں موندتا رہا۔ اور کھولتا رہا۔ چند بار ایسا کرنے کے بعد اس نے ایک اور لمبا سانس کھینچا۔

"سنیل بیٹا! اب طبیعت کیسی ہے؟" حکیم صاحب نے پوچھا۔ "اور تمہارے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا کہ تمہاری ایسی حالت ہوئی کچھ بتاؤ تا کہ اس کا تدارک کیا جائے۔"

سنیل اپنی نحیف آواز میں بولا۔ "حکیم صاحب میں گہری نیند میں تھا کہ اچانک کسی بلی کے چیخنے پر میری آنکھ کھل گئی۔ کمرے میں گھپ اندھیرا تھا، میں نے دیکھا کہ دو سبز گہرے رنگ کے گولے نظر آ رہے تھے، کہ پھر اچانک بلی کی غراہٹ سنائی دی، اس کے بعد بلی کی لرزا دینے والی زوردار آوازیں آنے لگیں۔ آوازیں پھر زور پکڑنے لگیں اس کے بعد لگا کہ کئی بلیاں ایک ساتھ مل کر چیخنے لگیں۔ آوازیں اتنی زوردار تھیں کہ میں نے اپنے کان اپنے دونوں ہاتھ سے بند کر لئے لیکن پھر بھی آوازیں میرا کان پھاڑنے لگیں۔ پھر ان بلیوں نے مجھ پر حملہ کر دیا، حملہ اتنا زوردار تھا کہ میرے برداشت سے باہر ہو گیا۔ تکلیف اور اذیت میرے برداشت سے باہر ہو گئی اور میں چیخنے لگا۔ اندھیرا اتنا تھا کہ میں دیکھ بھی نہیں سکتا تھا اور پھر میں تیورا کر گر پڑا، اس کے بعد مجھے ہوش نہ رہا۔"

"شیام داس! آج سے سنیل کو اندھیرا کر کے سونے نہیں دینا، اور کوشش کرنا کہ اس کے ساتھ کوئی اور بھی سوئے، چند دن تک اس کا اکیلا سونا میرے خیال میں ٹھیک نہیں، کیونکہ ابھی بھی اس کے ذہن پر خوف سوار ہے۔ میں چند دن تک متواتر اسے چیک کرتا رہوں گا اور دوا دوں گا۔"

"حکیم صاحب پیسوں کا آپ بتا دیں۔" سنیل کے باپو نے پوچھا۔

"آپ دو روپے دے دیں۔" وہ سستا زمانہ تھا، ایک روپے میں بیس سیر آٹا آتا تھا۔ سنیل کے باپو نے دو روپے حکیم صاحب کو دیئے۔ روپے لے کر حکیم صاحب کمرے سے باہر نکل گئے۔ حکیم صاحب نے ایک دوا دی تھی کہ رات میں سوتے وقت سنیل ضرور کھایا کرے۔ اور وہ دوا تھی گہری نیند کے لئے۔

ادھر سنیل کے دوست گنیش کو بھی سنیل کے ساتھ پیش آنے والے حالات کا پتا چل چکا تھا، تمام باتیں سن کر گنیش پر بھی کپکپی سوار ہو گئی تھی۔ اس نے گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ سرِ شام ہی گھر میں گھس کر سو جاتا۔ یہی نہیں بلکہ اس نے تو سنیل سے ملنا بھی چھوڑ دیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سنیل کے ساتھ میں بھی ان میں سے کسی بلی کی نظر میں آ جاؤں۔ کئی دفعہ سنیل نے گنیش کے پاس خبر بھی بھیجی کہ گنیش میرے پاس آئے مگر گنیش یہ بول کر ٹال دیتا کہ "سنیل سے بولنا میں ترنت آؤں گا۔"

گنیش کا اب زیادہ تر وقت کالی ماتا کے مندر میں گزرنے لگا تھا۔ صبح ہوتے ہی وہ مندر میں پہنچ جاتا اور اپنا سر نیچے کیئے کالی ماتا کے سامنے بیٹھا رہتا۔ لوگ آتے اور کالی ماتا کے چرنوں میں پھول یا پھر دان دکھشنا ڈال کر چلے جاتے مگر گنیش کو کسی کے آنے جانے سے کوئی فکر نہیں تھی، بس وہ اپنا سر جھکائے بیٹھا رہتا، دوپہر تک لوگوں کا آنا جانا بالکل ختم ہو جاتا تو پنڈت کی آواز سنائی دیتی۔ "گنیش اب گھر چلا جا، یہ آرام کا سمے ہے، اب ماتا کو بھی آرام چاہئے۔" جب گنیش یہ سنتا تو اپنے گھر کی راہ لیتا اور بولتا۔ "پنڈت جی پتا نہیں کیوں میرا سکھ شانتی سب کچھ چھن گیا ہے، ہر وقت دل میں دھڑکا

سالگار رہتا ہے، من کہیں بھی نہیں لگتا، ہر سے خوف اور ڈر دماغ میں سمایا رہتا ہے، آپ ماتا کے سیوک ہیں، ماتا آپ کی سنے گی، میرے لئے پرارتھنا کرنا کہ ماتا مجھ پر دیا کرے، بس میرے بیاکل من کو شانتی مل جائے، ماتا جس چیز کے لئے بھی اشارہ کرے گی میں وہ چیز لاکر ماتا کے چرنوں میں ڈال دوں گا۔" ہر روز پنڈت سے اس قسم کی باتیں کرتا اور گھر کی راہ لیتا۔

ادھر سنیل کی زندگی اجیرن بن کر رہ گئی تھی۔ وہ چلنے پھرنے کے قابل ہوگیا تھا۔ وہ اپنے گھر کے قریب گھومنے پھرنے کے علاوہ اب دارو والی جگہ پر بھی جانے لگا تھا۔ لیکن ہر وقت سہما سہما رہتا تھا۔ لیکن سب سے بڑی مصیبت اس کے ساتھ یہ لگ گئی تھی کہ وہ جب بھی اور جہاں بھی اکیلا ہوتا اور قرب و جوار میں کوئی اور نہیں ہوتا تو کسی خونخوار بلی کی بھیانک فلک شگاف چیخ سنائی دیتی تو وہ اچھل پڑتا اور لرز جاتا۔ وہ گھنٹوں دارو خانے میں بیٹھا گھونٹ گھونٹ دارو پیتا رہتا، چونکہ دارو خانے میں ہر وقت رش رہتا تھا اس وجہ سے وہ اس جگہ بیٹھا رہتا تھا۔ شام کا اندھیرا ہونے سے بہت ہی پہلے اپنے گھر آجاتا تھا۔ اس کی کوشش ہوتی تھی کہ اس کے ساتھ کوئی نہ کوئی رہے، اس لئے وہ کوشش کرتا کہ کسی کو بھی اپنے ساتھ رکھے لیکن کوئی کب تک کس کے ساتھ رہتا ہے، اور جب وہ اکیلا ہوتا تو اسے بلی کی چیخ سنائی دیتی۔

حکیم صاحب ہر روز رات کے لئے اسے نیند کی دوا دیتے تاکہ وہ رات میں سوتے سے گہری نیند میں پڑا رہے، مگر اس کے باوجود بھی وہ اکثر رات میں بہت زیادہ ڈر جاتا، اس کی گھٹی گھٹی آواز گھر والوں کو سنائی دیتی، کبھی کبھی وہ نیند میں چیخ پڑتا، بچاؤ...... بچاؤ...... یہ مجھے مار دے گی...... یہ مجھے مارنے آرہی ہے...... بچاؤ...... بچاؤ۔" سنیل کی آوازیں سن کر بھی گھر والے اسے نہیں اٹھاتے کیونکہ وہ گہری نیند میں ہوتا، اور حکیم صاحب کا کہنا تھا کہ "چاہے یہ جتنا بھی چیخے اسے جھنجھوڑ کر اٹھانا نہیں، اگر اسے اس حالت میں جھنجھوڑ کر اٹھا دیا گیا تو ہوسکتا ہے کہ خوف کی وجہ سے اس کا دماغ الٹ جائے۔"

دن بدن اس کی حالت غیر سے غیر ہورہی تھی۔ اس کی جسمانی کمزوری صاف نظر آنے لگی تھی۔ اس بڑھتی ہوئی کمزوری کے باعث اس کو اس کے بابوجی کئی مرتبہ شہر میں موجود ایک بڑے ڈاکٹر کے پاس بھی لے کر جاچکے تھے۔ ڈاکٹر نے انجکشن لگائے اور کئی دوائیں دیں کہ وہ رات اور صبح کے وقت استعمال کرے۔ مگر کمزوری تھی کہ بڑی تیزی سے بڑھ رہی تھی۔ اب زیادہ دور تک وہ چل بھی نہیں سکتا تھا۔ زیادہ چلنے سے اس کا سانس پھولنے لگتا تھا اور جب سانس پھولنے لگتا تو پھر وہ مجسم پسینے میں شرابور ہوجاتا۔ اس کی ماں سے اس کی حالت دیکھی نہیں جاتی، ماں اس کی حالت دیکھ کر اندر سے ٹوٹ جاتی۔ جوان اولاد کا غم ویسے بھی ماں باپ کے لئے بہت بھاری ہوتا ہے۔

"بیٹا! تو کھل کھلا کر بتا تو کہ تیرے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے، کیسا ڈر تیرے دل و دماغ میں سما گیا ہے، بیٹا! ہم نے بڑے ارمانوں سے تیری پرورش کی ہے، جب تک تو اپنے من کا نہیں بتائے گا اس وقت تک کیا ہوسکتا ہے، دیکھ تیرے بابوجی بھی تیرے غم میں گھلتے جارہے ہیں، تو نے ایسی کیا غلطی کردی جس کارکن یہ سزا بھگت رہا ہے۔" اس کی ماں آئے دن اس طرح کی باتیں کرتی۔

لیکن وہ مجبور تھا، اپنی کرنی کی سزا بھگت رہا تھا، چند منٹ کی ہوس پرستی نے آج اس کی زندگی کو کربناک بنادیا تھا، وہ اس کرب میں مبتلا تھا کہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر بتا دیتا تو شرمندگی کے ساتھ ساتھ پھانسی کے پھندے پر لٹکا دیا جاتا اور یہی نہیں بلکہ اس کے گھر والے بھی شرمندگی سے کہیں کے بھی نہیں رہتے۔

"ماں۔" یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم کہ میرے ساتھ یہ کیا کچھ ہورہا ہے، بس میں اب زندگی کے دن پورے کررہا ہوں، میری حالت خود میری سمجھ سے باہر ہے، کاش! کہ میں سمجھ پاتا۔" سنیل اسی طرح کے

جواب دیتا تو اس کی ماں سسک پڑتی۔

گاؤں والے بھی اس کی بگڑتی ہوئی ابتر حالت کو دیکھ کر دکھی ہوجاتے تھے۔ ایسا کڑیل جوان دیکھتے دیکھتے چلنے پھرنے سے بھی قاصر ہوگیا تھا۔ طرح طرح کی باتیں اور مشورے لوگ دیتے مگر وہ سب کی سنتا رہتا، اس کے پاس یا پھر اس کے گھر والوں کے پاس اس کی بیماری کا کوئی حل نہیں تھا۔ ڈاکٹر، وید، سادھو، سنیاسی اور بڑے سے بڑے پنڈت تک کے پاس اسے لے جایا گیا مگر وہی ڈھاک کے تین پات...... کوئی جنتر منتر والا بھی کھل کر اس کے بارے میں نہیں بتا پاتا، ایسا لگتا کہ اس کی حالت کی تفصیل بتانے کے لئے ان کی زبان ان کا ساتھ نہیں دیتی تھی۔ وہ سب بائیں شائیں کی باتیں کر کے ٹال دیتے۔

رات میں سوتے سے اسے اکیلا نہیں سونے دیا جاتا تھا۔ کوئی نہ کوئی اس کے کمرے میں ضرور سوتا تھا۔ رات بھر کمرے میں چراغ جلتا رہتا تھا۔ اندھیرا بالکل نہیں ہونے دیا جاتا تھا۔ ایک نے مشورہ دیا تھا کہ اس کے سرہانے ایک چھری رکھ دیا کریں کیونکہ چھری رکھنے سے ہوائی چیزیں قریب نہیں آتی ہیں اور اس طرح ہوائی چیزوں سے حفاظت رہتی ہے۔ لہٰذا اس کے سرہانے رات سے ایک چھری ضرور رکھ دی جاتی تھی۔

گاؤں والے آہستہ آہستہ اپنے دل و دماغ سے خوف نکال چکے تھے اور ویسے بھی کب تک کسی غم، کسی دکھ، کسی اذیت، یا پھر کسی خوف کو دماغ میں رکھا جاتا ہے، وقت کے ساتھ ساتھ انسان کی حالت نارمل ہوتی چلی جاتی ہے، اب گاؤں کے افراد بے خوف و خطر رات برات آتے جاتے نظر آنے لگے تھے۔

گرمیوں کا وقت شروع ہوچکا تھا اور گرمیوں میں ویسے بھی لوگ زیادہ تر کافی دیر تک جاگتے رہتے ہیں۔ پاس پڑوس کے چند لوگ اپنے گھر بار کے قریب بیٹھ کر اپنا دکھ سکھ کہہ کر غم بانٹتے رہتے ہیں اور گاؤں دیہات میں تو ایسے بھی لوگ دن بھر رات محنت مزدوری کے علاوہ، مشقت والا کام زیادہ کرتے ہیں جس میں کھیتی باڑی یا ہل چلانا، جانوروں کی دیکھ بھال شامل ہوتی ہے، شام کا اندھیرا پھیلتے ہی اپنے کام کاج سے فارغ ہوکر تھوڑے وقت کے لئے چند لوگ ایک جگہ بیٹھ کر ہنس بول کر اپنے آپ کو ہلکا کرلیتے ہیں جبکہ شہروں میں یہ بات نہیں، شہروں میں چونکہ رات دن کی مصروفیات ہوتی ہیں لہٰذا پڑوسی اپنے پڑوسی سے مہینوں میں کہیں میل ملاقات کرتا ہے۔

رات کافی سے بیت چکا تھا۔ کمرے میں چراغ بدستور جل رہا تھا۔ سنیل کی چارپائی کے قریب ہی دوسری چارپائی پر اس کے بابو گہری نیند میں پڑے تھے۔ اچانک سنیل کی آنکھ کھل گئی، اس نے چاروں طرف کمرے کو بہت غور سے دیکھا۔

پھر اچانک اس نے اپنا تکیہ اٹھا کر دیکھا اور تکیہ کے نیچے رکھی ہوئی تیز دھار چھری اٹھالی، چھری پر اپنی گرفت مضبوط کرلی، ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ اپنے حواس میں نہ ہو بلکہ کسی ان دیکھی طاقت کے زیر اثر ہو۔

وہ بہت احتیاط سے اپنی چارپائی پر سے اٹھا اور بچتا بچاتا کمرے سے نکلنے لگا، خیر وہ اپنے کمرے سے باہر صحن میں نکل آیا۔ اس نے اچٹتی نظروں سے اپنے پورے گھر کو دیکھا اور پھر اپنے قدم باہر دروازے کی طرف بڑھا دیئے۔ جب وہ دروازے کے قریب پہنچا تو دروازہ خود بخود کھلتا چلا گیا، دروازے سے وہ باہر نکل گیا۔ چھری اس کے ہاتھ میں موجود تھی۔ دروازے سے باہر نکلتے ہی دروازہ خود بخود بند ہوگیا اور اندر سے کنڈی لگنے کی آواز بھی سنائی دی۔

وہ ٹرانس کی حالت میں چل رہا تھا۔ وہ اپنے ارد گرد سے بیگانہ ایک سمت میں آگے ہی آگے بڑھتے جارہا تھا۔ گاؤں میں موجود کئی کتوں نے اسے دیکھا تو وہ بھونکنے لگے مگر ہر جگہ اس کی آنکھ سے چنگاریاں نکل کر کتوں پر پڑتیں تو کتے نحیف آواز میں "کوں ں ں...... کوں ں ں...... کر کے خاموش ایک طرف بیٹھ جاتے۔

پورے گاؤں میں آج کی رات ایک فرد بھی ایسا نہیں تھا کہ کسی کی نظر اس پر پڑتی۔ ہر آدمی اپنے گھر

میں محوِ خواب تھا۔ سنیل اپنی حالت سے بالکل بیگانہ بس ایک ہی طرف سیدھ میں چلتا رہا۔ چلتے چلتے گاؤں کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ وہ جگہ بالکل سنسان اور ویران تھی۔

اس جگہ کالی ماتا کا پرانا مندر گھپ اندھیرے میں بہت ہی مہیب منظر پیش کر رہا تھا۔ مندر سے چند قدم کے فاصلے پر وہی برگد کا درخت تھا جس جگہ پہلے دو شخص مرے پڑے تھے۔ ایک برگد کے درخت پر برگد کی داڑھی سے گلے میں پھندا لگ کر مرا تھا جبکہ دوسرے پر برگد کی ایک ٹہنی اوپر سے ٹوٹ کر گری تھی اور وہ ٹہنی مرنے والے کے سر پر سے ہوتی ہوئی سینے میں اتر گئی تھی۔

سنیل برگد کے درخت کے پاس پہنچ کر ساکت کھڑا ہو گیا۔ چھری اس کے ہاتھ میں اب بھی موجود تھی۔

مندر کے پیچھے جہاں کہ مالنی کو مار کر ان چاروں نے گڑھا کھود کر دبا دیا تھا۔ اس جگہ سے ایک روشن ہیولہ باہر کو نکلا اور چکراتے ہوئے وہ ہیولہ کالی ماتا کے مندر کے اندر چلا گیا اور پھر چند منٹ بعد وہ ہیولہ مندر سے باہر نکلا اور اس جگہ آ گیا جہاں کہ سنیل بے حس و حرکت خاموش کھڑا تھا۔ پھر وہ ہیولہ سنیل کے چاروں طرف چکر لگانے لگا۔ ہیولہ نے سنیل کے چاروں طرف چکر لگانے کے بعد سنیل کے سامنے کچھ فاصلے پر ایک جگہ ٹھہر گیا۔

سنیل اردگرد سے بیگانہ خاموشی سے برگد کے درخت کی جڑ کے پاس خاموشی سے چت لیٹ گیا۔ اس نے اپنا دہ ہاتھ جس میں چھری تھی میکانکی انداز میں اوپر کو اٹھایا۔ چھری کی دھار کو سیدھی کر کے اپنا ہاتھ آہستہ آہستہ نیچے کو اپنی گردن کی طرف لانے لگا۔ اپنا ہاتھ اپنے نرخرے کے قریب لایا اور پھر ایک جھٹکے سے تیز دھار چھری کو نرخرے پر پھیرنے لگا۔ وہ کسی ان دیکھی وجود کے زیر اثر لگ رہا تھا۔

خرخر کی آواز کے ساتھ ہی نرخرے سے خون فوارہ کی طرح ابل پڑا۔ اب اس کا پورا نرخرہ کٹ چکا تھا۔ سنیل چند سیکنڈ میں ساکت ہو گیا۔ اس کا دایاں ہاتھ جس میں چھری تھی وہ سیدھے پہلو کی طرف گر گیا۔ اب بھی چھری اس کے ہاتھ میں ہی موجود تھی۔

روشن ہیولہ اب حرکت کرتا ہوا مندر میں چلا گیا، پھر چند سیکنڈ میں مندر سے نکل کر اس جگہ آیا جہاں مالنی کو گڑھے میں دبایا گیا تھا۔ پھر وہ ہیولہ اس جگہ آہستہ آہستہ زمین کے اندر سماتا ہوا غائب ہو گیا۔ اور اس کے بعد برگد کے درخت پر بیٹھے الو نے ایک کریہہ چیخ مار کر ایک طرف کو اڑتا ہوا چلا گیا۔

ادھر صبح کا اجالا پھیلنے سے پہلے سنیل کے باپو کی اچانک آنکھ کھلی تو انہوں نے دیکھا کہ سنیل کی چارپائی خالی پڑی ہے، وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے گھبراتے ہوئے سنیل کے بستر کو دیکھنے لگے، پھر وہ اپنی چارپائی سے اٹھے اور صحن میں آ گئے تو انہوں نے دیکھا کہ باہر کا دروازہ بند تھا، کنڈی اندر سے لگی پڑی تھی۔

سنیل کے باپو کو پہلے تو تشویش ہوئی کہ اتنی جلدی سنیل کہاں جا سکتا ہے پھر انہیں اچانک خیال آیا کہ کھیتوں میں رفع حاجت کے لئے چلا گیا ہوگا، لیکن اندر سے کنڈی لگی پڑی تھی؟ پھر انہوں نے سوچا کہ اس نے اپنی ماں کو اٹھا لیا ہوگا اور پھر انہوں نے کنڈی لگا لی ہوگی۔ (ویسے بھی گاؤں دیہات میں مرد حضرات گاؤں میں پورا اجالا پھیلنے سے پہلے کھیتوں میں رفع حاجت کے لئے جاتے ہیں)

صبح کا اجالا پھیلتے ہی گاؤں کے افراد اپنے کام کاج کے لئے گاؤں سے باہر جانے لگے۔ جب ایک شخص اس برگد کے درخت کے پاس سے گزرنے لگا تو اس کی نظر مردہ سنیل پر پڑی تو وہ دہل کر رہ گیا۔ وہ کپکپاتی ٹانگوں سے بھاگتا ہوا گاؤں میں آیا اور یہ خبر پورے گاؤں میں گرجتے بادلوں کی طرح آناً فاناً پھیل گئی کہ سنیل نے برگد کے درخت کے نیچے رات کسی سے جا کر تیز دھار چھری سے خودکشی کر لی ہے۔

چند منٹ بھی نہیں لگے کہ پورا گاؤں امڈ کر برگد کے درخت کے نیچے جمع ہو چکا تھا۔ ہر چھوٹا بڑا انگشت

بدنداں تھا کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اور اگر سنیل نے خودکشی ہی کرنی تھی تو وہ کسی اور جگہ بھی خودکشی کر سکتا تھا اتنی دور گاؤں سے ہٹ کر کیوں آیا؟

سنیل کے گھر والوں کی حالت جل تڑپتی مچھلی کی طرح تھی، انہیں ہوش آتا، پھر وہ پچھاڑ کھا کر نیچے گرتے اور بے ہوش ہو جاتے، گاؤں میں موجود ہر آنکھ اشک بار تھی، غم سے سب کے سر جھکے ہوئے تھے۔ ویسے بھی گاؤں کے سارے لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی ہوتے ہیں۔

سنیل کی لاش کو چارپائی پر ڈال کر گاؤں میں لایا گیا، گاؤں کے سارے لوگ روتے اور بلکتے رہے اور پھر دوپہر کے بعد سنیل کو چتا کے حوالے کر دیا گیا۔

اب تک برگد کے درخت کے پاس تین موتیں ہو چکی تھیں۔ گاؤں والوں نے کسی ایک کے بارے میں بھی پولیس کو اطلاع نہیں دی تھی۔ اس لئے کہ پولیس کا کام سوائے شک شبہ اور پوچھ گچھ کے کچھ بھی نہیں ہوتا، چند روز تک گاؤں والوں کو تھانے میں بلانا اور پھر چند باتیں کر کے واپس کر دینا یا پھر شک کی بنا پر چند کو ڈرا دھمکا کر کچھ رقم اینٹھ لینا، اسی وجہ سے گاؤں والوں نے پولیس سے دوری اختیار کر رکھی تھی۔

(گاؤں کے لوگ اکثر سر جوڑ کر کسی نہ کسی جگہ بیٹھ جاتے اور آپس میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرنے لگتے انہیں ہر وقت فکر رہنے لگی تھی کہ نہ جانے اب کس پر کٹھن وقت آن پڑے اور وہ موت کے منہ میں چلا جائے۔ یہ بات تو ان کے دماغ میں بیٹھ گئی تھی کہ کوئی نہ کوئی کارن ضرور ہے کہ اس طرح جوان مر رہے ہیں اور وہ بھی ایک ہی جگہ پر ان کی موت انہیں کھینچ کر لے جاتی ہے۔ برگد کا درخت اور پرانا مندر کے پاس۔

کسی نے یہ بھی کہا کہ "لگتا ہے ماتا ہم گاؤں والوں سے ناراض ہو گئی ہے۔" پھر یہ بات طے کی گئی کہ ماتا کے چرنوں میں دو عدد کالے بکروں کی بھینٹ دی جائے اور ماتا سے غلطیوں کی معافی مانگی جائے۔ لہٰذا گاؤں والوں نے تھوڑے تھوڑے ہندو برادری سے پیسے جمع کئے۔ لوگوں نے بڑھ چڑھ کر ماتا کے نام پر دان دیا۔ اتنے پیسے جمع ہو گئے کہ دو کے بجائے تین کالے بکرے آ گئے۔ گاؤں والوں کی خوشی دیکھنے کے قابل تھی۔

گاؤں والوں نے پروگرام بنایا کہ کل چھوڑ پرسوں بکروں کی بھینٹ دی جائے۔ اور اس بات پر سارے گاؤں والے متفق ہو گئے۔

دوسرے دن گاؤں میں ایک عمر رسیدہ سادھو مہاراج آ گئے، وہ گاؤں میں داخل ہوئے تو انہوں نے آواز لگانی شروع کر دی۔ "بربادی! اس گاؤں پر منڈلا رہی ہے، بہت سارے موت کے منہ میں چلے جائیں گے، میں دیکھ رہا ہوں، یہاں پر موت نے اپنا ڈیرہ ڈال لیا ہے، مرنے والوں کا بچنا بہت مشکل ہے۔"

سادھو مہاراج کی بات سن کر گاؤں والے دہشت زدہ ہو گئے، زیادہ تر لوگوں پر لرزہ طاری ہو گیا، کچھ سہم کر رہ گئے، کچھ لوگوں پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا اور کچھ تو ایسے ہو گئے کہ کاٹو تو ان کے جسم سے خون نہ نکلے۔

سادھو مہاراج کو پیار محبت سے ایک جگہ بٹھایا گیا۔ ان کی آؤ بھگت کی گئی۔ ان کے آگے ہاتھ جوڑے گئے۔ ان کے آگے گاؤں والوں نے اپنے سر ٹیکے اور سادھو مہاراج سے کہا گیا۔ "سادھو مہاراج اس کشٹ کا کوئی تو اپائے ہوگا، آپ برائے مہربانی ہم

فقیر

ایک فقیر کسی آدمی سے۔ "تیس روپے اللہ کے نام پر دو۔ چائے پینی ہے۔"

آدمی۔ "چائے تو پندرہ روپے کی ہے۔"

فقیر۔ "معلوم ہے۔ گرل فرینڈ بھی ساتھ ہے۔ اس لئے۔"

آدمی۔ "فقیروں نے بھی گرل فرینڈ بنا لی ہے؟"

فقیر۔ "نہیں بلکہ گرل فرینڈ نے فقیر بنا دیا ہے۔"

(محمد عثمان علی۔ میاں چنوں)

گاؤں والے پر دیا کرتے ہوئے ہمیں اس کشٹ سے چھٹکارا دلوائیں۔ ہماری تو دن کا چین اور رات کا سکون برباد ہو کر رہ گیا ہے۔"

"جئے ماتا کی، جئے بھوانی کی، جئے درگا کی۔" سادھو مہاراج ان تین ناموں کا نعرہ لگا کر بولے۔ "اپائے ہو سکتا ہے اور تم گاؤں والوں کی جان بچ سکتی ہے۔ اس کے لئے تمہیں تین بکرے کالے اور ایک عدد دودھ دینے والی گائے دینی پڑے گی، اور ان جانوروں کو لے کر میں تمہاری جان چھڑا سکتا ہوں، موت سے، راکھشش موت کو بہت دور بھگا دوں گا، اگر تم لوگوں کو منظور ہے تو حامی بھرو، ورنہ میں اپنے راستے چلا جاؤں گا، اور تم لوگ آئے دن کسی نہ کسی بہانے مرتے رہو گے، جئے بھوانی۔" سادھو مہاراج نے ایک اور نعرہ لگایا اور مسکرا کر لوگوں کو دیکھنے لگے۔

مہاراج کے آگے فوراً ٹھنڈی لسی رکھی گئی اور پھر چند لوگوں نے ان کے پاؤں دبانے لگے۔ لوگوں نے کہا کہ مہاراج ہم ابھی مشورہ کر کے آپ کے چرنوں میں آتے ہیں۔"

مہاراج پاؤں پھیلا کر بیٹھ گئے اور اپنے پاؤں دبوانے لگے۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق لوگوں نے ترنت آپس میں مشورہ کیا اور دھڑا دھڑ پیسے جمع کرنے شروع کر دیئے۔ تین کالے بکرے تو پہلے ہی ان کے پاس موجود تھے۔ اور ان بکروں کی بھینٹ کالی ماتا کے مندر میں دینی تھی۔ مگر اب ان تینوں بکرے اور ایک گائے دودھ والی سادھو مہاراج کے سامنے پیش کر دی گئی۔ سادھو مہاراج تین کالے بکرے اور ایک تگڑی گائے دیکھ کر مسکرانے لگے اور بولے۔ "تم لوگ موت سے بچ گئے آج رات میں مندر میں جاپ کروں گا اور کل کا سورج طلوع ہونے سے پہلے پہلے موت کے راکھشش کو یہاں سے دور کر دوں گا اور تم لوگ ہنسی خوشی اپنی زندگی گزارنے لگو گے، گاؤں میں خوشحالی آ جائے گی، تم لوگوں کی فصلیں لہلہانے لگیں گی۔ کھیتوں میں غلے کا ڈھیر لگ جائے گا۔ تم لوگوں کی قسمت اچھی ہے کہ میں اس گاؤں میں آ گیا۔ ورنہ تم لوگوں کا حال آگے اور بہت برا ہوتا۔"

بہرحال گاؤں والے بہت خوش تھے کہ سادھو مہاراج موت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے اس گاؤں سے بھگا دیں گے، ایسی موت جو کہ آئے دن جوانوں کو اپنا نشانہ بنا رہی ہے۔

شام ہو گئی اور پھر شام کے بعد رات کا اندھیرا پورے گاؤں پر چھا گیا۔ سادھو مہاراج کو بھوجن کرایا گیا۔ اور پھر انہیں مندر میں پہنچا دیا گیا۔

سادھو مہاراج کو مندر کے ایک کمرہ میں بستر لگا دیا گیا۔ مندر میں چند ایسے کمرے بھی تھے کہ جن میں دور دراز سے آنے والے سادھوؤں، پنڈتوں اور مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا۔

سادھو مہاراج کو خوشی خوشی مندر کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس کے بعد اس جگہ موجود سارے لوگ سادھو مہاراج سے آشیرواد لے کر اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔

رات کے دو بجے کے قریب کسی نے جھنجھوڑ کر سادھو مہاراج کو گردن سے پکڑ کر اٹھا دیا۔ پورے کمرے میں چکا چوند روشنی پھیلی ہوئی تھی، خوف اور ڈر کی وجہ سے سادھو مہاراج کی گھگھی بندھ گئی تھی، ڈر کی وجہ سے سادھو مہاراج کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر کو ابل رہی تھیں۔ ان کی آواز ان کے حلق میں اٹک رہی تھی۔ "ماتا مجھے معاف کر دو، ماتا میں پاپی ہوں، ماتا میں لوبھی ہوں، ماتا میں نے لالچ میں آ کر تمہارے نام پر لوگوں کو دھوکا دیا، ماتا میں اسی وقت رات کے اندھیرے میں یہ گاؤں چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔ ماتا مجھ پر دیا کرو، ماتا تم دیالو ہو اور میں لوبھی پاپی ہوں۔" تعریف کرتے کرتے سادھو کی آواز گلے میں پھنس رہی تھی۔

کالی ماتا کی گرجدار آواز سنائی دی۔ "تو بہت بڑا پاپی ہے، تیرا پاپ دیا کے قابل نہیں، تجھ پر کرپا نہیں کر سکتی، تو نے جان بوجھ کر میرے نام پر لوگوں کو دھوکا دینے کا سوچا اور وہ بھی میرے ہی مندر میں عیش و آرام

سے رات گزارنے کے لئے آ گیا۔ تجھے پتا ہے گاؤں والوں نے وہ تین کالے بکرے میرے چرنوں میں بھینٹ دینے کے لئے لائے تھے، ارے پاپی! اگر میں نہ آتی تو تو ان بکروں اور گائے کو لے کر چلا جاتا۔ تو نے بہت بڑا پاپ کیا ہے، ناقابل معافی پاپ۔" اور پھر کالی ماتا کی آنکھوں سے چنگاریاں نکل کر سادھو کی طرف بڑھیں۔

چنگاریوں کا سادھو کے جسم سے ٹکرانا تھا کہ سادھو بے سدھ ہو کر زمین پر گر پڑا، پھر سادھو کا پورا وجود اوپر کو اٹھنے لگا اور پھر مجسم سادھو ہوا میں معلق ہو گیا۔ پھر اسی صورت سادھو کا جسم ہوا میں ہی معلق کمرے سے باہر کو نکل کر مندر کے سامنے موجود پیپل کے درخت کی طرف بڑھنے لگا۔ اور پھر پیپل کے درخت کے پاس پہنچ کر اوپر کو اٹھنا شروع ہو گیا۔ کافی اوپر جب پہنچ گیا تو نہ جانے کدھر سے ایک مضبوط رسی لہراتی ہوئی آئی اور سادھو کی گردن میں مضبوطی سے اس کا ایک سرا لپٹ گیا۔ اور اس کا دوسرا سرا ایک موٹی ٹہنی میں بندھ گیا۔ ایسا ہوتے ہی سادھو کا وجود جھولنے لگا کہ اچانک سادھو کی اذیت ناک اور کربناک دل و دماغ کو ماؤف کرتی فلک شگاف چیخ پوری فضا کو منتشر کر گئی۔

سادھو کی موت واقع ہو گئی تھی۔ سادھو کی چیخ اتنی کربناک اور زوردار تھی کہ مندر اور پیپل کے درخت کے قریب کے گھروں سے ہڑبڑا کر کئی لوگ باہر کو نکل آئے تو انہوں نے دیکھا کہ پیپل کے درخت پر اچھی خاصی روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس روشنی میں پیپل کے درخت پر سادھو کی جھولتی ہوئی لاش واضح طور پر نظر آ رہی تھی۔ سادھو کی جھولتی ہوئی لاش دیکھ کر لوگ مبہوت ہو کر رہ گئے، دہشت سے ان پر کپکپی طاری ہو گئی۔ لوگوں پر اس قدر دہشت سوار ہوئی کہ لوگ ڈر کر اپنے گھروں میں جا کر دبک گئے۔ نیند ان کی آنکھوں سے کوسوں دور ہو گئی تھی۔

ساری رات ان لوگوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں کاٹی۔ دن کا سورج طلوع ہوا تو پورے گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ دہشت اور خوف کی وجہ سے لوگوں کی نگاہیں پتھرا کر رہ گئی تھیں۔ کسی کے بھی دماغ میں یہ نہیں آ کے دے رہا تھا کہ بھلا یہ ہوا تو کیسے ہوا؟

سادھو نے ایسا کیوں کیا؟ جبکہ سادھو اچھا بھلا اپنے کمرے میں تھا، لوگ اس سے آشیرواد لے کر اپنے گھروں کو لوٹے تھے اور پھر عمر رسیدہ سادھو اتنی اونچائی پر پہنچا کیسے؟

گاؤں کے دو نوجوان بڑوں کے مشورے سے بھاگم بھاگ پولیس کو بلانے کے لئے تھانے پہنچے اور انہوں نے سادھو کی خودکشی کی کتھا تھانیدار کو بتادی۔ تین پولیس والے اور ایک داروغہ اپنی جیپ میں ان دونوں نوجوانوں کے ہمراہ گاؤں میں آ گئے۔

مندر کے پاس جیپ روکی گئی۔ اوپر لٹکتی ہوئی سادھو کی لاش کو دیکھ کر پولیس والے حیران ہو گئے کہ ایک عمر رسیدہ سادھو اتنے بڑے اور اونچے درخت پر چڑھا کیسے؟ درخت کی ساخت بتاتی تھی کہ ایک جوان اور مضبوط آدمی کا بھی اس درخت پر چڑھنا بہت مشکل تھا۔ پولیس والے اور گاؤں کے لوگ ابھی سادھو کی لاش دیکھ ہی رہے تھے کہ اچانک رسی کے ٹوٹنے سے لاش نیچے زمین پر دھڑام سے گر گئی۔ لاش کے نیچے گرتے ہی سادھو کا سر پھٹ کر بھیجا دور جا پڑا۔ لاش کی بہت بری حالت ہو گئی تھی اور چہرہ کو تو دیکھ کر لوگوں پر دہشت سوار ہو گئی۔ لوگوں میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ سادھو کی لاش کو نظر بھر کر دیکھ سکیں۔

داروغہ نے جلدی سے ایک شخص کے گھر سے چادر منگوائی اور جھٹ لاش پر چادر ڈال دی اور اس کے بعد داروغہ نے گاؤں کی ایک بیل گاڑی میں لاش کو اس پر ڈال کر پوسٹ مارٹم کے لئے بھجوا دیا۔

داروغہ نے چند کاغذی کارروائی کی، چند لوگوں کی گواہی لی اور انگوٹھے لگوا کر جیپ میں بیٹھ کر چلتا بنا۔

سادھو کی لاش دیکھ کر گاؤں والوں کی بہت بری حالت تھی۔ ہر کوئی یہی سمجھنے لگا تھا کہ اب ہمارا زندہ رہنا مشکل ہے۔ جب سادھو سنت جیسا آدمی نہیں بچا تو ہم

کس کھیت کی مولی ہیں۔ لوگوں نے مندر کے بعد اپنے گھروں میں بھگوان نام کا بھجن گانے شروع کر دیئے۔

اب تو لوگ برگد کے درخت کی طرف اور پیپل کے درخت کے قریب جانے سے بھی ڈرنے لگے تھے، اگر اس طرف کوئی کسی کام سے جاتا بھی تو اکیلا نہیں جاتا تھا۔ کئی لوگ مل کر ایک ساتھ ان دونوں درختوں کے پاس سے گزرنے لگے تھے۔

تینوں کالے بکرے لا کر مندر میں ماتا کے چرنوں میں بلی دی گئی اور گاؤں والے ہاتھ جوڑ کر کالی ماتا سے پرارتھنا کرنے لگے تھے، "ماتا ہم گاؤں والوں پر دیا کرو، ہماری غلطیوں کو معاف کر کے ہمیں شانتی دو۔"

خوف اور ڈر کی وجہ سے مندر میں ماتا کے چرنوں میں دان دکھشنا کا ڈھیر لگنے لگا۔ کھانے پینے کی چیزوں سے لے کر کپڑے لتے اور پیسے بھی لوگ ماتا کے چرنوں میں رکھنے لگے تھے۔ صبح شام رات دن ہر سمے جیسے ہی وقت ملتا وہ مندر میں پہنچ جاتے اور مندر میں بیٹھ کر کالی ماتا کے نام کا مالا جپنے لگتے تھے۔

چوتھے دن پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آ گئی۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ میں لکھا تھا کہ سادھو کی موت دہشت، خوف اور ڈر کی وجہ سے دل کی حرکت بند ہونے سے ہوئی، اس کے علاوہ کوئی اور کارن موت کا نہیں۔

رپورٹ کو جان کر لوگ اور بھی زیادہ حیرت میں پڑ گئے تھے کہ سادھو مہاراج کس چیز سے رات سے خوفزدہ ہو گئے اور وہ کون سی بلا تھی جس نے سادھو مہاراج کو دہشت زدہ کر دیا۔ سادھو مہاراج تو بہت پہنچے ہوئے تھے بھلا کسی سے کیسے ڈر سکتے تھے؟ خیر جتنے منہ اتنی باتیں، پورا گاؤں حیرت زدہ، خوفزدہ اور بیاکل تھا کہ اب نہ جانے کیا ہو جائے۔

سادھو کی موت نے لوگوں کو اور بھی سہما کر رکھ دیا تھا۔ نحیف و ناتواں ایک ضعیف آدمی کو پیپل کے درخت پر اوپر چڑھنا، یہ بات لوگوں کے دماغ میں بالکل بھی نہیں آ رہی تھی اور سونے پر سہاگہ یہ کہ جب پولیس آ گئی تو خود بخود درخت سے رسی ٹوٹ کر لاش کا نیچے گرنا، یہ دماغ میں آنے والی بات نہیں تھی۔

بڑے بوڑھے جب ایک جگہ سر جوڑ کر بیٹھتے اور یہ موضوع چھڑ جاتا تو لوگ طرح طرح کے اپنے خیالات کا اظہار کرتے، کوئی بھی حتمی اور اٹل بات نہیں کہہ پاتا، اور پھر سب سے زیادہ خوف والی بات یہ تھی کہ جو بھی مرتا وہ کسی نہ کسی بہانے برگد کے درخت کے پاس ضرور جاتا۔ اب تو لوگوں کا یہ خیال اٹل ہو گیا تھا کہ ہو نہ ہو برگد کے درخت پر کسی بھٹکی ہوئی خونی آتما کا بسیرہ ہو گیا ہے۔

اس بات کو حتمی شکل دیتے وقت یہ بات بھی دماغ میں آ جاتی کہ کالی ماتا کا مندر اس جگہ موجود ہے اور ایسا کسی جوگ میں ہو نہیں سکتا کہ دیوی دیوتاؤں کے مندر کے پاس کوئی بھٹکی ہوئی آتما بسیرا کر لے اور پھر وہ آتما لوگوں کی بھینٹ لینا شروع کر دے۔ اگر مندر سے ہٹ کر برگد کا درخت ہوتا تو ایسا ہو سکتا تھا کیونکہ اکثر ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ بڑے پرانے برگد یا پھر پیپل کے درخت پر کوئی آتما بسیرا کر لیتی ہے۔

اور پھر دوسرا اچنبھے میں ڈالنے والا واقعہ سادھو کی خودکشی پیپل کے درخت پر، وہ بھی مندر کے سامنے، چونکہ سامنے مندر تھا اس لئے کوئی خونی آتما اس درخت پر آ نہیں سکتی۔

"تو پھر آخر یہ سب ہے کیا؟" لوگوں کا دماغ چکرا کر رہ جاتا۔ بہرحال پورا گاؤں سہما ہوا تھا۔ دن ہی دن میں لوگ اپنے سارے کام نمٹا لیتے اور سرِ شام ہی اپنے گھروں کے دروازے بند کر کے کمروں میں دبک کر رہ جاتے۔

گنیش کے باپو جی رام پرشاد گاؤں کے مکھیا تھے۔ آئے دن گاؤں کے چند افراد ان کے پاس جاتے اور دست سوال بن جاتے۔ "مکھیا جی اب آپ ہی کچھ کریں، یہ کب تک چلے گا اور ایسا کب تک ہوتا رہے گا۔ آپ ہم لوگوں سے زیادہ بدھی مان ہیں کوئی اپائے کریں، کسی سیانے یا کسی پہنچے ہوئے سے رابطہ کریں کہ

گاؤں والوں کی جان جو سولی پر لٹکی ہوئی ہے اس سے شانتی ملے۔

یہ سن کر رام پرشاد پریشانی سے اپنے ماتھے پر اپنا ہاتھ پھیرنے لگتے اور بولتے۔ ''بھائیو! اس گاؤں کے سارے لوگ میری نظر میں بڑی مان ہیں، میں کسی کو بھی بے عقل نہیں سمجھتا، جنم جنم سے ہم ساتھ رہتے ہوئے آرہے ہیں، میرے اور آپ لوگوں کے باپ دادا نے کبھی ایسا کچھ نہیں دیکھا اور نہ ہی کوئی ایسا خونی واقعہ ان کے سامنے آیا۔ میری پہنچ بھی وہیں تک ہے، جہاں تک کہ آپ لوگوں کی ہے، میں اس واقعے کا ذکر اپنے کئی جاننے والوں سے کر چکا ہوں اور کہہ بھی دیا ہے کہ اگر ان کی نظر میں کوئی زیادہ پہنچا ہوا، مہاپرش ہے تو ہمارے گاؤں لے کر آئیں یا خبر دیں ہم اس کے پاس جا کر پاؤں پڑ جائیں گے۔ اس مہاپرش کو ہم ہر حال میں اپنے گاؤں میں لے آئیں گے اور پھر وہ یہاں آکر یہ پتا لگائے کہ گاؤں میں ایسا کیوں ہو رہا ہے؟

بھائیو! اس گاؤں میں ہم جتنے لوگ بھی رہتے ہیں ہم ایک پریوار کی طرح ہیں، ایک دوسرے کا دکھ ہم سب کا دکھ ہے، گاؤں کے ہر دکھ سکھ میں ہم لوگ برابر کے شریک رہتے ہیں، میں نے آج ہی اپنے ماما کے گاؤں میں یہ خبر بھیجی ہے۔ سنا ہے کہ وہاں مندر میں ایک پنڈت جی ہیں جو کہ اپنے علم میں مہان ہیں، اب ان کی عمر زیادہ ہو چکی ہے۔ مگر میں نے کہا کہ ہم خود ان کے پاس جائیں گے اور انہیں گھوڑا گاڑی یا پھر بیل گاڑی پر لے آئیں گے اور میں نے یہ بھی کہا ہے کہ وہ اپنے علم سے یہ معلوم کریں کلہ یہ معاملہ کیا ہے؟

اب میں کیا بتاؤں ہمارا اپنا بیٹا اپنے دوستوں کی موت کو دیکھ کر خوف سے سہم گیا ہے۔ ایسے ہو گیا ہے جیسے کہ مہینوں کا بیمار ہو، ہر وقت سہما سہما رہنے لگا ہے، اگر کسی وقت اکیلا ہو تو بھاگ کر اپنی ماتا، بھائی بہنوں یا پھر میرے پاس آجاتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ ''باپو جی مجھے اکیلے میں ڈر لگنے لگا ہے، آپ لوگ مجھے اکیلا نہ چھوڑیں نہیں تو وہ آتما مجھے بھی مار دے گی۔ میں کئی مرتبہ اس آتما کو خواب میں دیکھ چکا ہوں۔ وہ آتما میرے پاس آکر میرے چاروں اور چکر لگاتی ہے اور اس کی آنکھوں سے لال رنگ کی چنگاریاں نکلنے لگتی ہیں۔ اس آتما کے ہاتھ لمبے ہو جاتے ہیں اور پھر اس کے ہاتھ کے ناخن بڑھ جاتے ہیں۔ ایسی حالت میں آتما کا رنگ کالا بھجنگ ہو جاتا ہے۔ پھر وہ چیخنے لگتی ہے اور بولتی ہے۔ ''چل میرے ساتھ، میں تجھے لینے آئی ہوں، آرام سے میرے ساتھ چلا چل، نہیں تو میں تجھے گھسیٹ کر لے جاؤں گی۔ ہر حالت میں تجھے میرے ساتھ چلنا ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت تجھے نہیں بچا سکتی مجھ سے۔''

سنیل کی موت کے بعد تو وہ اور بھی ڈر گیا ہے۔ اب تو ایسا لگنے لگا ہے کہ اس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں۔ میں اسے حکیم صاحب کے پاس لے گیا تھا۔ حکیم صاحب کا کہنا ہے کہ ''یہ بہت تیزی سے اندرونی طور پر کمزور ہو رہا ہے۔ اب کل ہی کی بات ہے کہ خوف زدہ ہو کر بے تکی باتیں کرنے لگا۔ میں تو ایسے ہی بہت پریشان ہوں، گاؤں والوں کی حالت کو دیکھ کر میں اسے منع کرتا رہا، اسے ڈھارس دیتا رہا۔ ''بیٹا تو جوان ہے، طاقتور ہے، مرد بن، کیوں بچوں کی طرح ڈر رہا ہے، مگر وہ مانا نہیں میں نے غصہ سے اسے ایک تھپڑ دے مارا۔ اس کے بعد وہ بچوں کی طرح دہاڑیں مار کر رونے لگا اور بولا۔ ''باپو جی! میں مر جاؤں گا...... کسی صورت بھی وہ آتما مجھے نہیں چھوڑے گی۔ وہ ایک آتما ہے جس نے میرے تینوں دوستوں اور پھر سادھو مہاراج کو مارا ہے۔ آپ مجھے بچا لیں...... مجھے خاص طور سے رات میں بہت ڈر لگتا ہے۔''

بھائیو! اب آپ لوگ اندازہ کریں کہ میں کس قدر دکھی ہو گیا ہوں۔ جس کا جوان پتر اس حالت کو پہنچ جائے اور وہ خود اپنی موت کے بارے میں بتائے تو اس کے باپ کے دل پر کیا گزر سکتی ہے۔ میں تو خود اتنا بیاکل ہوں کہ کوئی مجھ سے ہزاروں لے لے اور اس بھیانک حالت سے مکتی دلا دے!!''

''کھیا جی! آپ پر بھگوان دیا کرے اور ہم تمام گاؤں والوں کو سکھ شانتی دے۔'' یہ کہتے ہوئے لوگ واپس آگئے اور اپنے اپنے گھروں میں بھگوان سے پرارتھنا کرنے لگے۔

دن ڈھل گیا۔ شام کے بعد رات آگئی۔ ہر طرف گھٹا ٹوپ اندھیرے کا راج ہو گیا۔ رات کا ڈھائی کا پہر تھا کہ اچانک کھیا جی کے باڑے میں بندھے ہوئے بیل ڈکرانے لگے۔ بیل اس قدر زوردار آواز میں ڈکرا رہے تھے کہ پاس پڑوس کے گہری نیند میں سوئے ہوئے لوگ نیند سے بیدار ہو گئے اور گھروں میں ششدر ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ ''اتنی رات گئے کھیا جی کے بیل گلا پھاڑ کر کیوں ڈکرا رہے ہیں۔'' قرب و جوار کے لوگوں کے دماغ میں یہی سوال تھا۔

بیل تھے کہ چپ ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ ان کا ڈکرانا ایسا تھا کہ جیسے انہیں زبردست طور سے تکلیف پہنچ رہی ہو۔ وقفے وقفے سے ایسا بھی لگتا کہ جیسے ان کے گلے پر چھری چلائی جا رہی ہو۔ کھیا جی! بھاگتے ہوئے باڑہ میں آئے، لالٹین ان کے ہاتھ میں تھی۔

اس دوران پاس پڑوس کے اور بھی چند لوگ آگئے اور کھیا جی کے ساتھ باڑے کے دروازے پر پہنچ گئے۔ آنے والے دو لوگوں کے ہاتھ میں بھی لالٹین تھی۔ کھیا جی نے جیسے ہی درواز کھولا تو وہ سب چکرا کر رہ گئے۔ بیل کھونٹے پر مضبوط رسیوں سے بندھے پڑے تھے اور بری طرح پچھلی ٹانگوں سے اچھل رہے تھے، بیلوں کی زبانیں باہر کو نکلی پڑی تھیں اور چاروں بیل ڈکرائے جا رہے تھے۔ لوگوں نے اندازہ لگایا کہ بیل ناقابل برداشت تکلیف سے ڈکرا رہے ہیں۔

ایک بڑی جسامت کی خونخوار کالی بلی بیلوں کے سامنے چبوترے پر بیٹھی تھی، ایسا دلخراش منظر جس نے لوگوں کی عقل سلب کر دی تھی، اس منظر کو دیکھ کر لوگوں کی آنکھیں پتھرا کر رہ گئی تھیں۔ وہ تو بڑے دل گردہ کے لوگ تھے اور اگر کمزور دل کے مالک ہوتے تو وہ حواس باختہ ہو کر الٹے پاؤں اس جگہ سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ ایسا دل دہلا دینے والا منظر تھا کہ لوگوں کے دل دہل کر رہ گئے تھے۔ ایسا خوفناک اور بھیانک منظر انہوں نے اپنی زندگی میں نہ دیکھا تھا اور نہ ہی کبھی کسی سے سنا تھا۔

بلی کی آنکھوں سے سبز رنگ کی چنگاریاں سی روشنی نکل کر بیلوں کی آنکھوں میں پڑ رہی تھی۔ بیل تھے کہ ان چنگاریوں کے آنکھوں میں پڑتے ہی کرب و اذیت سے اچھل رہے تھے۔ کسی بیل میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ اپنا منہ کسی اور طرف کر لے۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی مرئی اندیکھی طاقت نے بیلوں کا سر پکڑ کر چنگاریوں کی سیدھ میں کر رکھا ہو۔ اس جگہ موجود سارے لوگ بھی جیسے ٹرانس میں آکر مبہوت ہو کر رہ گئے تھے کہ اچانک دل دہلا دینے والی بلی کی فلک شگاف خونخوار چیخ پورے باڑہ میں گونج گئی کیونکہ اب بلی نے آنے والے لوگوں کو دیکھ لیا تھا۔

اب بلی کی آنکھوں سے سبز روشنی کی جگہ سرخ رنگ کی چنگاریاں نکلنے لگی تھیں۔ بلی بدستور خوفناک طریقے سے غرا رہی تھی۔ اس کی جسامت اتنی بڑی تھی کہ وہاں پر موجود لوگوں نے اتنی بری بلی اپنی زندگی میں نہیں دیکھی تھی۔

چند ساعت بلی غراتی رہی پھر اچانک اس نے چھلانگ لگائی اور ایک بیل کی پیٹھ پر جا بیٹھی۔ بلی کا بیل کی پیٹھ پر بیٹھنا تھا کہ کرب و اذیت سے دوچار ہو کر بیل نیچے کو گرتا چلا گیا۔ اور پھر پچھاڑ کھاتے ہوئے بہت زور سے ڈکرا کر ٹھنڈا ہو گیا۔ باقی تینوں بیل جیسے ساکت و جامد ہو چکے تھے۔ بیل کے نیچے گرتے ہی بلی آنکھوں سے اوجھل ہو کر غائب ہو چکی تھی۔

اچانک جیسے کھیا رام پرشاد کو ہوش کا جھٹکا لگا اور وہ جھٹ دوڑ کر بیل کے پاس پہنچے مگر بیل اپنی زندگی ہار کر نیچے گرا ہوا تھا۔ ان کے پیچھے اس جگہ موجود لوگ بھی آگے کو بڑھے مگر سب نے بیل کی ابتر حالت دیکھ کر سکتے میں آگئے تھے۔ کھیا جی کی آنکھیں جیسے پتھرا گئی تھیں، ان کی نظروں کے سامنے ان کا مہنگا بیل مر چکا تھا۔

سب لوگ ایک دوسرے کو ٹکر ٹکر دیکھ رہے تھے،

کسی میں ہمت نہیں تھی کہ وہ ایک دوسرے سے پوچھیں کہ "یہ سب کیسے ہوگیا؟"

"مرگیا!!" کھیا جی کے منہ سے صرف اتنا ہی نکلا۔ پھر ان کے منہ سے نکلا۔ "بھگوان ہم پر کرپا کر۔" اور ان کا سرغم کے بوجھ سے جھک گیا۔ ایک شخص نے ان کے کندھے پر ہاتھ رکھا تو جیسے انہیں ہوش آ گیا۔ وہ کھڑے ہوگئے اور بے کسی کی حالت میں لوگوں کی طرف دیکھا۔ کسی کی بھی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب ہوا کیا۔

وہ خونخوار بلی کون تھی؟ اس کی آنکھوں سے پہلے سبز رنگ کی چنگاریاں، پھر سرخ رنگ کی چنگاریاں نکلنے لگیں، اس کا بیل پر چھلانگ لگا کر پیٹھ پر سوار ہونا، اس کے بعد بیل کا اذیت کی حالت میں نیچے گرنا اور پھر فوراً اس بیل کا مرجانا، یہ سب کتنے اچنبھے کی بات تھی۔

بہرحال کھیا جی نے ایک شخص سے کہا۔ "رگھو! باقی تین بیلوں کو یہاں سے ہٹا کر دوسری طرف باندھ دو، نہیں تو یہ بیل اس مردہ بیل کو دیکھ کر مزید پریشان ہوں گے۔"

رگھو کے ساتھ دو شخص اور بھی لگے اور انہوں نے تینوں بیلوں کو کھول کر اس جگہ سے تھوڑے فاصلے پر دوسری طرف لے جا کر باندھ دیئے۔ اس کے بعد کھیا جی نے ایک جلتی ہوئی لالٹین باڑے میں لٹکا دی۔ اور لوگوں سے بولے۔ "یہاں سے چل کر باہر بیٹھتے ہیں۔"

دیگر کل چھ افراد تھے کھیا جی کے علاوہ۔ سب کے سب باڑے سے باہر نکل کر چار پائیوں پر بیٹھ گئے۔

کھیا جی! کیا آپ کی بدھی میں کوئی بات آئی ہے کہ یہ سب کیا ہے؟ ہم سب تو یہ سوچ سوچ کر ہلکان ہوگئے ہیں۔" ایک شخص بولا۔

میرا دماغ تو یہ سب سوچ سوچ کر اب سنسنانے لگا ہے۔ اندرونی طور پر میں خود بھی کپکپانے لگا ہوں، یہ نہیں کہ مجھے ڈر لگ رہا بلکہ یہ سوچ کر کے گاؤں والے ہر روز ایک نئی مصیبت سے دوچار ہو رہے ہیں۔ میرے دماغ میں تو بس یہی بات آ رہی ہے کہ گاؤں میں کوئی خونی آتما گھس آئی ہے اور طرح طرح سے یہ خونی کھیل کھیل رہی ہے اور اگر اس کا روک تھام نہ کیا گیا تو......"

اور کھیا جی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

کھیا جی! پھر کیا اپائے کیا جائے، ہر اچھے اور برے کا کوئی نہ کوئی تو حل ہوتا ہے۔" رگھو بولا۔

"ہاں! رگھو ہوتا تو ہے، مگر جس تیزی سے گاؤں کے لوگ مر رہے ہیں، یہ دیکھ کر تو ہر آدمی حال سے بے حال ہوگیا ہے۔" کھیا جی بولے۔

جو بھی حالات واقعات ہو رہے ہیں وہ نہ تو اتفاق کہلا سکتے ہیں اور نہ ہی کوئی جادو ٹونا ہوسکتا ہے، جادو ٹونا اس قدر سرچڑھ کر نہیں بولتا۔ یہ سراسر کسی خونی آتما کا کیا دھرا ہے۔ ابھی جو کچھ بھی ہوا ہے وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہوا ہے۔ وہ بلی کوئی عام بلی نہیں تھی۔ کسی عام بلی کی آنکھوں سے سبز اور لال چنگاریوں کا نکلنا اور پھر اچانک اس بلی کا چھلانگ لگا کر بیل کی پیٹھ پر بیٹھتے ہی، اس بلی کا سینکڑوں من وزنی ہو جانا جس سے اتنا تگڑا بیل پلک جھپکتے ہی نیچے کو بیٹھتا چلا گیا اور پھر نیچے گرتے ہی اس کا مرجانا، یہ عام بات نہیں بلکہ ناقابل یقین ہے۔" کھیا جی نے کہا۔ اور وہاں پر موجود لوگوں پر انہیں نظریں مرکوز کر دیں۔"

"جی کھیا جی! آپ کی باتیں سو فیصد ٹھیک ہیں۔" ایک شخص نے کہا۔

"حل تو یہی ہوسکتا ہے کہ ہم پورے گاؤں کے لوگ ایشور کے آگے ماتھا ٹیک دیں اور گڑگڑا کر اپنی غلطیوں کی معافی مانگیں۔ چلو مانتے ہیں کہ چند لوگ قصوروار ہوں گے، یعنی انہوں نے ایشور کی نافرمانی کی ہوگی اور سارا گاؤں دکھ جھیل رہا ہے۔" کھیا جی نے کہا۔

اس جگہ موجود سارے لوگ اور کھیا جی طرح طرح کی باتیں کرتے رہے اور انہیں سمے کا پتہ نہ چلا اور پھر صبح کا اجالا چاروں اور پھیل گیا۔ تو وہ لوگ اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے تاکہ اپنے اپنے کام کاج کو نمٹا سکیں۔

کھیا جی نے گاؤں میں موجود کئی چماروں کو بلا

بھیجا۔ تھوڑی دیر میں ہی تین چمار بھاگے ہوئے آئے اور کھیا جی کے سامنے جھکتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر پرنام کیا اور پھر ان میں سے ایک بولا۔ "مائی باپ خیر تو ہے، آپ نے صبح ہی صبح ہمیں بلا بھیجا۔"

"ارے خیریت نہیں ہے، ہمارا ایک بیل رات سے مرگیا، باڑے میں پڑا ہے، اسے اٹھا کر لے جاؤ، گاؤں سے باہر جنگل میں، کھال اتار لینا، اور پھر کھال کو بیچ کر تم لوگ آپس میں روپے بانٹ لینا۔ بیل کو تو چند منٹ میں ہی گدھ نوچ کر چٹ کر جائیں گے، اس کے بعد ہڈیوں کو جنگل میں گڑھا کھود کر دبا دینا۔ بس یہی کام ہے۔" کھیا جی نے کہا۔

"جی سرکار! جیسا آپ بول رہے ہیں ایسا ہی ہوگا۔" ان تینوں نے کہا اور پھر اس مرے ہوئے بیل کو ایک بیل گاڑی میں ڈال کر جنگل کی طرف لے گئے۔

کھیا جی بیل کے مرنے سے بہت اداس تھے کیونکہ ان چاروں بیلوں کی جوڑی بہت زبردست تھی اور وہ تھے بھی بہت مہنگے۔ ان کا دل نہیں کرتا تھا کہ کچھ کھائیں پیئیں، بہرحال زندہ رہنے کے لئے تو کھانا ہی پڑتا ہے۔ ان کے گھر والے بھی بہت پریشان تھے۔ سب سے بڑی پریشانی گنیش کی تھی جو ڈر کی وجہ سے دن بدن گھلتا جا رہا تھا۔

کھیا جی نے اپنے ماما کے گاؤں میں موجود مندر کے پنڈت جی کو خبر بھیجی تھی کہ "پنڈت جی آپ بتائیں کہ یہ معاملہ کیا ہے؟ اور اس سمسیا کا حل کیا ہے؟ تو پنڈت جی نے کہلا بھیجا تھا کہ یہ بہت گمبھیر سمسیا ہے اور یہ اتنی آسان بات نہیں، جان جوکھوں کا کام ہے اور آج کل میں ایک بہت بڑے جاپ میں مصروف ہوں، میرے پاس وقت نہیں اور ویسے بھی میں کافی بوڑھا ہو چکا ہوں، اب مجھ میں اتنی طاقت نہیں کہ اتنا بڑا کام کرسکوں، کیا ہی اچھا ہو کہ آپ کسی اور کا انتظام کرلیں۔"

پنڈت جی کا انکار سن کر کھیا جی بہت افسردہ اور غمگین ہوگئے۔ ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ اس مصیبت سے گاؤں والوں کو چھٹکارا دلوا دیں۔ خیر انسان جب بے بس ہو جاتا ہے تو وہ اوپر والے کی طرف دیکھنا شروع کر دیتا ہے اور یہی حال گاؤں کے سارے لوگوں کا تھا۔

اب اماوس کی راتیں شروع ہو چکی تھیں۔ سرشام ہی پورے گاؤں پر مہیب اندھیرا مسلط ہو جاتا تھا۔ چونکہ گاؤں والے بہت زیادہ خوفزدہ تھے لہٰذا سرشام ہی اپنے اپنے گھروں میں بند ہو جاتے تھے۔

رات دس بجے کھیا جی اپنے گھر کے بیٹھک میں گئے تاکہ اگر گنیش سو چکا ہو تو اسے جگا کر اندر کمرے میں لے آئیں۔ جب وہ بیٹھک میں گئے تو گنیش بیٹھک میں موجود نہیں تھا۔ انہیں تشویش ہوئی کہ اس وقت کہاں جا سکتا ہے؟ پاس پڑوس میں بھی انہوں نے اسے دیکھا، اب تو ان کا دل دھڑکنے لگا کیونکہ ان دنوں گنیش گھر کے علاوہ کہیں جاتا بھی نہیں تھا۔

وہ اپنے پڑوسی کو ساتھ لے کر باہر نکلے، اس پڑوسی کے ہاتھ میں لالٹین تھی اور کھیا جی کے ہاتھ میں ایک بڑا اور مضبوط لٹھ تھا۔ گنیش کے لئے وہ بہت زیادہ پریشان ہوگئے تھے۔ قرب و جوار میں ان دونوں نے سب سے پوچھ لیا مگر گنیش کا کہیں بھی پتہ نہیں تھا۔ "اب کیا کریں؟ کہاں ڈھونڈیں؟ ہر جگہ تو دیکھ لیا۔" اتنی دیر میں مزید کئی لوگ کھیا جی کے ساتھ ساتھ پھرنے لگے

تعلیمات قرآن

برطانوی رکن اسمبلی موسیو بیرک نے برطانوی پارلیمنٹ میں کہا: "بے شک تاریخ جن قوانین کو جانتی ہے ان میں سب سے زیادہ محکم، زیادہ قابل فہم اور زیادہ رحم والی تعلیمات قرآن کریم کی ہیں۔"

(The Magnificence of the Qur`an Page 82)

(ایس حبیب خان۔ کراچی)

تھے۔ وہ سب ملا کر تقریباً پندرہ کے قریب لوگ تھے۔

ان میں سے ایک بولا۔ ''سب جگہ تو دیکھ لیا، کہیں وہ برگد کے درخت......'' اور اس نے بات ادھوری چھوڑ دی کیونکہ اب اس میں ہمت نہیں تھی کہ کوئی بات اپنی زبان سے نکالے۔

برگد کے درخت کی بات سن کر لوگوں پر جیسے سکتہ طاری ہوگیا اور کھیا جی کی تو ٹانگیں کپکپانے لگیں، سارے لوگوں کے دل و دماغ پر خوف سوار ہو چکا تھا۔ بہرحال ایک شخص بولا۔ ''چلو چل کر اس طرف بھی دیکھ لیتے ہیں۔'' ''ہاں...... ہاں...... چلو...... چل کر دیکھنے میں کیا ہے۔'' ایک دوسرا بولا۔

گاؤں دیہات میں ایک بات اچھی ہے کہ جب لوگ گھر سے رات برات نکلتے ہیں تو اپنے ہاتھ میں مضبوط لٹھ ضرور رکھتے ہیں۔ اس وقت بھی لوگوں کے پاس ان کے اپنے لٹھ تھے۔ ان لوگوں کے قدم برگد کے درخت کی جانب اٹھنے لگے۔ چھ لوگوں کے ہاتھوں میں جلتی ہوئی لالٹین بھی موجود تھی۔

جب سارے لوگ بھگوان بھگوان کرتے ہوئے پرانے مندر کے قریب برگد کے درخت کے پاس پہنچے تو سب کا کلیجہ دھک دھک کرنے لگا، تھوڑی دور سے ہی انہوں نے بھانپ لیا تھا کہ کوئی ہے جو برگد کی جڑ کے پاس برگد کے درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا ہے کیونکہ بیٹھنے والے نے سفید کپڑے پہن رکھے تھے۔

اور جب سارے لوگ بہت قریب گئے تو لوگوں کے جسم میں گردش کرتا خون جیسے اچانک منجمد ہوکر رہ گیا۔ ان کی آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں۔ دماغ ماؤف ہوگیا، ٹانگیں جیسے کپکپانے لگیں، پندرہ کے پندرہ لوگ سہم کر رہ گئے تھے۔ اسی اثناء میں گنیش کے پتا تو غش کھا کر زمین پر گر گئے تھے۔ کیونکہ انہوں نے گنیش کو پہچان لیا تھا۔ گنیش کا سر دھڑ سے الگ ہوکر اس کے قریب ہی پڑا تھا جیسے کسی نے سر کو کھڑا کرکے رکھ دیا ہو، اور اس کا دھڑ برگد کے تنے سے ٹکا ہوا تھا۔

اچانک ایک الو اپنی کریہہ آواز نکالتا ہوا درخت پر سے کسی جانب پرواز کر گیا تو لوگ الو کی آواز سے جیسے چونک کر ہوش میں آ گئے۔

سب کے سب اپنا سر پکڑ کر اکڑوں بیٹھ گئے اور غور سے گنیش کی کٹی ہوئی گردن کو دیکھنے لگے۔ کئی لوگ گنیش کے پتا کی جانب لپکے مگر وہ تو حواس سے بیگانہ ہو کر بے ہوش پڑے تھے۔

گنیش کی گردن اور دھڑ کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ کسی وزنی تلوار یا پھر بھاری گنڈاسا نے کسی مضبوط آدمی نے ایک ہی وار سے دھڑ اور گردن کو الگ کر دیا ہو، گنیش کے دھڑ سے نکلتے خون کی وجہ سے اس کا سفید جوڑا بالکل سرخ ہو گیا تھا۔

بہت ہی ڈراؤنا اور ہیبت ناک منظر تھا۔ الو کی کریہہ چیخ نے لوگوں کو اور بھی سہا کر رکھ دیا تھا۔ لوگوں نے گنیش کے پتا کو بہت ہلایا جلایا، جھنجھوڑا اور منہ ناک تک بند کئے تاکہ ہوش آ جائے، مگر چند سیکنڈ کے لئے انہیں ہوش آتا اور پھر سے وہ اپنا حواس کھو بیٹھتے۔

''اب کیا کیا جائے؟ پوری رات تو یہاں نہیں بیٹھا جا سکتا۔'' ایک شخص بولا۔

''بھیا تمہاری بات بالکل ٹھیک ہے۔ لیکن کرا کیا جائے؟'' ایک اور نے کہا۔

''اسے تو بغیر چارپائی کے نہیں لے جا سکتے، چارپائی پر ڈالنا ضروری ہوگا۔'' ایک اور کی آواز سنائی دی۔

''ایسا کیا جائے کہ چند لوگ چل کر چارپائی لے آئیں، مگر چارپائی دو چاہئیں کیونکہ کھیا جی بھی اپنے پیروں سے چل کر نہیں جا سکتے، انہیں اپنے حواس قابو میں کرنے کے لئے تھوڑا سمے لگے گا۔'' کھیا جی کے پڑوسی نے کہا۔

بہرحال سب کی مرضی سے چار افراد اس جگہ سے گاؤں کی طرف چل پڑے، ان کے ہاتھ میں ایک لالٹین تھی، اور ان سے کہا گیا تھا کہ واپسی پر دو چار لوگوں کو اور بھی لیتے آئیں اور ساتھ میں دو چارپائی ضرور لائیں تاکہ ایک چارپائی پر گنیش کی لاش رکھی جائے اور دوسری پر

کھیا جی کو لٹا کر گاؤں لے جایا جائے۔

ڈر اور خوف کی وجہ سے اس جگہ موجود برگد کے درخت کے نیچے لوگوں کا پتا پانی ہوا جا رہا تھا۔ مگر مجبوری تھی، وہ لوگ اس حالت میں گنیش اور کھیا جی کو چھوڑ کر بھاگ نہیں سکتے تھے۔ سارے لوگ کوشش میں تھے کہ کھیا جی کو ہوش آ جائے، مگر آدھا گھنٹہ گزرنے کے باوجود بھی کھیا جی کو ہوش نہیں آ کے دے رہا تھا۔

ایک باپ کی نظروں کے سامنے جب اس کے جوان بیٹے کی لاش اس بری طرح کٹی پھٹی پڑی ہو تو اس باپ پر کیا گزر رہی ہے، وہ باپ ہی جان سکتا ہے، جوان اولاد کی لاش اس حالت میں دیکھنا ہر باپ میں ہمت بھی نہیں ہوتی۔ اور یہی حال گنیش کے پتا رام پرشاد جی کا تھا کہ وہ اپنے حواس پر قابو نہیں پا سکتے تھے۔

رات کا سمے یہ خوفناک گھٹا ٹوپ اندھیرا، اماوس کی راتیں، اور ویسے بھی جب اماوس کی راتیں شروع ہوتی ہیں تو نفسیاتی طور پر لوگ خوفزدہ ہو جاتے ہیں، کیونکہ لوگوں کا کہنا ہے کہ ان راتوں میں ہر طرح کی بلائیں، بھوت، چڑیل، آسیب، اور بھٹکی ہوئی آتمائیں اپنے مسکن اور ٹھکانے سے نکلتی ہیں اور آزادانہ طریقے سے دندناتی ہوئی نظر آتی ہیں اور اس سمے کوئی ان کے راستے میں آ جائے تو وہ اس شخص کا نقصان کئے بنا چھوڑتی نہیں ہیں۔ کئی دفعہ تو ایسا ہوتا ہے کہ وہ آتمائیں منش کو اذیت دے کر خوفناک طریقے سے اس کا جیون ختم کر دیتی ہیں۔ لہٰذا لوگوں کو حتیٰ الامکان کوشش ہوتی ہے کہ ایسے سمے لوگ رات برات اماوس کی راتوں میں دور دراز اور ویران جگہوں پر جانے سے کتراتے ہیں۔

خیر پچیس منٹ میں وہ چاروں افراد جو چارپائی لینے گاؤں کی طرف گئے تھے وہ آ گئے ان کے ساتھ اور بھی کوئی آٹھ دس کے قریب لوگ تھے چار کے ہاتھ میں لالٹین بھی تھیں۔ چار آدمیوں نے دو دو کرکے چارپائی اٹھا رکھی تھی۔ انہوں نے دونوں چارپائی زمین پر رکھ دی تو ایک چارپائی پر کھیا جی کو اٹھا کر لٹا دیا گیا اور دوسری چارپائی پر گنیش کا دھڑ اور سر رکھ دیا گیا۔ اور پھر دونوں چارپائی اٹھا کر لوگ گاؤں کی طرف چل پڑے۔ چند منٹ میں سارے لوگ کھیا جی کے گھر کے پاس پہنچ گئے۔

چارپائی نیچے رکھ دی گئی۔ جھٹ سے چند لوگ اپنے گھر سے دری لے آئے جس پر لوگ بیٹھ گئے۔ چند منٹ میں ہی گیس بتی کا انتظام ہوگیا۔ جلتی ہوئی، چار گیس بتی اس جگہ ایک میز پر رکھ دی گئیں، کھیا جی کے چہرے پر تابڑ توڑ پانی ڈال کر جھنجھوڑا گیا تو کسمسا کر انہوں نے اپنی آنکھیں کھول دیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گئے مگر ابھی بھی وہ حواس باختہ تھے۔ وہ سر جھکائے اپنی جگہ بیٹھے تھے اور ان کے گھر سے گھر والوں کی درد میں ڈوبی بین کرنے کی آوازیں لوگوں کا دل دہلانے لگیں۔

پورے گاؤں میں کہرام مچ گیا۔ اردگرد اور پاس پڑوس کی عورتیں رات سمے ہی کھیا جی کے گھر میں آنے لگیں۔ اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کا گھر عورتوں سے بھر گیا۔ اور باہر گاؤں کے سارے مرد حضرات آ کر بیٹھ گئے۔ سب کی آنکھیں نم تھیں، سب کی قوت گویائی جیسے سلب ہوکر رہ گئی تھی۔ سو، سوا سو کے قریب لوگ دری پر بیٹھے تھے مگر سب کی زبان گنگ تھی، ہر آدمی اپنی جگہ جیسے بت بنا بیٹھا تھا۔ سب کی گردنیں نیچے کو جھکی پڑی تھیں اور دماغ میں ان گنت سوالات تھے مگر کسی کے پاس بھی ان سوالات کے جوابات نہیں تھے۔ کہ یہ سب اچانک کیسے اور کیوں ہوگیا؟

غم اور صدمے کی رات ویسے بھی پہاڑ بن جاتی ہے۔ کسی جگہ بھی اس حالت میں بیٹھے ہوئے لوگ پل پل گن کر وقت گزارتے ہیں مگر وقت ہوتا ہے کہ گزرنے کا نام نہیں لیتا اور اس کے مقابلے میں ناچ گانے اور خوشی کی رات پلک جھپکتے گزر جاتی ہے۔ لوگوں کو احساس تک نہیں ہوتا کہ کب رات گزر گئی اور اچانک صبح کا سپیدہ پھیل گیا۔ جہاں غم اور صدمہ ہو اس جگہ لوگ صرف اور صرف اپنی ذات میں مقید ہوتے ہیں، غم کی وجہ سے کوئی کسی سے بات تک نہیں کرتا، لوگ اپنی اپنی سوچوں میں پڑے ہوتے ہیں۔ بہرحال رات غم کی ہو یا خوشی کی

گزر ہی جاتی ہے۔

رات گزر گئی۔ اب تک کھیا جی کو بالکل ہوش آچکا تھا۔ ان کے حواس بحال ہو چکے تھے، مگر وہ بالکل چپ تھے جیسے کہ پتھر کے بت ہوں، گنیش سے بڑا بھائی بھاگ دوڑ کرنے لگا۔ کئی گھروں سے فنافٹ چائے بن کر آ گئی۔ دل تو کسی کا بھی نہیں چاہتا تھا کہ وہ چائے پئیں مگر دل مار کر لوگ چائے پینے لگے۔ لاش کی حالت بہت خراب ہونے لگی تھی۔ سارا بدن سیاہ پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ لہٰذا جلدی جلدی کر کے کریا کرم کر دیا گیا۔ چتا کے شعلے بلند ہوتے ہی گنیش کے پتا جی کا کلیجہ جیسے پھٹنے لگا۔

''لوگو! میرا گنیش مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔ پتر! میں تیری یادوں کا بوجھ کیسے سنبھال پاؤں گا، ارے اسی سال تیرا لگن ہونا تھا، تم دو ہی بھائی تھے، میرے دو بازو تھے، تو چلا گیا، اب تو میرا ایک بازو کٹ گیا، میں تو اب اپنا بوجھ بھی نہیں اٹھا پاؤں گا، بھگوان! تو نے مجھے چھوڑ دیا، ارے گنیش کے بدلے مجھے اٹھالیتا۔''

رام پرشاد جی زار و طار رونے لگے تھے، کئی لوگوں نے انہیں سہارا دے رکھا تھا۔ چتا کے شعلے ٹھنڈے پڑ گئے تو لوگ واپس آ گئے۔

دو ماہ پہلے یہی گاؤں رامپور دلکش خوبصورتی اور جاذب نظر میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا اور اب پورا رامپور ویران اور اجاڑ نظر آتا تھا۔ جدھر نظر اٹھ جاتی عجیب قسم کی ویرانی نظر آتی تھی۔ بڑے اور عمر رسیدہ لوگ تمام خونی واقعات کو سوچ سوچ کر خون کے آنسو روتے تھے۔ مگر سب کے سب مجبور و بے کس تھے کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا، تمام اندازے، تمام سوچ، تمام اپائے، تمام کوششیں بے کار ثابت ہو گئی تھیں۔

مرنے والے چاروں دوست چندر، رامو، سنیل اور گنیش پکے دوست تھے، اکھڑ مزاجی، لوگوں پر دھونس جمانا ان کا شیوہ تھا۔ بڑوں کی تو عزت کرنا ان کے شریست میں شامل نہ تھی، وہ بہت زیادہ منہ پھٹ ہو گئے تھے۔ زیادہ تر وقت شراب کے نشے میں دھت رہنا ان کا شیوہ تھا۔ گاؤں بھر کی جوان لڑکیاں تو انہیں دیکھ کر لرزیدہ ہو جاتی تھیں۔ ہر جوان لڑکی کی کوشش ہوتی تھی کہ ان میں سے کسی کی نظر اس پر نہ پڑے۔

گاؤں میں اس طرح کے کئی کیس ہو چکے تھے۔ رات کے اندھیرے میں تین لڑکیاں ان کی ہوس کی بھینٹ چڑھ چکی تھیں۔ اس قسم کے معاملات وہ اندھیری رات میں کرتے تھے۔ اور ویسے بھی گاؤں دیہات میں چھوٹی چھوٹی چار دیواریاں ہوتی ہیں۔ جب زیادہ رات بیت جاتی اور لوگ گہری نیند میں غرق ہو جاتے، اس سمے وہ لوگوں کے گھروں میں کود جاتے اور لڑکی کا منہ دبا کر باہر لے جاتے اور پھر اپنی ہوس پرستی کو عروج پر پہنچا دیتے اور من مانی کرنے کے بعد لڑکی کا گلا گھونٹ کر مار دیتے، پھر اسے قریب کے جنگل میں گہرا گڑھا کھود کر دبا دیتے تھے۔

صبح ہوتے ہی لڑکی کو پورے گاؤں میں ڈھونڈا جاتا مگر لڑکی نہ ملتی۔ یہی نہیں چوری چکاری بھی ان کا کام تھا، کوئی اور چیز وہ چراتے نہیں تھے سوائے روپے کے، کیونکہ کوئی اور چیز چراتے تو وہ پکڑے جاتے۔ گاؤں میں جو بھی وارداتیں ہوتی تھیں لوگوں کا شک ان پر جاتا تھا۔ ان پر شک کرنے والے جو لوگ آگے آگے ہوتے تو وہ چاروں ان لوگوں کے ساتھ بھی رات کے اندھیرے میں چھپ کر کوئی ایسی کارروائی کر دیتے کہ وہ کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے اپنی زبان پر تالا لگا لیتے تھے۔ وہ نشہ کے عادی تھے اور پھر ہر کوئی جانتا تھا کہ وہ اوباش قسم کے جوان تھے۔

لوگوں کے ذہن میں یہ بات جڑ پکڑ چکی تھی کہ آخر یہ چاروں ہی کیوں یکے بعد دیگرے موت کا شکار ہوئے۔ چاروں کی موت الگ الگ طریقے سے اور پھر سب سے اہم بات جو کہ لوگوں کو اچنبھے میں ڈالتی تھی کہ ان چاروں کی موت کی جگہ بھی ایک ہی تھی۔ پرانا مندر کے قریب برگد کے درخت پر، یا درخت کے پاس۔

لوگوں کو تو یقین ہو چلا تھا کہ ہو نہ ہو ان چاروں نے کوئی ایسا پاپ ضرور کیا ہو گا جو کہ ناقابل معافی تھا۔

یہ اور بات ہے کہ ان کے پاپ یا ظلم کے کرتوتوں کا کسی کو علم نہ تھا۔ ابھی تک ان چاروں کے علاوہ کوئی اور اس آتما کا شکار نہیں بنا تھا۔ لیکن درمیان میں وہ سادھو بھی آ گیا تھا جس نے اس آتما سے ٹکر لینے کی بات کی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میں جاپ کر کے اس خونی آتما سے پورے گاؤں کو مکتی دلا دوں گا۔ اور اسی بنا پر وہ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا، ورنہ کوئی اور کارن نہ تھا کہ اس کے ساتھ ایسا کچھ ہوتا۔

جس رات گنیش کی موت واقع ہوئی تھی اور جب لوگ برگد کے درخت کے نیچے بیٹھے تھے تو انہوں نے واضح طور پر دیکھا تھا کہ رات کے اندھیرے میں مندر کے پیچھے والی جھاڑیوں کی جگہ سے ایک روشن ہیولہ اچانک نمودار ہوا، اور پھر وہ چکراتا ہوا مندر میں جا گھسا اور پھر تھوڑی دیر بعد وہ روشن ہیولہ مندر سے نکل کر مندر سے باہر چکراتا رہا۔ جسے دیکھ کر لوگوں کے اوسان گم ہونے لگے تھے۔ ایک تو گنیش کا قتل اور پھر اس ہیولے کا نمودار ہو کر مندر میں جانا اور پھر مندر سے نکل کر چند منٹ تک چکراتے رہنا ضرور کوئی بات تھی۔ اس کے بعد وہ ہیولہ دوبارہ مندر کے اندر چلا گیا اور پھر وہ تھوڑی دیر بعد باہر نکلا، اب واضح طور پر لوگ دیکھ سکتے تھے کہ وہ ہیولہ کسی عورت کا تھا۔

پھر وہ ہیولہ اس طرح چکرتا ہوا، جس جگہ اور جس طرف سے آیا تھا، اس جگہ جا کر آہستہ آہستہ زمین کے اندر گھستا چلا گیا۔

اب کھیا جی بھی ہوش و حواس میں تھے اور ویسے بھی مرنے والے کے ساتھ مرا نہیں جاتا۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب کوئی مرتا ہے تو اس کے قلبی اور خونی رشتے اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھتے ہیں اور جب مرنے والے کو آخری منزل تک پہنچا کر لوگ آتے ہیں تو کافی حد تک حواس باختہ اور غمزدہ لوگوں کو سکون مل جاتا ہے اور پھر اس کے بعد جب روٹی اس کے پیٹ میں جاتی ہے تو تقریباً تین حصہ غم کم ہو جاتا ہے، صدا سے یہی ہوتا آ رہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔

کھیا جی بھی آہستہ آہستہ اپنے کام کاج میں دلچسپی لینے لگے تھے، ہر وقت جاگتے سمے گاؤں کے چند افراد کھیا جی کے پاس بیٹھے ہی رہتے تھے۔ اور ادھر ادھر کی باتیں کر کے کھیا جی کا دل بہلاتے رہتے تھے۔ ایک دن شام کے بعد جب پاس پڑوس کے لوگ کھیا جی کے پاس بیٹھے تو اچانک ان کے پڑوسی رگھو کو اس رات والا واقعہ یاد آ گیا جس رات گنیش کا قتل ہوا تھا، رگھو نے من و عن وہ سب کچھ بیان کر دیا کہ کس طرح ایک روشن ہیولہ جھاڑیوں میں سے نمودار ہوا، اور پھر وہ چکراتا ہوا ماتا کے مندر میں گیا، اس کے بعد پھر وہ باہر نکلا، تھوڑی دیر تک باہر چکراتا رہا، اس کے بعد دوبارہ وہ ہیولہ مندر میں چلا گیا۔ پھر جب وہ باہر نکلا تو واضح طور پر نظر آیا کہ وہ ہیولہ کسی عورت کا تھا۔ پھر وہ چکراتا ہوا اس جگہ جا کر زمین کے اندر آہستہ آہستہ گھستا چلا گیا۔

اس بھیانک اور ڈراؤنے واقعے کو سن کر کھیا جی جیسے سن ہو کر رہ گئے۔ اس وقت کئی لوگ اور بھی موجود تھے۔ جنہوں نے رگھو کی بات کی تصدیق کی کہ واقعی ایسا ہوا تھا۔

کھیا جی بولے۔ ''ہیولے کا جھاڑیوں سے نکلنا اور پھر ماتا کے مندر میں جانا، پھر باہر نکل کر چکراتے رہنا پھر دوبارہ مندر میں جانا، اس کے بعد مندر سے نکل کر جھاڑیوں کی جگہ جا کر زمین میں گھسنا، اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ اس کا کوئی نہ کوئی سمبندھ ماتا کے مندر سے ضرور ہے۔ جبکہ ماتا کا نیا مندر گاؤں کے بیچ میں بن چکا ہے۔ اس کے معنی یہ ہوا کہ ماتا اپنے پرانے مندر میں بھی آشن جماتی ہے۔ پرانے مندر میں ماتا کی آشن نہیں ہوتا تو وہ ہیولہ مندر میں کبھی بھی نہ جاتا۔

بھائیو! اس سے تو ثابت ہوتا ہے کہ ہم لوگ ماتا کے چرنوں میں اپنا اپنا ماتھا ٹیکیں تو یقیناً ماتا ہم پر کرپا کرے گی۔

یہ سمسیا بہت گمبھیر لگتی ہے اس لئے میرے ماما کے گاؤں کے پنڈت جی نے یہ بول کر جان چھڑائی کہ یہ میرے بس سے باہر ہے اور میں نے یہ بھی سنا ہے کہ وہ پنڈت جی بہت مہان ہیں، دیوی دیوتاؤں سے ان کے

رابطے رہتے ہیں۔ اور دیوی دیوتا ان کی بات مانتے ہیں۔ اور یہ تو ہو نہیں سکتا کہ جو کچھ ہمارے گاؤں میں ہو رہا ہے، اس کی خبر دیوی دیوتا یا پھر کالی ماتا کو نہ ہو۔ کالی ماتا تو ہر وقت اپنے بھگتوں پر نظر رکھتی ہے اور ان کی حفاظت بھی کرتی ہے۔

میں نے تو یہ سوچا ہے کہ آنے والی پورن ماشی کو ماتا کا بہت بڑا پوجا کرایا جائے۔ اور ساتھ ہی سات کالے بکروں کی بھینٹ بھی دی جائے، ماتا کو خوش کر کے ہی ہم گاؤں والے سکھ شانتی میں رہ سکتے ہیں۔

میں مانتا ہوں کہ گنیش اچھی سوچ کا نہیں رہا تھا اور اس کی سنگت بھی ایسے لوگوں سے تھی جو کہ بھگوان کے احکام ماننے والے نہیں تھے، آپ لوگ ذہنی طور پر پورن ماشی کے پوجا کے لئے تیار ہو جاؤ اور یہ باتیں باقی لوگوں کو بھی بتا دینا اور ان سے کہنا کہ زیادہ سے زیادہ رقم اپنے حصے کے جمع کرا دیں۔"

اور یہ خبر پورے گاؤں میں پھیل گئی کہ آنے والی پورن ماشی کی رات ماتا کا بڑا پوجا ہوگا اور سات بکروں کی بھینٹ دی جائے گی، لوگ دھڑا دھڑ مکھیا جی کے پاس پیسے جمع کرانے لگے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے آنے والے مہینہ میں نیا چاند طلوع ہوا۔

ایک دن...... دو دن...... اور پھر اس طرح کر کے پورن ماشی کی رات آ گئی۔ سارے انتظامات مکمل تھے۔ سات بکروں کی بھینٹ دی گئی۔ طرح طرح کے لوازمات اور پھول پرشاد ماتا کے چرنوں میں رکھے گئے۔

پوجا کے دن ایسا ہوتا ہے کہ پنڈت جو کہ دیوی دیوتا کا بہت بڑا بھگت ہوتا ہے۔ وہ اس دیوی یا دیوتا کے نام کا اشلوک پڑھتا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اشلوک پڑھنے والے پر اس دیوی یا دیوتا کی حاضری آ جاتی ہے، جس کے لئے وہ اشلوک پڑھ رہا ہے۔ پھر وہ دیوتا یا دیوی اشلوک پڑھنے والے کی زبان میں بات کرتی ہے اور جس بات یا مسئلے کے لئے دیوی دیوتا کی حاضری کی جاتی ہے وہ مسئلہ ان کی زبانی سامنے آتا ہے۔

بہر حال وقت مقررہ پر گاؤں کے سارے لوگ موجود تھے۔ ہر آدمی شکل سے سوالی نظر آ رہا تھا۔ ان کے دماغ میں خوشی کی روشنی جگمگا رہی تھی۔ وجہ یہ کہ ماتا کی حاضری جب ہوتی ہے تو ماتا اپنی خوشی یا ناراضگی کا اظہار کرتی ہے اور پھر وہ لوگوں کو پیغام بھی دیتی ہے کہ آئندہ انہیں کیا کرنا ہے۔

سب سے زیادہ لوگوں کی خوشی تھی کہ آج کی رات ماتا ہم سے خوش ہو کر ہم گاؤں والوں پر دیا کرے گی جس سے گاؤں سے سارے دکھ درد ختم ہو کر گاؤں میں سکھ شانتی کا دور دورہ شروع ہو جائے گا۔

پنڈت اپنی جگہ بیٹھا ہوا ماتا کے نام کا اشلوک پڑھ رہا تھا۔ آدھا گھنٹہ تک وہ اشلوک پڑھتا رہا کہ پھر اچانک اس کے چہرے کا رنگ بدلنے لگا، اس کی آواز بھاری ہونے لگی۔ اس کی آنکھیں چڑھ گئیں۔ پھر چشم زدن میں اس کے منہ سے مترنم مگر غصیلی گونجدار آواز کسی عورت کی سنائی دی۔

"گاؤں والو! مجھے بلانے کی کیا ضرورت پیش آئی، بولو! مجھے کیوں بلایا گیا ہے۔"

آواز سے پتا چلتا تھا کہ دیوی بہت غصہ کی حالت میں ہے۔

ایک کافی ضعیف آدمی اٹھا اور ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ "ماتا! ہم سے کوئی غلطی یا نافرمانی ہوئی ہے تو ہم گاؤں والوں کو معاف کر دو، ہمیشہ آپ کی کرپا ہم گاؤں والوں پر رہی ہے، مگر دو ماہ سے ہم کشٹ میں گھر گئے ہیں، سکھ شانتی کے لئے ہم ترس گئے ہیں، ہر وقت ہم لوگ بیاکل رہنے لگے ہیں۔ گاؤں کے کئی لوگ بھیانک موت مر گئے ہیں اور نہ جانے آگے اور کیا ہونے والا ہے، ماتا ہم پر کرپا کرو۔" یہ بول کر وہ شخص خاموش ہو گیا۔ سارے گاؤں والے اپنا سر نیچا کئے اور ہاتھ جوڑے بیٹھے تھے۔

"گاؤں والو! مجھے معلوم ہے! مرنے والے پاپی تھے، انہوں نے بہت بڑا پاپ کیا تھا۔" دیوی کی گونجدار غصہ سے بھری آواز سنائی دی۔

(جاری ہے)

دولہا دلہن

ذیشان اقبال عظمی - کراچی

مردے کو دفنا کر لوگ قبرستان سے باہر نکلنے نہ پائے تھے کہ اچانک ایک لرزہ خیز چیخ سنائی دی، لوگوں نے مڑ کر جب اس جانب دیکھا تو ایک شخص زمین پر گرا تڑپ رہا تھا وہ منظر بہت دلخراش تھا...... اور پھر بھگدڑ مچ گئی۔

عشق و محبت اور چاہت و خلوص کی لازوال کہانی مرنے کے بعد بھی دونوں کا ساتھ نہ چھوٹا

وہ سہ پہر تین بجے کا وقت تھا جب ٹرین راولپنڈی اسٹیشن پر رکی۔ میں ٹرین سے باہر آیا تو سر سے پیر تک گرد اور مٹی میں اٹا ہوا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ اے سی کمپارٹمنٹ میں جگہ نہ ملنے کے باعث مجبوراً مجھے اکانومی درجے میں سفر کرنا پڑا تھا۔ کراچی سے راولپنڈی تک مختلف گاؤں، قصبوں اور ریگستانوں سے گزرتے ہوئے دھول مٹی میرے کپڑوں اور جسم کے عیاں حصوں میں اٹ چکی تھی اسٹیشن سے باہر آتے ہی ٹیکسی ڈرائیور مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ بڑی مشکل سے ایک ٹیکسی ڈرائیور سے کرایہ طے کرنے کے بعد میں اس کی ٹیکسی میں جا بیٹھا۔ کچھ ہی دیر میں ٹیکسی سڑک پر فراٹے بھرنے لگی۔ میری یہاں آمد کا مقصد ایک عالمی تصویری نمائش میں حصہ لینا تھا جو ایک ہفتے بعد اسلام آباد میں منعقد ہو رہی تھی۔

مصوری میرا شوق تھا اور کراچی میں اس حوالے سے میرا ابھی ایک چھوٹا موٹا نام تھا۔ کچھ روز پہلے آرٹس کونسل کے زیر اہتمام ہونے والی ایک تصویری نمائش میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوئی جو عالمی مصوری ادارے کے اعزازی ممبر تھے۔ انہوں نے میرے کام کو سراہا اور مجھے اسلام آباد آکر اس عالمی تصویری نمائش میں شامل ہونے کی دعوت دی۔

ان صاحب کا نام تیمور خان تھا۔ گزشتہ بیس سالوں سے کینیڈا میں مقیم تھے لیکن کچھ ماہ پہلے وطن کی یاد شدت سے ستانے لگی تو پاکستان واپس آگئے۔ عموی طور پر ایک بردبار اور سلجھی ہوئی شخصیت کے مالک تھے۔ کچھ سوچ بچار کے بعد میں نے ہامی بھر لی۔ انہوں نے نمائش کی تاریخ اور دیگر تفصیلات بتاتے ہوئے یاددہانی کرائی کہ اپنی تصاویر کے نمونے نمائش سے چارروز پہلے ہی جمع کرادوں ورنہ بعد میں نمونے قبول نہیں کیے جائیں گے۔ چلتے وقت مجھے یاد آیا کہ میرے ایک دور کے رشتہ دار راولپنڈی میں مقیم ہیں۔ میں نے سوچا چلو ان سے ملاقات بھی ہوجائے گی اور رہائش کا مسئلہ بھی حل ہوجائے گا۔

جب میں نے انہیں فون کرکے اپنے آنے کی اطلاع دی تو وہ بہت خوش ہوئے اور اپنا پتہ اور دیگر تفصیلات مجھے بتادیں اور بطور خاص تاکید کی کہ میں ہوٹل میں نہ ٹھہروں۔ سو اس وقت میری ٹیکسی راولپنڈی کی مختلف سڑکوں سے گزرتی ہوئی اڈیالہ روڈ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ راولپنڈی آنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا اس لئے میں دلچسپی سے باہر کے مناظر دیکھنے میں مصروف تھا۔ ٹیکسی مختلف سڑکوں سے گزرتے ہوئے راولپنڈی کے مضافاتی علاقے میں داخل ہوگئی۔

"اور کتنی دور جانا ہے بھئی؟" میں نے سفر کی طوالت سے اکتا کر پوچھا۔

"بس تھوڑی دور اور جانا ہے باؤ۔ آپ نے پتہ بھی تو گلشن آباد کا دیا ہے۔ پنڈی کے کونے میں ہے گلشن آباد۔"

ٹیکسی ڈرائیور نے کہا تو میں خاموش ہوگیا۔ کچھ دیر بعد ٹیکسی ایک نوتعمیر شدہ کالونی میں داخل ہوگئی۔ (یاد رہے یہ سن 2006 کی بات ہے) کچھ گلیوں سے گھوم گھام کر ٹیکسی ایک خوبصورت بنگلے کے سامنے رک گئی۔ میں نے ٹیکسی سے اتر کر دروازے کی گھنٹی بجائی۔ کچھ دیر بعد ایک لحیم شحیم آدمی باہر نکلا جس کی رنگت قدرے سیاہی مائل اور چہرے پر خشخشی داڑھی تھی۔ یہی منور نیازی صاحب تھے جنہیں ہم منو بھائی کہتے تھے۔ مجھے دیکھ کر ان کا چہرہ کھل اٹھا۔

"میں تو بڑی دیر سے تمہارا انتظار کررہا تھا۔ ماشاء اللہ صحتمند ہوگئے ہو۔" انہوں نے مجھ سے بغلگیر ہوتے ہوئے کہا۔

"جی بس ٹرین تین گھنٹہ دیر سے پہنچی۔ پھر اسٹیشن سے یہاں تک کا فاصلہ کافی تھا۔" میں نے جواب دیا۔

"تم اندر چلو۔ میں تمہارا سامان اترواتا ہوں۔" انہوں نے مجھ سے کہا۔ "او بشیرے! جلدی باہر آکر ٹیکسی سے سامان اتروا۔ اور ٹیکسی والے کو لسی پانی پوچھ۔" انہوں نے دروازے کی طرف منہ کرکے آواز لگائی۔ میں ڈرائیور کو پیسے دینے کے لئے جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تو انہوں نے میرا ہاتھ پکڑلیا۔

"بس بس۔ اب تم گھر پہنچ گئے ہو تو اب سے سارے معاملات ہمارے ذمے ہیں۔ تم اندر جاؤ۔" انہوں نے مخلصانہ سختی سے کہا تو میں نے بے چارگی سے ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ اتنی دیر میں ایک نوکر اندر سے بھاگا بھاگا آیا اور ٹیکسی سے سامان اتارنے لگا۔ منو بھائی نے مجھے ایک آراستہ کمرے میں پہنچا دیا اور کچھ ہی دیر میں میرا سامان بھی آپہنچا، میں تھکا ہوا تھا۔ اچھی طرح نہانے اور کپڑے بدلنے کے بعد بستر پر پڑ کر سوگیا۔ آنکھ کھلی تو رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ بھوک بھی محسوس ہورہی تھی۔ میں کچھ دیر لیٹا آنکھیں جھپکتا رہا پھر اٹھ کر باتھ روم میں گھس گیا۔ باتھ روم سے باہر آیا تو منو بھائی کو کمرے میں موجود پایا۔

"بھئی تم تھکے ہوئے تھے اس لئے میں نے تنگ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ ابھی کمرے کی بتی جلتی دیکھی تو سمجھ گیا تم جاگ گئے ہو۔ آجاؤ کھانا تیار ہے۔" انہوں نے مسکرا کر کہا۔ رات کے کھانے پر صرف میں اور منو بھائی موجود تھے۔

"منو بھائی! آپ کی بیگم اور بچے نظر نہیں آرہے۔" میں نے ادھر ادھر سر گھماتے ہوئے کہا۔

"وہ تو تین چار دن ہوئے اوکاڑہ گئے ہوئے ہیں۔ گھر میں کوئی شادی وغیرہ ہے۔ ابھی ہفتہ دس دن اور رکیں گے۔" انہوں نے سرسری انداز میں کہا تو میں نے سرہلادیا۔ رات کے کھانے کے بعد منو بھائی مجھے لے کر ٹہلنے نکل آئے۔ گو یہ مضافاتی علاقہ تھا لیکن یہاں آب وہوا بے حد صاف ستھری تھی اور چاروں طرف اونچے نیچے پہاڑی سلسلے موجود تھے۔ کراچی جیسے مصروف اور تیز رفتار شہر سے دور اس خاموش اور پرفضا علاقے میں ٹہلتے ہوئے میں نے خود کو بے حد ہلکا محسوس کیا۔

اگلے روز میں اسلام آباد جاکر تیمور صاحب سے ملا۔ کچھ ضروری کاغذات پر کرنے کے بعد میں نے اپنی مصوری کے کچھ نمونے ان کے پاس جمع کرائے جنہیں نمائش میں شامل ہونا تھا اور کچھ دیر گپ شپ کرنے کے بعد میں واپس لوٹ آیا۔

منو بھائی رات کے کھانے کے بعد ٹہلنے کے عادی تھے۔ آج بھی انہوں نے مجھے ہمراہ لے لیا۔ میں بخوشی ان کے ساتھ ہولیا۔ ٹہلتے ہوئے انہوں نے سرسری انداز میں ذکر کیا کہ کل وہ ایک روز کے لئے فیصل آباد جارہے ہیں۔ منو بھائی کا گارمنٹس کا کاروبار تھا اور ان کی دکانیں فیصل آباد اور پشاور میں بھی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ایک روز بعد واپس آجائیں گے۔ ان کی عدم موجودگی میں، میں خود کو تنہا نہ سمجھوں اپنی کسی بھی ضرورت کے لئے بلاتوقف بشیر (ملازم) سے کہوں۔ مجھے بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ میں نے خاموشی سے سرہلادیا۔

اگلے روز میں بھی مری چلا گیا اور سارا دن خوبصورت نظاروں کو اپنے کینوس پر منتقل کرتا رہا۔ شام میں واپس آکر میں نے کچھ دیر آرام کیا۔ پھر رات کا کھانا کھا کر میں اکیلے ہی ٹہلنے نکل آگیا۔ کوئی مصروفیت تو تھی نہیں۔ میں ٹہلتے ٹہلتے کافی دور نکل آیا۔ سامنے ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ میرے دل میں آیا کہ کیوں نہ اس پہاڑی پر چڑھ کر دور تک شہر کا نظارہ دیکھوں۔ میں آہستہ آہستہ قدم جما کر پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ گو یہاں کافی اندھیرا تھا لیکن ایسا لگتا تھا جیسے یہاں سے لوگ گزرتے رہتے تھے کیونکہ پہاڑی پر ایک پگڈنڈی سی بنی ہوئی تھی۔ تقریباً آدھ گھنٹے کی چڑھائی کے بعد میں پہاڑی کے اوپر کھڑا تھا۔ میں نے ایک طویل سانس لے کر صاف ستھری ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں سمونے کی کوشش کی اور ماحول پر ایک طائرانہ نظر ڈالی۔ مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ دور تک اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ بس گھروں کی جلتی بتیاں اور گزرنے والی گاڑیوں کی روشنیاں نظر آرہی تھیں۔

میں نے آسمان کی طرف دیکھا۔ چاند کا زرد گولا اپنے عروج کو پہنچنے کے بعد اپنے اختتام کا سفر شروع کرچکا تھا۔ کچھ دیر تک وہیں کھڑے رہنے کے بعد میں نے پلٹ کر واپس اترنا شروع کردیا۔ ابھی میں پہاڑ کے دامن میں ہی پہنچا تھا کہ مجھے آس پاس کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میں نے سر گھما کر ادھر ادھر دیکھا پھر میری نظر بائیں جانب ایک اونچی چٹان پر جم گئیں جہاں دو ہیولے سے بیٹھے نظر آرہے تھے۔ شاید وہ بھی یہیں کہیں رہنے والے لوگ تھے جو شاید ہواخوری کے لئے یہاں آبیٹھے تھے۔ میں کچھ اور نیچے اترا تو وہ لوگ مجھے صاف نظر آنے لگے۔ وہ ایک نوبیاہتا جوڑا تھا۔ دلہن نے سرخ عروسی لباس پہنا ہوا تھا اور دولہا سفید شیروانی اور پگڑی میں ملبوس تھا۔ مجھے تعجب ہوا۔ بھلا شادی کی رات بھی کوئی یوں ٹہلنے نکلتا ہے میں نے ان کے چہروں پر نظر ڈالی۔ چاند کی مدھم زرد روشنی میں دونوں خاموش بیٹھے کہیں دور خلاؤں میں تک رہے تھے۔ ان کے چہرے تاثرات سے عاری اور پتھرائے ہوئے تھے۔

اچانک مجھے صورت حال کی سنگینی کا احساس ہوا۔

میں آدمی رات کے وقت شہر سے دور مضافات میں ایک سنسان پہاڑی پر کھڑا تھا جہاں میرے علاوہ صرف یہ دولہا دلہن موجود تھے جو پتھرائے چہرے اور شادی کے جوڑوں میں ملبوس ساکت بیٹھے تھے۔ خوف کی ایک لہر بے اختیار میرے رگ و پے میں دوڑ گئی۔ میں نے ان کی طرف سے چہرہ موڑا اور تیزی سے نیچے اترنے لگا۔ پہاڑی سے نیچے اترنے کے بعد میں نے چاہا کہ پیچھے مڑ کر انہیں دیکھوں لیکن نہ جانے کیوں میری ہمت نہیں ہوئی۔ میں خاموشی سے گھر واپس آکر بستر میں دبک گیا۔ الجھے اور منتشر خیالوں کے ساتھ نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔

اگلے روز جاگا تو سر میں ہلکا ہلکا درد تھا۔ میں سست قدموں سے اٹھا اور منہ ہاتھ دھو کر کمرے سے باہر آگیا۔ ناشتے کی میز پر مجھے اطلاع دی کہ منو بھائی کا فون آیا تھا اور انہوں نے پیغام دیا ہے کہ انہیں فیصل آباد میں ایک روز مزید رکنا پڑے گا۔ میں سر ہلا کر ناشتے میں مصروف ہوگیا۔ ابھی نمائش میں مزید دو دن باقی تھے۔ کہیں باہر نکلنے کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ میں نے کمرے میں ایزل اور کینوس سیٹ کیا اور برش لے کر کھڑا ہوگیا۔ کچھ دیر تک خالی کینوس کو تکنے کے بعد اچانک میرے ذہن میں کل رات والے جوڑے کی شبیہ ابھر آئی۔ شادی کے جوڑے میں ملبوس لیکن خوشی سے عاری پتھریلے چہرے، زندگی بھر کے بندھن میں بندھنے کے بعد بھی ایک دوسرے سے لاتعلق لاتعلق۔ میرا ہاتھ تیزی سے کینوس پر چلنے لگا۔ دوپہر کا کھانا بھی میں نے کمرے میں ہی کھایا۔ رات کے کھانے تک تصویر تقریباً مکمل ہوچکی تھی بس چہرے کے خدوخال باقی تھے۔ میرا دل چاہا کہ میں ایک بار اور انہیں دیکھوں۔ تاکہ میری تصویر میں ان کے تاثرات بہتر طور پر نمایاں ہوں۔ لیکن دل میں ہلکا سا ڈر بھی موجود تھا۔ کچھ دیر کی ذہنی کشمکش کے بعد تخلیقی شوق نے خوف کی مات دے دی اور میں کھانا کھا کر گھر سے باہر نکل آیا۔

ابھی میں پہاڑی کے نزدیک ہی پہنچا تھا کہ میں نے اسی نوبیاہتا جوڑے کو اسی شادی کے لباس میں پہاڑ سے نیچے اترتے دیکھا۔ دونوں نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھاما ہوا تھا اور وہ قدم قدم نیچے اتر رہے تھے۔ ان کے چہرے اسی طرح جذبات سے عاری تھے اور آنکھیں کہیں دور خلاؤں میں گم تھیں۔ کچھ دور نیچے اترنے کے بعد وہ گھوم کے پہاڑی کی دوسری جانب چلے گئے اور میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

میں چونک کر تیزی سے آگے بڑھا اور پہاڑی پر چڑھنے لگا۔ جب میں گھوم کر پہاڑی کی عقبی سمت پہنچا تو وہ دونوں کہیں غائب ہوچکے تھے۔ میں کچھ دیر کھڑا اپنی سانس درست کرتا رہا پھر ان کے تعاقب میں کچھ اور آگے بڑھا۔ لیکن پہاڑی کے اس طرف آگے بڑھنے کا راستہ بہت مشکل تھا۔ اونچی نیچی چٹانوں اور جھاڑیوں کی وجہ سے ایک ایک قدم بڑھانا دوبھر ہورہا تھا۔ پھر وقت بھی رات کا تھا۔ میں نے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کردیا اور واپس پلٹ کر پہاڑی سے نیچے اترنے لگا۔ ایک جھلک تو ان کی میں دیکھ ہی چکا تھا۔

اگلے روز صبح میں نے پھر تصویر پر کام شروع کردیا۔ دوپہر تک تصویر مکمل ہوچکی تھی۔ بلاشبہ یہ میری شاہکار تصویروں میں سے ایک تھی۔ زندگی کی اہم ترین خوشی یعنی شادی کے لباس میں موجود دولہا دلہن لیکن چہروں پر الجھن اور آنکھوں میں ویرانی۔ پس منظر میں، میں نے وہی پہاڑی پینٹ کی تھی جہاں میں نے انہیں دیکھا تھا۔ ابھی میں تعریفی نظروں سے تصویر کو دیکھ ہی رہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ دوسرے ہی لمحے دروازہ کھلا اور منو بھائی کی شکل نظر آئی۔

''کہیں ڈسٹرب تو نہیں کیا میں نے؟'' انہوں نے مسکرا کو پوچھا۔

''ارے نہیں نہیں منو بھائی۔ آپ کب واپس آئے! اندر آیئے ناں۔'' میں نے لپک کر دروازے کے پاس پہنچتے ہوئے کہا۔ منو بھائی اندر آکر بستر پر ڈھیر ہوگئے۔

''بھئی یہ کاروبار بھی انسان کی جان سے چمٹا رہتا ہے۔ دل چاہے نہ چاہے مگر وقت دینا پڑتا ہے۔

تمہیں اکیلے چھوڑنے کو دل نہیں مان رہا تھا کہ اتنے عرصے بعد آئے ہو اور گپ شپ بھی نہ رہے مگر کچھ ایسے پیچیدہ مسئلے آن پڑے کہ جانا پڑا۔'' انہوں نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔

''کیسی باتیں کررہے ہیں منو بھائی۔ مجھے آپ کی مصروفیت کا اندازہ ہے اور اب تو انشاءاللہ آنا جانا لگا رہے گا۔'' میں نے جواباً ہلکے پھلکے انداز میں کہا تو وہ بھی مسکرا دیئے۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد انہوں نے ملازم کو آواز دی۔

''او بشیرے۔ گل سن پتر۔'' آواز سن کر ملازم بھاگا چلا آیا۔

''ذرا دو گلاس لسی تو بنا لا۔ بڑی گرمی ہے آج۔''

انہوں نے حکم دیا تو ملازم مؤدبانہ انداز میں سر ہلا کر واپس مڑ گیا۔ میں اور منو بھائی پھر گپ شپ میں مصروف ہوگئے۔ کچھ دیر بعد ملازم ایک ٹرے میں لسی کا جگ اور دو گلاس لے آیا۔ ابھی وہ ٹرے میز پر رکھ ہی رہا تھا کہ اس کا ہاتھ کانپا اور ٹرے گرتے گرتے بچی۔ منو بھائی نے اسے گھوم کر دیکھا لیکن اس کی نظریں کہیں اور جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اور منو بھائی نے بیک وقت اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔ وہ خوفزدہ نظروں سے میری بنائی ہوئی اس تصویر کو دیکھ رہا تھا جو میں نے ابھی مکمل کی تھی۔

''کی گل اے بشیرے؟ کی ہویا اے تینوں؟''

انہوں نے حسب عادتاً پنجابی میں پوچھا۔

''یہ تصویر...... یہ...... یہ آپ کو...... کدھر......''

وہ حیرت اور الجھن سے فقرہ مکمل نہ کرسکا۔

''اوئے کھوتے...... یہ ہاتھ سے بنائی ہوئی تصویر ہے۔ انہوں نے خود بنائی ہے۔'' منو بھائی نے ڈپٹ کر کہا۔

''لیکن یہ دونوں...... آپ کو کہاں ملے تھے؟''

اس نے پھر مجھ سے پوچھا۔

''میں نے انہیں یہیں قریب میں دیکھا تھا۔ ایک دو روز پہلے۔'' میں نے جذبات کو چھپاتے ہوئے کہا۔

بڑا آدمی

ایک سیاح دور دراز کی سیر کرتا ہوا ایک قصبے میں داخل ہوا اور ایک دیہاتی سے پوچھنے لگا کہ یہاں کوئی بڑا آدمی پیدا ہوا ہے۔ دیہاتی نے سادگی سے جواب دیا کہ نہیں جناب یہاں تو چھوٹے چھوٹے بچے پیدا ہوتے ہیں۔

(محمد آصف شہزاد الہ آبادی۔ الہ آباد قصور)

''ایسا کیسے ہوسکتا ہے؟'' اس نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''کیوں؟ کیوں نہیں ہوسکتا؟'' میں نے ہمت کرکے پوچھا۔

''کیونکہ وہ دونوں شادی کی رات ہی لاپتہ ہوگئے تھے اور اس بات کو ایک سال سے زیادہ بیت چکا ہے۔'' اس نے انکشاف کیا تو ہم دونوں اچھل پڑے۔ منو بھائی کی حیرت تو عمومی تھی لیکن میرا جو حال تھا وہ میں ہی جانتا تھا۔ منو بھائی کے کہنے پر بشیر نے بتایا کہ ''تصویر میں نظر آنے والا دولہا اس کے مامے کا لڑکا تھا اور اپنے محلے کی ایک لڑکی جمیلہ کو پسند کرتا تھا۔ دونوں کا عشق کئی سال تک چوری چھپے چلتا رہا۔ پھر جمیلہ کے بھائیوں کو کسی طرح بھنک پڑ گئی کہ جمیلہ کسی لڑکے سے چوری چھپے ملتی ہے۔ خاندان میں ہنگامہ مچ گیا۔ جمیلہ کے بھائیوں نے اشفاق (بشیر کے مامے کا لڑکا) کے گھر جاکر اسے جان سے مارنے کی دھمکیاں دیں۔ اشفاق اڑ گیا کہ اگر وہ شادی کرے گا تو صرف جمیلہ سے۔ ادھر جمیلہ نے بھی گھر میں شور مچا دیا کہ اگر اس کی شادی اشفاق سے نہیں ہوئی تو وہ خودکشی کرلے گی۔ دونوں گھروں میں نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ معاملہ پولیس تک پہنچ گیا اور دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کے خلاف کیس دائر کردیا۔

جمیلہ اور اشفاق نے عدالت میں صاف بیان دے دیا کہ دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ دونوں عاقل و بالغ تھے لہٰذا عدالت نے دونوں کی شادی کا فیصلہ سنا دیا اور دونوں گھروں کی آپس میں صلح کا حکم دیا۔ جمیلہ کے گھر والوں نے ناچار اس کی شادی کی تیاریاں شروع کر دیں۔ اشفاق تو جیسے ان دنوں ہواؤں میں اڑ رہا تھا۔ لیکن شادی کے روز رخصتی کے بعد جب بارات واپس آرہی تھی تو راستے میں دولہا کی گاڑی تیزی سے آگے بڑھ گئی اور بعد میں ایک موڑ پر خالی کھڑی ہوئی ملی۔ انہیں بہت ڈھونڈا گیا لیکن کچھ پتہ نہ چلا۔

طرح طرح کی قیاس آرائیاں کی گئیں۔ کچھ نے کہا کہ یہ جمیلہ کے بھائیوں کی سازش ہے۔ کچھ نے کہا کہ دونوں میاں بیوی خطرے کے پیش نظر کہیں روپوش ہو گئے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

اس وقت گاڑی اشفاق کا ایک دوست چلا رہا تھا مگر وہ بھی غائب تھا۔ اس سے شبہ قوی ہو گیا کہ اشفاق نے اپنے دوست کے ساتھ مل کر کہیں فرار ہونے کا منصوبہ بنایا ہوگا تاکہ بعد میں کوئی انہیں تنگ نہ کر سکے۔ اس بات کو آج سال سے زیادہ گزر چکا ہے۔ دونوں کے ماں باپ کا ان کی جدائی میں برا حال ہے لیکن آج تک ان کا کوئی پتہ نہیں چل سکا۔"

بشیر کی روداد ختم ہوئی تو ہم دونوں سکتے کے سے عالم میں بیٹھے تھے۔ بشیر بھی یہ داستان سناتے سناتے دکھی سا ہو گیا تھا۔ اس لئے بات ختم کر کے خاموش بیٹھ گیا۔ پھر اچانک کچھ دیر بعد اس نے چونک کر سر اٹھایا۔

"لیکن باؤ جی۔ آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے انہیں یہیں کہیں دیکھا ہے۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ ان کا پتہ بتا دیں۔ ان کے ماں باپ کا ان کی یاد میں رو رو کر برا حال ہے۔" اس نے ملتجیانہ لہجے میں کہا تو میں نے بے اختیار ایک گہرا سانس لے کر گزشتہ دو دنوں کی ساری تفصیل اسے بتا دی۔

"کمال ہے۔ اگر وہ کہیں قریب رہ رہے ہیں اور رات کو ٹہلنے بھی نکلتے ہیں تو اپنے رشتے داروں سے ملتے کیوں نہیں؟" منو بھائی نے حیرت سے کہا۔

"شاید وہ اب بھی ہم سے الگ رہنا چاہتے ہیں۔ رات کو بھی وہ اس پہاڑی پر ٹہلتے ہیں۔ جہاں سب جاتے ہوئے گھبراتے ہیں۔ تاکہ کوئی انہیں نہ دیکھ پائے۔" بشیر نے کہا تو میں چونک پڑا۔

"کیوں بھئی؟ لوگ اس پہاڑی پر جاتے ہوئے کیوں گھبراتے ہیں؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"اس کی وجہ میں بتاتا ہوں۔" منو بھائی نے گلا کھنکار کر کہا۔ "تم نے یہ تو دیکھ ہی لیا ہے کہ نہ علاقہ نو تعمیر شدہ ہے اور پہاڑی سلسلوں کو کانٹ چھانٹ کر پلاٹ اور سڑکیں بنائی گئی ہیں۔ مذکورہ پہاڑی پر کنسٹرکشن کے دوران کچھ حادثات پیش آگئے جنہیں توہم پرست لوگوں نے آسیب اور جنات وغیرہ کے سر تھوپ دیا کیونکہ یہ پہاڑی علاقہ گزشتہ سینکڑوں سال سے ویران پڑا تھا۔ سو اس پہاڑی پر سڑکیں اور مکان تو نہ بن سکے لیکن دن میں لوگ پیدل اسے آنے جانے کے لئے استعمال کرتے رہے کیونکہ پہاڑی کی دوسری طرف موجود علاقے سے یہاں تک کا یہ شارٹ کٹ راستہ ہے۔ لیکن رات میں جنات یا آسیب کے ڈر سے کوئی اس طرف نہیں جاتا۔" منو بھائی نے تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو آپ لاعلمی میں اس طرف جا نکلے تو ان کا سراغ مل گیا ورنہ شاید اب بھی پتہ نہ چلتا۔" بشیر نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر اب کیا پروگرام ہے؟" منو بھائی نے پوچھا۔

"پروگرام کیا ہونا ہے صاحب! آج رات کو میں وہاں جا کر اشفاق سے ملوں گا اور اسے گھر واپس لے کر آؤں گا۔" بشیر نے مضبوط لہجے میں پوچھا۔

"میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گا۔" منو بھائی نے کچھ سوچ کر کہا تو بشیر کچھ کہے بغیر خاموش ہو گیا۔

رات کو کھانے کے بعد ہم تینوں اس پہاڑی کی

طرف چل پڑے۔ پہاڑی کے نزدیک پہنچ کر میں نے ادھر ادھر دیکھا لیکن اس وقت یہاں کوئی نہیں تھا۔

"پہلی بار میں نے انہیں پہاڑی کے اوپر سے دیکھا تھا۔ کیوں نہ ہم اوپر چل کر ان کا انتظار کریں۔" میں نے تجویز پیش کرتے ہوئے کہا تو دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کچھ دیر بعد ہم پہاڑی کی چوٹی پر موجود تھے۔ کافی دیر تک۔ ادھر ادھر تاکا جھانکی کرنے کے بعد بھی ہمیں وہ دونوں نظر نہیں آئے۔

"شاید آج وہ نہیں آئیں گے یا پھر وہ ہم سے پہلے آکر جا چکے ہیں۔ منو بھائی نے خدشہ ظاہر کیا۔

"وہ رہے۔" اچانک میری نظر ان پر پڑ گئی۔ وہ دونوں اسی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے پہاڑی کے دامن میں چلے جا رہے تھے۔ ہم نے تیزی سے پہاڑی سے اترنا شروع کر دیا۔

"اشفاق! او فیکے! میں ہوں بشیر۔ تیری رضیہ خالہ دا پتر۔ بات سن۔" اچانک بشیر نے انہیں زور زور سے آوازیں دینا شروع کر دیں۔ بشیر کی آواز سن کر اشفاق نے پلٹ کر دیکھا اور اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں ہو گئے۔ وہ دوبارہ پلٹا اور اپنی دلہن کا ہاتھ تھامے پہاڑی کی عقبی سمت جانے لگا۔

"یہ دونوں پہاڑی کی پچھلی سمت جا کر غائب ہو جاتے ہیں۔ ہمیں جلدی کرنی ہوگی۔" میں نے ہانپتے ہوئے کہا اور تیزی سے آگے بڑھنے لگا۔ وہ دونوں ہماری نظروں سے اوجھل ہو چکے تھے۔ ہم پتھروں اور چٹانوں کو پھلانگتے، چڑھتے اترتے جیسے ہی پہاڑی کی دوسر سمت پہنچے، بے اختیار ٹھٹک کر رک گئے کیونکہ وہ دونوں ہمارے سامنے کھڑے تھے۔ ساکت اور خاموش وہی ویران آنکھیں، وہی تاثرات سے عاری چہرے۔

"کہاں چلا گیا تھا فیکے تو؟ تیری ماں کا تیری یاد میں برا حال ہے۔ چل گھر واپس چل۔" بشیر نے بے تابانہ لہجے میں کہا۔ اشفاق اور اس کی دلہن نے دکھ بھری نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا، پھر اشفاق نے کہا۔

"تو نے بہت دیر کر دی بشیرے۔ اب واپسی کا راستہ بند ہو چکا ہے۔ اب تو ہمیں یہیں رہنا ہے۔ نہ جانے کب تک۔" اس نے مایوسی سے کہا۔

"کچھ نہیں ہوا فیکے۔ سب تیری اور بھابھی، جمیلہ کی راہ تک رہے ہیں۔ سب مان جائیں گے۔ تو اپنی ضد چھوڑ دے۔" بشیر نے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"تو سمجھ نہیں رہا ہے بشیرے۔ ہمارے ساتھ جو، جو کچھ ہونا تھا وہ شادی کی رات ہو چکا۔" میں گاڑی سے اغوا کیا گیا اور...... اشفاق کہتے کہتے رک گیا۔ کچھ لمحے تک چپ رہنے کے بعد وہ پھر گویا ہوا۔

"اغوا کرنے والوں نے ہمیں یہاں لا کر ہم پر بے انتہا تشدد کیا۔ ہمیں ڈنڈوں، بیلٹوں اور موٹر سائیکل کی چین سے زدوکوب کیا گیا۔ ظالموں نے میری جمیلہ تک کا لحاظ نہیں کیا۔" یہ کہتے ہوئے اشفاق نے دکھ بھری نظروں سے جمیلہ کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر بھی دکھ اور تکلیف کے آثار نمودار ہو گئے تھے۔

"ہمیں زخموں سے چور چور کرنے کے بعد انہوں نے ہمیں اٹھا کر اس پہاڑی کے پیچھے ایک گڑھے، میں پھینک دیا اور ہمیں تڑپتا بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے گئے۔ نہ جانے کب تک ہم اسی طرح گڑھے میں پڑے رہے۔ پھر کچھ وقت گزرنے کے بعد تکلیف کا احساس آہستہ آہستہ ختم ہو گیا۔ ہم گڑھے سے باہر تو نکل آئے لیکن ہمیں یہاں سے باہر نکلنے کا راستہ نہ مل سکا۔ ہم اکثر اس پہاڑی کے ارد گرد گھومتے رہتے ہیں مگر ہمیں واپس اپنے گھر جانے کا راستہ نہیں ملتا۔ نہ جانے کب تک ایسا چلتا رہے گا۔" اشفاق نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔ ہم سب ساکت کھڑے اس کی روداد سن رہے تھے۔

"فکر نہ کر میرے بھائی۔ اب میں آگیا ہوں۔ آ ہمارے ساتھ چل۔ مجھے راستہ معلوم ہے۔" بشیر نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

"تو ابھی تک بات نہیں سمجھا بشیرے...... ہمیں اتنی آسانی سے راستہ نہیں ملے گا۔ اس گڑھے میں پڑے

پڑے ہماری موت واقع ہوگئی تھی۔ جب تک ہمارے بے گوروکفن لاشے وہاں پڑے ہیں۔ ہم یہاں سے نہیں نکل سکتے۔" وہ اداسی سے مسکرایا۔ اس کی بات سن کر ہمارے تو گویا سروں پر پہاڑ ٹوٹ پڑے۔ مجھے لگا جیسے میرا دل ابھی اچھل کر حلق میں آجائے گا۔ میرے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ دونوں مر چکے ہیں اور مردہ حالت میں بھٹک رہے ہیں۔ لیکن بشیر پر اس بات کا الٹا ردعمل ہوا۔

"مجھے معلوم ہے تو مجھے ٹال رہا ہے۔ میں تجھے ساتھ لے کر ہی جاؤں گا۔" اتنا کہہ کر اس نے تیزی سے آگے بڑھ کر اشفاق کا ہاتھ تھامنے کی کوشش کی لیکن اس کا ہاتھ ہوا میں یوں گھوم گیا جیسے اشفاق ٹھوس وجود کے بجائے ہوا کا ہی کوئی حصہ ہو۔ یہ ردعمل دیکھ کر بشیر بھی ہکا بکا رہ گیا۔

"میں نے کہا تھا ناں یہ اتنا آسان کام نہیں ہے۔" اشفاق نے اسی طرح کھوئے کھوئے لہجے میں کہا اور جمیلہ کا ہاتھ تھام کر واپس مڑ گیا۔ لیکن اس بار کچھ قدم چلنے کے بعد ان کے جسم اس طرح ہوا میں تحلیل ہوگئے جیسے وہاں کبھی کوئی تھا ہی نہیں۔ ہم تینوں کی حالت تو ایسی تھی کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ میں کس طرح گھر واپس پہنچا مجھے یاد نہیں......

اگلے روز منو بھائی اور بشیر کسی پیر صاحب کے پاس گئے اور انہیں ساری صورت حال بتائی۔ پیر صاحب ان کے ساتھ مذکورہ پہاڑی پر پہنچے۔ منو بھائی نے مجھے بھی ساتھ لے لیا تھا۔ کچھ دیر کی تگ ودو کے بعد ہم نے وہ گڑھا دریافت کرلیا جہاں اشفاق اور جمیلہ کی لاشوں کے پنجر پڑے تھے۔ ان کے اوپر پتھروں کا کافی ڈھیر تھا اور اردگرد خودرو جھاڑیاں بھی اگی ہوئی تھیں البتہ جمیلہ کے عروسی جوڑے کا ایک کنارہ باہر نکلا ہوا تھا جس سے ہم نے اس جگہ کی شناخت کی۔

پیر صاحب گڑھے کے کنارے بیٹھ کر کوئی وظیفہ پڑھنے لگے جبکہ بشیر کچھ مزدوروں کو ساتھ لے آیا جنہوں نے احتیاط سے اشفاق اور جمیلہ کے ڈھانچے گڑھے سے باہر نکال لئے۔ اس کے بعد انہیں باقاعدہ نماز جنازہ ادا کر کے دفنا دیا گیا۔ اس موقعہ پر اشفاق اور جمیلہ کے گھر والے بھی موجود تھے۔ فاتحہ خوانی اور دعا کے بعد سب لوگ بوجھل قدموں سے واپس چل دیئے۔

اشفاق اور جمیلہ کا قصور کیا تھا؟ صرف اتنا کہ انہوں نے محبت کی اور ایک دوسرے کے ساتھ قانونی اور جائز طریقے سے زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔ کیا کیا سپنے نہیں دیکھے ہوں گے انہوں نے ساتھ ساتھ رہنے کے۔ دکھ سکھ میں ساتھ نبھانے کے۔ بچوں کے اور اپنے پیارے سے گھر کے۔ ایسے کئی سوال تھے جو مجھ سمیت کئی لوگوں کے دل میں موجود تھے۔

ابھی ہم قبرستان سے باہر بھی نکلنے نہ پائے تھے کہ اچانک فضا میں ایک لرزہ خیز چیخ کی آواز بلند ہوئی۔ ہم سب بے اختیار چونک کر مڑے، ہمارے ساتھ آئے ہوئے لوگوں میں سے ایک آدمی نیچے گرا تڑپ رہا تھا۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ وہ جمیلہ کا بڑا بھائی پرویز تھا) اچانک کسی نے چلا کر کہا۔

"وہ دیکھو سانپ۔" سانپ کا سنتے ہی بھگدڑ مچ گئی۔ ہر کوئی ادھر ادھر بھاگ رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پرویز کے ہاتھ پاؤں اینٹھنے لگے اور منہ سے جھاگ بہنے لگا۔ اسے بھاگم بھاگ ہسپتال لے جایا گیا لیکن بعد میں اطلاع ملی کہ وہ راستے میں دم توڑ گیا۔ پرویز کی اس ناگہانی موت نے کئی سوالوں کو جنم دیا۔

قارئین یقیناً حالات وواقعات کی کڑیاں ملا کر اندازہ لگالیں گے کہ پرویز کی اس اچانک اور پراسرار موت کی کیا وجہ ہوسکتی ہے۔

میں نے اشفاق اور جمیلہ کی جو پینٹنگ بنائی تھی، وہ میں آتے ہوئے بشیر کو تحفتاً دے آیا۔ شاید اسی پینٹنگ کے سہارے اشفاق اور جمیلہ ان کے رشتے داروں کی یادوں میں ہمیشہ کے لئے زندہ رہیں گے۔

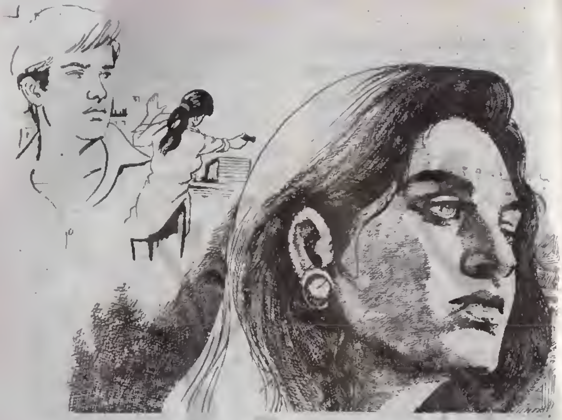

بزدل روح

ایس امتیاز احمد۔کراچی

ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دینے والا گھٹا ٹوپ اندھیرا پورے علاقے پر مسلط تھا، وقفے وقفے سے فلک شگاف چیخیں پوری فضا کو منتشر کردیتی تھیں کہ پھر اچانک پورا علاقہ جیسے روشنی میں نہا گیا اور پھر......

ایک اچھوتی انوکھی عجیب وغریب اور اچنبھے میں ڈالتی دلفریب اور پرفریب کہانی

جمی اس سڑک کے سامنے سے دن میں دو مرتبہ گزرتا تھا جس پر دو فرلانگ آگے چل کر اس کی چچی کا مکان تھا۔ وہ سڑک اب ٹوٹ پھوٹ چکی تھی اور اس کے اطراف جھاڑیاں اگ آئی تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس سڑک پر کوئی آبادی نہیں تھی اور اس کی چچی کا مکان بھی خالی پڑا رہتا تھا کیونکہ وہ آسیب زدہ مشہور تھا۔ بستی والے اس مکان سے دور رہتے تھے۔ خود بھی اپنی چچی کے ساتھ دوسرے مکان میں رہتا تھا۔ اس کی چچی اپنے مکان سے متعلق کوئی گفتگو نہیں کرتی تھیں وہ صرف اتنا کہتی تھیں کہ ان کا وہ مکان آسیب زدہ نہیں ہے اور وہ سب کہانیاں گڑھی ہوئی ہیں۔ اگر بستی والے توہم پرست نہ ہوں تو وہ اس مکان کو کرائے پر اٹھا سکتی ہیں اور اس طرح جو رقم حاصل ہوگی اس سے وہ جمی کے لئے نئے لباس بنا سکتی ہیں اور اسے تفریح کے لئے سینما لے

جاسکتی ہیں۔

جمی کو معلوم تھا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے کیونکہ اس کی چچی نے اس مکان کو تین مرتبہ کرائے پر اٹھایا اور کوئی بھی کرائے دار اس مکان میں ایک ہفتہ سے زیادہ نہیں ٹھہرا۔ اور اب تو ان کی بستی میں آنے والے اجنبی بھی اسے کرائے پر لینے پر تیار نہیں ہوتے تھے۔ جمی کو اس بات کا بہت افسوس تھا۔

روزانہ وہ اسکول جاتے وقت دور سے اس مکان کو دیکھتا اور پھر دوپہر کو واپسی کے وقت بھی۔ وہ سوچتا کہ ''اگر وہ کسی طرح بستی والوں پر ثابت کردے کہ مکان آسیب زدہ نہیں ہے تو......'' اور پھر ایک روز جب اس کی چچی بازار خریداری کے لئے گئی تھیں تو جمی نے اس آسیب زدہ مکان کی چابی جو باورچی خانے میں دیوار پر لٹکی ہوئی تھی اتاری اور اس مکان کی طرف چل دیا۔

مکان کے چاروں طرف بے تحاشا خاردار جھاڑیاں اگی ہوئی تھیں اور درخت پھیلے ہوئے تھے۔ جب جمی کی نظر گرد و غبار سے اٹی ہوئی کھڑکیوں پر پڑی تو اس کا ارادہ متزلزل ہوگیا۔ اسے معلوم تھا کہ روحیں دن کے وقت لوگوں کو پریشان نہیں کرتیں اور جب اس کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ کیوں نہ وہ خود اس مکان میں جاکر اس کا معائنہ کرے تو اسے یہ خیال بالکل اچھوتا اور عمدہ نظر آیا تھا لیکن جب وہ جھاڑیوں سے بچتا ہوا مکان کے دروازے کے سامنے پہنچا تو اس کا ارادہ متزلزل ہوگیا۔ زمین نے جیسے اس کے پیروں کو پکڑ لیا اور وہ پانچ منٹ تک خود کو اس بزدلی پر برا بھلا کہتا رہا، پانچ منٹ بعد وہ بمشکل اپنے خوف پر قابو پاسکا اور پھر تالا کھول کر مکان کے اندر داخل ہوگیا۔

تالا کھول کر مکان کے اندر داخل ہونے کا عمل شاید جمی کی زندگی کا سب سے زیادہ جرأت مندانہ اقدام تھا۔ اس نے اپنے پیچھے دروازے کو کھلا رہنے دیا اور غور سے اندر کا معائنہ کیا۔ اس وقت وہ ایک بڑے ہال میں کھڑا تھا جس کے دونوں طرف کمرے تھے اور تمام کمروں کے دروازے بند تھے۔ ہال کے بائیں جانب اسے سیڑھیاں نظر آئیں جو اوپری منزل کی طرف جاتی تھیں۔ کھلے دروازے سے آنے والی روشنی میں اسے ہال میں پڑی ہوئی میز اور کرسیاں نظر آئیں اس کے علاوہ پورا ہال خالی تھا۔

جمی بالکل خاموش کھڑا اپنے دل کی دھڑکنوں کی آوازیں سن رہا تھا پھر آہستہ آہستہ ہال پر تاریکی چھانے لگی جیسے کھلے دروازے کے سامنے کوئی عظیم الشان چیز کھڑی ہوگئی ہو۔ جمی تیزی سے مڑا لیکن اس کے پیچھے کوئی چیز نہیں تھی۔ جمی نے ایک گہرا سانس لیا۔ شاید سورج کے سامنے بادل کا کوئی آوارہ ٹکڑا ہوگا اسی لئے ہال میں تاریکی چھا گئی تھی اس نے سوچا لیکن پھر بڑی تیز آواز کے ساتھ دروازہ خود بخود بند ہوگیا۔ اور جب وہ بدحواسی کے عالم میں کنڈی پکڑے دروازہ کھولنے کی کوشش کررہا تھا تب جمی کو پہلی مرتبہ وہ روح نظر آئی۔

روح کا طرز عمل بالکل وہی تھا جس کی ایک روح سے توقع کی جاتی ہے۔ مدھم سا سفید رنگ کا وہ ہیولہ جسامت میں دبلا پتلا تھا اور وہ ہیولہ سیڑھیوں سے تیرتا ہوا آہستہ آہستہ اس کی طرف آرہا تھا۔

''میرے خدا۔'' جمی نے خود سے کہا۔ ''میں نے اس روح کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔'' لیکن پھر چند لمحوں کے بعد اس نے سوچا کہ ''آخر اس روح میں ایسی کیا خاص بات تھی؟ وہ مجھے اس طرح ڈرانے کی کوشش کررہی تھی جس طرح ٹام اسکول میں چپکے سے دوسرے بچوں کے پیچھے آکر زور سے ہاؤ کہہ کر بچوں کو ڈراتا ہے۔'' جمی نے سوچا اسے روح کی اس بچکانہ حرکت پر بے حد افسوس ہوا۔ ''وہ روح کوئی بچہ تو ہے نہیں پھر اسے ایسی ذلیل حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی؟''

''تو روح نے اسے ڈرانے کی کوشش کی تھی اور وہ ڈر گیا۔'' جمی نے خیال کیا اور یہ سوچ کر اس کا سارا خوف زائل ہوگیا بلکہ مارے غصے کے اس کا خون کھولنے لگا۔ پھر اسے چابی کا خیال آیا جو دروازے میں

لگی رہ گئی تھی۔ اس چابی کی واپسی بے حد ضروری تھی ورنہ چچی کو اس کی اس حرکت کا لازمی علم ہوجاتا۔

اس مرتبہ وہ بے حد خاموشی کے ساتھ مکان کے دروازے تک پہنچا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ خاموشی سے دروازہ بند کرکے تالا لگائے گا اور پھر چابی جیب میں رکھ کر واپس گھر چلا جائے گا۔ دروازہ اسی طرح کھلا ہوا تھا جس طرح وہ اسے چھوڑ کر بھاگا تھا۔ اسے اندر سے مدھم آوازیں آتی ہوئی سنائی دیں۔ جمی نے دروازہ بند کرنے کا ارادہ ملتوی کردیا اور کھلے ہوئے دروازے سے ہال کے اندر جھانکنے لگا جہاں وہ روح موجود تھی۔

وہ روح واپس اوپر جارہی تھی لیکن اس مرتبہ وہ تیر نہیں رہی تھی بلکہ وہ ایک قسم کا رقص کرتی ہوئی جارہی تھی۔ وہ ناچتی ہوئی ایک سیڑھی چڑھتی اور پھر پیٹ دبا کر بے تحاشہ ہنسنے لگتی۔ اس کی ہنسی کی آواز جمی کو سنائی دی۔ صاف ظاہر تھا کہ وہ جمی کو ڈرانے اور جمی کے دہشت زدہ ہوکر بھاگنے سے مکمل طور پر، لطف اندوز ہورہی تھی۔ یہ دیکھ کر جمی کا خون کھول گیا اس نے اپنا منہ دروازے کے اندر کرکے اپنے پھیپھڑوں کی پوری قوت کے ساتھ ''ہاؤ'' کہا تو روح نے ایک تیز چیخ ماری، فضا میں دو فٹ اچھل گئی اور پھر سیڑھیوں پر بے دم ہوکر گرگئی۔

جیسے ہی جمی نے یہ منظر دیکھا اس کا تمام خوف زائل ہوگیا کیونکہ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا کہ وہ روح کو اس سے کہیں زیادہ ڈرا سکتا ہے جتنا کہ خو د روح نے اسے ڈرایا تھا وہ بے دھڑک ہال میں داخل ہوگیا۔ روح نے سیڑھیوں کی ریلنگ کا سہارا لیا ہوا تھا۔ اس کا سانس بری طرح اکھڑا ہوا تھا۔ روح اکھڑے اکھڑے سانسوں کے درمیان کہہ رہی تھی۔ ''لڑکے تم نے مجھے ڈرادیا۔ تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔''

''کیوں نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' جمی نے کہا۔ ''تم نے مجھے ڈرایا، میں نے تمہیں ڈرادیا۔ حساب کتاب برابر ہوگیا۔''

''ایسا نہیں ہوتا لڑکے۔'' روح نے کہا۔ ''تم بہت زیادہ بے قوف ہو تمہیں اس اصول کا علم نہیں کہ روحیں انسانوں کو ڈراتی ہیں انسان روحوں کو نہیں ڈراتے۔'' روح نے کہا۔ اور پھر وہ تیرتی ہوئی سیڑھیوں سے نیچے اتر آئی اور آخری سیڑھی پر بیٹھ گئی۔

''تمہیں شاید معلوم نہیں۔'' روح نے کہا۔ ''یہ معاملہ میرے لئے بہت اہم ہے اگر لوگوں کو اس واقعے کا علم ہوگیا تو لوگ مجھ سے ڈرنا چھوڑ دیں گے۔ ایک روح کے لئے اس سے زیادہ بے عزتی کی بات اور کوئی نہیں ہوسکتی۔''

''تو تم یہ چاہتی ہو کہ میں کسی کو اس واقعے کے بارے میں نہ بتاؤں'' جمی نے پوچھا۔

''ہاں'' روح نے جواب دیا۔ ''آؤ ہم ایک معاہدہ کرلیتے ہیں۔ تم کسی سے اس واقعے کا ذکر نہ کرنا اور اس کے بدلے...... اس کے بدلے۔'' روح نے کہا اور کچھ سوچنے لگی پھر ایک دم اس نے کہا۔ ''کیا خیال ہے تمہارا اگر اس کے بدلے، میں تمہیں دوسروں کی نظر سے غائب ہونے کا گر سکھا دوں......؟''

''واہ مزا آجائے گا۔'' جمی نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا۔ ''لیکن...... لیکن کیا تم خود بھی غائب ہوسکتی ہو۔؟''

''کیوں نہیں۔'' روح نے کہا اور وہ اچانک جمی کی نظروں سے غائب ہوگئی۔ جمی ہال میں تنہا رہ گیا۔ لیکن اسے روح کی آواز بدستور سنائی دے رہی تھی۔ ''دوسروں کی نظروں سے غائب ہونے کی ترکیب بہت آسان ہے اس طرح تم بغیر ٹکٹ کے کسی بھی سینما گھر میں جاکر مفت فلم دیکھ سکو گے اور اگر تم باغ میں کھیل رہے ہو اور تمہاری چچی تمہیں کسی کام کے لئے آواز دیں اور تمہارا دل کام کرنے کو نہیں چاہ رہا تو تم غائب ہوجانا اور تمہاری چچی تمہیں نہیں ڈھونڈ سکیں گی۔''

''لیکن میں چچی کی مدد کرنے میں خوشی محسوس کرتا ہوں۔'' جمی نے کہا۔ ''مہربانی کرکے تم میرے سامنے آجاؤ۔ مجھے ہوا سے باتیں کرتے ہوئے عجیب سا لگ رہا ہے۔''

''اوہ معاف کرنا۔ مجھے بالکل خیال نہیں رہا۔''

روح نے دوبارہ ظاہر ہوتے ہوئے کہا۔ وہ بدستور اسی طرح آخری سیڑھی پر بیٹھی ہوئی تھی اور جمی کو اس کے جسم کے آر پار وہ سیڑھی دھندلی دھندلی سی نظر آرہی تھی۔ ”خیر اگر تم غائب نہیں ہونا چاہتے تو میں تمہیں ننھے منے سوراخوں میں سے نکلنے کی ترکیب سکھا سکتی ہوں۔“ روح نے کہا اور وہ فضا میں تیرتی ہوئی دروازے کے پاس گئی اور پھر قفل کے سوراخ میں داخل ہوگئی۔ اس طرح جیسے پانی غسل خانے کی نالی میں داخل ہوکر غائب ہوجاتا ہے اور پھر وہ اسی قفل کے سوراخ میں سے واپس آگئی۔

”یہ ترکیب بھی بہت کارآمد ہے۔“ روح نے کہا۔ ”اس طرح تم کسی بھی بند کمرے میں جاسکتے ہو بلکہ ہر اس جگہ جاسکتے ہو جہاں ہوا جاسکتی ہے۔“

”نہیں“ جمی نے سر ہلایا۔ ”میں صرف ایک شرط پر تیار ہوسکتا ہوں۔ اگر تم یہ مکان چھوڑ دو اور کسی دوسری جگہ رہنے لگو۔ مثلاً اس مکان میں جو اسی سڑک پر آگے جاکر بنا ہوا ہے۔ وہاں کوئی نہیں رہتا۔“

”اس کباڑ خانے میں!“ روح نے کہا اور پیٹ دبا کر بے تحاشہ ہنسنے لگی۔ ”جس کے دروازے اور کھڑکیاں ٹوٹی ہوئی ہیں اور جگہ جگہ سے چھت ٹپکتی ہے۔ نہیں شکریہ تمہیں معلوم ہے جب طوفان آتا ہے تو اس مکان کی کیا حالت ہوتی ہے۔ دروازے اور کھڑکیاں زور زور سے بجتی ہیں۔ بارش کا پانی پورے مکان میں ٹپکتا ہے اور اتنا شور ہوتا ہے کہ خدا کی پناہ، بہت بہت شکریہ، تمہیں معلوم ہے روحوں کو سب سے زیادہ کیا چیز پسند ہوتی ہے۔ تنہائی سناٹا اور سکون، یہی روحوں کی زندگی ہوتی ہے۔ اگر تین چیزیں انہیں میسر نہ ہوں تو ان کی زندگی جہنم بن جاتی ہے۔“

”لیکن یہ بھی غلط ہے۔“ جمی نے کہا۔ ”تم ایسے مکان میں رہتی ہو جو تمہارا نہیں ہے اور تمہاری وجہ سے میری چچی اس مکان کو کرائے پر نہیں دے سکتیں۔“

”میں تو نہیں روکتی تمہاری چچی کو۔“ روح نے جواب دیا۔ ”وہ بخوشی کسی کو بھی کرائے پر مکان دے سکتی ہیں اب اگر لوگ خود ہی ڈر کر مکان چھوڑ دیتے ہیں تو اس میں میرا کیا قصور؟“

”سب تمہارا قصور ہے۔“ جمی نے گرم ہوتے ہوئے کہا۔ ”تم لوگوں کو ڈراتی ہو اور میں تم سے کوئی معاہدہ نہیں کروں گا۔ میں شہر کے ایک ایک آدمی کو بتادوں گا کہ کس طرح میں نے تمہیں ڈرایا تھا۔“

”نہیں نہیں۔ ایسا مت کرنا۔“ روح نے جلدی سے کہا۔ وہ واقعی پریشان ہوگئی تھی اور اسی بوکھلاہٹ میں وہ کئی مرتبہ جلدی جلدی جمی کی نظروں سے غائب ہوئی اور پھر ظاہر ہوئی۔ ”اگر یہ بات پھیل گئی تو ملک کی ہر روح پریشان ہوجائے گی، لوگ ہم سے ڈرنا چھوڑ دیں گے اور ہماری زندگی جہنم بن جائے گی۔“

اس طرح وہ دونوں بہت دیر تک بحث کرتے رہے۔ روح کا کہنا تھا کہ ”اگر جمی دولت چاہتا تو وہ غائب ہونے کی ترکیب سیکھ کر دولت کما سکتا ہے۔ وہ کسی سرکس میں بہت بڑی تنخواہ پر ملازم ہوسکتا ہے۔ اس کے غائب ہونے کا کمال دیکھ کر کوئی بھی سرکس والا اسے بہت بڑی تنخواہ پر ملازم رکھ لے گا۔“

لیکن جمی کا کہنا تھا کہ ”وہ سرکس میں ملازمت نہیں کرنا چاہتا۔ وہ ڈاکٹر بننا چاہتا ہے۔“ جمی اپنے ارادے پر اٹل تھا۔ آخر روح بے بسی کے عالم میں رونے لگی۔

”اچھے لڑکے یہ گھر میری آرام گاہ ہے۔“ روح نے روتے ہوئے کہا۔ ”میں یہاں تیس سال سے مقیم ہوں۔ میں اسے چھوڑ کر کہاں جاؤں، تم مجھے یہاں سے نکال کر ظالم دنیا کے رحم وکرم پر چھوڑنا چاہتے ہو اور کس لئے؟ صرف چند ٹکوں کی خاطر! تم کتنے ظالم ہو، کتنے بے رحم ہو لڑکے، کتنے سنگدل ہو۔“ روح روتی رہی تاکہ جمی آخرکار خود کو ظالم محسوس کرلے۔

لیکن جمی نے خود کو ظالم محسوس نہیں کیا کیونکہ اسی روح نے تیس سال کے عرصے میں کتنے ہی خاندانوں کو اس مکان سے نکال دیا تھا اور ساتھ ہی جمی یہ بھی جانتا تھا کہ اگر لوگوں کو یہ بتا بھی دے کہ اس نے روح کو ڈرادیا

تھا تو خود اسے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ کوئی بھی اس پر یقین نہیں کرے گا اور وہ کس طرح ان پر ثابت کرے گا کہ وہ صحیح کہہ رہا ہے؟ جمی نے کچھ دیر غور کرنے کے بعد روح سے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے۔ تم مجھے غائب ہونا سکھادو اور میں کسی کو نہیں بتاؤں گا کہ میں نے تمہیں ڈرادیا تھا۔“ اس طرح دونوں کے درمیان معاہدہ ہوگیا۔

جمی نے اس روز کے واقعے اور معاہدے کے بارے میں اپنی چچی سے بھی کوئی ذکر نہیں کیا۔ وہ ہر ہفتے باقاعدگی سے غائب ہونے والی ترکیب سیکھنے جاتا رہا۔ جمی نے خوب محنت کی اور جب چھ ہفتوں بعد روح نے اس کا امتحان لیا تو وہ امتیازی نمبروں سے اس امتحان میں کامیاب ہوا۔ اسے روح نے بی گریڈ دیا جو ایک گوشت پوست کے انسان کے لئے بہترین گریڈ ہوتا ہے۔ جمی نے روح کا شکریہ ادا کیا اور اس سے مصافحہ کیا۔

”خدا حافظ“ جمی نے کہا۔ ”ہماری بہت جلد ملاقات ہوگی۔“

”کیا مطلب؟“ روح نے مشتبہ لہجے میں پوچھا لیکن جمی زور سے ہنستا ہوا وہاں سے بھاگ گیا۔

اس رات کھانے کی میز پر اس کی چچی نے اس سے پوچھا۔ ”تم آج دن بھر کیا کرتے رہے جمی؟“

”آنٹی میں غائب ہونے کی ترکیب سیکھ رہا تھا۔“ جمی نے اطمینان سے جواب دیا۔

”پھر تو بڑا مزا آیا ہوگا۔“ اس کی چچی نے ہنستے ہوئے کہا۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ جمی مذاق کررہا ہے۔

”سچ آنٹی میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ دادا جان کا مکان ہے نا اس کی روح نے مجھے یہ ترکیب سکھائی ہے۔“

”مجھے ایسا مذاق پسند نہیں جمی۔“ چچی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ”سچ سچ بتاؤ کہ تم سارا دن کہاں رہے......؟“

جمی فوراً غائب ہوگیا۔

”ادھر آؤ جمی کہاں گئے تم؟“ اس کی چچی نے چلا کر کہا۔

”میں یہاں تو بیٹھا ہوں آنٹی۔ آپ کے سامنے۔“ جمی نے کہا لیکن وہ بدستور غائب تھا۔

”میرے خدا!“ آنٹی نے کہا اور کرسی کھسکا کر اپنی آنکھیں صاف کرنے لگیں اور پھر جمی کی کرسی کی طرف دیکھا لیکن جمی بدستور غائب تھا جمی کو اپنی چچی کو قائل کرنے کے لئے بہت محنت کرنی پڑی اور مزید دو مرتبہ غائب ہوکر دکھانا پڑا اس نے اپنی چچی کو پورا واقعہ سنایا لیکن اس نے وعدے کے مطابق یہ نہیں بتایا کہ اس نے روح کو بری طرح ڈرایا تھا دونوں میں بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں جمی نے اپنی چچی سے کہا کہ اس کے ذہن میں روح کو اس مکان سے نکالنے کا ایک عمدہ منصوبہ ہے جس کے لئے اسے ان کی مدد کی ضرورت ہے۔

دوسرے روز جمی کی چچی اپنے پرانے مکان پر گئیں اور کام شروع کردیا اور انہوں نے تمام کھڑکیاں کھول کر جھاڑیں۔ تمام کمروں کی صفائی کی۔ جھاڑو نکالی۔ پانی سے فرش دھویا۔ اور اس عمل میں وہ جس قدر شور کرسکتی تھی انہوں نے کیا۔ اس شور وغل سے روح بہت پریشان ہوئی کیونکہ اس کے آرام میں خلل پڑ رہا تھا۔ آخر اسے اپنے کمرے سے نکلنا پڑا۔ وہ فضا میں تیرتی ہوئی اس کمرے میں آئی جہاں جمی کی چچی جھاڑو دے رہی تھیں وہ روح کو دیکھ کر ڈر گئیں۔ انہوں نے روح پر جھاڑو پھینک ماری۔ جھاڑو روح کے جسم سے پار ہوگئی اور روح بدستور دونوں ہاتھ پھیلائے اپنے حلق سے عجیب عجیب آوازیں نکالتی ہوئی ان کی طرف بڑھتی رہی اور وہ پیچھے ہٹتی رہی۔

جمی اس تمام عرصے میں اس کمرے میں موجود رہا لیکن وہ اس وقت غائب تھا۔ روح یہ سمجھ رہی تھی کہ کمرے میں جمی کی چچی کے علاوہ اور کوئی نہیں ہے اس لئے وہ پوری تندہی سے انہیں ڈرانے میں مصروف تھی۔ اچانک جمی نے روح کے سامنے ظاہر ہوکر زور سے ”ہاؤ“ کا نعرہ لگایا اور روح ایک بھیانک چیخ مار کر بے

ہوش گئی۔

جیسے ہی جمی کی چچی نے یہ منظر دیکھا ان کا سارا خوف دور ہوگیا پھر دونوں مل کر روح کو ہوش میں لانے کی ترکیبیں کرنے لگے۔ آخر کار ان کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں اور روح کو ہوش آگیا۔ روح نے جمی کو دیکھتے ہی غصے سے کہا۔ ''تم نے وعدہ خلافی کی ہے۔''

''نہیں میں نے وعدہ خلافی نہیں کی۔'' جمی نے کہا۔ ''میں نے وعدہ کیا تھا کہ میں کسی کو یہ نہیں بتاؤں گا کہ میں نے تمہیں ڈرایا تھا لیکن میں نے اس بات کا وعدہ نہیں کیا تھا کہ میں آئندہ کبھی تمہیں نہیں ڈراؤں گا۔''

جمی کی چچی نے غور سے روح کو دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم روح ہو؟'' میرا خیال تھا کہ لوگوں نے خواہ مخواہ اس مکان کے بارے میں کہانیاں گڑھ لی ہیں۔ خیر معاف کرنا میرے پاس وقت کم ہے اور مجھے کام بہت کرنا ہے۔ یہ کہہ کر وہ دوبارہ اپنے کام میں جٹ گئیں۔ اس مرتبہ وہ پہلے سے بھی زیادہ شور کررہی تھیں وہ زور زور سے دروازے بند کرتیں۔ کرسیاں پٹختیں، کھڑکیاں کھولتیں اور بند کرتیں اور جھاڑو کو پوری قوت سے دیواروں پر مارتیں۔

روح نے گھبرا کر اپنا سر پکڑلیا۔ ''اتنا شور خاتون کیا آپ آہستہ آہستہ کام نہیں کرسکتیں؟''

''تم کون ہو اعتراض کرنے والی۔'' جمی کی چچی نے کہا۔ ''کیا یہ مکان تمہارا ہے؟ اگر تمہیں شور پسند نہیں ہے تو کسی دوسرے مکان میں چلی جاؤ۔''

جھاڑو کی وجہ سے کمرے میں گرد و غبار اڑ رہا تھا۔ روح کو کئی چھینکیں آئیں کیونکہ مٹی اس کی ناک میں گھس گئی تھی۔ ''معاف کیجئے گا۔'' روح نے معذرت کرتے ہوئے کہا۔ ''مٹی اتنی اڑ رہی ہے۔ ارے وہ لڑکا کہاں گیا......؟'' روح نے چونک کر پوچھا کیونکہ جمی پھر غائب ہوگیا تھا۔

''مجھے کیا معلوم۔'' جمی کی چچی نے جھاڑو سے گرد و غبار اڑاتے ہوئے کہا۔ ''شاید وہ تمہیں دوبارہ ڈرانے کی تیاری کررہا ہے۔''

''آپ اس پر کنٹرول رکھا کریں۔'' روح نے سخت لہجے میں کہا۔ ''اگر وہ میرا لڑکا ہوتا تو میں اس کی چمڑی ادھیڑ دیتی۔''

''میری طرف سے تمہیں اس کی اجازت ہے۔'' جمی کی چچی نے جواب دیا اور انہوں نے روح کے جسم کے اندر اپنا ہاتھ ڈال کر کرسی پر پڑے ہوئے کشن کو اٹھایا اور جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''اب تمہیں شکایت نہیں ہونی چاہیے روح اس کرسی پر سے اٹھ کر دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔

''لیکن میں تمہیں اس کا مشورہ نہیں دوں گی۔'' روح نے کہا۔ ''کیونکہ آج سے میں اور جمی رات کو یہیں سویا کریں گے اور تم نے وہ ضرب المثل سنی ہوگی کہ دریا میں رہ کر مگر مچھ سے بیر رکھنا دانشمندی نہیں ہوتی۔''

''ہا......ہا......ہا''......روح نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''دریا مگر مچھ ہو......ہو......ہو......''

''ہو......ہو......ہو۔'' جمی نے روح کے قریب ظاہر ہوتے ہوئے کہا۔ ''یہ میں جمی ہوں۔'' روح نے زیر لب بڑبڑا کر کچھ کہا اور پھر وہ غائب ہوگئی۔

رات کے وقت جمی کی چچی نے دونوں کانوں میں روئی ٹھونسی اور اس مکان کی سب سے آرام دہ خواب گاہ میں روشنی جلا کر سوگئیں۔ روح پہلے تو خوب چلائی۔ بھیانک آوازیں نکالتی رہی۔ لیکن جب ان آوازوں کا ان دونوں پر کوئی اثر نہ ہوا تو اس نے اپنے مہلک ترین ہتھیار سے کام لینے کا فیصلہ کیا یہ ہتھیار دو سرخ انگاروں کی طرح دہکتی ہوئی بڑی بڑی آنکھیں تھیں جنہیں دیکھ کر اس سے پہلے بڑے بڑے سورما میدان چھوڑ کر بھاگ گئے تھے لیکن اس ترکیب کو استعمال کرنے سے پہلے وہ جمی کی طرف سے اطمینان کرلینا چاہتی تھی کہ جمی کہاں ہے۔ اس نے مکان کا ایک ایک کونا دیکھ لیا لیکن اسے جمی نظر نہیں آیا حالانکہ وہ خود اس وقت غائب تھی لیکن جمی کو

بھی غائب پایا وہ گھبرا گئی۔ اسے یہی دھڑکا لگا رہا کہ کسی بھی لمحے جمی کسی کونے سے اچھل کر اس پر حملہ کرکے اسے ڈرا دے گا۔ اس خوف نے اس کی بری حالت کردی اور وہ اتنی تھک گئی کہ تہ خانے میں جا کر ساری رات کوئلے کی کوٹھری میں پڑی رہی۔

اس کے بعد آنے والے روز بھی روح کے لئے اتنے ہی تکلیف دہ ثابت ہوئے۔ اس نے کئی مرتبہ جمی کی چچی کو ڈرانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اس پر کوئی توجہ نہ دی۔ اس عرصے میں خود جمی نے دو مرتبہ روح کو بری طرح ڈرا دیا اور وہ بے ہوش ہوتے ہوئے بچی۔ شاید وہ روح خود روحوں کے معیار کے مطابق بھی کچھ ڈرپوک تھی۔ بہت جلد اس روح کی حالت تباہ ہوگئی۔ وہ بے حد پریشان رہنے لگی۔ اس نے جمی کی چچی سے پہلے بحث کرکے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی اور پھر رحم کی اپیل کی۔

ایک مرتبہ تو وہ خوب روئی لیکن جمی کی چچی کا دل نہیں پسیجا اور وہ اپنی بات پر اڑی رہیں۔ انہیں اس مکان میں روح کے قیام پر کوئی اعتراض نہیں تھا۔ وہ روح کو اپنا مکان کرائے پر دینے کے لئے تیار تھیں اگر وہ روح باقاعدہ دوسرے کرائے داروں کی طرح اس مکان کا کرایہ ادا کرے۔ اور اگر وہ کرایہ ادا نہیں کرسکتی تو پھر وہ اس...... مکان میں کیوں نہیں جا بستی جو برسوں سے ویران پڑا ہے۔

جب پورا مکان صفائی ستھرائی کے بعد آئینے کی طرح چمکنے لگا تو جمی کی چچی قصبے کے ہوٹل میں گئیں۔ جہاں اس زمانے میں مسٹر اور مسز ڈسلر مقیم تھے کیونکہ کرائے پر کوئی مناسب مکان نہیں مل رہا تھا۔ انہوں نے مسٹر ڈسلر کو اپنا مکان کرائے پر دینے کی پیش کش کی۔ جیسے ہی انہوں نے آسیب زدہ مکان کا نام سنا تو......فوراً انکار کردیا۔

''لیکن مسٹر ڈسلر وہ سب کہانیاں جھوٹی ہیں، میں خود ایک ہفتے سے اس مکان میں سو رہی ہوں اور میرے ساتھ میرا بھتیجا جمی بھی وہیں رہتا ہے، وہ بارہ سال کا ہے۔ اگر آپ چاہیں تو جمی آپ کے ساتھ اس مکان میں سو سکتا ہے اور جب آپ کو یقین ہوجائے کہ مکان آسیب زدہ نہیں ہے تو جمی اس مکان میں نہیں سوئے گا۔''

''واہ وہ بارہ سال کا لڑکا۔'' مسٹر ڈسلر نے کہا۔ ''وہ ایک منٹ کے لئے بھی نہیں ٹھہرے گا اس مکان میں۔''

جمی کی چچی نے فوراً جمی کو بلوایا۔

''میں چچی کے ساتھ وہاں پچھلے پورے ہفتے سویا ہوں اور اب بھی وہاں سونے پر تیار ہوں۔'' جمی نے کہا لیکن اس کے باوجود مسٹر ڈسلر نے مکان کرائے پر لینے سے انکار کردیا۔ اس پر جمی کی چچی نے پورے قصبے کو فرداً فرداً گفتگو سنادی۔ اب لوگوں نے ڈسلر کا مذاق اڑانا شروع کردیا کہ ایک بارہ سال کا بچہ مکان میں رہنے پر تیار ہے لیکن یہ سن کر مسٹر ڈسلر اور ان کی بیوی بچے اس قدر شرمندہ ہوئے کہ انہوں نے خود آکر جمی کی چچی سے وہ مکان کرائے پر دینے کی درخواست کی تاکہ اپنے چہروں سے بزدلی کا داغ دھو سکیں اور اسی روز وہ خاندان اس آسیب زدہ مکان میں منتقل ہوگیا۔

جمی مسٹر ڈسلر اور ان کے خاندان کے ساتھ اس مکان میں ایک ہفتے تک رہا۔ لیکن اس ایک ہفتے کے دوران کسی کو بھی وہ روح نظر نہیں آئی نہ کسی قسم کی بھیانک آوازیں سنائی دیں۔ پھر ایک روز جمی کو اسکول کے ایک لڑکے نے بتایا کہ بوسیدہ اور ویران مکان میں اس نے ایک روح کو دیکھا ہے تب جمی کو یقین ہوگیا کہ روح نے ان کا مکان چھوڑ دیا ہے اور مجبوراً اس ٹوٹے ہوئے کباڑ خانے میں، بقول روح کے، رہائش اختیار کرلی ہے۔

چند روز بعد جمی اس روح سے ملنے کے لئے اسی ٹوٹے ہوئے گھر میں پہنچا۔ اس بوسیدہ مکان کا کوئی دروازہ تھا ہی نہیں اس لئے جمی بے دھڑک اندر داخل ہوگیا۔ اسے اندر سے کسی کے رونے کی آواز سنائی دی۔

غالباً وہ روح رو رہی تھی۔ پھر کچھ دیر بعد روح نیچے آئی۔ ”لڑکے خدا کے لئے میرا پیچھا چھوڑ دو۔“ روح نے بے بسی سے کہا۔ ”میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ اب تو مجھے سکون سے رہنے دو۔“

جمی نے کہا۔ ”وہ صرف اس سے ملنے اور یہ پوچھنے آیا ہے کہ اس کی زندگی کیسی گزر رہی ہے؟“

”بس گزر رہی ہے۔“ روح نے افسردگی سے جواب دیا۔ ”میرے نقطہ نظر سے یہ بہت اچھی جگہ ہے۔ خاموش ویران، یہاں کوئی نہیں آتا۔“

”ٹھیک ہے۔“ جمی نے کہا۔ ”اگر تم ہمارے کرائے داروں کو پریشان نہ کرنے کا وعدہ کرو تو میں بھی تمہیں پریشان نہیں کروں گا لیکن اگر تم اس مکان میں واپس آنے کی کوشش کی تو۔“

”نہیں میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔“ روح نے جلدی سے جواب دیا۔ مکان کرائے پر اٹھ جانے کے بعد جمی اور اس کی چچی کے مزے آ گئے۔

جمی کے ڈھیر سارے کپڑے بن گئے اور اب وہ ہفتے میں ایک مرتبہ اور کبھی کبھی دو مرتبہ فلم بھی دیکھنے لگے۔ روح سے جمی مانوس ہو گیا تھا اس لئے وہ اس سے ملنے کے لئے ہفتے میں ایک مرتبہ ضرور جاتا تھا۔ بہت جلد وہ آپس میں گہرے دوست ہو گئے۔

اس سال کرسمس کے موقعے پر جمی نے روح کو اپنے گھر کھانے کی دعوت دی جسے اس نے شکریہ کے ساتھ قبول کر لیا۔ ظاہر ہے روح نے کچھ نہیں کھایا لیکن وہ روشن اور گرم مکان میں آ کر بہت خوش ہوئی اور اس نے خوب باتیں کیں۔ روح نے جمی کو کئی اور ترکیبیں سکھائیں جن میں سب سے عمدہ ترکیب انگاروں کی طرح روشن اور دہکتی ہوئی آنکھوں والی ترکیب تھی۔ یہ ترکیب بعد میں جمی کے بہت کام آئی۔ جب وہ ڈاکٹر بن گیا تو وہ لوگوں کے گلے کا معائنہ اسی ترکیب سے کرتا تھا اور اسے معلوم ہو جاتا تھا کہ مریض کے ٹونسل نکالنے پڑیں گے یا دوا سے علاج ہو جائے گا۔

جمی کی چچی بھی روح کو بہت پسند کرنے لگی تھیں اور وہ روح بھی بہت شریف اور ہنس مکھ تھی۔ جب سردیاں آئیں تو جمی کی چچی یہ سوچ کر پریشان ہو گئیں کہ اس ٹوٹے پھوٹے مکان میں جس میں آگ کا انتظام تو ایک طرف رہا کھڑکیاں اور دروازے تک نہیں ہیں۔ روح بے چاری کس طرح سردی سے بچاؤ کرتی ہو گی؟ روح نے انہیں بتایا کہ روحوں پر موسم کا اثر نہیں ہوتا اس کے باوجود وہ فکر مند رہیں۔

”ہو سکتا ہے روحوں پر موسم کا اثر نہ ہوتا ہو۔“ جمی کی چچی نے کہا۔

”لیکن اس کے باوجود ایسی جگہ پر رہنا بہت دشوار اور تکلیف دہ ثابت ہو گا۔“

جمی کی چچی نے روح کے لئے سوئٹر اور دستانے تیار کئے اور جب انہوں نے روح کو دونوں چیزیں دیں تو روح اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار اس کے آنسو بہنے لگے۔ خود جمی کی چچی بھی رونے لگیں۔ جمی نہیں رویا لیکن اس نے کہا۔ ”کیا خیال ہے آنٹی اگر یہ سردیاں ہمارے ساتھ ہمارے مکان میں گزار لیں؟“

”مجھے خوشی ہو گی۔“ جمی کی چچی نے کہا اور روح کی طرف دیکھا۔ جمی اور اس کی چچی کے اصرار پر روح سردیاں ان کے ساتھ گزارنے پر تیار ہو گئی۔ جب سردیاں ختم ہو گئیں تو جمی کی چچی کی روح سے اتنی گہری دوستی ہو گئی تھی کہ انہوں نے اسے جانے نہیں دیا کیونکہ جمی اسکول جاتا تھا اور اس کی غیر موجودگی میں اس کی چچی بور ہوا کرتی تھیں لیکن روح کی موجودگی میں وہ ان سے باتیں کرتی رہتیں اور اپنا کام کرتی رہتیں۔ اس طرح ان کا دن بڑے مزے میں کٹ جاتا اور رات کو کھانے کی میز پر وہ تینوں خوب باتیں کرتے۔ درحقیقت وہ روح ان کے گھر کا ایک فرد بن گئی تھی۔ اور آج تک وہ ان کے ساتھ رہتی ہے۔

فالج زدہ

قاسم رضا۔ چنیوٹ

چیخوں کی آواز سے نوجوان کے کان کے پردے پھٹے جارہے تھے، بہت ہی دردناک منظر تھا۔ اس جگہ ایسے نرمادہ تھے جو شکل و دھڑ سے سور اور ٹانگیں انسان جیسی تھیں وہ کربناک آواز میں چیخ رہے تھے۔

قدرت کے نافذ کردہ قوانین کو نہ ماننے والوں کے لئے اپنی نوعیت کی دلگرفتہ عبرتناک کہانی

”**میری** بات مانو بیٹی! ایسا مت کرو، ہمارا مذہب ہمیں اس بات سے منع کرتا ہے، خدا کے بنائے اصولوں کے خلاف جو بھی اپنی مرضی کرتا ہے اس کا انجام برا ہوتا ہے۔“ بوڑھے متان نے اپنی جوان بیٹی کو پیار سے سمجھایا۔

”کیسی بات کر رہے ہیں آپ! کون سا مذہب؟ چند لوگوں کی خودساختہ باتوں کو آپ نے مذہب کا نام دے دیا ہے۔ اور میں کوئی غلط کام نہیں کرنے جا رہی، بہت پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے۔ اب میری یہ خواہش ہے تو اس میں مذہب آڑے آ رہا ہے۔ میں ایسے اصولوں کو نہیں مانتی۔ آپ کان کھول کر سن لیں میرا دل جو کہے گا میں وہی کروں گی۔“ سوزا جیسے پھٹ پڑی۔

بوڑھے نے مدد طلب نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا اور بولا ”جمیس بیٹا! تم ہی سمجھاؤ اسے یہ نادان ہے

اسے علم نہیں یہ کیا کرنے جارہی ہے تم تو بہت سمجھدار ہو اسے سمجھاؤ۔ اگر یہ ایسا کرے گی تو شاید خدا کا قہر ہم تینوں سمیت اس ساری بستی کو بھی تہس نہس کردے گا۔"

"والد محترم! سوزا جو کہہ رہی ہے بالکل ٹھیک کہہ رہی ہے۔ پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے مگر کبھی کسی کو اس بات کا خمیازہ نہیں بھگتنا پڑا۔ میں سوزا کی بات سے متفق ہوں اور اس میں میری اپنی خواہش بھی شامل ہے۔" جمیس جواب تک چپ بیٹھا سن رہا تھا بہت نرمی سے مگر فیصلہ کن انداز میں بولا۔

"میرے بچو! وہ لوگ جاہل تھے ان کے پاس بھی گاہے گاہے خدا کے نیک بندے آتے رہے مگر انہوں نے ان کو سنا نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ خدا اور اس کے بنائے ہوئے اصولوں سے مخالفت کرنے والے لوگ دنیا میں ہی ذلیل وخوار ہوئے۔ مگر میں نے تمہاری مذہبی تعلیم میں کوئی کسر نہیں چھوڑی پھر تم کیوں نہیں سمجھتے یہ جو تم کرنے جارہے ہو یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ میں تمہیں اس کی ہرگز اجازت نہیں دوں گا۔"

بوڑھا منان آخری جملہ غصے سے کہتا ہوا اٹھ کر کمرے سے باہر چل پڑا۔

"تو ہماری بھی آخری بات سنتے جایئے! ہم اپنی مرضی کریں گے اور اگر کسی کی طاقت ہے تو اسے کہو کہ ہمیں آکے روک لے۔" جمیس نے چلاتے ہوئے کہا۔

بوڑھا منان دروازے کے پاس جاکر رک گیا اور پلٹ کر ایک نظر دکھ سے دونوں کی طرف دیکھا اور دروازے سے باہر نکل گیا۔ اس کی نم آلود آنکھوں سے گالوں پر پھسلتے آنسو جمیس اور سوزا کو اپنے ارادے سے باز رکھنے میں ناکام رہے۔

☆......☆......☆

جانے اس ہوٹل میں ایسا کیا تھا کہ وسیم الدین کو یہاں آئے ابھی دن بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ دو لوگ تو اسے یہاں نہ ٹھہرنے کا مشورہ دے چکے تھے۔

وسیم کالج کے طبیعات کے شعبے میں لیکچرار تھا۔ اور جب بھی گرمیوں کی چھٹیاں ہوتی تھیں تو وہ کسی صحت افزاء مقام کی طرف کوچ کر جاتا تھا۔

اس وقت بھی وہ گرمیوں کی چھٹیاں منانے کے لئے انتہائی خوبصورت علاقے میں آیا ہوا تھا۔ وہ طبیعات کا لیکچرار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا اسٹوری رائٹر بھی تھا۔ اس کی تحریریں پراسراریت پر مبنی ہوتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ پورے ملک میں اس کی اسٹوریز کا ڈنکا بجتا تھا۔ جہاں وہ پراسراریت پر کہانیاں لکھتا تھا، وہ پراسرار علوم کا تجسس بھی رکھتا تھا۔ تسخیر ہمزاد، تسخیر جن، ٹیلی پیتھی، ہپناٹزم اور اس طرح کے کئی علوم پر وہ پریکٹیکل بھی کرچکا تھا۔ مگر بدقسمتی سے ہپناٹزم کے علاوہ کسی علم پر اسے دسترس نہ ہوسکی۔ وسیم الدین کے لئے اتنا بھی بہت تھا۔ مگر وہ اس علم کا استعمال بھی نہ ہونے کے برابر کرتا تھا۔

وہ گرمیوں کی چھٹیاں گزارنے اس دلکش جنت نظیر وادی میں آیا تھا۔ مگر جب سے اس نے الگ تھلگ بنے ہوٹل میں اپنی رہائش کی تھی تب سے آس پاس کے لوگ اسے ایسے گھور رہے تھے جیسے وہ کسی دوسری دنیا سے آیا ہو۔ اور ایک آدھ نے تو کانوں کو بھی ہاتھ لگایا تھا۔

جب تیسرے آدمی نے وسیم الدین کو جلد از جلد اس ہوٹل کو چھوڑنے کا مشورہ دیا تو اس سے رہا نہیں گیا اور وہ ناگواری سے بولا۔

"آپ کون ہیں اور کیوں مجھے ہوٹل چھوڑنے کا کہہ رہے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ آپ دوسرے ہوٹلوں کے کارندے ہیں جو یہاں آنے والے سیاحوں کو اپنے ہوٹلوں میں آنے کی ترغیب دیتے ہیں۔"

"میری طرف غور سے دیکھو اور بتاؤ کہ کیا میں شکل سے کسی ہوٹل کا کارندہ لگتا ہوں میری بات کو اگر مان لو گے تو محفوظ رہو گے۔ ورنہ......" اجنبی نے اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔" تب وسیم نے اس کے حلیے کا بھرپور جائزہ لیا۔ وہ واقعی کسی طرح سے بھی اس طرح کا آدمی معلوم نہیں ہوتا تھا۔ سفید شرٹ کالی پینٹ اور اس پر گرے رنگ کی ٹائی میں ملبوس وہ کوئی سلجھا ہوا شخص لگ رہا تھا۔

اب وسیم گیلانی کو اپنی کہی ہوئی باتوں پر شرمندگی ہورہی تھی۔ اس لئے خفت مٹانے کے لئے اس نے ہاتھ آگے بڑھایا اور بولا۔ "میرا نام وسیم الدین ہے اور آپ کا؟"

"نبیل!" اجنبی نے مصافحہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"مگر آپ مجھے اس ہوٹل میں ٹھہرنے سے منع کیوں کررہے ہیں؟" وسیم نے اپنے دبے ہوئے تجسس سے مجبور ہوکر کہا۔

"کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ تم "فالج زدہ" ہوجاؤ۔" ڈاکٹر نبیل نے سنجیدگی سے کہا۔

"واٹ!" فالج زدہ، "یہ کیا بات ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب اب تو مجھے شک پڑتا ہے کہ آپ کی اپنی طبیعت خراب ہے۔" وسیم کے لہجے میں ناگواری پھر سے عود کر آئی۔

"میں بالکل سچ کہہ رہا ہوں یہاں آنے والا جو بھی شخص اس ہوٹل میں رہنے کی جرأت کرتا ہے وہ فالج کا شکار ہوجاتا ہے۔" ڈاکٹر نبیل نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا اب کی بار ڈاکٹر نبیل کا انداز غصیلا تھا۔

"فالج زدہ۔" واہ یہ تو کسی فلم یا کہانی کا نام ہونا چاہیے۔ وسیم استہزائیہ انداز میں ہنسنے لگا۔

"میرا کام تھا تمہیں روکنا، آگے تمہاری مرضی۔ میں دعا کرتا ہوں کہ تمہارا انجام ویسا نہ ہو جو پہلے آنے والے لوگوں کا ہوا ہے۔" ڈاکٹر نبیل نے عجیب انداز سے اسے گھورا اور چل دیا۔

وسیم کو ابھی تک ہنسی آرہی تھی۔ کافی دیر وہ وہاں کھڑا رہا اور پھر ہوٹل کی راہ لی۔ ہوٹل پہنچ کر وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس ہوٹل میں اب تک اسے ایک آدمی کے علاوہ نہ کوئی ویٹر نظر آیا تھا اور نہ کوئی دوسرا۔ طاہر پاشا ہی اس ہوٹل کا سب کچھ تھا۔ اور اس نے اسے کمرہ دیتے وقت عجیب سرسری انداز میں کہا تھا۔ "اپنے کام سے کام رکھنا اور اپنے کمرے تک محدود رہنا۔"

وسیم کو تو لکھنے کے لئے تنہائی کی ہی ضرورت تھی سونے پر سہاگہ کہ اس کے علاوہ ہوٹل میں اور کوئی نہیں تھا۔ تو ایسی سچویشن میں کہانی لکھنا اس کے لئے بہت موزوں تھا۔ ایک تو تنہائی میں وہ یکسوئی سے کہانی کا پلاٹ بنا سکتا تھا دوسرے اس کے کام میں کوئی مخل بھی نہیں ہوتا، یہی وجہ تھی کہ اس نے طاہر پاشا کے کہے ہوئے الفاظ کو من وعن تسلیم کیا اور ان پر کوئی توجہ نہ دی۔

مگر ڈاکٹر نبیل سے ملاقات کے بعد وہ سوچ رہا تھا کہ "ضرور ایسی کوئی بات اس ہوٹل سے جڑی ہوئی ہے جو طاہر پاشا بتانا نہیں چاہتا اور اسی بات کی وجہ سے دوسرے لوگ اس ہوٹل سے خائف ہیں۔ ان خیالات کے آتے ہی اس کی متجسس فطرت جاگ اٹھی۔

شام ہوچکی تھی اور وہ کافی اندھیرا ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ وسیم نے طے یہ کیا تھا کہ جب طاہر پاشا سوجائے گا تو وہ اس ہوٹل کو اچھے طریقے سے دیکھے گا۔ اور اس کے لئے اسے بارہ بجنے کا انتظار تھا۔ خدا خدا کرکے بارہ بجے اور آہستگی سے اپنے کمرے سے نکلا اور دبے قدموں چلتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ طویل کاریڈور کے اختتام پر ایک کمرہ بالکل سامنے کی سیدھ میں تھا اور اس کے اندر سے عجیب عجیب آوازیں آرہی تھیں۔ اس کا تجسس بھڑک اٹھا تو وہ دبے قدموں چلتا آہستہ آہستہ اس دروازے کے قریب ہوتا گیا۔

آوازیں آہستہ آہستہ اونچی ہوتی جارہی تھیں۔ وہ جو خود اپنی تحریروں سے لوگوں کے اندر سنسنی کی لہر دوڑا دیتا تھا۔ آج خود ان دہشتناک غیر انسانی چیخ نما آوازوں سے ڈر کر کانپ رہا تھا۔ وہ لرزتے ہوئے دروازے کے قریب پہنچا اور دھڑکتے دل سے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو اسے معلوم ہوا کہ دروازے پر بہت بڑا تالا پڑا ہوا ہے۔

کاریڈور کے اس حصے میں روشنی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ دور لگے بلب کی روشنی ہلکی ہلکی یہاں پڑ رہی تھی جو ماحول کو اور پراسرار کررہی تھی۔ اس نے آخری کوشش کے طور پر جھولتے ہوئے قفل سے منسلک چھوٹے سے سوراخ سے آنکھ لگانی چاہی تو ایک بھاری بھرکم ہاتھ اچانک اس کے شانے پر آکے جم گیا، وہ شخص قہر آلود نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "ایک بار کہنے سے سمجھ نہیں

آئی تم کو؟ کہا تھا ناں کہ تم اپنے کام سے کام رکھنا۔ ادھر ادھر تانک جھانک تمہارے لئے خطرناک ہو سکتا ہے۔"
طاہر پاشا کو اپنا غصہ کنٹرول کرنا ناممکن ہو رہا تھا۔
"پہلے یہ بتاؤ کہ کیا ہے اس کمرے میں اور یہ کیسی غیر انسانی آوازیں آ رہی ہیں؟" وسیم نے اس کے غصے کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔
"تم کون ہوتے ہو یہ پوچھنے والے؟ اگر یہاں رہنا ہے تو سیدھی طرح رہو ورنہ اپنا بوریا بستر سمیٹو اور چلتے بنو یہاں سے۔" طاہر پاشا بپھر کر بولا۔
وسیم اس کے جارحانہ تیور دیکھ کر خاموشی سے واپس مڑ گیا۔ اور جا کے اپنے بستر پر لیٹ گیا۔ کافی دیر تک وہ طاہر پاشا کے رویے اور اس کمرے کے بارے میں سوچتا رہا پھر نہ جانے کب اس کی آنکھ لگی۔
فجر کی اذان کانوں میں پڑتے ہی وہ بستر سے اٹھ گیا۔ وہ فجر کی نماز پابندی سے پڑھتا تھا۔ اس نے نماز پڑھی اور حسب معمول سیر کے لئے نکل پڑا۔ اسے دور سے ڈاکٹر نبیل کی جھلک نظر آئی جو اس پر نظر پڑتے ہی جوگنگ کا راستہ تبدیل کرنے والا تھا۔
"ٹھہریئے ڈاکٹر صاحب!" وسیم نے دور سے آواز دی اور قدم ڈاکٹر نبیل کی طرف بڑھا دیئے۔ ڈاکٹر نبیل اسے عجیب نظروں سے دیکھ رہا تھا۔
"میں بہت شرمسار ہوں ڈاکٹر صاحب! کل میں نے آپ سے انتہائی بدتمیزی کی مگر آپ کی باتوں میں سچائی ہے۔ میں نے وہاں بہت عجیب غیر انسانی آوازیں سنی ہیں جو بہت دہشتناک تھیں۔ کیا آپ اس بارے میں کچھ جانتے ہیں؟" وسیم نے ایک ہی سانس میں سب کچھ کہہ ڈالا۔
پہلے تو ڈاکٹر نبیل اسے سرد نظروں سے گھورتا رہا پھر گویا ہوا۔ "میں اس ہوٹل کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتا، بس اتنا معلوم ہے کہ اس ہوٹل کے کسی کمرے میں کوئی ایسی چیز ہے جو اپنا آپ ظاہر نہیں کرنا چاہتی۔"
ڈاکٹر نبیل نے کچھ دیر توقف کیا اور وسیم کا چہرہ تکنے لگا جو نہ سمجھنے والے انداز میں اسے دیکھے جا رہا تھا۔
"تم ایسے نہیں سمجھو گے آؤ میرے ساتھ۔" ڈاکٹر نبیل نے اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور خود آگے چل پڑا۔ راہگیر اب بھی وسیم کو پراسرار نظروں سے دیکھ رہے تھے اور چند نوجوان تو اب بھی اونچی آوازوں سے اسے ہوٹل سے چلے جانے کا کہہ رہے تھے۔ ڈاکٹر نبیل اسے اپنے گھر لے آیا۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھانے کے بعد وہ گھر کے اندر گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد ایک اور شخص کے ساتھ باہر آیا۔ اس شخص کی حالت دیکھ کر وسیم صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ شخص ڈاکٹر نبیل کے سہارے چلا آ رہا تھا اس کی گردن ایک طرف ڈھلکی ہوئی تھی اور منہ ٹیڑھا تھا جب کہ دونوں ہاتھ فالج کی وجہ سے مڑے ہوئے تھے۔
"یہ میرا بھائی شرجیل ہے۔ اس کی حالت دیکھ رہے ہو۔ کتنی اذیت میں ہے۔" نبیل نے درد بھرے لہجے میں کہا۔
"مگر اس کی ایسی حالت کا ذمہ دار کون ہے؟" وسیم جواب معلوم ہوتے ہوئے بھی سوال کر ہی بیٹھا۔
"ایک طرح سے تو اس کی اس حالت کا ذمہ دار میں ہی ہوں۔" نبیل کے جواب سے وسیم کو شاک سا لگا۔
"آپ تو کہہ رہے تھے کہ اس ہوٹل میں جو جاتا ہے وہ "فالج زدہ" ہو جاتا ہے مگر......؟
"ہاں! وہ بھی سچ تھا۔ اس نے وہاں کوئی دہشت ناک منظر دیکھا تھا۔" نبیل نے اپنے فالج زدہ بھائی کی طرف اشارہ کیا۔ "جب یہ ہمیں بتانے لگا تو اس کی گردن اور منہ خود بخود ٹیڑھا ہونا شروع ہو گیا۔ جیسے کوئی غیر مرئی قوت چاہتی ہو کہ اس کا راز ظاہر نہ ہو۔" ڈاکٹر نبیل اتنا کہہ کر سسک پڑا۔
"پھر اس میں آپ کا کیا قصور ہوا، جو آپ اپنے آپ کو الزام دے رہے ہیں۔" وسیم نے پوچھا۔
"میرا قصور ہے کیونکہ میں نے یہ چاہتے ہوئے بھی کہ وہ غیر مرئی قوت اپنا راز ظاہر نہیں ہونے دے گی، اپنے بھائی کو مجبور کیا کہ وہ مجھے لکھ کر دے کہ وہاں پر اس نے کیا دیکھا۔ اور جیسے ہی اس نے قلم پکڑا اس کے ہاتھ

......اوہ! میں اپنے آپ کو کبھی معاف نہیں کر سکوں گا۔"
ڈاکٹر نبیل پھر سے سسکنے لگا۔ وسیم نے اسے دلاسہ دیا اور جانے کے لئے وہاں سے اٹھا۔
"میں تم کو یہی مشورہ دوں گا کہ جتنا جلدی ہو سکے وہ ہوٹل چھوڑ دو۔" ڈاکٹر نبیل اب اپنے آپ کو سنبھال چکا تھا۔
"آپ کی ہمدردی کا بہت شکریہ، میں آپ جیسے لوگوں کی دل سے قدر کرتا ہوں۔ اور آپ کے مشورے پر ضرور غور کروں گا۔ خدا حافظ۔"
وسیم وہاں سے آ تو گیا تھا۔ مگر اس کا دماغ اب بھی ڈاکٹر نبیل کی باتوں کی طرف ہی تھا۔ اسے اب یقین ہو چلا تھا کہ ضرور طاہر پاشا کے ہوٹل اور خود طاہر پاشا کے دل میں کوئی راز دبا ہے جو وہ نہیں چاہتا کہ کسی کو پتہ چلے، اور اس کی متجسس طبیعت بار بار اس سے کہہ رہی تھی کہ اس راز کا پتہ چلایا جائے۔ اسے اپنی بہترین کہانی کا پلاٹ مل چکا تھا اور یہ سنسنی خیز کہانی اس کے اندازے کے مطابق عوام میں دھماکہ کر سکتی تھی بشرطیکہ اس کہانی کا انجام ہو پاتا۔
اس نے کاغذ قلم سنبھال لیا اور تمام جزئیات لکھنے بیٹھ گیا۔ اب تک جو کچھ اس کے ساتھ پیش آ چکا تھا وہ اسے کاغذ پر اتارنے لگا۔ اس سارے کام میں وقت کیسے گزرا اسے پتہ ہی نہ چلا۔ بارہ بجے کا گھنٹہ بجتے ہی وہ چونکا۔ وسیم چاہتا تو اپنی دوسری خود ساختہ تخلیقوں کی طرح اس کہانی میں بھی کوئی مرچ مصالحہ ڈال کر اسے اختتام تک پہنچا دیتا۔ مگر وہ اس حقیقت کو حقیقت کے روپ میں لوگوں کے سامنے لانا چاہتا تھا۔ اسی لئے اس نے فیصلہ کر لیا کہ چاہے جو ہو جائے اس کمرے میں چھپے راز سے پردہ ضرور اٹھائے گا۔
اور اپنے فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے وہ اٹھا اور نہایت محتاط انداز سے کمرے سے باہر نکلا اس نے پہلے طاہر پاشا کے کمرے میں جھانکا، وہ نہایت گہری نیند میں لگ رہا تھا گاہے بگاہے نشر ہوتے اس کے خراٹے اس کی گہری نیند کی غمازی کر رہے تھے۔ وسیم اس طرف سے مطمئن ہو کر کمرے کی طرف بڑھا۔ دل پر لرزہ طاری کرتی وہ آوازیں اب بھی آ رہی تھیں جو کبھی دھیمی ہو جاتیں تو کبھی اونچی۔
وسیم دروازے کے پاس جا کر رکا اور تالے کو الٹ پلٹ کر بغور اس کا جائزہ لینے لگا۔ جمبو جیٹ سائز وہ تالا بغیر کسی ہتھیار کے کھلنے والا نہیں تھا۔
"تو تم باز نہیں آئے؟" وسیم کے عقب سے طاہر پاشا کی آواز ابھری، وسیم پلٹا اور حیرانگی سے طاہر پاشا کی طرف دیکھنے لگا جو کہ نہایت غصے سے اسے دیکھ رہا تھا۔
"تم کیا سمجھتے ہو کہ میں تمہاری طرف سے غافل ہوں؟ بالکل نہیں یہ تالا جو تم دیکھ رہے ہو!" طاہر پاشا نے انگلی کا اشارہ تالے کی طرف کیا۔ "یہ کوئی عام تالا نہیں اس میں ایک ایسا میکنزم لگایا گیا ہے کہ جب بھی اسے کوئی چھوئے گا۔ اس کا سائرن میرے کمرے میں بجے گا۔
وسیم ہونقوں کی طرح اسے منہ کھولے دیکھے جا رہا تھا۔
"اور اب تم اپنا بوریا بستر اٹھاؤ اور چلتے بنو، تمہارے جیسے جیمز بانڈ نما کرایہ دار مجھے نہیں چاہیے؟" طاہر پاشا نے اپنی سرخ ہوتی آنکھوں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
یکا یک وسیم کے ذہن میں ایک خیال بجلی کے کوندے کی طرح لپکا۔ اور اس نے طاہر پاشا کو ٹرانس میں لینا شروع کر دیا۔
"تمہاری آنکھیں بند ہو رہی ہیں۔" وسیم نے چند سیکنڈ اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے بعد کہا۔ اور واقعی طاہر پاشا نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔
"میں جو تمہیں کہوں گا وہ کرو گے کیا؟" وسیم نے تسلی کرنے کے لئے پوچھا۔
"بالکل کروں گا۔" طاہر پاشا کے منہ سے میکانکی انداز میں نکلا۔
"اس تالے کی چابی لا دو۔" وسیم نے حکم دیا۔
"اس تالے کی چابی میں نے گہری کھائی میں پھینک دی ہے۔ وہ اب نہیں مل سکتی۔" طاہر پاشا کی آواز

جیسے کنوئیں سے آرہی تھی۔

"کیا تم جانتے ہو کہ اس کمرے میں کیا ہے؟" وسیم نے اس خیال کے آتے ہی طاہر پاشا سے سوال کیا۔

"ہاں۔" طاہر پاشا کا جواب مختصر تھا۔

وسیم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ تمام معلومات ایک ہی بار اگلوا لے۔

"کیا ہے اس کمرے میں، کیا تم نے کبھی خود دیکھا ہے اس کمرے میں جا کر؟" وسیم کا ضبط جواب دینے لگا۔

"ہاں! میں ایک ہی بار اس کمرے میں گیا ہوں۔ اور وہ دہشتناک منظر دیکھا تھا۔" طاہر پاشا بھی جیسے وسیم کو زچ کرنے پر تلا ہوا تھا۔

"کیا دیکھا تھا تم نے؟" وسیم نے جیسے چیختے ہوئے کہا۔ غصہ اس کے کنٹرول سے باہر ہو رہا تھا۔ اس کا دل کر رہا تھا کہ طاہر پاشا کے گلے میں ہاتھ ڈالے اور تمام راز کھینچ لے۔

"میں نے وہاں دیکھا کہ...... آہ...... آں......"

اور پھر طاہر پاشا کا منہ ٹیڑھا ہوتا گیا اور تکلیف کے باعث وہ کراہتا ہوا زمین پر گر پڑا۔ وسیم حیرانگی سے اس کی بدلتی ہوئی کیفیت دیکھ رہا تھا۔ طاہر پاشا ٹرانس سے باہر آچکا تھا۔ اور عجیب نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔ "اب پڑ گئی کلیجے میں ٹھنڈک۔"

وسیم کو اس کی حالت دیکھ کر ترس بھی آرہا تھا اور اپنے آپ پر ندامت بھی ہو رہی تھی۔ طاہر پاشا کے متعلق اخذ کیے ہوئے اس کے تمام اندازے غلط ہو چکے تھے۔ "یہ بے چارہ تو اسے بچانے کی کوشش کر رہا تھا۔"

وسیم نے اسے سہارا دیا اور لے کر اس کے کمرے کی طرف چل پڑا۔ اسے اس کے کمرے میں چھوڑنے کے بعد وہ خود اپنے کمرے میں آگیا۔ اس نے اپنی رکی ہوئی کہانی کو آگے بڑھایا اور طاہر پاشا پر گزرنے والی بپتا لکھ دی۔

اب اسے صبح ہونے کا انتظار تھا۔ ساری رات جاگ کر گزارنے کے بعد اس نے فجر کی نماز پڑھی اور طاہر پاشا کے ساتھ کی جانے والی زیادتی کی خدا کے حضور رو کر معافی مانگی۔ ضمیر پر پڑا بوجھ رونے سے ہلکا ہوا تو وہ اٹھا۔ طاہر پاشا کے کمرے میں گیا۔ چائے بنائی اور اسے اپنے ہاتھوں سے پلا کر وہ بولا۔ "میں نے تمہارے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی ہے مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے تجسس کی وجہ سے تم اس حال تک پہنچو گے۔ میں تم سے اپنے کیے کی معافی مانگتا ہوں۔" وسیم نے اس کی ٹیڑھی گردن کو سیدھا کر کے اپنے روبرو کرتے ہوئے کہا۔

طاہر پاشا اپنے ہاتھوں سے کچھ اشارہ کر رہا تھا جس کا مفہوم وسیم یہ سمجھا کہ وہ اسے ہوٹل سے جلد از جلد نکل جانے کا کہہ رہا ہے۔

"نہیں میرے دوست! اب تو میں یہ راز جان کر ہی رہوں گا کہ آخر کون سی ایسی قوت ہے جو اس کمرے کا راز کھلنے نہیں دے رہی۔ میں ضرور جاؤں گا اور ہو سکا تو دنیا کو بھی بتاؤں گا۔ چاہے اس کے لئے مجھے جو بھی قربانی دینی پڑے۔" وسیم نے مضبوط لہجے میں کہا۔

طاہر پاشا اشاروں سے اسے روکتا رہا مگر وسیم وہاں سے اٹھا اور ہوٹل سے باہر آگیا۔ مارکیٹ سے اس نے چند ضروری اوزار خریدے اور ہوٹل کی سمت چل پڑا۔ رات ہونے میں ابھی دیر تھی۔ اور وہ یہ کام رات کو ہی کرنا چاہتا تھا۔ صبح کے وقت کمرے سے کوئی ایسی آواز نہیں آئی تھی جو اسے پراسرار بنائے۔ اور وسیم نے بھی اسی لئے رات کا وقت چنا تھا کہ جو ہوگا وہ سامنے ہوگا۔

خدا خدا کر کے رات ہوئی۔ وسیم سے صبر نہ ہوا کو گیارہ بجے ہی وہ اس کمرے کے دروازے پر جا پہنچا۔ اوزاروں والے تھیلے سے لوہا کاٹنے والی آری نکالی۔ اور تالے پر رگڑنے لگا۔ جب کافی دیر کے بعد تالا آدھا کٹ چکا تو اس نے تھیلے میں سے وزنی ہتھوڑا نکالا۔ اور ایک زوردار چوٹ تالے پر ماری۔ اسی وقت اندر سے غیر انسانی چیخوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تالا ایک ہی چوٹ سے دور جا گرا تھا۔ وسیم نے ہینڈ واچ پر وقت دیکھا۔ بارہ بج چکے تھے۔ دل دہلا دینے والی چیخوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ وسیم کا دل کہہ رہا تھا کہ واپس چلا

جائے مگر دماغ دل کی بات تسلیم نہیں کر رہا تھا۔ آخر کار دماغ کی جیت ہوئی اور وسیم نے قفل کھول دیا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھلا۔

دروازہ کھلنا تھا کہ چیخوں کا سیلاب جیسے تھم سا گیا۔ ہر سو گہرا سکوت۔ خاموشی اور سنسنی۔ کمرہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وسیم نے دیواروں کو ٹٹول کر سوئچ بورڈ ڈھونڈا اور اس پر لگے تمام بٹن یکے بعد دیگرے نیچے کر دیئے۔ کمرے میں روشنی ہونے سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ کافی دیر بعد جب وہ دیکھنے کے قابل ہوا تو کمرے کا جائزہ لیا۔ یہ کمرہ بھی دوسرے کمروں کی طرح کا تھا۔ مگر یہاں تبدیلی صرف صفائی نہ ہونے کی تھی۔ کمرہ مکڑی کے جالوں سے بھرا ہوا تھا۔ وسیم کمرے کا بغور جائزہ لے رہا تھا کہ اس کی نظر فرش کے ایک حصے پر پڑی جہاں سے قالین ہٹا ہوا تھا۔ نہ صرف قالین ہٹا ہوا تھا بلکہ وہاں ایک دروازہ نما تختہ تھا جو کھلا ہوا تھا۔ وسیم بے اختیار اس کھلے طاقچے کی طرف بڑھا۔ اس کا اندازہ تھا کہ وہاں کوئی تہہ خانہ ہوگا مگر طاقچے کے اندر نظر پڑتے ہی وہ ہکا بکا رہ گیا۔

چیخوں کا سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا تھا اور اب چیخیں ہی نہیں وہ دہشتناک منظر بھی اس کے سامنے تھا جس کو دیکھ کر نہ جانے وہ کیسے اب تک وہاں پر ٹکا ہوا تھا۔ منظر کی ہیبت اس کی توقع سے بھی کہیں زیادہ تھی۔

چیخوں کی آواز سے اس کے کان کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی اور بھی اس کمرے میں ہے۔ وہ وہاں پر بہت خوف محسوس کر رہا تھا اور پھر اچانک ہی وہ اٹھا اور دیوانہ وار بھاگتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔ اپنے کمرے میں جاتے ہی وہ بیڈ پر جا گرا۔ وہ دہشتناک منظر اب بھی اس کی آنکھوں کے آگے آ رہا تھا۔ اور اس منظر کی ہیبت سے وہ کپکپا رہا تھا۔

یکبارگی اسے اپنے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ کوئی تھا ضرور جو اسے نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے بیڈ پر پڑا لحاف اپنے ارد گرد لپیٹ لیا اور سر کو بھی لحاف میں چھپا لیا۔ اسے کسی نادیدہ قوت کی شر انگیزی کا ڈر تھا۔

مگر ساری رات اسے کسی نے نہیں چھیڑا۔

صبح کی روشنی نے اس کے اندر پھیلے ڈر کے اندھیرے کو دور کر دیا۔ حسب معمول فجر کی نماز پڑھتے ہی اس کو سکون کا احساس ہوا۔ تھوڑی دیر باہر کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے کے بعد جب وہ ہوٹل پہنچا تو کافی فریش تھا۔ اس نے اپنی ادھوری کہانی کو آگے بڑھانے کے لئے کاغذ قلم سنبھالا اور جیسے ہی اگلے حالات لکھنا شروع کیے اسے عجیب سا احساس ہونا شروع ہو گیا۔ اس نے قلم روک لیا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی غیر مرئی وجود اس کے آس پاس ہے۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ اگر اس نے اس وحشت ناک، منظر کی عکاسی کی تو بہت غلط ہوگا۔

اسی وقت ڈھلی گردن کے ساتھ طاہر پاشا اس کے کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے اس کی لکھی ہوئی کہانی کو اٹھایا اور قلم سے لکھنا شروع کیا۔ تھوڑی دیر بعد وسیم کو طاہر پاشا نے اس کا مسودہ تھما دیا وسیم نے پیج پر نظر ڈالی تو اس کی ادھوری کہانی کے آخر پر ''ختم شد'' لکھا ہوا تھا۔

''اس کا کیا مطلب ہے؟'' وسیم نے طاہر پاشا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ طاہر پاشا نے اپنے دونوں ہاتھ باندھے اور شانوں پر ڈھلکی گردن کو ہلکے ہلکے جھٹکے دینے شروع کر دیئے۔ جس کا واضح مطلب تھا کہ۔ ''یہاں سے چلے جاؤ۔ خدا کے لئے۔ یہاں سے چلے جاؤ۔''

وسیم بھی اب جیسے تھک چکا تھا۔ اس نے ہوٹل سے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اپنے کمرے میں جا کر اپنا سامان باندھنے لگا۔ مسودے کو بیگ میں ڈالتے ہوئے اس کا دل بہت اداس تھا۔ اپنی زندگی میں اس نے کوئی کہانی ادھوری نہیں چھوڑی تھی مگر یہ پہلی کہانی تھی جو مکمل ہو کر بھی نامکمل رہی تھی۔ اس نے اپنا سفری بیگ کاندھے پر لٹکایا اور ہوٹل سے باہر نکلا۔

ہوٹل کے بالکل سامنے ایک عجیب الخلقت شخص بیٹھا تھا۔ حلیے سے وہ کوئی بھیک مانگنے والا لگتا تھا۔ اس کے جسم کی نوعیت عجیب سی تھی۔ بے ڈھنگا سراپا ہاتھ پیر بڑے بڑے۔ چنگاریاں چھوڑتی آنکھیں۔ وہ وسیم کو ہی

گھور رہا تھا۔ جب سے وسیم اس ہوٹل میں آیا تھا اس نے اس شخص کو کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مگر آج جب وہ جانے لگا تھا تو اچانک یہ عجیب قسم کا فقیر اس کے سامنے تھا۔ وسیم اس سے نظر بچا کر گزر جانا چاہتا تھا کہ اس کی آواز آئی۔

''ہر کہانی اپنے انجام کو پہنچتی ہے۔ مگر تم نے اپنی کہانی ادھوری چھوڑ دی۔ منزل پر آ کر واپس جا رہے ہو بیٹا!''

اس شخص کی آواز میں اتنی مٹھاس تھی کہ وسیم کے بڑھتے قدم رک گئے۔ وہ پلٹا اور اس بھکاری نما شخص کے پاس جا بیٹھا۔ عجیب قسم کی بو اس شخص کے پاس سے آ رہی تھی۔ طبیعات کا لیکچرار ہونے کی وجہ سے وسیم کو اس بو کے پرکھنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ یہ فاسفورس کی بو تھی۔ یا تو اس شخص کے کپڑوں سے یہ بو اٹھ رہی تھی یا پھر کوئی اور وجہ تھی۔

''بابا آپ کون ہیں اور کون سی کہانی کی بات کر رہے ہیں؟'' وسیم نے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا۔

''انجان بننے سے کچھ نہیں ہوگا۔ ختم شد لکھ دینے سے کہانی ختم نہیں ہو جاتی۔ جاؤ اور حالات کا مقابلہ کرو، کود جاؤ اس تہہ خانے میں، وہی تمہاری منزل ہے، تم کامیاب لوٹو گے۔ اور تمہاری کہانی کا انجام تمہیں شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دے گا۔'' فقیر نے عجیب سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''آپ چاہتے ہیں کہ میں موت کا پھندا اپنے ہاتھوں خود اپنے گلے میں ڈال لوں۔ مجھ سے یہ نہیں ہوگا۔'' وسیم نے سر کو نفی میں ہلایا۔

''تمہیں یہ کرنا پڑے گا۔ امیدیں تم سے جڑی ہوئی ہیں وہ صدیوں سے اس عذاب میں گرفتار ہیں۔ جاؤ اور وقت ضائع کئے بغیر اس کہانی کو انجام تک پہنچاؤ۔'' اب کی بار فقیر کے لہجے میں سختی تھی۔

وسیم اٹھا اور مصمم ارادے سے ہوٹل کی جانب بڑھ گیا۔ ہوٹل کے داخلی دروازے پر پہنچتے ہی اس نے مڑ کر فقیر کی طرف دیکھا۔ مگر اب وہاں کچھ نہیں تھا۔ وسیم مسکراتا ہوا ہوٹل میں داخل ہو گیا۔ اب اسے روکنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ سیدھا کاریڈور کے آخری کمرے کی طرف گیا دروازہ جوں کا توں کھلا تھا۔ اندر جا کر اس نے ایک نظر طاقچے کے نیچے بنے خلاء میں دیکھا وہاں اب پہلے جیسی دہشت نہ تھی۔ وہ سب جیسے سکون سے سو رہے تھے عذاب کا وہ لمحہ رات کے بارہ بجے کے بعد شروع ہوتا تھا۔ اب تو سب سے زیادہ دہشت اسے ان خلاؤں میں کودنے سے ہو رہی تھی۔ نیچے آسمان پر سورج اپنی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ یہی وہ خلاء تھا جو دیکھنے والے کو دہشت زدہ کر دیتا تھا۔ خلاء میں اوپر اوپر گھر تھے جو بغیر ستونوں کے خلاء میں ٹکے ہوئے تھے۔ مگر جہاں زمین ہونی چاہیے تھی وہاں آسمان تھا۔ یعنی وہاں سب الٹ تھا۔ اس جگہ کودنے کی اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ اور اب تو وہ سور نما انسان یا انسان نما سور سوئے ہوئے تھے۔ جو رات کو عذاب میں گرفتار ہوتے تھے۔

کتنا دردناک عذاب تھا۔ جانے کہاں سے ان سوروں کے بچے نکل آتے جو کہ آدمی انسان اور آدمی سور بنی عورت کی چھاتیوں سے دودھ پیتے مگر وسیم کو اچھی طرح یاد تھا کہ دودھ کی جگہ خون کے فوارے نکلتے تھے۔ اور جب یہ عمل ختم ہو جاتا تو سارے گھروں میں آگ بھڑک اٹھتی۔ اور پھر چیخوں کا نہ تھمنے والا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ مگر صبح ہوتے ہی یہ ایسے سکون سے سو جاتے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اور اب بھی اس خلا میں جہاں تک نظر پڑتی تھی یہ مخلوق سوئی ہوئی تھی۔

آخر کار وسیم نے آنکھیں بند کیں اور خدا کا نام لے کر خلاء میں کود گیا۔ وہ گرتا جا رہا تھا۔ اور تبھی اس کو محسوس ہوا کہ وہ کسی پتے سے بھی زیادہ ہلکا ہو گیا ہے۔ کافی دیر وہ اپنے آپ کو ادھر ادھر اڑتا محسوس کرتا رہا۔ پھر جب اس کے قدموں نے زمین کو چھوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ انہی گھروں میں سے وہ ایک گھر میں تھا۔ وہ کافی دیر تک گھر میں گھومتا رہا۔ گھر میں اسے مادہ اور نر سور سوئے نظر آئے جو کہ نیچے دھڑ اور شکل سے سور تھے جبکہ ٹانگیں انسانوں جیسی تھیں۔

وہ گھر سے باہر نکلا تو ایک راہداری سی جو خلاء میں بنی ہوئی تھی دوسرے گھر تک جا رہی تھی۔ یہ راہداری چار فٹ چوڑی تھی اور اس کے نیچے گہرا نیلا آسمان پھیلا ہوا تھا۔ اس نے سر اوپر کیا تو جہاں آسمان ہونا چاہیے تھا وہاں مشرق سے مغرب تک مٹی کی ناہموار تہہ سی لگی ہوئی تھی۔ کہیں کہیں سے کسی درخت کی جڑیں نکلی ہوئی تھیں۔ وسیم حیرت سے اس جادوئی دنیا کو دیکھ رہا تھا کہ ایک آواز نے اسے پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

"کہاں کھو گئے بیٹا۔" وسیم نے آواز کی طرف منہ پھیرا تو اسے حیرت کا ایک اور جھٹکا لگا۔ جس فقیر کو اس نے ہوٹل کے باہر دیکھا تھا وہ اب اس کے سامنے تھا۔

"بابا آپ؟ یہاں کیسے اور یہ سب کیا ہے؟" وسیم نے حیرت کی زیادتی سے مغلوب ہو کر سوال کیا۔

"بیٹا میں ایک جن ہوں۔ مجھ سے ڈرو مت۔" بوڑھے نے وسیم کو پیچھے ہٹتے دیکھا تو بولا۔ "یہ الٹی دنیا ہے۔ یہاں ہم ان جنوں کو بھیجتے ہیں جنہیں سزا دی گئی ہو۔ یہاں جو بھی جن آتا ہے اپنی مقررہ سزا کی معیاد ختم ہوتے ہی پھر جناتی دنیا میں چلا جاتا ہے۔ مگر یہ بدنصیب شاید قیامت تک یہاں رہتے اگر تم نہ آتے تو۔" بوڑھا سانس لینے کو رکا۔

"بابا یہ سب اتنے دہشتناک عذاب میں کیوں گرفتار ہیں؟" وہ ابھی تک حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔

"ان لوگوں نے وہ گناہ کئے ہیں جو ناقابل معافی ہیں۔ آؤ میرے ساتھ۔" بوڑھے جن نے کہا اور واپس اس گھر میں چلا گیا جہاں سے وسیم نکلا تھا۔ اس کے پیچھے وسیم بھی اسی گھر میں داخل ہو گیا۔ یہ بغیر چھت کا گھر تھا۔ اور اس گھر کے ٹھیک اوپر بہت بلندی پر وہی سوراخ نظر آ رہا تھا جس سے وسیم نیچے کودا تھا۔ سوراخ بہت دور بلندیوں پر تھا مگر حیرت انگیز طور پر وسیم کی نگاہ عقاب کی نظر سے بھی تیز کام کر رہی تھی۔

"یہ میری بیٹی سوزا اور وہ میرا بیٹا حمیس سو رہا ہے۔" وسیم کو بوڑھے کی آواز نے چونکا دیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے ابھی تک اوپر بنے سوراخ کو دیکھے جا رہا تھا۔ بوڑھے کی آواز پر اس نے مڑ کر دیکھا۔

"یہ دونوں سور نما انسان آپ کے بیٹی بیٹا ہیں؟" وسیم ایک حیرت کے جھٹکے سے نکلا تھا تو دوسری حیرت اس کی منتظر ہوتی تھی۔

"ہاں بیٹا! یہ میری ہی اولاد ہے۔ ان کو میں نے بہت منع کیا تھا کہ یہ گناہ تمہارے لئے بھاری پڑے گا مگر یہ نہیں مانے۔ اب رات ہوتی ہے تو اپنے کئے کی سزا بھگتتے ہیں۔" بوڑھا جن اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کھل کر بتائیں۔ میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کون سا گناہ کیا تھا انہوں نے؟" وسیم جھنجھلاتے ہوئے بولا۔

"میں بتاتا ہوں۔ سب کچھ بتاتا ہوں۔" بوڑھا جن کمرے کے فرش پر بیٹھتے ہوئے بولا اور کچھ سوچنے لگا جیسے واقعات کی کڑیاں جوڑ رہا ہوں۔

"میرا نام منان ہے۔ اور ہمارا قبیلہ حضرت عیسیٰؑ کے پیروکاروں میں سے ہے۔ صدیوں تک ہم ان کے بتائی ہوئی باتوں پر زندگی گزارتے رہے۔ میں اپنے قبیلے کا سردار ہوں۔ اور جس طرح میں نے دوسرے جنات کے بچوں کو خدا کی وحدانیت کی تعلیم دی اسی طرح میں نے اپنے بچوں کو بھی سکھایا کہ دین و دنیا کا خالق ایک ہے۔ وہ نظر نہ بھی آئے تو وہ ہے۔ اس کو مانو۔ اس کے بنائے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی نہ کرو۔" بوڑھا جن سانس لینے کو رکا اور پھر گویا ہوا۔

"میں نے اپنے تئیں دونوں بچوں کو ہر طرح کی مذہبی تعلیم دی۔ مگر نہ جانے ان سے یہ گناہ کیسے ہو گیا۔" بوڑھا منان! اتنا کہہ کر فرش کی طرف دیکھنے لگا۔

"کون سا گناہ!" وسیم نے بے چین ہوتے ہوئے پوچھا۔

"بھائی بہن کی میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گزارنے کا۔ یہ ہے ان کا گناہ۔" بوڑھے منان کا سر جھکا ہوا تھا اور آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آ رہی تھی۔

"کیا؟" وسیم پر ان الفاظ نے کسی دھماکے کی طرح اثر کیا تھا۔

"ہاں! یہ نر اور مادہ سور دیکھ رہے ہو، یہ میرا بیٹا اور بیٹی ہیں۔ اور یہ چھوٹے بچے جو بھوک سے تنگ آ کر مادہ سور کا خون پیتے ہیں یہ ان کے بچے ہیں۔"

"اوہ!" حیرت کی زیادتی سے وسیم کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا تھا۔

"اور وہ جو دوسرے گھروں میں رہتے ہیں کیا وہ بھی بہن بھائی......؟" وسیم نے پوچھا۔

"ہاں! مگر وہ جن ہم میں سے نہیں وہ آگ اور پتھر کی پوجا کرتے تھے۔ ان میں تو یہ رواج ہزاروں سالوں سے چلا آ رہا تھا کہ بہن بھائی سے اور بھائی جس بہن سے چاہے شادی کر سکتا ہے۔ وہ لوگ گمراہ تھے۔ میں نے اپنے بچوں کو سمجھایا تھا کہ اگر ان پر ایسا کرنے سے کوئی آفت نہیں آتی تو یہ مت سمجھو کہ خدا ان کی طرف سے غافل ہے۔ ہر بندے کو اپنے اعمال کی سزا ملتی ہے۔ مگر یہ نہیں مانے اور پھر عذاب کا فرشتہ انہیں اٹھا کر اس دنیا میں پھینک گیا۔ اور ساتھ ہی کافر جنوں کا بھی برا وقت آ گیا۔"

"مگر بابا! یہ سب اس ہوٹل میں آنے والوں کو کیوں نظر آتا ہے۔ کیا اس کی بھی کوئی وجہ ہے؟"

"وجہ ہے۔ یہ سب ہم دکھاتے ہیں، وہاں سے نظر نہیں آتا وہ تو بلندی ہی اتنی ہے کہ وہاں سے کچھ بھی نظر نہ آئے۔" بوڑھے منان نے اوپر دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر کیوں؟" وسیم نے اضطراب سے پہلو بدلا۔

"کیوں کہ ان عذاب گرفتہ لوگوں کے لئے نجات دہندہ انسانوں کی دنیا سے آنا تھا۔ جب یہ بہن بھائی عذاب میں گرفتار ہوئے اور ان کی شکلیں بدل گئیں۔ نہ صرف ان کی بلکہ ان کے بچوں کی بھی، تب میں اور دوسرے جنات جو عذاب گرفتہ کے والدین تھے چرچ میں رو رو کر دعا مانگی تبھی رحم کے فرشتے نے اپنی صورت دکھائی اور کہا۔ "یہ لوگ ہزاروں سال تک اس عذاب میں گرفتار رہیں گے۔ جب تک انسانوں میں سے کوئی مسلمان ان کے چہرے پر ہاتھ نہیں پھیرتا۔" اس فرشتہ نے یہ بھی بتایا کہ۔ "یہ سب یہاں کے عذاب سے آزاد ہونے کے ساتھ ساتھ زندگی کی قید سے بھی آزاد ہو جائیں گے۔ پھر دوسری دنیا میں بھی ان پر عذاب مسلسل ہوتا رہے گا۔" تبھی سے کئی ہزار سال گزر گئے، میں اس کھڑکی کی طرف نظر کئے ہوئے ہوں صدیوں پہلے یہاں چٹیل میدان تھا۔ پھر جھونپڑے بنے۔ گھر بنے اور اب یہ ہوٹل بنا ہوا ہے۔ ہر کوئی یہاں آتا ہے مگر عذاب میں گرفتار ان کو دیکھ کر بھاگ جاتا ہے۔" بوڑھے منان نے تمام تفصیل بتا دی تو وسیم بولا۔

"یہ تو بہت آسان تھا۔ آپ ایسے ہی اس سوراخ کی طرف دیکھ کر انتظار کرتے رہے۔ آپ خود انسانوں کی دنیا میں چلے جاتے جیسا کہ میں پہلے دیکھ چکا ہوں۔ وہاں سے کسی کو اٹھا لاتے اور یہ نیک کام کرواتے۔"

"تمہیں کیا لگتا ہے کہ میں نے ایسا نہیں کیا ہوگا۔ ایک انسان کو میں یہاں لایا تھا مگر وہ خوف سے مر گیا۔ اور رحم کا فرشتہ اسی وقت ظاہر ہوا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ "آئندہ کسی انسان کو زبردستی یہاں نہیں لانا۔ جو بھی آئے گا اپنی مرضی سے آئے گا۔ اور سچی بات تو یہ ہے کہ میں خود کسی بے گناہ پر ظلم نہیں کرنا چاہتا۔" بوڑھے منان نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔

"خوب کہی! آپ ظلم نہیں کرنا چاہتے۔ مگر وہ کیا ہے؟ جو لوگ فالج زدہ ہو رہے ہیں کیا وہ ظلم نہیں ہے۔" وسیم کا لہجہ یک لخت تلخ ہو گیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اپنے راز کو چھپانے کے لئے یہ اس شخص کو فالج زدہ کرتے ہیں جو ان کی مدد نہ کرنا چاہتا ہو یا ڈر کر بھاگ رہا ہو۔

"تم اسے ظلم سمجھو یا جو مرضی! اس میں ہمارا کوئی ہاتھ نہیں۔ یہ جناتی دنیا کے اصول ہیں کہ یہاں کی کوئی بات باہر نہیں جائے گی۔ باقی رہی انسان کو یہاں لانے کی بات وہ ہماری مجبوری ہے۔ یہ اس دنیا کا قانون ہے کہ یہاں کی بات اگر کوئی ظاہر کرے گا تو اس کی زبان کھینچ لی جائے گی اور یہاں کا سحر اسے فالج زدہ بنا دے گا۔" بوڑھے منان نے نرمی سے کہا۔

"مگر آپ نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ میری کہانی یہاں آکر مکمل ہوگی اب آپ کہہ رہے ہیں کہ یہاں کی بات باہر نہیں جاسکتی!"

"تمہیں میں نے بیٹا کہا ہے، تمہارے لئے میں یہ سہولت دیتا ہوں کہ تم اپنی کہانی مکمل کرسکتے ہو۔" منان نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔

"آپ واقعی بہت اچھے ہیں!" وسیم نے بے اختیار اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

"یہ نہیں ہوسکتا۔ یہاں کی بات باہر نہیں جائے گی۔" وسیم آواز سنتے ہی مڑا وہ ایک لمبا تڑنگا حبشی نما جن تھا جو نہ جانے کب سے ان کی باتیں سن رہا تھا۔

"سوانگ یہ کیا کہہ رہے ہو تم! مت بھولو کہ یہ تمہاری اور ہماری اولاد کے لئے نجات بن کر آیا ہے۔" بوڑھے منان نے اس کے قریب جاکر کہا۔

"میں جانتا ہوں کہ یہ انسان یہاں ہماری اولاد کو نجات دلانے آیا ہے مگر میں یہ کبھی نہیں چاہوں گا کہ ہماری زندگی کے راز باہر جائیں۔" سوانگ نے کڑک دار انداز میں کہا۔

"تو پھر میں بھی دیکھتا ہوں کہ اسے کون روکتا ہے! اس کی کہانی مکمل کرنے سے۔" بوڑھے منان نے حتمی انداز میں کہا۔

سوانگ کے نتھنے پھولنے لگے اور وہ غصے سے سر پٹختا ہوا باہر نکل گیا۔

"بیٹا! تم بالکل فکر مت کرو۔ یہاں سے فارغ ہو کر تم اپنی دنیا میں چلے جانا اور کہانی مکمل کرنا، اپنے آپ کو اکیلا نہ سمجھنا، میں تمہاری کہانی تمہارے ساتھ مل کر مکمل کرواؤں گا۔"

"رات کے بارہ بجے۔ اور وہ ڈراؤنا منظر شروع ہوگیا۔ وسیم اپنی جگہ سے اٹھا بوڑھے منان کی طرف دیکھا اور اشارہ پاتے ہی اس کی بیٹی کے سور جیسے سر پر ہاتھ پھیرا۔ حیرت انگیز طور پر وہ چہرہ نارمل ہوتا گیا اور ایک خوبصورت قالب میں آگیا۔ اب وسیم ایک گھر سے نکلتا اور راہداری پر چلتا ہوا دوسرے گھر میں داخل ہوتا۔ تمام گھروں سے ہو کر جب وہ واپس نکلا تو چیخوں کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رک چکا تھا۔

بوڑھا منان بہت خوش تھا۔ وسیم نے کچھ دیر اس کے ساتھ رہنے کے بعد اجازت چاہی تو بوڑھا منان اسے اپنے ساتھ لے آیا۔ بوڑھے جن نے منہ ہی منہ میں کچھ پڑھا تو آسمان گھومنے لگا، وسیم کو لگ رہا تھا کہ جہاں وہ کھڑا ہے، وہ فرش آہستہ آہستہ ٹیڑھا ہورہا ہے اور پھر آسمان گھومتا گھومتا اوپر ہوا، وہ تمام گھر الٹے ہوگئے، وسیم نے بوڑھے کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش کی مگر بوڑھے نے ہاتھ کھینچ لیا۔ وسیم پل پل نیچے زمین کے نزدیک ہوتا گیا۔ اور پھر موت کے خوف نے اس کے حواس چھین لئے۔

☆......☆......☆

وسیم کو ہوش آیا تو وہ ہوٹل کے کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ اس نے طاقچے کی طرف دیکھا۔ کمرہ وہی تھا مگر وہاں کسی خلاء کا نام ونشان بھی نہیں تھا۔ وسیم اٹھا اور اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ٹیبل پر اس کا ادھورا مسودہ اسے لکھنے کی دعوت دے رہا تھا۔ وسیم لکھنے بیٹھ گیا۔ بقیہ رات اس نے کہانی مکمل کرنے میں گزاری۔ اب کی بار اسے کوئی خطرہ محسوس نہیں ہوا۔

وہ بہت خوش تھا۔ اسے یقین تھا کہ یہ کہانی اس کی دوسری کہانیوں سے بھی زیادہ پسند کی جائے گی۔ اور انجام اس کی توقع سے بڑھ کر ہوا۔

اس کی کہانی نے پورے ملک میں ہنگامہ مچادیا تھا۔ لوگوں نے کہانی کو بہت سراہا تھا۔ اور اسے بہت سے گفٹ اور انعامات موصول ہوئے تھے۔

ایک دن وسیم کے گھر کے سامنے لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہوگیا تھا۔ بات ہی ایسی تھی، کیونکہ جس شخص نے یہ سنسنی خیز کہانی "فالج زدہ" لکھی تھی وہ خود سر سے پیر تک "فالج زدہ" ہوگیا تھا۔

جادوئی گڑیا

ساجدہ راجا۔ ہنڈواں سرگودھا

درخت کے نیچے کھڑی بند جیپ کی چھت پر اچانک سانپوں کی بارش ہونے لگی، زبردست خوفناک سانپ اپنا پھن پھیلائے آگے کو بڑھنے لگے تو اس جگہ موجود چاروں دوست جیسے پتھر کے بت بن گئے۔

خوفناک جنگل میں جنم لینے والی ناقابل فراموش دہشت ناک اور وحشت سے لبریز حقیقت

"میری بات مانو! آج کا پروگرام ملتوی کردو، ہم کل چلیں گے، آج موسم بہت خراب ہے اور اگر جنگل میں سیر کے دوران بارش آگئی یا آندھی تو ہمیں بہت مشکل کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے!!" جونی نے اپنے دوستوں کو سمجھاتے ہوئے کہا لیکن کوئی بھی اس کی بات نہیں مان رہا تھا۔

وہ چاروں دوست تھے اور شمالی افریقہ میں جنگلات کی سیر اور شکار کو آئے تھے، ان سب کا تعلق جنوبی امریکہ سے تھا، انہوں نے ایک ساتھ اپنی تعلیم مکمل کی تھی اور اب فارغ وقت میں شمالی افریقہ چلے آئے تھے۔ یہاں کے جنگلات کے بارے میں انہوں نے کافی کچھ سن رکھا تھا اور وہ اس سے بہت متاثر تھے...... ان کا ارادہ تھا کہ وہ اندرونی جنگلات میں اس جگہ تک جائیں گے جہاں ابھی کسی انسان کے قدم نہیں پہنچے، اپنی حفاظت

کے لئے انہوں نے مکمل انتظامات کر رکھے تھے ان سب کے پاس جدید رائفلیں اور ریوالور کے علاوہ کھانے پینے کا مکمل سامان ان کے اپنے الگ الگ بیگ میں تھا اور ایک جیپ جو انہوں نے جنگل کی سیر کرنے کے لئے کرائے پر لی تھی۔

"واٹ ربش......! تم بارش سے خوفزدہ ہو؟ ہمیں ہر حال میں آج ہی جنگل میں جانا ہے چاہے کچھ بھی ہو، ہم اپنا پروگرام ہرگز تبدیل نہیں کریں گے۔"

جونی کو گھورتے ہوئے جمی نے کہا۔

"ویسے جونی غلط تو نہیں کہہ رہا۔ ہمیں واقعی اپنا پروگرام بدلنا چاہیے۔ اگر بارش ہوگئی تو ہم راستہ بھٹک بھی سکتے ہیں۔ اور تم جانتے ہو یہاں کے جنگلات کس قدر گھنے اور وحشت ناک ہیں اور قسم قسم کے درندے بھی ہوں گے جو ہمیں نقصان پہنچا سکتے ہیں۔" یہ جیک تھا۔ چاروں دوستوں میں سب سے زیادہ خوبصورت اور بہادر! لیکن وہ دور اندیش بھی تھا آنکھیں بند کرکے کام کرنے سے پہلے سو بار سوچتا اور اچھی طرح جائزہ لیتا تھا اور اس کے بعد عمل کرتا تھا۔ اس وقت کوئی بھی اس کی بات کو سمجھنا نہیں چاہتا تھا اور اس بات پر سب سے زیادہ اعتراض رابرٹ نے کیا تھا۔ اسے اپنی بہادری اور ریوالور پر پورا بھروسہ تھا، وہ سمجھتا تھا کہ وہ اس جنگل میں آسانی سے شکار کرسکے گا اور اگر کسی درندے نے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو وہ اس سے بھی اچھی طرح نمٹ لے گا......

لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ جب سر پر آتی ہے تو سب دھرے کا دھرا رہ جاتا ہے۔ جونی اور جیک کے سمجھانے کے باوجود وہ دونوں نہ مانے تو مجبوراً انہیں بھی ان دونوں کا ساتھ دینا پڑا......

وہ لوگ جس وقت ہوٹل سے نکلے، اس وقت دن کے دس بج رہے تھے۔ آسمان بادلوں سے بھرا ہوا تھا۔ کالے کالے بادل یہاں سے وہاں اڑتے پھر رہے تھے۔ ٹھنڈی ہوا بہت بھلی محسوس ہو رہی تھی۔ لیکن یہ تمام دلکشی بارش سے پہلے تک کی تھی۔ وہ جانتے تھے کہ بارش کے دوران اور بعد میں جنگلات میں کتنی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس وقت آسمان کو دیکھ کر یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ برس پڑنے کو بے تاب ہو۔ کالے بادلوں کی وجہ سے دن میں بھی شام کا سماں تھا اور جنگل میں درختوں کی بہتات کی وجہ سے اور بھی اندھیرا محسوس ہو رہا تھا۔

بہر حال ان کے پاس پاور فل ٹارچز موجود تھیں اور ہر خطرے سے نمٹنے کے لئے ممکنہ حد تک سامان بھی تھا۔

اس لئے انہیں ان چیزوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔

تقریباً آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد وہ جنگل کی حدود میں داخل ہوگئے۔ جنگل بہت خوبصورت نقشہ پیش کر رہا تھا اور چھوٹے چھوٹے خوبصورت جانور اور پرندے بہت پیارے لگ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے کیمرے سے ان کی تصویریں بنانی شروع کردیں......

جوں جوں ان کی جیپ آگے بڑھتی جارہی تھی جنگل گھنا ہوتا جارہا تھا اور ساتھ ہی اندھیرے کی وجہ سے انہیں گاڑی کی ہیڈلائٹس روشن کرنا پڑ گئیں......

وہ سب دلچسپی سے آس پاس کے مناظر دیکھ رہے تھے۔ اندھیرا تو تھا لیکن اتنا بھی نہیں کہ وہ کچھ دیکھ ہی نہ پاتے۔ اچانک بادل اتنے زور سے گڑگڑائے کہ جیپ ڈرائیو کرتے ہوئے جونی کے ہاتھ ایک لمحہ کے لئے کانپے تو جیپ کچے راستے سے اتر کر نیچے درختوں کی طرف بڑھتی گئی۔ جونی نے خود کو سنبھالا اور بڑی مشکل سے بریک لگائے ورنہ جیپ درخت سے ٹکرا جاتی اور ان کو بہت نقصان پہنچتا۔

"سنبھل کر جونی...... کیا تم بادلوں کے گرجنے سے ڈر گئے؟ بھئی مان گئے تمہاری بہادری کو......" رابرٹ نے طنز سے بھرپور آواز میں کہا تو جونی کو غصہ آگیا اور وہ غصے سے بولا......

"تم اپنی زبان کو قابو میں رکھو ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔"

"پلیز! تم دونوں لڑو تو مت...... جونی تم ایسا کرو کہ جیپ کو آہستہ آہستہ پیچھے کی طرف لے جاؤ، میں نیچے اتر کر تمہیں بتاتا ہوں۔" یہ جیک کی آواز تھی۔

جونی نے اثبات میں سر ہلایا تو جیک جیپ سے نیچے اترا اور جونی کو ہدایات دینے لگا۔ جونی نے آہستہ آہستہ ڈرائیو کرتے ہوئے جیک کی ہدایات پر عمل کیا تو تھوڑی دیر بعد وہ اسی راستے پر تھے لیکن آگے بڑھنے کے بجائے وہ وہیں رک گیا اور فکرمند انداز میں بولا۔

"میرا خیال ہے مزید آگے بڑھنا ہمارے لئے خطرناک ہوسکتا ہے، ایسا کرتے ہیں اب واپس چلتے ہیں اور موسم جب ٹھیک ہوا تو دوبارہ آئیں گے۔" اس کی بات سن کر جیک نے اس کی ہاں میں ہاں ملائی لیکن جمی اور رابرٹ بھتے سے اکھڑ گئے۔

"ہرگز نہیں! ہم اب بالکل واپس نہیں جائیں گے جو ہوگا۔ بھگتیں گے۔ ہم یہاں ہوٹل میں آرام کرنے نہیں بلکہ ہر طرح کے خطرے کے باوجود جنگل کی سیر کے لئے آئے ہیں اور دوسرا ہم نے جنگل میں بہت آگے تک جانا ہے، تو بہتر ہے کہ آج سے خطرات کا مقابلہ شروع کردیں پورا ایک دن ضائع کرنے کا کیا فائدہ؟"

مزید بحث کی گنجائش نہیں تھی اس لئے وہ دونوں بھی چپ ہوگئے کہ "اب اوکھلی میں سر دیا ہے تو موسل سے کیا ڈرنا......؟"

بادل کے گرجنے میں شدت آگئی تھی اور بجلی بھی بار بار چمک رہی تھی جس کا اندازہ انہیں درختوں کے درمیان سے آنے والی وقفے وقفے کی روشنی سے ہوا......

ان کی جیپ آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی تھی کچے راستے پر مہارت سے جیپ چلانی پڑتی ہے تاکہ سڑک کے اردگرد درختوں سے ٹکرانے سے بچا جاسکے۔

اچانک انہیں محسوس ہوا کہ جیسے جیپ کی چھت پر کوئی وزنی شے گری ہو، ابھی وہ اس بارے میں غور ہی کر رہے تھے کہ پھر تو جیسے چھت پر وزنی چیزوں کی بارش شروع ہوگئی۔ انہیں کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟

جیک ابھی باہر نکلنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی نظر شیشے سے باہر درخت پر پڑی۔ اس نے دیکھا کہ جس درخت کے نیچے ان کی جیپ کھڑی ہے۔ اس درخت سے سانپوں کی بارش ہو رہی ہے۔ درخت سے سانپ بہت بڑی تعداد میں گر رہے تھے اور حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ وہ بہت زیادہ تعداد میں ہونے کے باوجود صرف جیپ پر ہی گر رہے تھے۔ سانپوں کے منہ سے نکلنے والی پھنکاریں دل دہلائے دے رہی تھیں۔

وہ سب بہت پریشان تھے۔ ابھی وہ کچھ سوچ بھی نہ پائے تھے کہ اچانک ایک سانپ کے ساتھ اوپر سے ایک شاخ ٹوٹ کر گری اور شیشہ ٹوٹ گیا تو وہ سانپ اندر داخل ہونے کی کوشش کرنے لگا اب تو وہ بہت بدحواس ہوگئے......

جمی نے چیخ کر جونی کو جیپ چلانے کا کہا اور رابرٹ نے اپنا بیگ شیشے کے ساتھ لگا دیا تاکہ سانپ اندر داخل نہ ہونے پائے۔

جونی نے بدحواسی میں جیپ اسٹارٹ کی اور جلدی سے وہاں سے جیپ نکالنے لگا۔ وہ جگہ بہت تنگ سی تھی اور جیپ کو وہاں سے تیز بھگانا بہت مشکل تھا لیکن جونی بہت مہارت سے جیپ کو وہاں سے آگے لے جانے لگا......

اچانک دوسری طرف کا شیشہ بھی ٹوٹنے کی آواز آئی۔ جیک نے بھی رابرٹ کی تقلید میں اپنا بیگ شیشے سے چپکا دیا اور جونی کو جیپ بھگانے کا کہا۔ جونی نے جیپ کی رفتار میں اضافہ کردیا، کچے راستے پر جیپ کو بہت جھٹکے لگ رہے تھے اور ان جھٹکوں کی وجہ سے وہ سانپ نیچے گرتے جارہے تھے یہ اور بات تھی کہ وہ چاروں بھی ان جھٹکوں سے بدحال ہو رہے تھے......

جیپ بہت آگے آچکی تھی اور شیشے پر کوئی سانپ نظر نہیں آرہا تھا اس لئے جونی نے جیپ کی رفتار نارمل کرلی۔ جیک اور رابرٹ نے بھی اپنے بیگز شیشوں سے ہٹالئے۔ سانپوں سے جان چھوٹنے پر انہوں نے شکر ادا کیا اور اپنی اپنی نشست پر پھیل کر بیٹھ گئے۔

بادل اب بھی مسلسل گرج رہے تھے۔ کچے راستے پر کیچڑ کی وجہ سے انہیں بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ سکتا تھا اور اب انہیں درندوں سے مڈبھیڑ کا اندیشہ بھی تھا

اس خدشے کے پیش نظر انہوں نے اپنی رائفلیں اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اچانک ایک جھٹکے سے جیپ رک گئی انہوں نے سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر ان کی نظر سامنے راستے پر پڑی۔ اور جو کچھ انہوں نے دیکھا اس نے انہیں ساکت کردیا۔

انہوں نے دیکھا کہ دو شیر اسی راستے پر کھڑے ہیں جہاں سے وہ گزرنے والے تھے۔ ان شیروں کی نظریں ان کی جیپ پر تھیں۔ اور وہ یوں اکڑ کر کھڑے تھے جیسے اس جیپ اور اس میں موجود لوگوں کی انہیں کوئی پرواہ نہ ہو۔ اور یہ حقیقت تھی شیروں نے بہت پہلے ہی انسانی بو سونگھ لی تھی۔ وہ چاروں پریشان تو ہو گئے تھے لیکن یہ سوچ کر انہیں اطمینان تھا کہ ان کے پاس جدید رائفلیں تھیں اور وہ آسانی سے انہیں مار سکیں گے۔ ابھی وہ اسی سوچ میں تھے کہ وہ دونوں شیر اتنے زور سے دھاڑے کہ ان کی جیپ جھٹکا کھا کر رہ گئی اور ان کے دل اتنے زور سے دھڑک رہے تھے جیسے ابھی پسلیاں توڑ کر باہر نکل آئیں گے کسی شیر سے سامنا کا ان کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ وہ سب دل میں خوف زدہ تو تھے لیکن ایک دوسرے پر ظاہر نہیں کررہے تھے...... پھر اچانک ان شیروں نے اس جیپ پر چھلانگ لگا دی۔ ایک شیر جیپ کی بونٹ پر چڑھ گیا اور دوسرا چھلانگیں مار مار کر شیشوں کو توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ جیپ اتنے زور سے ہل رہی تھی کہ یوں لگتا تھا کہ اب گری کہ تب......! ان کے پاس وقت بہت کم تھا اگر ان کی جیپ گر جاتی یا وہ شیر اس کے شیشے توڑنے میں کامیاب ہو جاتا تو ان کا بچنا کسی صورت میں ممکن نہیں تھا......

"رابرٹ تم جلدی سے اپنی رائفل لوڈ کرو اور شیر پر فائر کرو۔" جیک نے چیخ کر رابرٹ کو ہدایت دی تو رابرٹ نے فوراً اپنی بندوق اٹھائی اور ٹوٹے ہوئے شیشے میں اس کی نال لگا دی۔ اب اسے شیر کا انتظار تھا کہ کب وہ اس طرف آتا ہے؟ جیپ کے ہلنے کی وجہ سے وہ توازن قائم نہیں رکھ پا رہے تھے کبھی سیٹ پر ادھر ہو جاتے اور کبھی ادھر...... شیر اب اس طرف بڑھ رہا تھا جہاں رابرٹ نے رائفل سے اسی کا نشانہ لینا تھا۔

رابرٹ فوراً سیدھا ہو گیا لیکن شیر کو بھی خطرے کی بو آ گئی تھی وہ زور سے غرایا اور چھلانگ مار کر شیشے پر جھپٹا جہاں رابرٹ نے رائفل رکھی ہوئی تھی اگر شیر کے پنجے شیشے سے ٹکرا جاتے تو شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ جاتا۔ اس لئے جیسے ہی شیر نے چھلانگ لگائی رابرٹ نے فوراً یکے بعد دیگرے فائر کر دیئے اور شیر ایک بھیانک آواز نکال کر وہیں ڈھیر ہو گیا......

دوسرا شیر بھی اپنے ساتھی کی حالت دیکھ کر چھلانگ مار کر سامنے آیا۔ وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ رابرٹ نے اس پر فائر کر کے اسے بھی لمبا لٹا دیا......

دونوں شیر بے حس و حرکت پڑے تھے اور وہ شکر ادا کر رہے تھے کہ انہوں نے دوسرا معرکہ بھی سر کر لیا تھا۔ جونی نے جیپ اسٹارٹ کی اور آگے بڑھا دی وہ چاروں خاموش تھے اور اردگرد محتاط نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

اچانک انہیں روشنی سی محسوس ہونے لگی اور بارش کی آواز بھی سنائی دینے لگی وہ چوکنے ہو گئے۔ درخت آہستہ آہستہ کم ہو رہے تھے۔ اور وہ نسبتاً ایک کھلی جگہ پر آ گئے تھے۔ انہیں ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی قید خانے سے رہائی پانے کے بعد اچانک کھلے آسمان تلے آ گئے ہوں...... لیکن اب یہ مشکل تھی کہ بارش کی وجہ سے کچا راستہ کیچڑ آلود ہو چکا تھا اور جیپ کو چلانے میں بڑی مشکل ہو رہی تھی۔ جونی بہت اچھی ڈرائیونگ کر لیتا تھا ورنہ اب تک وہ کسی جگہ پھنسے ہوتے اور ان کا نکلنا بہت مشکل ہوتا، جونی اب جیپ کو بہت آہستہ آہستہ اور احتیاط سے ڈرائیو کر رہا تھا۔

دن تقریباً ڈھلنے والا تھا اور انہیں ایک نئی فکر نے آ گھیرا کہ وہ رات کہاں بسر کریں گے؟

بارش تھم چکی تھی اور درختوں کی تعداد میں بہت حد تک کمی ہو گئی تھی یہ نسبتاً ایک کھلی جگہ تھی جنگلی درندوں کا خوف بہت حد تک کم ہو گیا تھا انہیں یہ جگہ رات بسر کرنے کے لئے نہایت موزوں لگی انہوں نے جیپ روک لی اور اپنا سامان لے کر نیچے اتر آئے۔ اگر بارش نہ ہوتی تو انہیں یہاں کوئی مشکل نہیں ہوتی لیکن اب ہر طرف کیچڑ تھا

سوائے ان گھنے درختوں کے جن کے نیچے خشکی تھی۔ ایک ایسا ہی درخت انہوں نے منتخب کیا اور اپنا سامان اس کے نیچے رکھ دیا اور خود بھی بیٹھ گئے۔ شام ہو چکی تھی۔ پرندوں کی بولیاں اور ہر قسم کے جانداروں کی آوازوں نے ایک عجیب سا سماں پیدا کر دیا تھا۔ ان کے پاس ٹارچیں تھیں جو انہوں نے روشن کر لی تھیں۔ ان کو بھوک بھی لگی تھی اس لئے انہوں نے کھانے کے ڈبے نکالے اور کھانا شروع کر دیا...... کھانے کے بعد وہ سونے کے لئے لیٹ گئے۔

رات کے کسی پہر جیک کی آنکھ کھل گئی۔ آنکھ کھلنے کی وجہ اسے سمجھ میں نہیں آئی۔ وہ خالی خالی نظروں سے اردگرد دیکھ رہا تھا، اچانک اس کی نظر ایک جگہ جا کر رک گئی۔ وہاں ایک روشنی کا دائرہ سا تھا۔ جو ایک ہی جگہ تھا اور کوئی حرکت نہیں کر رہا تھا۔ جیک بہت متجسس ہوا۔ اس نے ٹارچ اٹھائی اور اس روشنی کی جانب چل پڑا۔ دوسرے دوست بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ وہ جلد ہی اس روشنی تک پہنچ گیا اور اس نے جو کچھ دیکھا وہ اسے حیران کر دینے کے لئے کافی تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی گڑیا تھی جو زمین پر پڑی ہوئی تھی اور جسے دیکھ کر جیک اس طرف آیا تھا، اسی گڑیا سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ وہ بہت حیران ہوا اور نیچے جھک کر گڑیا کو اٹھا لیا۔

حیرت انگیز طور پر جیسے ہی اس نے گڑیا کو ہاتھ میں لیا وہ روشنی جو اس کے بدن سے پھوٹ رہی تھی یکلخت غائب ہو گئی وہ گڑیا اتنی چھوٹی تھی کہ آسانی سے ہاتھوں میں چھپ جائے۔ جیک نے اسے ہاتھ میں لیا اور واپس اپنی جگہ پر آ گیا۔

واپس آ کر اس نے ٹارچ کی مدد سے اس گڑیا کو اچھی طرح دیکھا وہ مٹی کی بنی ہوئی چھوٹی سی لیکن بہت سخت گڑیا تھی، بظاہر اس میں ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی لیکن روشنی کا پھوٹنا جیک کو حیرت میں مبتلا کر رہا تھا اس نے بہت سوچا لیکن اسے کوئی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے دوستوں کی طرف دیکھا وہ سب بے سدھ پڑے تھے۔ وہ بھی سونے کے لئے لیٹ گیا۔ گڑیا کو اس نے کہیں رکھنے کے بجائے اپنی مٹھی میں بند کر لیا اور آنکھیں بند کر لیں......

☆......☆......☆

دوسری صبح پرندوں کی چہچہاہٹ سے ان کی آنکھ کھل گئی آسمان اب تقریباً صاف ہو چکا تھا لیکن کہیں کہیں آوارہ بادلوں کے ٹکڑے اڑتے پھر رہے تھے اور نہایت خوشگوار ہوا چل رہی تھی۔ دلکش موسم نے ان کی طبیعت پر بہت خوشگوار اثر ڈالا تھا۔ انہوں نے خوشگوار موڈ میں ناشتہ کیا اور آگے کے سفر کے لئے روانہ ہو گئے...... کل کے واقعات وہ کسی حد تک فراموش کر چکے تھے اور اب کسی حد تک وہ اس جنگل سے خوفزدہ نہیں تھے۔

وہ گڑیا ابھی تک جیک کے ہاتھ میں تھی اور اس نے سب دوستوں کو بھی بتا دیا تھا وہ بھی اسے الٹ پلٹ کر دیکھنے لگے۔ انہیں بھی اس روشنی کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اچانک جونی نے اپنا تجزیہ پیش کیا اور بولا! "مجھے تو یہ کوئی اسرار لگتا ہے ہو نہ ہو یہ گڑیا کسی اور مخلوق سے تعلق رکھتی ہو......!"

"بھئی تم تو ہر بات میں جنات، روحوں اور شیاطین کو لے آتے ہو لگتا ہے وہ تمہارے قریبی رشتہ دار ہیں جو یوں ان کی موجودگی کا ہمیں یقین دلا رہے ہو۔" رابرٹ کے ایسا کہنے پر سب قہقہہ لگا کر ہنس پڑے۔ جب کہ جونی برے برے منہ بنانے لگا...... "خیر اگر یہ واقعی جادوئی گڑیا ہے۔ جیسا کہ جونی نے کہا ہے تو پھر ہمیں انتظار کرنا چاہیے کیونکہ اگر یہ جادوئی گڑیا ہے تو کچھ نہ کچھ ظاہر ہو گا جس کا تعلق اس گڑیا سے ہو گا۔" جیک نے سب کو قائل کرتے ہوئے کہا اور وہ اثبات میں سر ہلانے لگے......

وہ مسلسل سفر کرتے رہے، دوپہر کی دھوپ کافی زیادہ ہونے کی وجہ سے انہیں پتا چلا ورنہ وہ تینوں تو بے خبر سوتے رہے جب کہ جونی جیپ چلاتا رہا اور انہیں سوتا دیکھ کر بار بار خون کے گھونٹ بھرتا رہا۔

آخر اس سے برداشت نہ ہوا تو اس نے جیپ روک دی۔ جیسے ہی جیپ رکی وہ بیدار ہو گئے...... "کیا بات ہے جونی جیپ کیوں روک دی......؟"

''ابے نکمو! میں تمہارا نوکر نہیں جو یوں تم لوگ آرام سے سو کر میرا دل جلاتے رہو اور میں گدھے کی طرح مسلسل ڈرائیو کرتا رہوں......'' جونی کی بات سن کر وہ ہنس پڑے۔ جمی بولا...... ''یار ہمیں تو پتہ ہی نہیں چلا کہ کب آنکھ لگی۔ ویسے میرا خیال ہے اب کھانا کھا کر باقی کا سفر شروع کریں گے......!'' اس کی بات پر سب نے اثبات میں سر ہلایا اور کھانا نکالنا شروع کر دیا۔

وہ چاروں حیران و پریشان آس پاس دیکھ رہے تھے انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ بہت سارے جنگلی اچانک کہیں سے آگئے تھے اور ان کی جیپ کے چاروں طرف دائرے کی صورت میں کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں نیزے، بھالے اور تلواریں تھیں اور وہ کسی درندے کی مانند ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ وہ باتیں جو انہوں نے جنگلوں کے وحشی قبیلوں کے بارے میں سنی تھیں۔ ایک ایک کر کے ان کے ذہن میں آرہی تھیں کہ یہ قبیلے کتنے وحشی ہوتے ہیں اور جنگل میں بھٹکنے والے انسانوں کو اپنے قبیلے میں لے جا کر آگ پر بھون کر کھاتے ہیں۔ بظاہر تو وہ بھی انسان ہوتے ہیں لیکن انسانیت سے قطعاً نا آشنا......!

یہ باتیں انہیں سہمائے دے رہی تھیں اور وہ آنے والے وقتوں سے لرزیدہ تھے۔ ان کے پاس اسلحہ ضرور تھا لیکن اس کے استعمال کا موقعہ نہیں تھا کیونکہ وہ وحشی اتنے زیادہ تھے کہ اگر وہ کچھ کو مار بھی دیتے تو باقی بچنے والے انہیں وقت سے پہلے مار دیتے اور دوسرا وہ اتنے قریب پہنچ چکے تھے کہ اگر وہ اپنا اسلحہ نکالنے کی کوشش میں ہی ان کے نیزوں بھالوں کا شکار ہو سکتے تھے۔ اس لئے انہوں نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا۔ جیک نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی گڑیا کو نامحسوس انداز میں پینٹ کی جیب میں ڈال لیا تھا۔ نہ جانے اس نے ایسا کیوں کیا تھا؟ لیکن اسے یوں لگا تھا جیسے کسی نے اسے مجبور کیا ہو ایسا کرنے کے لئے۔

وہ وحشی انہیں باہر آنے کا اشارہ کرنے لگے، انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور چار و ناچار نیچے اتر آئے۔ ان کے اترتے ہی ان وحشیوں نے انہیں گھیرے میں لے لیا اور ایک اجنبی آواز میں کچھ بولتے ہوئے ایک طرف لے جانے لگے۔ شاید وہ ان انسانوں کو پکڑنے کی خوشی میں کچھ گا رہے تھے۔ کچھ دور چلنے کے بعد وہ اچانک ایسی جگہ آگئے جہاں سامنے پہاڑ نظر آرہے تھے اور پانی بہنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ حیران نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہے تھے کہ جنگل میں اچانک پہاڑ کہاں سے آگئے......؟ انہوں نے اس بارے میں سوچا ہی نہیں تھا۔ وہ وحشی انہیں لے کر ایسی جگہ آگئے جہاں بہت سی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں۔ یہ ان وحشیوں کی بستی تھی اور ان سے تھوڑی دور ایک ندی بہہ رہی تھی۔ ان وحشیوں کی آواز سن کر ان جھونپڑیوں سے بہت سے لوگ نکل آئے جو نیم برہنہ تھے ان میں بچے، بوڑھے اور عورتیں بھی شامل تھیں۔ جب انہوں نے چار انسانوں کو دیکھا تو ان کی آنکھوں میں ایک وحشیانہ چمک نمودار ہوئی ۔ شاید وہ اپنے شکار کے منتظر تھے اور اسے دیکھتے ہی ان کے منہ سے پانی بہنے لگا تھا......

وہ وحشی انہیں گھیرے میں لئے ایک ایسی جھونپڑی کی طرف بڑھے جو ان سب جھونپڑیوں سے بڑی اور کسی قدر خوبصورت تھی۔ شاید وہ ان کے سردار کی جھونپڑی تھی۔ وہ وحشی انہیں لے کر جھونپڑی کے باہر کھڑے ہو گئے اور زور زور سے عجیب سی آواز میں بولنے لگے ان آوازوں کو سنتے ہی ایک آدمی باہر آ گیا وہ بہت ہٹا کٹا تھا اور وہ بھی صرف ایک جانگیے میں ملبوس تھا اس کے سر پر پرندوں کے پروں کا تاج تھا اور گلے میں اس نے منکوں کا ہار پہنا ہوا تھا۔ جیسے ہی وہ اپنی جھونپڑی سے باہر آیا وہ جنگلی اسے دیکھ کر سجدے کے سے انداز میں جھک گئے۔ اس سردار نے ان کی طرف ورزیدہ نظروں سے دیکھا اور نامانوس سی آواز میں کچھ بولنے لگا جس کے جواب میں اسے پکڑنے والوں نے بھی کچھ بتایا۔

یقیناً وہ اسے بتا رہے ہوں گے کہ انہوں نے انہیں کیسے اور کہاں سے پکڑا......! اس کے بعد سردار نے انہیں کچھ کہا جسے سن کر وہ جنگلی انہیں ایک طرف لے

جانے لگے۔ ان کا رخ پہاڑوں کی طرف تھا وہ پہاڑ بستی کے بالکل اوپر واقع تھے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں سامنے ایک غار کا دہانہ نظر آرہا تھا وہ سمجھ گئے کہ اب انہیں یہاں قید کیا جائے گا۔

اچانک انہیں بادل کے گرجنے کی آواز سنائی دی۔ انہوں نے اوپر آسمان کی طرف دیکھا تو شمال کی جانب کالی گھٹا اٹھ رہی تھی، بادلوں کو دیکھ کر لگ رہا تھا کہ بارش بہت شدید ہوگی۔ وہ جنگلی انہیں لئے اس غار میں داخل ہو گئے۔ غار اندر سے بہت کشادہ تھا اور اس میں روشنی کا بھی خاطر خواہ انتظام تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ یہاں ضرورت کے تحت قیام بھی کرتے ہیں۔ ان پہاڑوں میں اور بھی بہت سے غار تھے۔

ان جنگلیوں نے ان لوگوں کو غار میں چھوڑا اور واپس جانے کے لئے مڑ گئے، تھوڑی دیر بعد وہ سب واپس چلے گئے تو جیک نے اٹھ کر غار سے باہر جھانکا گھٹا پورے آسمان پر پھیل گئی تھی اور بار بار بادل بھی گرج رہے تھے اور بجلی چمک رہی تھی۔ بستی کے پاس جو ندی تھی وہ گزشتہ دن کی بارش کی وجہ سے زور و شور سے بہہ رہی تھی اگر آج پھر اسی طرح بارش ہوتی تو خدشہ تھا کہ اس کا پانی کناروں سے نکل کر پوری بستی کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا تھا۔ شاید اسی خطرے کے پیش نظر ان جنگلیوں نے غاروں میں بھی اپنا قیام رکھا ہوا تھا۔

سب سے حیرت انگیز بات تو یہ تھی کہ انہوں نے غار کے دہانے پر کسی قسم کا کوئی پہرہ نہیں لگایا تھا......شاید انہیں یقین تھا کہ وہ چاروں کہیں فرار نہیں ہو سکیں گے اور یہ حقیقت بھی تھی کیونکہ ایک طرف تو پہاڑ تھے اور سامنے ان جنگلیوں کی بستی......ایک طرف ندی تھی جسے بغیر کشتی کے پار نہیں کیا جا سکتا تھا اور نہ ہی ان بستی والوں کی نظر سے چھپ کر فرار ہوا جا سکتا تھا۔ اس لئے انہوں نے پہرہ لگانے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔

جیک نے اپنی رسٹ واچ کی طرف دیکھا شام کے 5 بج رہے تھے لیکن گہرے بادلوں کی وجہ سے سر شام ہی رات کا سماں لگ رہا تھا۔ ہر جھونپڑی میں دیئے روشن ہو چکے تھے۔ اچانک بجلی بہت زور سے کڑکی اور اس کی چمک آسمان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی زوردار بارش شروع ہو گئی۔ بارش اتنی تیز تھی کہ ایسا لگ رہا تھا کہ آسمان کا منہ کھل گیا ہو۔

جیک اپنے دوستوں کے پاس واپس آگیا تھا۔ وہ سب خاموش بیٹھے تھے۔ جیک نے اپنی جیب سے وہ گڑیا نکالی اور اسے ہاتھ میں لے لیا۔ ابھی تک کچھ ایسا ظاہر نہیں ہوا تھا جسے دیکھ کر وہ اس گڑیا کو جادوئی سمجھتے......

جیک نے گڑیا کو دیوار کے پاس رکھ دیا اور خود بھی پتھریلی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ پھر حیرت انگیز طور پر وہی ہوا جو پہلے جنگل میں ہو چکا تھا۔ اس گڑیا کو زمین پر رکھتے ہی وہی روشنی کا دائرہ اس کے گرد بن گیا۔

وہ سب تجسس سے اس کے نزدیک آگئے اور غور سے اسے دیکھنے لگے۔ انہوں نے دیکھا کہ اس گڑیا کی آنکھیں بالکل زندہ انسانوں جیسی ہو گئی تھیں اور ان سے شعاعیں نکل کر ان سب دوستوں کی آنکھوں پر پڑیں۔ ایک لمحے کو تو انہیں نظر آنا بالکل بند ہو گیا اور دوسرے ہی لمحے وہ پہلے جیسی نارمل حالت میں تھے وہ حیران تھے کہ یہ کیا ہوا......؟ اچانک گڑیا کے لب ہلے اور جسم میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ وہ ساکت نظروں سے اس گڑیا کی طرف دیکھ رہے تھے۔

دوستو! پریشان مت ہو، میں تم لوگوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گی بلکہ تم لوگوں کی مدد کروں گی۔ چونکہ تم لوگ مجھے جنگل سے بحفاظت اپنے ساتھ لائے ہو اس لئے میں بھی تم لوگوں کی حفاظت کروں گی۔ یہ قبیلہ ''جن کی تم قید میں ہو'' یہ بہت وحشی ہیں یہ آدم خور ہیں اور جو بدنصیب بھی بھولے بھٹکے سے ادھر آنکلتا ہے اسے یہ اپنی خوراک بنا لیتے ہیں۔ اسے آگ پر بھون کر کھاتے ہیں۔ اور تم لوگ بھی انہی بدنصیبوں میں سے ہو جاتے اگر میرا ساتھ تم لوگوں کو میسر نہ ہوتا......ان کا ایک جادوگر ہے جو ان وحشیوں کو اپنے اشاروں پر نچاتا ہے۔ اس قبیلے کے جس کے تم قیدی ہو، اسی جادوگر نے مجھے قید کر کے اس گڑیا میں بند کر دیا۔

وہ بہت بڑا جادوگر ہے اس نے ایک گھناؤنے عمل سے مجھے اپنا غلام بنایا اور مجھ سے طرح طرح کے گھٹیا کام لینے لگا۔ پھر جب میں نے انکار کیا تو مجھے ہمیشہ کے لئے قید کرکے اس جنگل میں پھینک دیا تاکہ کوئی انسان مجھے نہ چھو سکے۔ کیونکہ جیسے ہی کوئی انسان مجھے چھوتا میں اس کی قید سے رہا ہو جاتی اور اس کے خلاف جو چاہے کرتی۔

جنگل کا وہ ایسا حصہ تھا جہاں شاید ہی کبھی کوئی انسان گیا ہو۔ پھر جانوروں کے آنے جانے سے میں ان کے پیروں کی ٹھوکروں کی وجہ سے اس جگہ آ گئی۔ جہاں سے تم لوگوں نے مجھے اٹھایا اور مجھے آزادی جیسی نعمت مل گئی۔ اب میں اپنا انتقام ضرور کرلوں گی اور تم لوگوں کو بحفاظت تمہاری منزل تک پہنچاؤں گی ورنہ اگر میرا ساتھ تم لوگوں کو نہ ملتا تو کل دن ہوتے ہی تم لوگوں کو زندہ جلادیا جاتا اور پھر پورا قبیلہ تمہارے گوشت سے لطف اٹھاتا۔" اس گڑیا کے منہ سے نکلنے والی آواز نے انہیں سب بتایا اور آخری بات پر وہ سب جھرجھری لے کر رہ گئے۔

"کیا تم جنات کے قبیلے سے تعلق رکھتی ہو......؟" جمی نے پوچھا تو جواباً بولی...... "ایسا ہی سمجھ لو۔ اس دنیا میں انسانوں اور جنات کے علاوہ اور بھی بہت سی مخلوقات ہیں، میرا تعلق بھی انہی سے ہے۔"

"ہمیں سمجھ میں نہیں آرہی کہ جب آپ آزاد ہوئیں تو آپ کی آنکھوں سے کچھ لہریں نکل کر ہماری آنکھوں میں آئیں تھیں اور کچھ دیر ہمیں کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔ کیا آپ ہمیں بتا سکتی ہیں کہ وہ کیا تھا؟" رابرٹ کا لہجہ اپنے اندر مکمل احترام سموئے ہوئے تھا۔

"کیا تم لوگ غور نہیں کر رہے کہ ایک اجنبی زبان تم لوگ کتنی آسانی سے بول اور سمجھ رہے ہو؟ میں نے وہ سب اس وجہ سے کیا تھا تاکہ تم لوگوں کو آسانی سے اجنبی زبانیں سمجھ آسکیں۔ جب تم لوگ ان جنگلیوں سے ملو گے تو ان کی زبان آسانی سے تم لوگوں کی سمجھ میں آجائے گی اور تم خود بھی ان جیسا بول سکو گے......" گڑیا نے انہیں ساری تفصیل سے آگاہ کیا۔ اور یہ واقعی حیرانگی کی بات تھی کہ وہ جادوئی گڑیا ایک اجنبی زبان میں بول رہی تھی لیکن وہ سب اسے آسانی سے سمجھ رہے تھے۔ پھر اس جادوئی گڑیا نے انہیں آرام کرنے کے لئے کہا اور خود بھی بے جان ہوگئی۔

ان سب نے حیرانگی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور وہ سونے کے لئے لیٹ گئے......

دوسری صبح ان کی آنکھ کچھ اونچی آوازوں سے کھل گئی بہت سے جنگلی ان کے اوپر جھکے ہوئے انہیں اٹھانے میں لگے ہوئے تھے جب وہ مکمل طور پر بیدار ہوگئے تو انہیں لئے اس بستی کی طرف بڑھ گئے۔

انہوں نے ایک نظر ندی کی طرف دیکھا جو پورے جوش وخروش سے بہہ رہی تھی۔ رات ہونے والی بارش نے پانی کی سطح میں خطرناک حد تک اضافہ کردیا تھا۔ بادل ابھی بھی موجود تھے اور موسم بہت خوشگوار تھا۔

جب وہ بستی میں داخل ہوئے تو سب جنگلی ایک جگہ جمع تھے۔ خوشی ان کے چہروں پر سے چھلک رہی تھی۔ لگتا تھا کہ بہت عرصے بعد انہیں انسانی شکار میسر آیا تھا وہ بھی چار ہٹے کٹے نوجوانوں کا...... جب وہ بستی میں داخل ہوئے تو ان آدم خوروں نے اونچی اونچی آواز میں نعرے لگانے شروع کردیئے۔ ان کا سردار اور وہ جادوگر جس نے قیدی گڑیا کو جنگل میں پھینکا تھا وہاں موجود تھے...... ایک طرف آگ کا بڑا سا الاؤ روشن تھا۔ جو شاید ان چاروں کو بھوننے کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اس آگ کو دیکھ کر ان میں خوف کی لہر دوڑ گئی۔ انہیں اپنی موت بہت قریب محسوس ہو رہی تھی۔ ان کے ذہن سے اس گڑیا کا خیال نکل گیا تھا۔

اچانک سردار نے ان کو ایک مخصوص اشارہ کیا جس کے نتیجے میں کچھ آدم خور ان کی طرف بڑھے شاید انہیں آگ میں پھینکنے کے لئے۔

ابھی وہ کچھ قدم چلے ہی تھے کہ پانی کا بھیانک شور سنائی دیا۔ جسے سنتے ہی ایک پل کو ہر طرف خاموشی چھا گئی اور دوسرے ہی لمحے ان میں بھگدڑ مچ گئی۔

"ندی ٹوٹ گئی...... ندی ٹوٹ گئی۔"

اچانک ان چاروں کو اس گڑیا کی آواز سنائی دی

"......تم لوگ فوراً پہاڑوں کی طرف بھاگو اور اسی غار میں چلے جاؤ جہاں تم لوگوں کو قید کیا گیا تھا۔ جلدی کرو۔"

اس گڑیا کی آواز سنتے ہی وہ چاروں بھاگ کر اس غار کی طرف بڑھے اور جلد ہی وہ سب اس غار میں تھے۔ غار کے دہانے پر کھڑے ہو کر انہوں نے دیکھا کہ ندی کا پانی چنگھاڑتا ہوا پوری بستی کو اپنی لپیٹ میں لے چکا تھا ان جنگلیوں کو بدحواسی میں وہ پہاڑی غار بھی یاد نہیں رہے تھے جہاں وہ سیلاب کے پانی سے بچنے کے لئے پناہ لیتے تھے۔

تھوڑی ہی دیر میں پوری بستی پانی میں ڈوب گئی اور اس کا کہیں بھی نام ونشان نہ رہا...... وہ چاروں خوفزدہ نظروں سے اس پانی کو دیکھ رہے تھے جو بستی کو ڈبونے کے بعد اب پرسکون ہو چکا تھا اور ندی اپنی پہلی والی حالت میں بہہ رہی تھی وہ حیران تھے کہ کس طرح پانی اچانک آیا اور بستی کو تباہ کرنے کے بعد اچانک ہی واپس چلا گیا۔ اتنے میں اسی گڑیا کی آواز سنائی دی۔

"دوستو......! تم لوگوں کو اب کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم لوگ بالکل محفوظ ہو۔ میں نے اپنا بدلہ لے لیا اور تم لوگوں کو بچالیا...... چونکہ تم لوگوں کی وجہ سے مجھے قید سے رہائی ملی ہے، اس لئے میں تم لوگوں کو کچھ دینا چاہتی ہوں...... تم لوگ اسی غار میں آگے بڑھتے جاؤ۔ وہ چیز تمہیں مل جائے گی۔" گڑیا کی بات سن کر وہ آگے بڑھنے لگے۔

غار بہت لمبا تھا آخر کار وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں اس گڑیا نے انہیں کہا تھا۔ وہاں پہنچ کر ان کی آنکھیں چکا چوند ہوگئیں۔ بات ہی کچھ ایسی تھی...... وہاں انہوں نے دیکھا کہ خزانے کا ڈھیر لگا ہوا ہے۔ سونا، چاندی، ہیرے، جواہرات، ڈھیر کی صورت میں پڑے تھے۔

وہ چاروں آنکھیں پھاڑے اس خزانے کو دیکھ رہے تھے۔ اچانک اس جادوئی گڑیا کی آواز گونجی...... "تمہارے پیچھے خالی بیگ موجود ہیں جتنا چاہو خزانہ لے لو لیکن کبھی لالچ نہیں کرنا۔ کیونکہ یہ لالچ آدم زادوں کو ایک دوسرے کی پہچان بھلادیتا ہے۔"

انہوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو واقعی بیگ موجود تھے، انہوں نے وہ بیگ اٹھائے اور اسے خزانے سے بھرنا شروع کردیا۔ اس کام سے فارغ ہونے کے بعد وہ گڑیا کی ہدایت کے مطابق غار سے باہر آگئے۔ ان کا رخ جنگل کی طرف تھا۔ جب وہ جنگل سے گزر رہے تھے تو کوئی جانور بھی ان کے قریب آنے کی کوشش نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ ان چاروں کو دیکھتے ہی وہ وہاں سے دور بھاگ جاتے تھے۔

وہ حیران تو تھے لیکن وہ جانتے تھے کہ یہ اس گڑیا کا کمال ہے اسی طرح چلتے ہوئے وہ اپنی جیپ تک پہنچ گئے۔ ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی وہ جلدی سے جیپ میں بیٹھ گئے اور اسے اسٹارٹ کرکے وہاں سے چل پڑے۔

دو دن کا سفر انہوں نے ایک دن میں طے کرلیا۔ راستے میں بھی انہیں کوئی مشکل پیش نہ آئی۔

شام سے کچھ پہلے وہ جنگل سے باہر تھے۔ تھوڑی دیر بعد اس گڑیا کی آواز سنائی دی۔

"دوستو......! اب میرے جانے کا وقت آگیا ہے۔ تم لوگوں کو میں نے بحفاظت پہنچادیا ہے۔ تم لوگ اپنا خیال رکھنا تم لوگوں کا احسان میں کبھی نہیں بھولوں گی۔ اب میں جارہی ہوں......" انہوں نے دیکھا کہ جیپ سے تھوڑے فاصلے پر ایک ہیولہ نمودار ہوا اور آہستہ آہستہ وہ ٹھوس جسم اختیار کرتا گیا۔

جب وہ پیکر مکمل ہوا تو انہوں نے دیکھا کہ وہ بہت ہی حسین تھی۔ اتنی زیادہ کہ اس پر سے نظریں نہیں ہٹ رہی تھیں۔ پھر وہ پری پیکر مسکرا کر ہاتھ ہلانے لگی اور آہستہ آہستہ اس کا وجود تحلیل ہونے لگا اور آخر کار وہ مکمل طور پر غائب ہوگئی۔

وہ چاروں ساکت نظروں سے اس طرف دیکھ رہے تھے۔ جب وہ غائب ہوئی تو جیسے انہیں ہوش آیا۔ جونی نے ٹھنڈی سانس بھری اور جیپ آگے بڑھادی۔

سنہری تابوت

ایم اے راحت

قسط نمبر: 1

خراماں خراماں اور سبک رفتاری سے دل و دماغ کو خوف کے شکنجے میں جکڑتی ہوئی صدیوں پر محیط اپنی نوعیت کی اچھوتی انوکھی دلکش دلفریب ایک طویل عرصہ تک دماغ سے محو نہ ہونے والی حقیقت سے قریب تر، سوچ کے افق پر جھلمل کرتی ناقابل فراموش کہانی۔

شاہکار کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے اچنبھے میں ڈالتی حیرت انگیز اور تحیر انگیز کہانی

میری داستان کا آغاز اس وقت سے ہوتا ہے۔ جب میری عمر سترہ سال تھی۔ یہ عمر خود ناشناسی کی نہیں ہوتی۔ یہ اور بات ہے کہ ناز و نعم میں پرورش پانے والی امیر زادیاں اسے بچپن کہہ لیں۔ اور نو سال جیسے بچوں کی سی حرکتیں کریں میں ایسی نہیں تھی۔ میں تو اس سے بہت پہلے بردبار ہو چکی تھی۔ آٹھ سال کی تھی جب والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ ہم خوشحال تھے۔ شہر سے دور ایک زرخیز علاقے میں باغ اور بہت سی زمینیں تھیں۔ جن پر زراعت ہوتی تھی۔

یہ سب خاندانی ورثہ تھا۔ اور اس کی دیکھ بھال کرنے والے لوگ بھی ورثے میں ہی ملے تھے۔ اس قدر اچھے اور وفادار تھے کہ کبھی کوئی مشکل ہی پیش نہیں آئی۔ چنانچہ والد صاحب یعنی ہارون دانش نے اپنی مرضی کی زندگی گزاری۔ کسی شعبے سے باقاعدہ منسلک ہونے کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی۔ آرکیالوجی ان کا پسندیدہ موضوع تھا۔ اور اپنے اس شوق کی تکمیل میں وہ کمال فن کو پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے دنیا کی کئی زبانیں سیکھیں۔ خاص طور پر قدیم زمانے کی تحقیق پر انہیں عبور حاصل تھا۔ محکمۂ آثار قدیمہ میں کئی بار انہیں بڑے بڑے عہدوں کی پیش کش کی گئی۔ لیکن انہوں نے معذرت کر لی۔ البتہ دنیا کے بڑے بڑے ممالک میں ان کی دانش کی دھوم تھی۔ قدیم معلومات اور پراسرار تحریروں کی عقدہ کشائی کے لئے انہیں بہت معتبر سمجھا جاتا تھا۔ نجانے کہاں کہاں سے لوگ ان سے ملنے کے لئے آتے تھے۔ والدہ کی موت کے وقت میں بہت معصوم نہیں تھی۔ آٹھ سال کی عمر بالکل ناسمجھی کی عمر نہیں ہوتی۔ مجھے ماں سے جدا ہونے کا بہت غم تھا۔ لیکن اس غم کو غلط کرنے کے لئے پاپا نے مجھے اپنے وجود کا ایک حصہ بنا لیا۔ حالانکہ وہ بہت مصروف انسان تھے۔ لیکن انہوں نے مجھے اپنی مصروفیتوں میں شامل کر لیا۔ اور آٹھ سال کی عمر سے ہی میں پاپا کی وجہ سے قدیم زمانوں اور انسان کے ماضی سے دلچسپی لینے لگی۔

زمانہ قدیم کے دلچسپ راز مجھ پر منکشف ہونے لگے۔ خاص طور سے مجھے مصریات سے بہت لگاؤ تھا۔ کبھی کبھی مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں بھی زمانہ قدیم کی مصر کی کوئی روح ہوں۔ مصر سے متعلق تاریخ پڑھتے ہوئے مجھے تاریخ کے وہ واقعات اپنی داستان محسوس ہوتے تھے۔ اور میری روح فرعون کے دور میں بھٹکنے لگتی تھی۔

سترہ سال کی عمر تک میں بہت کچھ حاصل کر چکی تھی۔ اس دوران بے شمار متعلقہ افراد سے میری ملاقات

ہو چکی تھی۔ اکثر بہت سے غیر ممالک سے لوگ پاپا کے پاس آتے رہتے تھے۔ امیر الحسنات اور مائیکل جون کے ساتھ۔ ایک انوکھا شخص روشاق نامی آیا تھا۔ جس کے بارے میں پتہ چلا تھا کہ اسکا تعلق پیرو سے ہے۔ وہ پیرو میں جپسم کا تاجر ہے لیکن قدیم زمانوں اور آثار قدیمہ سے اسے عشق ہے۔ روشاق کی شخصیت بہت عجیب تھی۔ وہ دراز قامت اور دبلے پتلے جسم کا مالک تھا۔

چہرے کے نقوش بہت عجیب تھے۔ بالکل بلی کی شکل کا لگتا تھا۔ اور دل چسپ بات یہ تھی کہ ایک خوب صورت سیانی بلی اسکے ساتھ ساتھ رہتی تھی۔ بلی کے اور اس کے قدوقامت میں فرق نہ ہوتا تو دونوں سگے بہن بھائی لگتے۔ اتنی مشابہت تھی دونوں میں۔ اس کے علاوہ کچھ عجیب سی انڈر اسٹینڈنگ بھی تھی۔ دونوں میں جیسے وہ ایک دوسرے کو اچھی طرح سمجھتے ہوں۔ روشاق میں ایک اور عجیب بات تھی وہ یہ کہ اس کا رنگ بہت سفید تھا۔ لیکن یہ سفیدی ایسی تھی جیسے اس کے جسم میں خون کا ایک قطرہ بھی نہ ہو۔ آنکھیں، ناخن، اور ہونٹ تک سفید تھے۔ باقی امیر الحسنات، اور مائیکل نارمل لوگ تھے۔ پاپا کے ساتھ ان کی نشستیں اکثر طویل ہوتیں۔ ایک دن پاپا نے پرمسرت لہجے میں کہا۔ ”تیار ہو جاؤ نشاء ہم ایک دل چسپ مہم پر چل رہے ہیں۔“

”کہاں پاپا!“ میں نے پوچھا۔

”تیونس، ہمیں خلیج تیونس پر کارچوک نامی ایک پہاڑ کے حصے میں کھدائی کرنی ہے۔“

”کیوں؟“ میں نے سوال کیا۔

”ہمیں صدیوں پرانی آشوانی تہذیب تلاش کرنی ہے۔ میں نے اس تہذیب کے بارے میں ایک مضمون لکھا تھا۔ جس کا پوری دنیا میں شاندار خیر مقدم کیا گیا تھا۔ میں نے اس تہذیب کے مرکز کی نشاندہی بھی کی تھی۔ اور اس سے متعلق کچھ انکشافات بھی کیے تھے۔ میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں آشوانی تہذیب کے یہ پراسرار انکشافات مجھ پر خواب میں ہوئے تھے۔ کچھ پراسرار کرداروں نے مجھ پر انکشافات کیئے تھے۔ اور میں نے غیر مرئی قوت کے زیر اثر انہیں اپنے مضمون میں شامل کرلیا تھا۔ لیکن اس وقت میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب آثار قدیمہ کے سب سے معتبر بین الاقوامی ادارے آرگوش آرمن نے اس مضمون کی زبردست پذیرائی کی اور اس کی تصدیق کی اس کے بعد طویل عرصے تک یہ مضمون میرے لئے دردسر بنا رہا۔ بڑی مشکل سے اس سے پیچھا چھوٹا تھا۔ اور اب یہ لوگ جن میں صرف دو سے میری پرانی شناسائی ہے۔

یعنی امیر الحسنات جو مصری نژاد ہے اور مائیکل جو برطانوی ہے اپنے وسائل سے آشوانی تہذیب کے بارے میں انکشافات کرنا چاہتے ہیں۔ خاص طور پر یہ شخص روشاق جس کا کہنا ہے کہ آشوانی تہذیب کے آثار قدیم مصر سے جا ملتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ بے شمار دلیلیں دیتا ہے۔ بے پناہ قابل اور بہت ہی گہرا آدمی ہے تم یقین کرو۔ یہ ایک ایسا شخص ہے جس نے مختصر ملاقات میں مجھے اپنا قائل کرلیا ہے۔ اس کے اندر کچھ غیر مرئی قوتیں بھی ہیں جو انسانی ذہن کو اپنی گرفت میں لے کر اس سے اپنا کام نکالتی ہیں بس یہ میرا احساس ہے۔ ورنہ ایسی باتوں کا کوئی ٹھوس ثبوت میرے پاس موجود نہیں ہے۔“ میں چونکہ آٹھ سال کی عمر سے پاپا کے ساتھ کام کر رہی تھی۔ اور ہر ایسی بات یا ایسے امور مجھے بہت دلکش لگتے تھے۔ جیسا میں بیان کر چکی ہوں۔ ہمارا کوئی مالی مسئلہ نہیں تھا۔ میرے گھر میں ملازموں کی فوج تھی۔ اور ان میں سے ہر ملازم مجھ پر جان چھڑکنے کے لئے تیار رہتا تھا ابھی میں ان میں سے کسی کا نام نہیں لوں گی۔ لیکن آپ یوں سمجھ لیجئے کہ والدہ کی موت کے بعد ان ملازموں ہی نے میری پرورش کی تھی اور پاپا کو ان پر بہت اعتماد تھا۔

تیونس جانے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ میں نے چونکہ آج تک پاپا کے ہر کام میں دل چسپی لی تھی، اور یہ سب کچھ میری دلچسپی کا باعث بن چکا تھا۔ چنانچہ مجھے بھی تیونس جانے کی خوشی تھی۔ میں آشوانی تہذیب کے بارے میں خود بھی جاننا چاہتی تھی۔ تیونس کا جائے وقوع

یہ ہے کہ شمالی افریقہ میں واقع ہے۔ اس کے شمال میں بحیرہ روم، مغرب میں الجزائر اور جنوبی مشرق میں لیبیا واقع ہے۔ اس کی آبادی وغیرہ کے بارے میں مجھے مکمل تفصیلات معلوم تھیں اور میں ان کے بارے میں مزید تحقیقات کر رہی تھی۔

ادھر پاپا تیونس جانے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ طے یہ کیا گیا تھا کہ یہیں سے تیونس کا سفر شروع کیا جائے گا تمام تر تیاریاں مکمل ہونے کے بعد آخر کار ہم تیونس روانہ ہو گئے۔ تیونس کے سب سے بڑے شہر کا نام بھی تیونس ہی تھا یہ دارالحکومت تھا۔ یہاں کے مذاہب میں اسلام سرفہرست اس کے علاوہ رومن کیتھولک، اور یہودی بھی کافی آباد تھے۔ طرز حکومت جمہوری تھا۔ کافی خوب صورت شہر تھا۔ ہم وہاں ایک عالی شان ہوٹل میں مقیم ہو گئے۔ ہمیں سرکاری طور پر بھی سراہا گیا۔

خاص طور سے جب میرے والد کا نام ان کے مخصوص حلقے میں آیا تو بہت سے لوگوں نے پاپا سے ملاقات کی۔

ادھر مائیکل۔ امیر الحسنات، اور روشاق وغیرہ اپنے اپنے کمروں میں مقیم تھے اور خاموشی سے کارچوک جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ یہ ذمہ داری انہی لوگوں نے سنبھالی تھی۔ کیونکہ پاپا ان میں ذرا سپر حیثیت کے مالک تھے۔ آخر کار ہم کارچوک کے پہاڑ کی جانب روانہ ہو گئے۔ اس دوران مجھے یہاں کے بارے میں کافی معلومات حاصل ہو گئی تھیں۔ جو میرا مخصوص شوق تھا۔ چند مقامی افراد بھی ساتھ لئے گئے تھے اور اس کے بعد ہم کارچوک روانہ ہو گئے۔

بہت ہی سنسنی خیز سفر تھا۔ کارچوک کے ایک مخصوص حصے میں ہماری کیمپنگ ہوئی اور اس کے بعد اس جگہ کی نشاندہی کی گئی۔ جہاں مزدوروں کو کھدائی کرنی تھی۔ تقریباً چودہ دن تک شدید مشقت کی گئی۔ میری تفریحات یہاں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ پہاڑی علاقہ تھا، البتہ جب بھی موقع ملتا میں پاپا کے ساتھ بیٹھ کر تیونس اور اس کے اطراف کے بارے میں باتیں کرلیا کرتی تھی۔

کھدائی برق رفتاری سے جاری تھی۔ اور باقی لوگوں کے ساتھ ہم باپ بیٹی ہی وہاں مصروف رہتے تھے۔ یہاں تک کہ ایک دن مزدوروں نے وہ جگہ دریافت کرلی۔ جہاں سے نیچے جانے کا راستہ تھا۔ آشوانی تہذیب کے آثار اب واضح طور پر نمایاں ہو گئے تھے اور ہم باپ بیٹی مل کر اس کے بارے میں شواہد اکٹھے کر رہے تھے۔ چوتھے دن کی کھدائی میں ہمیں ایک اجنبی چیز نظر آگئی یہ ایک سنہری تابوت تھا۔ یہ اندازہ نہیں ہو پاتا تھا کہ یہ سنہری کیوں ہے۔

تحقیق بھی کی گئی تھی مزدور پہلے تو یہ سمجھے تھے کہ وہ سونے کا بنا ہوا ہے۔ لیکن یہ سونے کا نہیں تھا۔ بلکہ یہ لکڑی ہی کا تھا۔ البتہ اس پر جو پینٹ کیا گیا تھا۔ وہ بالکل سونے کے رنگ کا تھا اور بالکل یہ اندازہ نہیں ہوتا تھا کہ یہ پینٹ کتنا گہرا ہے۔ اسے سونے کا پانی بھی نہیں کہا جاسکتا تھا۔ غرض یہ کہ یہ سنہری تابوت ہم سب کے لئے باعث دلچسپی تھا۔ میں نے پہلی بار محسوس کیا کہ روشاق، اس نئے تابوت کو دیکھ کر کسی قدر بدحواس سا ہو گیا ہے۔ اور اس کے اندر کچھ عجیب سا جوش پایا جاتا ہے۔ سنہری تابوت میں خاص قسم کا تالا پڑا ہوا تھا۔ جس کو آسانی سے نہیں کھولا جاسکا۔ بلکہ اسے اوزاروں سے توڑنا پڑا۔

اس بات کا میرے پاپا کو بھی بڑا دکھ تھا۔ کیونکہ یہ تابوت تو بڑے عالی شان نوادرات میں سے تھا۔ تالا توڑنے کے بعد تابوت کا ڈھکن ہٹایا گیا اور جو کچھ ہمارے سامنے آیا اسے دیکھ کر سچی بات یہ ہے کہ میرا تو دل بند ہونے لگا۔ اس میں ایک لاش لیٹی نظر آرہی تھی۔ بالکل نامعلوم دور کے لباس میں ملبوس لیکن اس کا چہرہ ناقابل یقین تھا۔ اوہ...... کون سی زبان میں بتاؤں۔ وہ میں تھی سو فیصدی میں۔

میرے چہرے کا ایک ایک نقش میرے بالوں کا رنگ، میری ہر چیز اس لاش میں موجود تھی، وہ لاش دیکھ کر پاپا بھی دنگ رہ گئے تھے۔ باقی لوگ بھی حیران تھے۔ لیکن ایک بار، بس ایک بار میری نگاہ۔ روشاق کی جانب

اٹھی تھی۔ میں نے اس کے ہونٹوں پر ایک پراسرار مسکراہٹ کھیلتی ہوئی دیکھی۔ اس مسکراہٹ کا راز میری سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

تھوڑی دیر تک تو اسے ہی سکتہ طاری رہا۔ جیسے ہم سب پتھر کے ہوگئے ہوں۔ اس کے بعد امیر الحسنات نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”خدا کی پناہ، اب یہ سوال کرنا تو بالکل بے کار ہے ہارون دانش کے تم نے وہ سب کچھ محسوس نہ کیا ہو۔ یا ہم میں سے کسی نے“ پاپا نے گہری سانس لے کر گردن ہلائی اور بولے۔

”ہاں۔ یہ دنیا کی سب سے انوکھی بات ہے بہت کچھ دیکھا ہے۔ میں نے زندگی میں لیکن اس بات کو کبھی فراموش نہیں کروں گا۔ ارے...... ٹھہرو...... ذرا ہٹو......ادھر سے......“

”کیوں......کیا ہوا؟“

”اس کے چہرے پر کوئی ایسا سایہ کرو جس سے یہ الگ ہی نظر آئے۔“

”میں سمجھا نہیں۔“ اس بار مائیکل جون نے کہا۔

پاپا ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ پھر انہوں نے ایک پتھر کی سل دیکھی۔ جو پتلی تھی۔ اور اس قابل تھی کہ اسے اٹھایا جاسکے۔ انہوں نے مزدوروں کو اشارہ کیا۔ اور مزدوروں نے پتھر کی وہ سل اٹھالی۔ پتھر کی سل سے اس لاش پر سایہ کیا گیا۔ اور پاپا اس کا جائزہ لینے لگے۔ انہوں نے مایوسی سے گردن ہلائی۔ اور پتھر کی سل وہاں سے ہٹوادی۔

”کیوں......کیا ہوا؟“ امیر الحسنات نے سوال کیا۔

”ایک خیال میرے ذہن میں آیا تھا۔ اب ان قدیم مقبروں کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ کہ ان میں کون کون سی سائنسی چیزیں استعمال کی گئی ہیں۔ اصل اس دور کی سائنس بہت عجیب تھی۔ میں نے سوچا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ نشاء کا عکس اس پر پڑ رہا ہو۔ اور یہ اس شکل کی نظر آرہی ہو۔ مگر ایسی کوئی بات نہیں ہے۔“

”کیا ایسا ممکن تھا۔ مسٹر ہارون دانش؟“

”ممکن تو نہیں تھا، لیکن بس ایک خیال دل میں آیا تھا، اور میں نے اس کی تصدیق کر لی، اور میری تصدیق غلط نکلی۔“

”کیا خیال ہے، اس لاش کو تابوت سے نکالا جائے؟“

”ضرورت نہیں ہے۔ البتہ تابوت یہاں سے ہٹا لیا جائے۔ ان کھنڈرات میں جن کی ہم نے کھدائی کی تھی۔ اور ان میں جو کچھ برآمد ہوا تھا۔ ایسے کمرے بھی تھے۔ جن کو صاف ستھرا کہا جاسکتا تھا اور لازی بات ہے کہ یہ قدرتی نہیں تھے۔ بلکہ انسانی ہاتھوں کی تراش تھی۔ گویا زمانہ قدیم میں آشوانی تہذیب کے جن کاریگروں نے یہاں کام کیا تھا انہوں نے یہ کھنڈر بنایا ہوگا۔ غرض یہ کہ مزدوروں نے وہ تابوت اپنی جگہ سے ہٹایا اور ہم نے ایک منتخب شدہ کمرے میں اسے رکھوادیا۔ میں خود دنگ تھی اس وقت سے اب تک میں نے اپنے منہ سے ایک لفظ تک نہیں کہا تھا۔ لیکن میرے دل پر بڑا گہرا اثر تھا۔

”آخر میری شکل کی یہاں کہاں سے آئی۔“ بعد میں پاپا نے مجھ سے کہا۔ ”تم نے اسے غور سے دیکھا......نشاء؟“ میں نے سنسنی خیز نگاہوں سے پاپا کو دیکھا تو وہ بولے ”ایک بات کہوں؟“ جس طرح فرعون مصر کی ممیاں، پٹیوں میں لپٹی نظر آتی ہیں اور مسالوں سے لیس یہ پٹیاں ان کے جسموں اور ان کے چہروں کو محفوظ رکھتی ہیں اس طرح کوئی پٹی اسکے چہرے پر نہیں تھی۔ اس کا لباس بھی سالم تھا۔ جب کہ ہم ابھی تک اسکی عمر کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکے کہ وہ کب سے اس تابوت میں لیٹی ہوئی ہے۔“

”پاپا ایک بات اور کہوں آپ سے؟“

”ہاں......بولو......“

”پاپا اس طرح جو ممیاں دریافت ہوتی ہیں یا مصر میں جو معلومات حاصل ہوئی ہیں۔ ان میں ان ممیوں کو مسالوں سے حنوط کیا جاتا ہے۔ اور پاپا ان کے چہرے آپ نے بھی دیکھے ہیں اور میں نے بھی ان کے چہرے بالکل سفید ہوتے ہیں۔ مگر لگتا ہے پاپا اس ممی کا چہرہ سفید

نہیں ہے میرا مطلب ہے۔ اس لڑکی کا جو یہاں نظر آئی ہے اور پاپا ایک بات اور بتاؤں آپ کو، اسکی عمر بھی میری عمر سے الگ معلوم نہیں ہوتی۔“ پاپا نے کوئی جواب نہیں دیا۔ حالانکہ اس سے پہلے ایسا نہیں ہوتا تھا ان کے پاس ہر چیز کی تفصیل موجود ہوتی تھی۔

لیکن پاپا خاموش تھے۔ غالباً وہ بھی اس معمے کو حل نہیں کر پائے تھے۔ دفعتاً انہوں نے کہا۔

”اٹھو......“ میں وہاں سے اٹھ گئی۔ پاپا مجھے اس کمرے میں لے کر آئے۔ جہاں وہ ممی موجود تھی کمرے کو باہر سے بند کردیا گیا تھا۔ وہاں پہرے وغیرہ کی ضرورت نہیں تھی۔ مزدور کھنڈر سے بہت دور کیمپنگ میں ہوا کرتے تھے۔ وہ صبح کو کام کے وقت ہی یہاں آجاتے تھے۔ باقی امیر الحسنات، مائیکل جون، اور روشاق ایک بڑے کمرے میں قیام پذیر تھے۔ ہم باپ بیٹی کو الگ جگہ دی گئی تھی۔ میں لفظ کمرہ استعمال کررہی ہوں لیکن یہ قدرتی غار تھے۔ جنہیں تراش کر کمروں کی شکل دی گئی تھی۔ چنانچہ انہیں کمرہ ہی کہا جاسکتا تھا۔ بہرحال ہم اس جگہ پہنچے جہاں وہ تابوت اب بھی رکھا ہوا تھا۔ تالا چونکہ ٹوٹ چکا تھا۔ اس لئے اس کا ڈھکن اٹھانے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ پاپا نے لیمپ روشن کرلیا تھا۔ جو ایک خاص قسم کا لیمپ تھا اور بس یوں لگتا تھا جیسے سورج کی روشنی کمرے میں داخل ہوگئی ہو بالکل دن نکل آتا تھا۔ اور ایک ایک چیز کو بغور دیکھا جاسکتا تھا۔ پاپا گھٹنوں کے بل اس تابوت کے پاس بیٹھ گئے اور اس کا جائزہ لینے لگے۔ پھر انہوں نے بڑی ہمت کر کے لڑکی کے لباس پر ہاتھ ڈالا اور اسکے لباس کا ایک ٹکڑا کھینچ کر دیکھا۔ پھر وہ گہری سانس لے کر بولے۔

”اگر یہ طویل عرصے سے یہاں مدفون ہے۔ تو کم از کم اس کا لباس راکھ کی شکل اختیار کر جانا چاہیے تھا۔ لیکن دیکھو کپڑے بھی جوں کے توں ہیں۔ ان میں وہی لچک اور وہی چیز پائی جاتی ہے۔ جو زیادہ پرانے کپڑوں میں نہیں ہوتی اور اس کا چہرہ میرے خدا......صاف لگ رہا ہے کہ یہ زندگی سے محروم نہیں ہے۔“

”تت......تت......تو کیا......پاپا......یہ زندہ ہے۔؟“

”نہیں! کیسی باتیں کرتی ہو۔ البتہ یہ انتہائی انوکھا اور پراسرار وجود ہے۔“

”جی پاپا......“ میں نے آہستہ سے کہا۔ پاپا اسے دیکھتے رہے۔ انہوں نے تمام چیزوں کو غور سے دیکھا۔ اور پھر بولے۔“

”اسکا تعلق سو فیصدی مصر سے ہے۔“

”مصر۔؟“

”ہاں......سو فیصدی مصر سے، تم جانتی ہو مصریات میرا بہترین مشغلہ ہے اور تمہارا بھی۔ وہاں کی عورتوں کے خدوخال یہی ہوا کرتے ہیں۔ اور رنگ بھی بالکل ایسا ہے۔“ دفعتاً میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی میں نے کہا۔

”پاپا......اس کا مطلب ہے کہ میرا تعلق بھی مصر سے ہے۔“ پاپا نے نگاہیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ لیکن ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار نہیں ہوئی تھی۔ پھر انہوں نے آنکھیں بھینچ کر گردن ہلائی اور بولے۔

”تابوت کا ڈھکن بند کردو۔“ اس انوکھی دریافت نے میرے دماغ کی چولیں ہلادی ہیں۔ کل دن کی روشنی میں، میں اس غار کا بغور جائزہ لوں گا۔ ہوسکتا ہے ہمیں وہاں کوئی ایسی دستاویز مل جائے یا کوئی ایسی چیز جو اس لڑکی کے دور پر روشنی ڈال سکے۔ پتہ نہیں یہ سب کچھ کیا ہے۔“ پاپا یہ الفاظ کہہ کر خاموش ہوگئے تھے پھر اس کے بعد وہ وہاں سے باہر نکل آئے لیکن میں نے محسوس کیا کہ وہ ساری رات ایک لمحے کے لئے نہیں سوئے تھے۔

دوسری صبح ایک اور واقعہ پیش آیا وہ کتاب مائیکل جون کے ہاتھ لگی تھی۔ مائیکل جون بہت پرجوش نظر آرہا تھا۔

”تقدیر شاید ہم پر آشوانی تہذیب کا انکشاف کرنا چاہتی ہے، ویسے آپ کا کیا خیال ہے۔ پروفیسر ہارون

دانش...... آشوانی تہذیب کے آثار، کیا تہذیب مصر سے ملتے ہیں۔؟“

”سرزمین مصر میں ایسی کسی چیز کا ایک دوسرے سے منسلک ہو جانا ناممکنات میں سے نہیں ہے۔

آپ نے وہ جسم تو دیکھا ہوگا۔ جسے ممی کہنا کچھ ناگوار سا گزرتا ہے وہ تو ایک زندہ وجود ہے جسکا حلیہ دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ ابھی وہ خوب صورت لڑکی تابوت میں اٹھ کر بیٹھ جائے گی اور کیا اس بات پر آپ نے غور نہیں کیا کہ آخر اس کی شکل ہماری بیٹی نشاء سے کیوں ملتی جلتی ہے۔

جب ہم پر کسی بات کا انکشاف نہیں ہوتا تو ہم اس بات کو اتفاق کہہ لیا کرتے ہیں۔ سچ یہ ہے کہ میری بیٹی میرے وجود کا ایک حصہ ہے۔ کم از کم اس کی جانب سے کسی وہم کا شکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ اتفاق بہت انوکھا ہے، اور پھر تم لوگوں نے دیکھا ہوگا کہ سنہری تابوت میں ملنے والی مخلوق کسی بھی طرح حنوط شدہ ممی محسوس نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ ایک انوکھا وجود ہے۔“

”میں آپ کو ایک تحفہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔“ پروفیسر ہارون دانش...... یہ لیجئے...... یہ صرف آپ ہی کے مطلب کی چیز ہے۔“ یہ کہہ کر مائیکل نے ایک بوسیدہ کتاب میرے پاپا کی طرف بڑھا دی۔ پاپا نے حیران نگاہوں سے اس کتاب کی طرف دیکھا اور بولے......

”اوہو...... یہ جس طرح بوسیدہ ہو رہی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ یہیں اسی کھدائی میں کہیں ملی ہے...... یقیناً...... اس سے تو ہمیں آشوانی تہذیب کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہو سکتا ہے۔“

”اور پتہ نہیں ہم سب کی خوش قسمتی ہے یا بدبختی کہ جس زبان میں یہ کتاب لکھی گئی ہے، وہ ہماری سمجھ سے باہر ہے۔“

”مجھے ایک بات پر اعتراض ہے۔ پروفیسر ہارون دانش۔“ پہلی بار روشاق نے زبان کھولی۔ اور میری نگاہیں اس کی جانب اٹھ گئیں۔ مجھے یوں لگا جیسے اس کتاب کو دیکھتے ہی اس کے چہرے پر کسی بھوکے کتے جیسے تاثرات پیدا ہو گئے ہوں۔ جو اپنی پسند کی کسی چیز کو دیکھ کر بے صبرا ہو جاتا ہے۔“ میرے پاپا نے اسے دیکھا تو وہ بولا......

”ہم میں سے کم از کم یہ چار یا پانچ افراد برابر کی حیثیت کے مالک ہیں۔ لیکن مسٹر مائیکل جون نے یہ کتاب نہ تو امیر الحسنات کے ہاتھوں میں دی نہ ہی مجھے اسے دیکھنے دیا۔ کیا یہ ہماری توہین نہیں ہے۔؟“

”ایک منٹ...... ایک منٹ......“ امیر الحسنات نے فوراً ہاتھ اٹھا کر کہا۔ پھر بولا......

”تم لفظ ہماری غلط استعمال کر رہے ہو میں مائیکل جون سے کوئی اختلاف نہیں رکھتا۔ کیونکہ بہر حال یہاں کی ہر چیز کی حفاظت بہت ضروری ہے۔ یہ کتاب جوں کی توں پروفیسر ہارون دانش کے ہاتھوں میں پہنچنی چاہیے کیونکہ اس کی تحریر نہ تم پڑھ سکتے ہو، نہ میں۔ چنانچہ یہ شعبہ ہارون دانش کا ہے مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ چاہیں تو کسی کو بھی دے سکتے ہیں۔“ روشاق خاموش ہو گیا تھا۔ مگر اس کے چہرے پر ناگواری کے اثرات صاف نمایاں تھے۔ مائیکل جون نے کہا......

”پروفیسر ویسے تو آپ جو پسند کریں وہی ہوگا۔ لیکن میری رائے ہے کہ ہم اس کتاب کی تحریر سے اگر واقف ہو سکیں تو آگے کے لئے بہت سے فیصلے کر سکتے ہیں۔“

”میں کوشش کرتا ہوں۔“ پاپا نے کہا اور کتاب اپنے ہاتھ میں لے لی۔ چند لمحات وہ اس کے اوراق الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے۔ پھر ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ انہوں نے کہا یہ ”اناطوق“ کی کہانی ہے۔“

”کون سی زبان میں لکھی گئی ہے۔؟“

”قدیم مصر کے ایک خاص علاقے کی زبان نطافہ کہلاتی تھی یہ نطافہ میں لکھی گئی ہے۔“

”کیا آپ اسے اچھی طرح پڑھ سکتے ہیں پروفیسر؟“

”ہاں...... میرا تو شوق ہی یہ رہا ہے میں اسے باآسانی پڑھ سکتا ہوں۔“

”اچھا، تو ہم انکشافات کے متمنی ہیں مائیکل جون نے کہا اور اس کے بعد یہ طے کیا گیا کہ پہلے اس کتاب کی تحریر سے مکمل واقفیت کر لی جائے۔ مزدوروں میں سے کچھ کو کھانے وغیرہ کی ذمہ داریاں دے دی گئی تھیں۔ ایک مناسب گوشہ تلاش کر کے ہم لوگ بیٹھ گئے۔ اور پاپا نے بہت ہی ماہرانہ انداز میں کتاب کا آغاز کر دیا۔ ”اناطوق“ کی طرف سے لکھا گیا تھا۔

”میں نہیں جانتا کہ صدیوں کے بعد میری یہ تحریر کس کے ہاتھ لگے گی۔ لیکن جو بھی اس تحریر کو پڑھے میرے بارے میں ضرور سوچے کہ اس دور میں جب کہ تحریری امور نہ ہونے کے برابر تھے۔ میں نے یہ کتاب کتنی محنت سے لکھی ہوگی۔ دوستو! نہ میں کوئی مورخ ہوں۔ نہ تاریخ داں، میں تو اپنے اردگرد پھیلے ہوئے حالات اور خود اپنی زندگی کی کہانی تحریر کرنا چاہتا ہوں۔ اور میری آرزو ہے کہ جب میری یہ کتاب کسی کے ہاتھ لگے اور وہ میری اس تحریر کو سمجھ سکے...... تو اسے...... اس وقت کی زبان میں تحریری دوام دے تاکہ اناطوق......، تحریر و دنیا میں زندہ رہے۔

میں نہیں جانتا کہ میری اس تحریر کو پڑھنے والے کا نقطہ نگاہ میرے بارے میں کیا ہوگا۔ لیکن بس اتنا بتا سکتا ہوں کہ اس کا ایک ایک لفظ درست ہے۔ کسی چھوٹے یا بڑے پر رحم نہ کرنے والی موت میرا احاطہ کر چکی ہے۔ کسی بھی وقت میرا بلاوا آ سکتا ہے۔ میں اپنی زندگی کی اس داستان کو تحریر کرنا چاہتا ہوں اور اس امید کے ساتھ کہ اس تحریر کو دیکھنے والے خوش ہوں گے یا منہ سکوڑ لیں گے، میں اپنے بارے میں یہ بتاؤں کہ میرا نام اناطوق ہے۔ میں ایک غریب گھرانے میں عین اس وقت پیدا ہوا جس روز اس وقت کا ولی عہد مصر نابلوس اس دنیا میں آیا تھا۔

میری ماں اکثر بڑے غرور کے ساتھ اس بات کا تذکرہ کیا کرتی تھی کہ نابلوس کی پیدائش والے دن جتنے بھی بچے مصر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان سب کے والدین کو فرعون مصر کی جانب سے سونے کے سکے دیئے گئے تھے۔ میری ماں کا کہنا تھا کہ میں گھر کے لئے خوش بختی کا پیغام لے کر آیا تھا۔ ماں تو ابتدائی آفرینش سے محبت اور شفقت کا مرکز ہوتی ہے۔ خیر یہ ساری باتیں اپنی جگہ...... میری زندگی عام انسانوں کی مانند گزرنے لگی۔

خوشی اور غم زندگی کا بہت بڑا حصہ ہوتے ہیں۔ اور میں نے اپنے تجربے کے مطابق جو تشخیص کی ہے کہ کوئی چیز کسی کا مقدر نہیں ہوتی مجھے خوش نصیب کہنے والی ماں...... اس وقت مر گئی...... جب میری عمر بہت چھوٹی تھی...... شاید آٹھ یا نو برس، میں اپنے والدین کے ساتھ عبادت گاہوں میں جایا کرتا تھا۔ اور وہاں کے ایک کاتب سے درخت کی چھالوں اور کیلوں کے پتوں پر کتابت کرنے کا فن سیکھا کرتا تھا۔ ماں کی موت کے وقت بھی میں یہ فن سیکھنے کے ابتدائی مراحل سے گزر رہا تھا۔ ماں کی موت سے مجھے موت سے آگاہی ہوئی۔

لیکن اس وقت بھی میں یہ صحیح فیصلہ نہیں کر پایا تھا کہ مرنے کے بعد لوگ بولتے کیوں نہیں ہیں۔ میری بڑی بہن جو عمر میں مجھ سے تین سال بڑی تھی وہ بھی یہ بات نہیں بتا سکی۔ پھر جب میں گیارہ سال کا ہوا تو اس کی شادی کر دی گئی۔ وہ جب بھی مجھ سے ملنے آتی میں اسے بتایا کرتا کہ تحریر کا کام بہت ہی جان لیوا ہے۔ دوسروں کی تحریروں کو نقل کرنے کے بجائے میرا دل چاہتا کہ میں خود اپنے دماغ سے کچھ سوچ کر لکھوں۔ وہ مجھے مشورے دیتی تھی کہ اگر صحیح طور پر حروف بنانا آ گئے ہیں تو تمہارے لئے خود سوچ کر لکھنا بھی مشکل نہیں ہوگا۔ بہن کے یہ کہنے پر میں نے مصر کی سب سے طویل تاریخ یعنی دریائے نیل کی خوبیوں پر ایک چھوٹی سی کہانی لکھی۔ جس میں بتایا گیا تھا کہ یہ دریا جو حقیقت میں ایک دیوتا ہے۔ ہم مصر میں رہنے والوں پر کتنا مہربان ہے۔ ہاں...... اس پر جو سال کے سال نوجوان لڑکیوں کی قربانی دی جاتی تھی۔ وہ ذرا دکھ بھرا کھیل ہوتا تھا۔ لیکن کاہنوں کا کہنا تھا کہ دریائے نیل لڑکیوں کو اپنی ملکہ بناتا ہے اور جب ایک سال گزر جاتا ہے۔ تو رات کے بھولے بھٹکے مسافروں

کے لئے انہیں آسمان پر پہنچادیتا ہے۔ جہاں وہ ستاروں کی شکل میں ہمیشہ چمکتی رہتی ہیں۔

مجھے یہ سب بہت اچھا لگا اور میں نے اپنی داستان تخلیق کی۔ مصریوں کے عقیدے کے مطابق جو لڑکی دریائے نیل کو بھینٹ کی جاتی تھی۔ وہ دیوتا کی ملکہ بن جاتی تھی۔ میں نے کبھی اس عقیدے سے اختلاف نہیں کیا...... کہ یہ سب غلط ہے۔ البتہ یہ سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہا۔ ''کہ اس حساب سے تو دیوتا کی ہزاروں، لاکھوں ملکائیں بن چکی ہوں گی۔ وہ انہیں رکھتا کہاں ہوگا۔ ان کے کھانے پینے کا انتظام کہاں سے کرتا ہوگا اور اتنی بہت سی ملکائیں اگر آپس میں لڑتی ہوں گی تو دیوتا کا اپنا کیا حال ہوتا ہوگا۔''

یہ ساری باتیں سوچ کر مجھے بھی ہنسی آتی تھی۔ میں نے اپنی کہانی میں تبدیلی کرتے ہوئے بتایا کہ ہر سال جب ایک نئی لڑکی کو بپھرے ہوئے دریا میں پھینک کر ملکہ بنایا جاتا ہے تو دیوتا اپنی پرانی ملکہ کو ستارہ بنا کر آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔ جہاں سے وہ اپنے عزیزوں اور رشتے داروں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہے۔ اور پھر مسافروں کے لئے رہنما بن جاتی ہے۔

میں نے جو کچھ لکھا تھا، مجھے خود بے پناہ پسند آیا اور میری بہن کو بھی۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں یہ کہانی عبادت گاہ کے سب سے بڑے پجاری کو سناؤں۔ پجاری نے میری یہ کہانی سنی اور دنگ رہ گیا۔ اس نے کہا کہ جو کچھ میں نے کہا ہے۔ وہی سچ ہے، اور مجھے اتنی شہرت ملی کہ مصر کی ساری عبادت گاہوں میں اس کہانی کو بڑی عقیدت سے پڑھا اور سنا جانے لگا۔ میری یہ کہانی مصریوں کے عقائد کی تقویت کا باعث بنی ہوئی تھی، اور اس کہانی کے باعث دیوتاؤں کے بارے میں صدیوں سے چلے آنے والے عقائد بھی متزلزل ہوگئے تھے۔ پھر سولہ سال کی عمر میں میری شادی ہوگئی۔ اس دوران میری شہرت دور دور تک پھیل گئی تھی۔ بڑے پجاری اور دوسرے لوگ مجھے بڑی اہمیت دیتے تھے۔ لیکن یہ بھی تقدیر کی بات ہوتی ہے کہ میری بیوی کو جو عمر میں مجھ سے تقریباً پانچ سال بڑی تھی میری ہر بات سے نفرت تھی۔

شادی کے بعد وہ ڈیڑھ سال تک میرے ساتھ رہی، اور میں ایک ننھی منی چاند جیسی بچی کا باپ بن گیا۔ لیکن بچی چھ ماہ کی بھی نہیں ہوئی تھی، کہ میری بیوی مجھے اور اپنی بچی کو چھوڑ کر اپنے ایک عاشق کے ساتھ شمالی ریگستانی علاقے میں بھاگ گئی، اور ننھی سی بچی اپنی ماں کے بغیر پندرہ بیس دن سے زیادہ زندہ نہیں رہ سکی۔ بچی کی موت نے مجھے بالکل حواس باختہ کردیا، اور میں نے ایک ایسی کہانی لکھی جس میں دیوی دیوتاؤں کو نظر انداز کر کے عام انسانوں کے کرداروں کو پیش کیا گیا تھا۔

میری اس کہانی کی بھی کافی پذیرائی ہوئی۔ پھر ایک دن شام کے وقت ڈوبتے ہوئے سورج دیوتا کا نظارہ کررہا تھا، اور دل میں سوچ رہا تھا کہ دیوتا تو ہم انسانوں سے بھی زیادہ پابند ہے۔ ہمیشہ ایک ہی ڈگر پر چلتا ہے، ایک ہی جگہ سے نکلتا ہے، ایک ہی جگہ پر غروب ہوجاتا ہے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس نے اپنا راستہ بدلا ہو، طلوع وغروب میں کوئی فرق پیدا کیا ہو۔ اس کے مقابلے میں ہم انسان کہیں زیادہ آزاد ہیں۔ جہاں چاہیں، جدھر چاہیں، جب چاہیں آجاسکتے ہیں۔ جتنا عرصہ چاہیں ایک ہی جگہ ٹھہر سکتے ہیں۔

اسی روز مجھے ولی عہد مصر کا پیغام موصول ہوا۔ جیسا کہ میں نے بتایا ہے...... کہ میری شخصیت اب مصر میں ایک الگ ہی حیثیت اختیار کرچکی تھی۔ اور بہت سے لوگ میری طرف متوجہ ہوگئے تھے۔ لیکن ولی عہد مصر کا...... یہ پیغام میرے لئے بڑی حیثیت کا حامل تھا۔

اس نے کہا تھا کہ میں دارالخلافہ میں منتقل ہوکر اس کے مشیروں اور مصاحبوں میں شامل ہوجاؤں۔ کس کی مجال تھی کہ ولی عہد...... یعنی مستقبل کے خدا کی حکم عدولی کرے۔

بہرحال میں، اپنی بہن، باپ اور بڑے پجاری کی دعائیں لے کر قاصد کے ساتھ ولی عہد کی خدمت میں جانے کے لئے روانہ ہوگیا۔ میری حد سے زیادہ پذیرائی کی گئی۔ اور ولی عہد نے مجھ سے کہا۔ کہ اس نے

میری کہانی پڑھی اور بہت پسند کی۔ میں بہت ہی ادب کے ساتھ اس کے سامنے زمین بوس ہوگیا۔ اور میں نے اس سے درخواست کی کہ وہ مجھ جیسے حقیر شخص کو میری حیثیت سے زیادہ مرتبہ نہ دے...... میری یہ بات سن کر وہ تخت سے نیچے اتر آیا اور جونہی وہ میرے قریب پہنچا میں نے شاہی آداب ملحوظ رکھتے ہوئے اپنا سر اس کے قدموں میں رکھ دیا۔ اس نے جلدی سے مجھے اٹھا کر سینے سے لگایا اور محبت بھرے لہجے میں بولا......

''نہیں اناطوق...... تم میرے ملازم کی حیثیت سے نہیں بلکہ میرے دوست کی حیثیت سے میرے پاس رہو گے اور ہاں...... تم آئندہ میرے قدموں میں اپنا سر نہیں رکھو گے۔''

''کیا؟'' مجھے حیرت ہوئی تھی۔ ولی عہد سیوعہ کے یہ الفاظ میرے لئے بڑی حیثیت کے حامل تھے۔ میں اپنے نصیب پر جھوم اٹھا تھا۔ جسم کی رگ رگ میں نیا خون دوڑتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

بیوی کی بے وفائی اور بچی کی موت کا صدمہ میرے دل سے بالکل صاف ہوگیا...... میں نے کہا کہ ''آپ کے حکم کی تعمیل میرے لئے باعث فخر وعزت ہوگی۔'' غرض یہ کہ سیوعہ کے سلوک نے مجھے بہت کچھ بھلا دیا۔ میری مالی حالت بھی بہترین ہوگئی۔ اس نے مجھے اپنا دوست بنالیا تھا۔ اور پھر یوں ہوا کہ ہم نے اپنا فیصلہ کیا کہ ہم کسانوں کے لباس میں دارالخلافے کی سیر کریں گے۔ اور پھر ایسا ہی ہوا۔ ہم نے سیر وسیاحت شروع کردی۔ ہم لوگ احراموں میں گئے۔ ہیکلوں کی زیارت کی۔ ابوالہول کی عبادت گاہیں دیکھیں زیر تعمیر احراموں کا معائنہ کیا۔ ایک زیر تعمیر احرام کے پاس شوروغل کی آواز سن کر سیوعہ رک گیا۔ ہم نے دیکھا کہ کچھ سپاہی ایک بوڑھے شخص کو کوڑے لگا رہے ہیں...... اور وہ درد کی شدت سے چیخ رہا ہے۔

''اسے کیوں مار رہے ہو؟'' شہزادے نے ایک جانب کھڑے ہوئے سپاہی سے پوچھا۔

''کام چور عبرانی ہے پورا کام نہیں کرتا۔''

''عبرانیوں کے بارے میں، میں پہلے بھی سن چکا تھا۔ میرے وطن میں یہ مشہور تھا کہ فرعون کے حکم سے ان ہزاروں، لاکھوں کو دریائے نیل کے ساحل پر لاکر قید کردیا گیا جو اپنے آپ کو عبرانی کہتے ہیں۔ یہ وہ باغی لوگ ہیں۔ جو نہ فرعون کو خدا مانتے ہیں...... اور نہ مصر کے دوسرے دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ یہ لوگ قابل گردن زدنی ہیں لیکن ان کی گستاخیوں کے باوجود فرعون مصر نے انہیں صرف اتنی سزا دی ہے کہ جہاں کہیں احرام یا ہیکل معابد یا کسی امیر کا محل تعمیر ہوگا تو بیگار کے طور پر انہیں کام پر لگا دیا جائے گا۔

''میں نے سنا ہے کہ فرعون مصر کا حکم ہے۔ کہ عورتوں، بوڑھوں اور بچوں سے بیگار نہ لی جائے۔'' سیوعہ نے ایک کسان کی حیثیت سے کہا۔ تو سپاہی نے گھور کر اسے دیکھا اور بولا......

''جاؤ...... جاؤ اپنا کام کرو۔'' اسی وقت کام کا جائزہ لیتا ہوا سپاہیوں کا ایک افسر ادھر آنکلا۔ اور اس نے کہا۔

''کیا بات ہے۔ یہ اجنبی کیا کہہ رہا ہے۔؟'' تب سیوعہ نے آگے بڑھ کر سخت لہجے میں کہا۔

''میں پوچھ رہا ہوں کہ کیا تم نے خدائے مصر کا یہ حکم نہیں سنا کہ بوڑھے عبرانیوں کو کام پر نہ لگایا جائے۔'' افسر جواب میں کوئی سخت بات کہنے ہی والا تھا کہ اچانک کوڑے کھاتا ہوا بوڑھا آدمی ایک شیر کی طرح اچھلا اور اس نے کوڑے مارنے والے سپاہی کو ایک طرف دھکا دیا۔ اور جونہی سپاہی نیچے گرا اس نے اس سے کوڑا چھین کر اس کے چہرے اور سینے پر مار مار کر اسے لہولہان کردیا۔

''کتے کے بچے تیری یہ مجال......'' ہمارے پاس کھڑے ہوئے افسر نے تلوار نکالی اور بوڑھے کی طرف لپکا...... اور اس نے پوری قوت سے تلوار بوڑھے کے سینے میں اتار دی۔ تلوار آرپار ہوگئی اور بوڑھے کے حلق سے چیخ بلند ہوئی۔

چیخ کے ساتھ ہی اس کے منہ سے خون کا فوارہ

جاری ہوگیا۔ اور چند ہی لمحوں کے بعد ہمارے سامنے بوڑھے عبرانی کے کھلے ہوئے منہ اور پھٹی پھٹی آنکھوں والی لاش پڑی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ میں خود بھی اس منظر اور اس خون خوار افسر کے غصے سے لرز اٹھا تھا۔ شہزاد سیوعہ کے چہرے سے شدید ناگواری کا احساس جاری ہو رہا تھا۔ غالباً وہ یہ سوچ رہا تھا کہ افسر کو اس کے جرم کی سزا خود دے یا فرعون مصر تک یہ سارا واقعہ پہنچا دے۔

اسی وقت سناٹے کو چیرتی ہوئی نسوانی آہ و بکا کی ایک آواز سنائی دی۔ ہم سب نے گھور کر دیکھا تو یک انتہائی حسین و جمیل لڑکی روتی اور بین کرتی ہوئی آئی تھی۔ اور ہائے بابا کہتی ہوئی لاش سے چمٹ گئی۔ لیکن پھر نجانے کیا ہوا، وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس وقت اس کا حسن و جلال مصر کی سب سے بڑی دیوی کے حسن و جمال کو شرما رہا تھا۔

"بزدلو! کتو!" اس نے مجمع سے مخاطب ہو کر کہا۔

"ایک بوڑھے اور بے بس انسان کو قتل ہوتے دیکھتے رہے اور تم میں سے کسی کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ تلوار چھین کر ظالم کے ہاتھوں کو کاٹ کر پھینک دیتے......"

"لڑکی......!" افسر گرجا...... "اپنے ناسمجھ باپ کا حشر دیکھ چکی ہے۔ اب بھی میری بات مان لے۔ ورنہ تیری لاش بھی اسی طرح بے گور و کفن پڑی ہوئی ہوگی۔"

"لڑکی نے ایک نگاہ بھر کر بوڑھے باپ کی لاش کو دیکھا۔ پھر افسر کی طرف منہ کر کے تھوکتی ہوئی بولی......

"میں تھوکتی ہوں ...... تجھ پر اور تیرے جہنمی چہرے پر۔" افسر کا ہاتھ بے ساختہ تلوار کی طرف گیا۔ تو اسی وقت سیوعہ چلا اٹھا۔

"ٹھہرو......" اس کی آواز میں اتنا رعب اور دبدبہ تھا کہ افسر سر سے پاؤں تک لرز گیا۔ مگر پھر فوراً ہی اپنے اوپر قابو پا کر وہ آگے بڑھا۔

"تو کون ہے کتے کے بچے؟" اس نے شہزادے کے چہرے پر الٹا ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا۔ اور اسی وقت اچانک ایک طوفان آگیا۔ نجانے کہاں کہاں سے شہزادے کے محافظ امڈ پڑے تھے۔ انہوں نے افسر کو زمین پر گرا کر اس کی تلوار چھین لی۔ اور مشکیں کس کر شہزادے کے قدموں میں ڈال دیا۔ شہزادے نے اپنے جسم سے کسانوں والا لبادہ اتار دیا اور سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔

ایک جانب سے کسی کی تھرتھراتی آواز ابھری۔

"ولی، عہد مصر......" اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارا مجمع علاوہ عبرانیوں کے شہزادے کے سامنے سجدے میں گر گیا۔ لڑکی نے شہزادے کے چہرے پر نگاہیں گاڑ کر کہا۔

"ولی عہد...... یہ شخص جو تمہارے سامنے زمین پر پڑا ہوا میرے بوڑھے باپ کا قاتل ہے۔ اور اس نے صرف اس جرم میں اسے قتل کیا ہے کہ میرے باپ نے مجھے اس کے حرم میں دینے سے انکار کر دیا تھا۔ پہلے تو اس نے فرعون کی حکم عدولی کرتے ہوئے میرے بوڑھے اور کمزور باپ کو بے گار پر لگایا، پھر اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس کا کوئی قصور ہو یا نہ ہو اس کے جسم پر خوب کوڑے لگائے جائیں۔ میرا باپ پامردی سے سارے مظالم برداشت کرتا رہا لیکن آج جب میں پانچ میل کی دوری سے اس کے لئے کھانا لے کر آئی تو مجھے راستے ہی میں اطلاع ملی کہ میرے باپ کو انتقام کا آخری نشانہ بنایا جا چکا ہے اور اب اگر میں نے اس کی بات نہیں مانی تو تھوڑے دنوں کے بعد یہی حشر میرا بھی ہوگا۔ میں نے تمہیں صحیح صحیح بات بتا دی ہے۔ اب تمہیں انصاف کرنے یا نہ کرنے کا پورا پورا اختیار ہے۔

"تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف کیا جائے گا لڑکی، دیوتاؤں کی قسم کھا کر بتاؤ کہ تم نے جو کچھ بیان دیا ہے وہ بالکل درست ہے۔"

"میں تمہارے دیوتاؤں کی قسم نہیں کھا سکتی۔"

"کیوں۔؟"

"ہمارے عقیدے کے مطابق تمہارے دیوتا جھوٹے ہیں۔ وہ اس قابل نہیں کہ ان کی پرستش کی

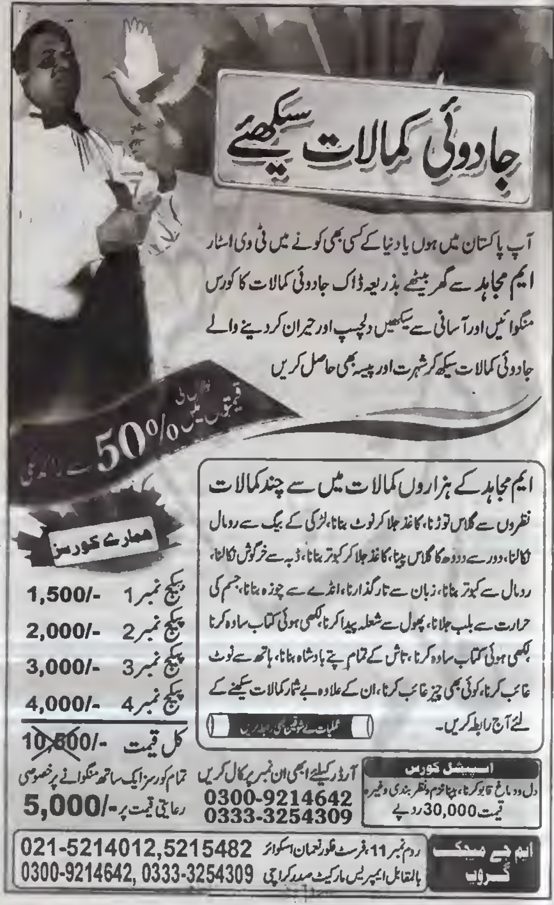

جائے۔ عبادت کے لائق تو صرف ایک ہی ہستی ہے۔ ایک ہی پاک ذات، نہ اس نے کسی کو جنا..... اور نہ وہ کسی سے جنا گیا۔" ولی عہد نے سوالیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔

"یہ کس دیوتا کا ذکر کررہی ہے اناطوق۔"

"میں نہیں جانتا۔" میں نے نفی میں سرہلایا۔

"تم کس کی عبادت کرتی ہو۔ خاتون!"

"ہم سب عبرانی ایک اللہ کی عبادت کرتے ہیں کہ لائق عبادت وہی ہے۔"

"اللہ....." ولی عہد نے زیرلب اس نئے نام کو دہرایا۔ پھر بولا......

"اپنے اللہ کی قسم کھا کر بتاؤ کہ تھوڑی دیر پہلے تم نے جو کچھ کہا ہے وہ حرف بہ حرف سچ ہے۔"

"میں اپنے اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ میری کہی ہوئی ایک ایک بات ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" ولی عہد نے مطمئن ہوکر مجھ سے کہا۔ "اب تم بتاؤ اناطوق کہ تم نے کیا دیکھا۔"

"میں نے جو کچھ دیکھا وہ تمہارے سامنے ہے۔ کیونکہ میں تمہارے ساتھ تھا۔" شہزادے نے افسر کے جسم پر ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔

"تم اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہتے ہو۔"

"ہاں..... حضور! میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ مجھ سے ایک غلطی ہوگئی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ کسان کے لباس میں جناب والا ہیں...... یہ گستاخی یقیناً ایسی ہے کہ میری گردن اڑا دی جائے...... لیکن میں آپ سے رحم کی درخواست کرتا ہوں۔ اگر مجھے پہلے علم ہوتا تو جناب کے چہرہ مبارک پر تھپڑ مارنے کے بجائے میں اپنا ہاتھ کاٹ دینا زیادہ پسند کرتا۔"

"بوڑھے کے قتل کے بارے میں کیا کہتے ہو۔؟"

"وہ عبرانی تھا حضور! ایک خدا کو ماننے والا...... خدائے مصر اور دیوتاؤں کا منکر، ان لوگوں کا خون ہم سب پر حلال ہے میرے آقا۔"

"کیا اس سلسلے میں خدائے مصر کا کوئی فرمان جاری ہوا ہے۔؟"

"نہیں حضور! فرمان تو جاری نہیں ہوا۔ البتہ خدائے مصر نے آج تک کسی عبرانی کو قتل کردینے پر کسی مصری باشندے کو کوئی سزا نہیں دی۔ خدائے مصر کی خاموشی، درگزر، اور چشم پوشی سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ انہوں نے ان عبرانیوں کا خون ہم پر حلال کردیا ہے۔"

"تمہیں ارتکاب قتل کا اقرار ہے۔"

"جی ہاں...... حضور میں اقرار کرتا ہوں، کہ عبرانی بوڑھے کو قتل کرکے میں نے ثواب کا کام سرانجام دیا ہے۔"

"محافظ!" شہزادے نے گرج دار آواز میں کہا۔

"اس کتے! کی گردن اڑا دی جائے۔"

"رحم...... شہزادہ حضور! رحم" افسر چلایا۔ لیکن اس کی آواز فضا میں تحلیل ہوگئی۔ ایک محافظ نے آگے بڑھ کر ایک ہی جھٹکے سے اس افسر کا سر کاٹ دیا۔

"ہمارا خیال ہے۔ ابھی انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہوئے۔ اس شریف اور خوب صورت خاتون کو اپنے باپ کی تجہیز و تکفین کے لئے۔ ایک سوسونے کے سکے پیش کیے جائیں۔ اور عزت کے ساتھ اسے اور اس کے باپ کی لاش کو اس کے گھر پہنچا دیا جائے۔"

لڑکی نے سسکی لے کر کہا۔

"میرا گھر تو باپ کے انتقال کے ساتھ ہی ختم ہوگیا۔ میری والدہ بچپن ہی میں مجھے چھوڑ کر عازم فردوس ہوگئی تھیں۔ میں غیر شادی شدہ اور بالکل تنہا ہوں۔ اپنے سپاہیوں سے کہیے کہ وہ مجھے اور میرے والد مرحوم کو میرے چچا کے ہاں پہنچا دیں۔"

"اس خاتون کے کہنے کے مطابق عمل کیا جائے۔" ولی عہد نے حکم دیا۔ "اور دیکھو! اگر راستے میں اسے کوئی تکلیف پہنچی یا اسے راستے میں کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تو اس کے ساتھ جانے والے سپاہیوں کا حشر بھی ویسا ہی ہوگا۔ جیسا اس کا ہوا۔" اس نے

افسر کی سرکٹی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اور پھر وہاں سے واپسی کے لئے مڑ گیا۔ میری چھٹی حس بار بار کہہ رہی تھی کہ "وہ عبرانی لڑکی اپنے ساتھ ساتھ ولی عہد کا دل بھی لے گئی۔"

اس رات کو شہزادی فرطانہ ولی عہد سے ملنے کے لئے آئی شہزادی ولی عہد کی بہن بھی تھی اور منگیتر بھی۔ پچھلی کئی نسلوں سے مصر کے فرعون نے سگے بہن بھائیوں کی شادی کو رواج دیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح خاندانی خون ہر قسم کی ملاوٹ سے پاک رہتا ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی یہ رواج مصر کے امراء میں بھی عام ہو چلا تھا۔ اور اب آہستہ آہستہ عوام میں پھیل رہا تھا۔

شہزادی فرطانہ نے پہلے تو میری موجودگی پر اعتراض کیا۔ لیکن جب میں باہر جانے کے لئے اٹھا۔ تو شہزادہ سیوعہ نے ہاتھ پکڑ کر مجھے بٹھا لیا۔ اور فرطانہ سے کہا کہ "وہ جو کچھ کہنا چاہتی ہے پورے اعتماد و اعتبار کے ساتھ کہہ سکتی ہے اناطوق یہیں رہیں گے۔"

شہزادی نے مجھے گھور کر دیکھا۔ "میں تمہیں پہلے سے متنبہ کیے دیتی ہوں کہ اگر یہاں کی ایک بات بھی باہر پہنچی تو تمہارے دونوں شانے سر سے محروم کر دیئے جائیں گے۔" پھر اس نے شہزادے سے مخاطب ہو کر کہا۔

"آج رات کے کھانے پر مجھے خدائے مصر نے مدعو فرمایا تھا۔ اور وہ اس بات پر تشویش کا اظہار کررہے تھے کہ ولی عہد مصر عبرانیوں میں دل چسپی لینے لگے ہیں اور آج انہوں نے ایک خوب صورت عبرانی لڑکی کی خاطر سپاہیوں کے ایک بڑے افسر کو سزائے موت بھی دی ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے۔" ولی عہد بوکھلا کر بولا۔ "سیوعہ تم ہی تو میرے ساتھ تھے۔ تم کیوں نہیں کہتے کہ میں نے محض انصاف کے تقاضے پورے کیے ہیں۔"

"نہیں اسے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں۔ اگر اس نے کچھ کہا تو گدی سے اس کی زبان کھینچ لی جائے گی۔" پھر وہ عجیب سی طنزیہ ہنسی ہنسنے لگی۔ "خدائے مصر کی جانب سے مجھے بھی ایسے اختیارات تفویض کیے گئے ہیں جن کو بروئے کار لاکر میں بھی انصاف کے تقاضے پورے کرسکتی ہوں۔"

"یہاں لڑنے کے لئے آئی ہو۔" ولی عہد نے پوچھا۔

"نہیں...... میں لڑنے نہیں، یہ معلوم کرنے آئی ہوں کہ لڑکی والی بات کہاں تک درست ہے۔؟"

"صرف اس حد تک درست ہے کہ اس دکھیاری کے بوڑھے باپ کو خدائے مصر کے احکامات کی صریح خلاف ورزی کرکے بڑھاپے اور کمزوری کے باوجود بیگار کرنے پر مجبور کیا گیا...... سپاہیوں سے کہا گیا کہ وہ اس پر وقتاً فوقتاً کوڑے برساتے رہیں۔ اور جب ظلم اپنی انتہا کو پہنچ گیا تو اس بوڑھے تک یہ پیغام پہنچایا گیا کہ اگر وہ اپنی معصوم، خوب صورت، نوجوان لڑکی کو پولیس افسر کے حرم میں داخل کرنے کے لئے راضی ہو جائے تو اسے انعام و اکرام سے نواز دیا جائے گا۔ اور جب اس نے انکار کردیا تو ایک معمولی سی بات کا بہانہ بنا کر اسے قتل کردیا گیا۔"

"اس نے ایک مصری سپاہی کا کوڑا چھین کر سپاہی کو مارنے کی جرأت کی تھی۔ اور تمہارے نزدیک یہ معمولی سی بات ہے۔" وہ بولی۔ "تمہاری حمیت کو کیا ہوگیا ہے۔ سیوعہ! ایک عبرانی جو ہمارے خدا اور ہمارے دیوتاؤں کی شان میں گستاخی کرتا ہے۔ ایک مصری سپاہی پر ہاتھ اٹھانے کی جسارت کرے تو تم بے حیا...... بے غیرت بن کر یہ کہتے ہو کہ اس نے معمولی سی غلطی کی۔ اگر ان گستاخ ہاتھوں کو ابتدا ہی میں نہیں کاٹا گیا تو میری دور رس نگاہیں انہیں تخت و تاج کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھ رہی ہیں۔ میں نہیں سمجھتی کہ تم جیسا ذہین اور سمجھ دار شخص عبرانیوں کے خبیث اور ناپاک عزائم سے ناواقف ہوگا۔ اس لئے جیسا کہ تم کہتے ہو، اس سارے فتنہ و فساد میں کسی لڑکی کا ہاتھ نہیں ہے۔ تو مجھے تمہاری حالت پر ترس آرہا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم شاہی معالج سے اپنے دماغ کا علاج کراؤ۔"

”تمہیں اور بھی کچھ کہنا ہے۔؟“

”نہیں۔ مجھے جو کچھ کہنا تھا۔ کہہ چکی“ اس نے منہ بنا کر کہا۔

”میں یہ تو برداشت کرسکتی ہوں کہ میرا ہونے والا شوہر کسی لڑکی کے چکر میں آ کر غلطی کر بیٹھے۔ لیکن یہ ہرگز برداشت نہیں کرسکتی کہ جان بوجھ کر اس سے غلطی سے اس سے ایسا کوئی کام سرزد ہو جس سے خدائے مصر اور ان کی کئی عظیم قوم کی اہانت کا کوئی پہلو نکلتا ہو، اور سچ تو یہ ہے کہ میں اب بھی یہی سمجھتی ہوں۔ کہ اگر عبرانی لڑکی درمیان میں نہ ہوتی تو تم ہرگز ہرگز پولیس افسر کو سزائے موت نہ دیتے۔

”مجھے ایک بات بتا سکو گی......؟“

”پوچھو......“

”آخر عبرانیوں نے ایسا کون سا قصور کیا ہے۔ جس کی پاداش میں خدائے مصر نے انہیں مقید کررکھا ہے......؟“ اگر واقعی ان سے کوئی خطرہ لاحق ہے تو انہیں مصر میں روکے رکھنے سے کیا فائدہ جب کہ وہ خود وعدہ کرتے ہیں کہ دریائے نیل کو پار کرکے کسی دوسرے علاقے میں چلے جائیں گے اور دوبارہ پھر کبھی مصر میں آنے کا قصہ نہیں کریں گے......؟“

”تمہاری بات کا جواب بعد میں دوں گی۔ پہلے تم میرے اس سوال کا جواب دو کہ فرعون مصر اپنے باپ کو تم خدا سمجھتے ہو یا نہیں......؟“

”ہاں......شاید...... میں انہیں خدا سمجھنے پر مجبور ہوں......“

”شاید مجبور...... بڑے اچھے الفاظ استعمال کررہے ہو...... خدائے مصر کے لئے......“ اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ”تاہم اگر تم انہیں اپنا خدا تسلیم کرتے ہو تو ان کے کسی کام میں تمہیں چوں و چرا کرنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ وہ جو کچھ بھی کریں گے اس میں کوئی نہ کوئی بہتری ضرور ہوگی۔“

”لیکن جس طرح انہوں نے عبرانیوں کو مقید کر کے ان کا جینا دوبھر کررکھا ہے۔ اس میں مجھے کوئی بہتری نظر نہیں آتی۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں۔ کہ ان کی ساری خدائی کنجوس مکھی چوس نابوس اور شاہی جادوگروں اور کاہنوں کے بل بوتے پر قائم ہے۔“

”توبہ کرو سیوعہ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ کہیں یہ شیطانی خیالات تمہارے ایمان اور عقائد کو متزلزل نہ کردیں......“

”تمہیں یقین ہے کہ فرعون مصر، تمہارا باپ حقیقت میں خدا ہے......؟“

شہزادے نے پوچھا۔

”ہاں مجھے اس بات پر اتنا ہی یقین ہے۔ جتنا اپنے وجود پر بلکہ اس سے بھی زیادہ۔“

”پھر تو تم یہ بھی مانتی ہوگی کہ خدا ہونے کی حیثیت سے فرعون مصر کے لئے کوئی بھی کام ایسا نہیں جو وہ انجام نہیں دے سکیں......“

”یہ عقیدہ میرے ایمان کا جزو ہے......“

”وہ دن یاد کرو۔ جب عبرانیوں کے پیغمبر دربار میں داخل ہوئے تھے اور انہوں نے فرعون مصر کو اپنا دین قبول کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ اور فرعون مصر کے اشارے پر دربار کے جادوگروں نے جادو کے زور سے سانپوں کو بلا کر انہیں ڈسنے کے لئے چھوڑ دیا تھا۔ اور تب انہوں نے بڑے اطمینان کے ساتھ اپنا عصاء فرش پر ڈال دیا تھا۔ جو دیکھتے ہی دیکھتے ایک بڑا اژدھا بن گیا تھا۔ اور سارے سانپوں کو پلک جھپکتے میں نگل گیا تھا۔ اس وقت فرعون مصر، جنہیں خدا ہونے کا دعویٰ ہے۔ بالکل عاجز ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کی بوکھلاہٹ قابل دید تھی۔ تمہیں یہ بھی یاد ہوگا کہ جب عبرانیوں کے پیغمبر نے بغل سے اپنا ہاتھ نکال کر سامنے کیا تھا۔ تو اس میں سے نور اور روشنی کی ایسی شعاعیں نکل رہی تھیں جن سے سارا دربار چندھیا گیا تھا۔

بہت سے جادوگر اور کاہن تو اس وقت عبرانیوں کے پیغمبر پر ایمان لے آئے تھے۔ کیا اس وقت تم نے اپنے خدا کے ماتھے پر پسینے کے قطرے نہیں دیکھے تھے۔ کیا تم نے محسوس نہیں کیا تھا کہ فرعون مصر کا پورا جسم خوف

دہشت سے کانپ رہا ہے۔ کیا تم نے کاہنوں، جادوگروں اور پجاریوں کی یہ سرگوشیاں نہیں سنی تھیں کہ وہ عبرانیوں کے پیغمبر کا مقابلہ نہیں کرسکتے......؟ میں پوچھتا ہوں ...... کہ فرعون مصر اگر واقعی خدا ہیں تو وہ عاجز اور پریشان کیوں ہوگئے تھے......؟ انہوں نے عبرانیوں کے پیغمبر کو اپنے غضب کی آگ میں جلا کر بھسم کیوں نہیں کردیا......؟ انہوں نے عبرانیوں کے پیغمبر سے یہ عاجزانہ درخواست کیوں کی کہ وہ کچھ سوچنے کی مہلت دیں......؟“

شہزادی فرطانہ نے اپنا سر پکڑ لیا۔ ”اسی طرح تم مجھے بھی پاگل بنا دو گے...... لیکن یہ بات خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ میں ایک لمحے کے لئے بھی یہ ماننے کو تیار نہیں ہوں کہ خدائے مصر کا کوئی کام مصلحت کے خلاف ہوسکتا ہے۔ میں تو آج بھی یہ ہی سمجھتی ہوں کہ انہوں نے محبت تمام کرنے کی غرض سے عبرانیوں کے پیغمبر کو تھوڑی سی ڈھیل اور مہلت دی ہے۔ اگر وہ واقعی خوف زدہ ہوتے تو عبرانیوں کو آزاد کرکے دریائے نیل کے پار جانے کی اجازت دے چکے ہوتے۔“

ولی عہد ہنسا......”اس بات کو یوں بھی تو کہا جاسکتا ہے کہ فرعون مصر محض اپنا بھرم اور وقار باقی رکھنے کے لئے عبرانیوں کو مقید کئے ہوئے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جس دن انہوں نے عبرانیوں کو آزاد کیا۔ اسی روز ان کی خدائی کا خاتمہ ہوجائے گا۔ حالانکہ یہ محض ان کی خام خیالی ہے۔ مصر میں میری بہن جیسے بھولے بھالے لوگوں کی اکثریت ہے۔ ان کے اس کام کو بھی خدائی کارنامہ ہی سمجھا جائے گا......“

”معلوم ہوتا ہے۔ عبرانیوں نے تمہارے اوپر بھی جادو کردیا ہے۔ میں خدائے مصر کو مشورہ دوں گی کہ وہ آئندہ تمہیں عبرانیوں سے دور رکھیں......“

”خدا کو کسی مشورے کی ضرورت نہیں ہوتی فرطانہ......“

شہزادی فرطانہ نے ولی عہد کو گھور کر دیکھا......”شب بخیر سیوعہ......“

”شب بخیر فرطانہ......“

جونہی شہزادی کمرے سے باہر گئی ولی عہد نے مجھ سے پوچھا......

”اناطوق! میں نے کسی غلط بیانی سے تو کام نہیں لیا؟“

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”آپ نے میرے دل کو مانجھ کررکھ دیا ہے۔ آپ کے دلائل سن کر نجانے کیوں میں یہ سوچنے پر مجبور ہوگیا ہوں کہ عبرانیوں کے پیغمبر سچے ہیں اور ان کا دین برحق ہے۔ نجات اسی کی ہوگی، جو ان کے دین پر ایمان لائے گا۔ آیئے جتنی جلدی ہوسکے ہم یہاں سے نکل بھاگیں اور عبرانیوں کے پیغمبر کے سایہ عاطفیت میں چلے جائیں......“

”جلد بازی کی ضرورت نہیں۔ مجھے پورے طور پر عبرانیوں کے دین کو سمجھ لینے دو۔ ابھی میرے ذہن میں کئی شکوک و شبہات ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اور اب تم مجھے کوئی رومانی کہانی سناؤ۔ ایسی کہانی جو میرے سینے کی دہکتی ہوئی آگ کو سرد کرسکے......“

میں نے فوراً ہی ایک کہانی گڑھ لی جس کا ہیرو شہزادہ سیوعہ جیسا تھا اور ہیروئن عبرانیوں کی اس لڑکی کی طرح جو ہمیں زیر تعمیر اہرام کے پاس ملی تھی۔ کہانی کا انجام طربیہ تھا۔ میں نے ساری رکاوٹیں دور کرکے ہیرو، ہیروئن کی شادی کرادی تھی۔ میرا خیال تھا کہ میری اس کہانی سے ولی عہد کو کچھ تسکین ملے گی۔ لیکن کہانی ختم ہونے پر پتہ چلا کہ سرد ہونے کے بجائے آگ کچھ اور بھی زیادہ بھڑک چکی ہے۔

ولی عہد جھلسا دینے والے گہری گہری آہیں بھرنے لگا کچھ بڑبڑا بھی رہا تھا۔ میں نے کان لگا کر غور سے سنا......تو وہ کہتا ہوا سنائی دیا......

”عبرانیوں کے چاند تمہارا نام کیا ہے......؟“

میرا خیال تھا کہ فرعون مصر ولی عہد کو اپنے دربار میں بلا کر براہ راست اس سے معلوم کرے گا۔ کہ اس نے عبرانی کی خاطر مصر کے پولیس افسر کو قتل کیوں کیا۔ لیکن میرا خیال بالکل غلط ثابت ہوا۔ ولی عہد سے نہ کوئی

وضاحت طلب کی گئی تھی اور نہ اس پر کسی قسم کی پابندیاں لگائی گئیں۔ وہ روزانہ شام کو مجھے اپنے ساتھ شاہی رتھ میں سوار کر کے گھومنے کے لئے نکل جاتا...... رات گئے...... تک ہم بستی کے مضافات میں گھومتے رہتے۔

تقریباً پندرہ دن کی بے مقصد سیر و تفریح کے بعد ایک روز اس نے مجھ سے پوچھا...... "جب ہم لوگ شام کو گھومنے کے لئے نکلتے ہیں تو کوئی ہمارا پیچھا تو نہیں کرتا......؟"

میں نے کہا۔ "شاید شروع کے تین چار دنوں میں مجھے یہ محسوس ہوا تھا۔ کہ آپ کے محافظ ساتھ چل رہے ہیں۔"

تین چار دن نہیں۔ پورے نو دن تک۔" وہ مسکرا کر بولا۔" اور وہ میرے محافظ نہیں تھے، شہزادی فرطانہ کے مخبر تھے...... جنہیں یہ پتہ لگانے پر مقرر کیا گیا تھا کہ ہم لوگ کہاں جاتے ہیں۔ لیکن اب شہزادی سمجھ چکی ہے کہ زیادہ تفتیش کرنا فضول ہے۔ اس لئے اس نے ایک کے علاوہ اپنے سارے مخبروں کو ہٹا دیا ہے۔ اگر کسی طرح ہم لوگ اس ایک مخبر پر قابو پالیں تو ہمارے راستے کی ساری رکاوٹیں دور ہو سکتی ہیں......"

"آپ حکم دیں تو تلوار کے ایک ہی وار میں اس کو ختم کر دیا جائے......"

"نہیں تمہارے ہاتھ میں قلم زیادہ زیب دیتا ہے۔ میں تلوار اٹھانے کی کبھی رائے نہیں دوں گا۔" اس نے سوچتے ہوئے کہا۔ "تم کہانی کار ہو۔ دل میں اتر جانے والے الفاظ تمہارے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے رہتے ہیں۔ تھوڑی سی چرب زبانی سے کام لو تو اس مخبر کو باآسانی خرید سکتے ہو۔"

اگلے روز جب ہم گھومنے کے لئے نکلے تو ولی عہد نے ایک تنگ راستہ کے موڑ پر اپنا رتھ اس طرح روک دیا کہ پورا راستہ بند ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد ادھر سے ایک گھڑ سوار نکلا۔ ولی عہد نے مجھے اشارہ کیا۔ راستہ بند دیکھ کر جونہی اس نے گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ میں نے رتھ سے کود کر اس کے گھوڑے کی لگامیں تھام لیں اور اسے ایک طرف کو لے گیا۔ ایک گھنٹے کی مسلسل محنت کے بعد میں نے اسے رشوت دے کر بالآخر اس بات پر راضی کر لیا۔ کہ وہ آئندہ ہم لوگوں کی تفریح میں مخل نہیں ہوگا اس سے یہ وعدہ بھی لیا گیا۔ کہ ولی عہد کے برسر اقتدار آتے ہی اسے حکومت کی جانب سے ایک بڑا عہدہ بھی پیش کیا جائے گا۔

شہزادے کی محتاط طبیعت نے اس کے بعد بھی تین روز تک اپنے دل کی بات زبان تک نہیں آنے دی۔ جب اسے پورا پورا اطمینان ہو گیا تو چوتھے روز اس نے رتھ کا رخ عبرانیوں کی بستی کی طرف موڑ دیا۔ مجھے پہلے ہی دن سے اس بات کی توقع تھی۔

ہمارا رتھ عبرانیوں کے علاقہ میں پہنچا۔ تو مجھے یہ دیکھ کر انتہائی حیرت ہوئی کہ ان لوگوں کی ایک بڑی تعداد پہلے ہی ہمارے استقبال کے لئے موجود تھی۔ یہ بات مجھے بہت بعد میں معلوم ہوا۔ کہ ولی عہد نے یہاں آنے کی تاریخ اسی روز مقرر کر لی تھی۔ جب وہ پہلی بار میرے ساتھ گھومنے نکلا تھا۔ اس کی سیاست اور احتیاط کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنا پڑتا تھا۔ کہ وہ حقیقت میں وارث تخت و تاج ہے۔

ہم دونوں کو کشاں کشاں...... اس لڑکی کے چچا کے ہاں لے جایا گیا۔ جسے ولی عہد عبرانیوں کا چاند کہا کرتا تھا۔ وہاں ولی عہد نے کھانا کھایا۔ ان لوگوں کے مسائل معلوم کیے اور وعدہ کیا کہ فرعون کو اس بات پر راضی کرنے کی کوشش کرے گا کہ عبرانیوں کو آزاد کر کے نیل پار جانے کی اجازت دے دی جائے۔ پھر اس نے اس بات کی خواہش ظاہر کی کہ وہ عبرانیوں کے پیغمبر سے ملنا چاہتا ہے۔ اسے بتایا گیا کہ ان کے پیغمبر اللہ تعالیٰ کے حکم پر کسی پہاڑی پر گئے ہوئے ہیں۔ اور ان کی واپسی کافی دنوں بعد ہوگی۔

ولی عہد باتیں تو ان لوگوں سے کر رہا تھا۔ لیکن اس کی بے چین نظریں کسی کو تلاش کر رہی تھیں۔ اچانک وہ دروازے پر نمودار ہوئی اس کے چچا نے پوچھا...... "کیوں نزائلہ کیا کھانا ابھی تک تیار نہیں

ہوا......؟"

"تیار ہے...... چچا...... معزز...... مہمان اندر چلیے۔ اور کھانا نوش فرمایئے......"

اس نے ولی عہد سے مخاطب ہو کر کہا اور یہ کہتے ہوئے ان دونوں کی نظریں چار ہوئیں شاید ایک لمحہ یا اس سے بھی کچھ کم لمحہ تک دونوں کی نگاہیں ٹکرائی ہوں گی۔ لیکن اس مختصر ترین لمحہ میں نجانے دونوں نے کتنی کہانیاں کہہ ڈالیں...... کتنے شکوے کر ڈالے...... کتنے محبت بھرے نغمے ایک دوسرے کو سنا ڈالے......

دستر خوان پر صرف دو قسم کے سالن تھے۔ بھنا ہوا اونٹ کا گوشت اور چنے کی ابلی ہوئی دال، اور مکئی کی موٹی موٹی روٹیاں تھیں۔ مگر جب ہم دونوں نے کھانا شروع کیا تو ایسا معلوم ہوا جیسے ہم صدیوں کے بھوکے ہوں۔ معمولی قسم کے سالن اور ادنیٰ درجے کی روٹیاں ہمیں جنت کے میووں کی طرح خوش ذائقہ معلوم ہو رہی تھیں......

کھانے کے دوران ہی...... ولی عہد نے لڑکی کے چچا سے پوچھا۔ "نزائلہ اپنے مرحوم باپ کو تو یاد نہیں کرتی......"

چچا بہت ہی جہاندیدہ اور چالاک شخص تھا۔ وہ بھانپ گیا کہ ولی عہد اس کی بھتیجی میں دل چسپی لے رہا ہے۔ مسکرا کر بولا۔

"آپ کے انصاف نے اس کا آدھا غم ختم کر دیا ہے۔ میں بھی اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ اسے کوئی تکلیف نہ ہونے پائے۔ لیکن غریب آدمی ہوں۔ صحیح طور پر اسکی خدمت نہیں کر سکتا۔" پھر گفتگو کا موضوع بدل کر بولا۔ "میری نزائلہ اپنے حسن و سیرت کے باعث اس قابل ہے کہ اسکا کسی شہزادے سے بیاہ کیا جائے۔ اور وہ کسی محل کو جا کر آباد کرے۔ مگر...... دکھ کی بات یہ ہے کہ ہم عبرانی، دین موسیٰ کو ماننے والے اپنی لڑکیوں کی شادی کسی مشرک سے نہیں کر سکتے......"

شہزادے نے کوئی جواب نہیں دیا۔ خاموشی سے بیٹھا ہوا کھانا کھاتا رہا۔ اور غالباً کچھ سوچتا بھی رہا۔ کھانا ختم کرتے ہی اس نے نزائلہ کے چچا سے کہا۔ "تمہارے پیغمبر موجود نہیں ہیں۔ لیکن کم سے کم کوئی اور دوسری بزرگ ہستی تو ضرور موجود ہوگی مجھے ان کے پاس لے چلو......"

سفید داڑھی اور نورانی چہرے والے بزرگ کے پاس ہم لوگ پہنچے شہزادے نے ان کے ہاتھوں کو چوم کر کہا۔ "میں بہت غور سے آپ کے دین کا مطالعہ کرتا رہا ہوں اور اب اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ آپ کا دین ایک سچا دین ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ مجھے بھی اس دین کے ماننے والوں میں شامل کر لیا جائے......"

بزرگ بولے۔ "بیٹا تمہارے دل پر مجھے ایک بہت ہی خوب صورت سی لڑکی کی تصویر نظر آ رہی ہے۔ میں اس لڑکی کو خوب اچھی طرح سے پہچانتا ہوں۔ یہ ایک عبرانی لڑکی ہے جس کا نام لینا میں مناسب نہیں سمجھتا۔ تم اسکی خاطر میرا دین اپنانا چاہتے ہو......"

شہزادے نے ادب سے سر جھکا کر اقرار کر لیا۔

"بزرگ کا ارشاد بالکل درست ہے۔" دوسرے ہی لمحے بزرگ کا محبت بھرا لہجہ غصہ میں بدل گیا......

"سچے دین کو اختیار کرنا ہے...... تو سچے بن کر آؤ...... لالچ اور ہوس کے ساتھ مت آؤ۔ قحبہ خانہ اور کسی کسبی کا گھر سمجھنے والوں کے لئے ہمارے دروازے بالکل بند ہیں...... واپس چلے جاؤ...... شہزادے اس سے پہلے کہ اللہ کے دین کو مذاق سمجھنے کے جرم میں تمہیں کوئی عذاب اپنی لپیٹ میں لے لے......"

"اے مقدس ہستی...... میں آپکو یقین دلاتا ہوں کہ......"

"نہیں...... مجھے یقین دلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تمہارے اندر اخلاص کی کمی ہے۔ اگر تم حقیقت میں ہمارے مذہب کو سچا سمجھتے ہو، اور واقعی نجات اخروی کے طلب گار ہو تو پہلے اپنے سینے کو ہر قسم کی آلائش سے پاک کرو......"

"اس میں کوئی شک نہیں، بزرگ محترم میرے دل و دماغ میں ایک خوب صورت عبرانی لڑکی بسی ہوئی

ہے۔ اگر وہ لڑکی میری شریک زندگی بن جائے تو میں آخری سانس تک اپنی اس خوش نصیبی پر فخر کروں گا۔ لیکن جہاں تک دین موسوی کو قبول کرنے کی بات ہے۔ تو میں یقین کامل کے ساتھ کہتا ہوں کہ میرے نزدیک یہ برحق دین ہے۔ اگر مجھے کچھ بھی تردد ہوتا تو میں شاہی تخت وتاج اور موروثی خدائی کو ٹھوکر مار کر آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہوتا۔"

"تمہاری دلیل بے وزن ہے۔ شہزادے...... تاریخ ایسے واقعات سے بھری ہوئی کہ بڑی بڑی غزالی آنکھوں اور کالی کالی گھنیری زلفوں اور نرم ونازک مرمریں جسموں کی خاطر بہت سے شاہوں نے تاج وتخت کو لات ماردی ہے۔ لیکن ہمارے دین کو اختیار کرنے کے لئے سب سے پہلے تمہیں اس لڑکی کا خیال اپنے سینے سے نکالنا پڑے گا۔ جس کا تصور تمہارے دل میں جھلملا رہی ہے۔ بتاؤ کیا تم یہ قربانی دینے کے لئے تیار ہو۔؟"

شہزادے کی زندگی کا یہ نازک ترین لمحہ تھا۔ اسکا پورا چہرہ اس طرح پیلا پڑ گیا۔ مانو کسی نے اسکا خون نچوڑ لیا ہو۔ تھوڑی دیر تک وہ خلاء کو اس مریض کی طرح گھورتا رہا جس کو معالجوں نے بتا دیا ہو کہ اب وہ چند پل کا مہمان ہے۔ پھر اس کے منہ سے درد بھری آواز یوں نکلی گویا وہ کہیں دور سے بول رہا ہو......

"ہاں...... بزرگ ہستی...... دین حق کی خاطر میں یہ قربانی دینے کے لئے بالکل تیار ہوں......"

"تمہیں یقین ہے کہ کسی لالچ، طمع، یا ہوس کی خاطر تم دین موسوی اختیار نہیں کر رہے ہو۔"

"جی ہاں...... مجھے پورا یقین ہے......"

"اور تم یہ وعدہ کرتے ہو۔ کہ ہمارے دین میں آنے کے بعد ہم میں سے کسی عبرانی کو خوشامد یا دھمکی یا لالچ دے کر اس بات پر آمادہ کرنے کی کوشش نہیں کرو گے کہ وہ اپنی لڑکی یا اپنی بھانجی، بھتیجی کی شادی تمہارے ساتھ کر دے۔"

"جی ہاں...... میں یہ بھی وعدہ کرتا ہوں۔"

بزرگ کا نورانی چہرہ گلاب کی طرح کھل اٹھا۔

انہوں نے زیر لب اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے شہزادے کو کلمہ پڑھوایا۔ طہارت اور عبادت کے چند ضروری مسائل بتائے۔ اور جب وہ ان کاموں سے فارغ ہو گئے۔ تو انہوں نے نزائلہ کے چچا کو جو بڑی حیرت سے منہ پھاڑے ہوئے ان کی باتیں سن رہا تھا۔ اپنے پاس بلایا۔

"تم گواہ ہو کہ شہزادے نے کسی لالچ کے بغیر دین موسوی اختیار کیا ہے۔ کوئی مشرک اور کوئی کافر یہ کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا۔ کہ عبرانی اپنی لڑکیوں کے سہارے نوجوانوں پر اپنا مذہب ٹھونستے ہیں۔ لیکن ابھی جب کہ نوجوان شہزادہ اخلاص کے ساتھ امت موسوی کا ایک فرد بن چکا ہے۔ تو اس کی آرزوؤں، تمناؤں اور خواہشوں کا احترام کرنا ہمارا اخلاقی فرض ہے۔ اسکی شادی غیروں میں نہیں اپنے دینی بھائیوں میں ہو گی۔ اس لئے میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ آج...... ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر اپنی بھتیجی نزائلہ کا نکاح شہزادے سے کر دو۔"

"شہزادے کے منہ سے حیرت ومسرت کی ملی جلی ایک چیخ نکل گئی۔

نکاح سے پہلے نزائلہ کے چچا نے شہزادے کو بتایا کہ اس نے نزائلہ کی حفاظت اور پرورش کے لئے اچھی خاصی رقم خرچ کر دی ہے اور اب شوہر کی حیثیت سے شہزادے کا فرض ہے کہ وہ نزائلہ پر خرچ کی جانے والی رقم واپس کر دے۔ اس وقت شہزادہ کچھ اتنا خوش ہو رہا تھا کہ اگر نزائلہ کے بدلے جان بھی مانگی جاتی تو وہ دینے سے انکار نہ کرتا، اس نے فوراً اپنے گلے کا طلائی ہار اتار کر نزائلہ کے چچا کو دے دیا۔

شکریہ ادا کرنے کے بجائے نزائلہ کے چچا نے شہزادے کے ہاتھ میں پڑے ہوئے طلائی کنگنوں کو کن انکھیوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "نزائلہ کے نکاح کے بعد مجھے اپنے عزیزوں اور پڑوسیوں کو دعوت بھی دینا پڑے گی۔ میری حیثیت سے آپ بخوبی واقف ہیں۔ ایک غریب ناچیز شخص ہوں۔ شادی کی دعوت کا بار نہ اٹھا سکوں گا۔ اس لئے اگر آپ مناسب سمجھیں تو......"

شہزادے نے اسکا جملہ مکمل ہونے سے پہلے

ہی دونوں کنگن اتار کر اسکے آگے ڈال دیئے۔

لیکن لالچی چچا کو شہزادے کی انگلی میں پڑی ہوئی انگوٹھی جس میں ایک بڑا سا قیمتی ہیرا جڑا ہوا تھا۔ اپنی طرف ملتفت کیئے ہوئے تھی۔ "میرا خیال ہے کہ نکاح کے بعد آپ نزائلہ کو فی الحال اپنے محل میں لے جانا پسند نہیں کریں گے۔"

"میرا خیال کچھ اور ہے۔" شہزادے نے کہا۔ "میں اب خود بھی محل میں جانا پسند نہیں کروں گا۔ بلکہ میں یہیں تم لوگوں کی بستی میں اپنی زندگی گزارنا پسند کروں گا۔"

"ارے ایسا غضب تو بھول کر بھی نہ کریں۔ اس طرح آپ ساری شاہی مراعات کھو بیٹھیں گے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کی وجہ سے ہم لوگوں پر بھی کوئی بڑی مصیبت آن پڑے۔ اس لئے میری ناچیز رائے یہ ہے کہ آپ کسی کو تبدیلی مذہب کے بارے میں نہ بتائیں۔ نہ کسی سے اپنی شادی کا تذکرہ کریں۔ اور جب تک آپ کو اقتدار نہ مل جائے۔ اس وقت تک نزائلہ کو یہیں رہنے دیں۔ گو میں غریب شخص ہوں۔ خود فاقے کر لوں گا۔ مگر آپ کی زوجہ کو کوئی تکلیف نہ ہونے دوں گا۔ ہاں اگر آپ یہ انگوٹھی عنایت فرما دیں تو شاید ایک دو مہینے آرام سے گزر جائیں گے۔"

شہزادے نے اپنی ہیرے کی انگوٹھی بھی اتار کر اس کے ہاتھ پر رکھ دی، نکاح کے بعد شہزادے نے پوری رات وہیں گزاری۔ مجھے رتھ کی رکھوالی کے لئے میدان میں سونا پڑا۔ صبح ہونے میں کچھ دیر باقی تھی۔ کہ شہزادے نے آکر جگایا۔ مسرت کے باعث اسکے جسم کا ایک ایک رواں رقص کر رہا تھا۔ اس روز میں نے شہزادے کو جتنا ہشاش بشاش پایا اس سے پہلے کبھی نہیں پایا تھا۔ اور نہ کبھی اس کے بعد وہ اتنا خوش نظر آیا۔

تاروں کی چھاؤں میں ہم لوگ دارالخلافہ کی طرف روانہ ہو گئے۔ شہزادہ ہمیشہ رتھ خود چلایا کرتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ کسی ایسی گاڑی یا ایسے جانور پر نہیں بیٹھ سکتا۔ جس کی باگ کسی دوسرے شخص کے ہاتھ میں ہو۔

لیکن اس روز اس نے رتھ کی باگیں میرے ہاتھوں میں دے دیں۔ اور خود آنکھیں بند کر کے نیم دراز ہو گیا۔ اثنائے راہ میں میں نے گھوم کر ایک اچٹتی ہوئی نگاہ شہزادے پر ڈالی۔ اسکے پورے جسم پر نجانے کہاں سے نور سمٹ آیا تھا۔ ہونٹوں پر عجیب سی ملکوتی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ کچھ ایسے محسوس ہو رہا تھا۔ گویا وہ اس کی مخلوق ہی نہیں۔ آسمانوں سے اتری ہوئی ایک ایسی مخلوق ہے۔ جس کو نور کے سانچے میں ڈھالا گیا ہے۔

میں یہ فیصلہ نہیں کرسکا کہ شہزادے کا فرشتوں جیسا یہ حسن نزائلہ کے قرب کا مرہون منت ہے۔ یا دین موسوی قبول کرنے کا نتیجہ ہے۔

دوپہر کو شہزادی فرطانہ نے بازیابی کی اجازت چاہی۔ جب وہ شہزادے کے قریب پہنچی تو اس نے مسکراتے ہوئے اسے شادی کی مبارکباد دی۔

"تم سے کس نے کہا کہ میں نے شادی کر لی ہے؟" شہزادے نے حیرت سے پوچھا۔ "انا طوق کہیں تم نے تو شہزادی کے کان نہیں بھرے۔؟"

میرے جواب دینے سے قبل شہزادی بول اٹھی۔

"اپنے معتمد کہانی کار پر شبہ نہ کرو۔ تم نے مخبر کو رشوت اور عہدے کا لالچ دے کر یہ سمجھ لیا تھا کہ میرے ہاتھ پاؤں کاٹنے میں کامیاب ہو گئے ہو۔ اگر میرا مخبر تمہاری بات مان لیتا۔ تب بھی مجھے تمہاری ایک ایک حرکت کا پتہ چل جاتا۔ کئی عبرانی کتے ایسے ہیں۔ جو میرے جاسوس بنے ہوئے ہیں۔ اور پل پل کی خبر مجھے پہنچاتے ہیں۔" پھر وہ ایک اور خوفناک قہقہہ لگا کر بولی۔ "مصر کی ہونے والی ملکہ کبھی دونوں آنکھیں بند کر کے نہیں سوئی۔ سوتے میں بھی اگر اسکی ایک آنکھ بند ہوتی ہے تو دوسری کھلی رہتی ہے۔"

شہزادے نے دریافت کیا۔

"کون...... کون سی باتیں تمہیں معلوم ہوئی ہیں......؟"

"دوسری باتیں ممکن ہے کسی کے لئے اہم ہوں مگر میرے نزدیک ان کی کوئی اہمیت اور کوئی وقعت نہیں۔ لڑکیوں کے دل جیتنے اور حرم بنانے کے لئے

مصری نوجوان بے تکی حرکتیں کرنے میں ماہر ہوتے ہیں۔ بہر حال مجھے خوشی ہے کہ تبدیلی مذہب کا ڈھونگ رچا کر تم نزائلہ کے ساتھ شادی کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ البتہ یہ بات میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آئی کہ تم اسے محل میں کیوں نہیں لائے۔ کس کے خوف نے تمہیں ایسا کرنے سے باز رکھا۔"

"اگر میں کہوں کہ سب سے بڑا خوف تمہارا تھا۔ تو کیا تم یقین کرلو گی......؟"

"ہش......" وہ ہنسی......"ہر فرعون کے حرم میں سو ڈیڑھ سو بیویاں رہی ہیں۔ میں ان تمام عورتوں کی طرح نہیں جو اپنی سوکنوں سے جلا کرتی ہیں۔ اس کے علاوہ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تم کتنی ہی شادیاں کرلو۔ خاندانی حسب ونسب کے اعتبار سے تمہاری ساری بیویوں پر مجھے فوقیت حاصل رہے گی اور وقت آنے پر صرف مجھ ہی ملکہ مصر سمجھا جائے گا۔ اور صرف میری اور تمہاری اولاد ہی وارث تخت ہو سکے گی۔"

"دین موسوی میں سگے بہن بھائی شادی نہیں کرسکتے۔" شہزادے نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "اور تمہیں پہلے ہی اس بات کا علم ہو چکا ہے کہ میں نے پورے ہوش وحواس اور رضا ورغبت سے اس دین کو قبول کیا ہے۔

دوسرے الفاظ میں اسی بات کو یوں کہو کہ یہ دین شرافت ونجابت کا دشمن ہے۔ بھائی بہن کی شادی نہیں ہوسکے گی تو اولاد کی رگوں میں خالص خون کس طرح دوڑے گا۔ پھر تو کوئی بھی یہ دعویٰ کرنے کی جرأت نہیں کرسکے گا کہ وہ شریف ماں باپ کی اولاد ہے۔"

اس نے مذاق بناتے ہوئے کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ تم اس اصول پر کاربند نہ رہ سکو گے۔ بہت جلد تمہیں احساس ہو جائے گا کہ بہن بھائی کی مشترکہ اولاد......"

"بس شہزادی......بس......" شہزادے نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ "دین موسوی کے کسی اصول کو توڑنے سے پہلے میں مرجانا پسند کروں گا۔"

شہزادی غصے سے پیر پٹختی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی اور مجھ سے مخاطب ہو کر بولی......"اے کہانی کار اپنے آقا کو بتادو کہ اب وہ میرے انتقام کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس سے یہ بھی کہہ دو کہ جب کوئی عورت انتقام لینے پر اتر آتی ہے۔ تو اس سے دیوتا بھی پناہ مانگ اٹھتے ہیں۔ اب تک اس نے میری محبت دیکھی ہے۔ ہمت وجرأت ہے تو میری نفرت کا سامنا کر کے دکھائے۔"

وہ چلی گئی تو میں نے شہزادے سے کہا۔

"یہ آپ نے کیا کر دیا حضور؟"

"تم بھی مجھے موردالزام ٹھہرا رہے ہو۔" اس نے دکھ بھرے لہجے میں کہا۔

"کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو کہ سگے بھائی بہنوں کا میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی گزارنا بالکل جائز ہے......"

"ہاں......" میں یہ ہی سمجھتا تھا۔ میں ابھی تک شہزادے کے پچھلے مشورہ پر کاربند تھا۔ کہ دین موسوی کو اپنانے میں جلد بازی نہ کرو۔ حالانکہ وہ خود اپنے مشورے کو فراموش کر چکا تھا۔ لیکن میں نے اچھا نہیں سمجھا تھا کہ اپنے آباؤ اجداد کے مذہب کو یکلخت چھوڑ دوں۔ میں پوری طرح یہ اطمینان کر لینا چاہتا تھا کہ موسیٰ کا دین سچا ہے......یا نہیں؟ میں ابھی تک فرعون مصر کو اپنا خدا اور اسے دیوی دیوتاؤں کو اپنے دیوی دیوتا سمجھتا تھا۔ اور اسی لئے میرے نزدیک بہن بھائی کی شادی معیوب نہیں بلکہ برکت ورحمت تھی۔

مگر میں نے یہ بات شہزادے کو نہیں بتائی۔ خاموش رہنا ہی مناسب سمجھا۔

شہزادے نے شہزادی فرطانہ کی دھمکیوں کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا۔ لیکن میرا دل اندر ہی اندر لرز رہا تھا۔ مجھے ایسا معلوم ہو رہا تھا۔ گویا کوئی بہت ہی زبردست طوفان آنے والا ہے جس میں ہم خس وخاشاک کی طرح بہہ جائیں گے......

(جاری ہے)

ناگ نقش

سجاد حسین نومی۔ پنڈدادنخان

اچانک نوجوان کی انگلی اپنی بہن کے بالوں میں پڑی تو وہ اچنبھے میں پڑگیا کیونکہ ایک چھوٹا سا سانپ گدی میں چپکا تھا۔ نوجوان نے سانپ کو نیچے پھینکا مگر سانپ کی آنکھوں سے نکلتی روشنی نے اسے مبہوت کرکے رکھ دیا

ماورائی مخلوق کے وجود سے انکاری لوگوں کے لئے حقیقت پر مبنی ایک عجیب شاخسانہ

وہ رات بہت طوفانی تھی، تیز جھکڑ درختوں کے نازک نازک تنوں کو ادھر سے ادھر ہلا کر گزر رہے تھے۔ جا بجا پتے بکھرے ہوئے تھے۔ جانوروں اور پرندوں کی ڈری سہمی آوازیں فضاء میں خوفناک تاثر پیدا کر رہی تھیں۔ سنیل سائیکل کو تیز سے تیز دوڑائے جا رہا تھا۔ مگر فاصلہ تھا کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ آج اسے اپنے گھر چھوٹی بہن ساکشی کی دوا لے کر جلد سے جلد پہنچنا تھا مگر موسم کی شدت آڑے آ رہی تھی۔

"بس بھائی آنے ہی والا ہوگا بیٹا۔" میں ذرا دروازے تک دیکھ کر آتی ہوں۔" سر درد سے نڈھال ساکشی کو چھوڑ کر لالٹین ہاتھ میں تھامے، تیز ہواؤں کا مقابلہ کرتے اس کی ماں منا کشی دروازے تک آگئی۔ گاؤں بھر کے بچوں کو پڑھانے کی وجہ سے سب لوگ اسے ماسٹرنی کے نام سے ہی پکارتے تھے دروازے سے باہر

پوری گلی اندھیرے میں ڈوبی پڑی تھی۔

مٹی کے کچے مکانوں میں سرد موسم سے بے نیاز لوگ، رضائیوں میں دبکے خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔

ماسٹرنی کبھی ایک نظر اندر سے آتی ساکشی کی سر درد سے نڈھال آوازوں پر ڈالتی اور کبھی لالٹین کی مدھم روشنی میں تاریک گلی میں کچھ دیکھنے کی ناکام کوشش کرتی۔ سردی کے مارے ہاتھ پاؤں سن ہوئے جا رہے تھے۔ دانت سے دانت بج رہے تھے۔ مگر یہ ٹھنڈ چودہ سالہ ساکشی کی فکر سے بڑھ کر نہیں تھی۔ جسے بارہ سال کی عمر سے ہی سر کے پراسرار درد نے جکڑ رکھا تھا۔ جب درد کا یہ دورہ پڑتا تو ساکشی کی چیخیں پورا محلہ سنتا۔

مناکشی دل ہی دل میں اپنے بیٹے سنیل کے جلدی آنے کی پراتھنا کر رہی تھی کہ اس کی نظر گلی کے کونے پر موجود برگد کے قدیم درخت پر پڑی جو تقریباً وہ اپنی جوانی سے وہیں دیکھ رہی تھیں۔

''ایسا لگا کہ وہاں کچھ ہے۔'' لالٹین کی ماند پڑتی مدھم روشنی میں جو ماسٹرنی نے درخت کی جانب دیکھا تو ان کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔

برگد کی شاخوں پر کوئی بیس بائیس سالہ لڑکی بیٹھی تھی۔ جس کے انتہائی لمبے بال شانوں پر بکھرے پڑے تھے اور آپس میں بری طرح الجھے ہوئے تھے۔ اس لڑکی کی سیاہ بھنویں تقریباً آدھے ماتھے تک پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں انگارہ برسا رہی تھیں۔ اور پھر یہ اس کی آنکھوں سے چنگاریاں سی نکل کر ارد گرد پھیلنے لگیں۔

مزید ماسٹر مناکشی سے نہ دیکھا گیا۔ انہوں نے آنکھیں بند کی، بھگوان، بھگوان کرتے ہوئے اندر آ گئی۔ کبیر العمری کی وجہ سے ان پر خوف غالب نہ آ سکا۔

وہ جانتی تھیں، موسم کی ایسی شدتوں میں یہ مخلوق اکثر اڑتی پھرتی ہے۔ اندر آ کر دیکھا تو ساکشی کی آنکھ لگ چکی تھی مگر کرب ابھی بھی اس کے چہرے پر واضح تھا۔ درد کی وجہ سے اس کا چہرہ پیلا پڑا ہوا تھا۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ جا کر کھولا تو نڈھال سا سنیل دواؤں کا شاپر تھامے اندر داخل ہوا۔

ساکشی کیسی ہے ماں! زیادہ درد تو نہیں ہوا اسے؟ اپنی تھکن سے بے نیاز اسے بہن کی پرواہ ہوئی۔

اسی لئے تو بھائیوں کو بہنوں کا سائبان کہتے ہیں۔

''سو گئی ہے بیٹا۔ پتہ نہیں یہ سر کا منحوس درد کب اس کی جان چھوڑے گا۔'' ماں نے سنیل کو گرم گرم چائے پکڑاتے ہوئے کہا۔

چائے کی چسکی بھرتے ہوئے سنیل بار بار اپنے سے پانچ سال چھوٹی بہن کی جانب دیکھتا رہا جو بے سدھ پڑی تھی۔ کتنی ہی بار اس کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہ بھی امیر لوگوں کی طرح اپنی بہن کو شہر کے کسی بڑے اسپتال لیجائے اور اس کا مکمل علاج کروائے۔ کتنی ہی بار اس کا دل اس خوف سے تیز تیز دھڑکا تھا کہ اس کی معصوم سی بہن کو۔ ''کوئی بڑی بیماری نہ ہو۔''

''سنیل بیٹا، اٹھ۔ دیکھ! دن چڑھ آیا ہے۔ اور اسکول کا وقت بھی ہو گیا ہے۔'' ماں کے جگانے پر وہ تیزی سے اٹھ بیٹھا منہ ہاتھ دھوئے بالوں میں کنگھی کی ناشتہ کیا اور بستہ اٹھا کر یہ جا، وہ جا۔

اسکول کی طرف جانے والا راستہ بہت ویران تھا۔ آبادی سے تھوڑا ہٹ کر اسکول تھا۔ راستے کے دونوں اطراف گھنی گھنی جھاڑیاں پڑتی تھیں۔

ایک دن سنیل کو ماسٹر نے کسی کام پر لگائے رکھا۔ کام کے ختم ہونے پر پتہ چلا کہ چھٹی ہوئے پندرہ بیس منٹ ہو چکے ہیں۔

''سنیل! تم تو بہت لیٹ ہو چکے ہو۔ چلو ایسا کرتے ہیں میں تمہیں گھر چھوڑ دیتا ہوں۔'' ماسٹر نے کہا۔

''نہیں ماسٹر جی، میں چلا جاؤں گا۔ آپ فکر نہ کریں۔'' تابعدار بچوں کی طرح سنیل نے ماسٹر کو زحمت دینا مناسب نہیں سمجھا اور اکیلے ہی راہ پر ہو لیا۔ ویران سارا راستہ ختم ہونے میں بس چند منٹ ہی رہ گئے تھے۔ اس کا گھر بس آنے ہی والا تھا کہ اس کی نظر سڑک کے دائیں طرف بیٹھے ایک سنیاسی بابا پر پڑی۔ اس کے گلے میں

بڑے بڑے موتیوں کی مالائیں تھیں۔ ہاتھوں میں رنگ برنگے کڑے بھی پہن رکھے تھے۔ اس نے اپنی لال انگارہ آنکھیں سنیل پر مرکوز کر رکھی تھیں۔

''ادھر آ بالک، میری بات سن کر جانا۔'' سنیل پاس سے گزرنے لگا تو سنیاسی بابا نے اس سے اونچی آواز میں کہا۔

''جی بابا جی، کوئی کام ہے آپ کو؟'' سنیل بیگ سمیت وہیں بیٹھ گیا۔

''یہ کیا ہے؟'' سنیاسی بابا نے سنیل کے ہاتھ پر سامنے کی طرف بنے ایک شبیہہ کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ!!......'' سنیل نے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ایک بار میں اپنے دوستوں کے ساتھ شہر گیا تھا بابا جی۔ بس وہیں سے یہ تصویر بنوائی تھی۔'' سنیل نے وضاحت کی۔

''پر یہ تصویر دوسری تصویروں جیسی نہیں ہے۔'' سنیاسی بابا کی انگارہ نما دہکتی آنکھیں ابھی بھی سنیل کے ہاتھ پر مرکوز تھیں۔

''مجھے سانپوں سے عشق ہے بابا۔ بہت اچھے لگتے ہیں مجھے۔ اسی لئے یہ نقش بنوایا ہے۔'' سنیل وضاحت پر وضاحت دیئے جا رہا تھا۔

''پر بالک، شاید تو نہیں جانتا۔ یہ نقش جو تیرے ہاتھ پر بنا ہے۔ کسی عام سانپ کا نہیں ہے۔ یہ مہان سانپ دیوتا کا نقش ہے۔'' سنیل کی کرنجی آنکھوں میں اچانک عود کر آنے والی نیلے رنگ کی آمیزش کو محسوس کر کے سنیاسی بابا نے تیزی سے اپنی نگاہیں سنیل کی آنکھوں سے ہٹائیں اور جھٹ سے بولا۔ ''بالک ابھی تو چلا جا۔''

کندھے اچکاتے ہوئے سنیل نے کھڑے ہو کر گھر کی راہ لی۔

''ماں کہاں ہے ساکشی؟'' بستے کو ایک جانب رکھ کر ہاتھ منہ دھوتے سنیل نے پوچھا ''ماسی گنگا نے بھجن کروایا ہے۔ وہیں گئی ہیں۔ مناکشی نے کھانا لا کر آگے رکھا۔

''تو نے کھانا کھا لیا؟'' سنیل تولیہ سے ہاتھ صاف کر کے چارپائی پر آ کے بیٹھا۔

''نہیں بھائی، مجھے نیند آ رہی ہے۔ سو کے اٹھ کر کھاؤں گی۔ بہن کے جانے کے بعد سنیل مزے سے کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔ آج اس کی پسندیدہ سبزی بنی تھی۔ دستک ہونے پر دروازہ کھولا تو سامنے ہمسائے کا بچہ کھڑا تھا۔

''سنیل بھائی، ماسٹرنی ماسی کہلوایا ہے کہ وہ رات کو واپس آئیں گی۔ وہاں سے انہوں نے کاکا کپت کے گھر جانا ہے۔ آپ پریشان نہ ہونا۔'' بچے کا پیغام سن کر سنیل نے اپنا سر ہلا دیا۔

شام کے جھٹپٹے کا ٹائم ہو چلا تھا۔ گاؤں کے بچے، بڑے سردی کے مارے ابھی سے گھروں میں دبک گئے تھے۔

ساکشی ابھی تک بے خبر سوئی پڑی تھی۔ سنیل نے ایک نظر ساکشی پر ڈالی اور دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ ابھی تک اس کی طبیعت خراب نہیں ہوئی تھی۔

اپنے کمرے میں بیٹھا وہ حساب کے سوالوں کی مشق کر رہا تھا۔ آخر کو اسے دسویں جماعت کے امتحان دینا تھے۔ کہ اسے ساکشی کے کمرے سے دلخراش چیخ کی آواز آئی۔ کاپی و پین پھینک کر، بغیر چپل پہنے وہ ساکشی کے کمرے کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ ساکشی کھلے بالوں، دونوں ہاتھوں سے سختی سے اپنا سر پکڑے مسلسل اونچی آواز میں چلائے جا رہی تھی اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

کمرے میں آتے ہی اس نے تیزی سے الماری کی طرف دوڑ لگائی۔ جہاں اس کی دوا رکھی تھی۔

''مگر یہ کیا......؟'' سنیل بھونچکا رہ گیا۔

دوائی تو کل ہی ختم ہو گئی تھی۔ اسے اب یاد آیا۔

تیزی سے اس نے پانی کا گلاس بھرا اور ساکشی کی طرف بھاگا۔ مگر ساکشی نے ہاتھ کے جھٹکے سے گلاس پرے پھینک دیا۔ وہ بری طرح چلائے جا رہی تھی۔

ساکشی...... میری بہن، دیکھ تھوڑا سا پانی پی لے،

ورنہ تیری طبیعت اور بگڑ جائے گی۔" سنیل روہانسا ہوگیا۔

ساکشی پسینے میں بری طرح بھیگ چکی تھی۔ ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر اس کی سانس اکھڑنے لگی تھی۔ سر میں اٹھنے والی درد کی ٹیسوں سے بے حال ہو کر وہ بار بار ادھر ادھر جھٹکے کھا رہی تھی۔ پسینے میں اس کے بال اس کے ماتھے اور گالوں پر چپک رہے تھے۔ شدت درد سے وہ نڈھال ہوئے جا رہی تھی۔

"ساکشی!!...... سنبھال خود کو۔" آنکھوں میں نمی لئے، لاچارگی کی کیفیت میں اس نے ہاتھ بڑھا کر ساکشی کے پسینے میں چپکے چہرے پر آئے بال پیچھے کئے تو اس کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ جیسے اس کے ہاتھ کو کرنٹ سا لگا۔

وہ ٹھٹک سا گیا۔

اسے ساکشی کے بالوں میں، سر کے پچھلے حصے میں کسی چیز کا گمان ہوا تھا۔ اس کی انگلیاں اس کے بالوں میں موجود کسی وجود سے ٹکرائی تھیں۔ بلند ہمت تو وہ شروع سے ہی تھا۔ فوراً اٹھا اور ساکشی کے سر سے پیچھے آکر کھڑا ہوگیا۔

ساکشی کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ اب وہ سر ڈھلکائے گھٹی گھٹی چیخیں نکال رہی تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اس نے ساکشی کے بال ہٹائے تو اسے زمین آسمان گھومتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اسے اپنی نظروں پر یقین نہ آیا۔

کالا اور چاندی کی طرح چمکدار ایک بالشت کا ایک سانپ ساکشی کے لمبے بالوں میں ڈھکا ہوا، اپنا منہ اس کے سر کی پچھلی جلد پر لگائے خون چوسنے میں مگن تھا۔

جیسے ہی سنیل کو ہوش آیا، اس نے پاس میں پڑی لکڑی اٹھالی، اس نے جھٹکے سے سانپ کو نیچے پھینک کر مارنا چاہتا تھا۔ ورنہ دوسری صورت میں ساکشی کو چوٹ لگنے کا خدشہ تھا۔ اس نے لکڑی مضبوطی سے اپنے ہاتھ میں پکڑلی۔

جونہی سنیل کے ہاتھ میں موجود لکڑی نے سانپ کو مس کیا۔ سانپ نے فوراً اپنا پھن اٹھا کر سنیل کی طرف دیکھا، اس کی گول گول چمکتی آنکھیں مسلسل سنیل کو گھورے جا رہی تھیں۔

سنیل کی آنکھوں میں سانپ کا جھانکنا تھا کہ سنیل کی آنکھوں میں پھر سے وہی نیلے رنگ کی آمیزش ہونے لگی۔ لکڑی اس کے ہاتھ سے کب کی گر چکی تھی اور، وہیں اپنی جگہ پر جامد سا کت رہ گیا تھا۔

دوبارہ سانپ نے اپنی دوشاخہ ساکشی کے سر کے پچھلی سائیڈ پر اپنا منہ مارا تو ساکشی کی بلند چیخ بھی سنیل کو ہوش میں واپس نہ لا سکی۔ سانپ نے اپنا کام مکمل کر کے رینگتا ہوا باہر کی جانب چل دیا۔ جب سنیل کو ہوش آیا اس کے گھر کا پورا صحن سفید چادروں سے ڈھکا ہوا تھا۔ محلے کے مرد و خواتین گردن جھکائے خاموش بیٹھے تھے اور ماسٹرنی مناکشی کی آنکھیں رو رو کر سرخ ہو چکی تھیں۔

"کیا اتنے عرصہ تک یہی سانپ میری بہن کی زندگی اجیرن کرتا رہا۔ ماں تو ماں، کیا میری نظر بھی اس پر نہ پڑ سکی۔ اور نظر پڑی بھی تو کب، جب وہ میری بہن کی زندگی کی آخری سانس بھی نچوڑ چکا تھا۔ اور میں کچھ بھی نہ کر سکا۔" صحن میں ستون کے ساتھ کھڑا سنیل کب سے اپنی ہی سوچوں میں مگن تھا۔

"تجھے تو بڑے اچھے لگتے ہیں ناں سانپ۔ اس منحوس کی تصویر ہاتھ پر بنوا رکھی ہے۔ اب دیکھ، اسی سانپ نے تیری بہن کو چتا پر پہنچا دیا، ارے میں تو سمجھتی رہی میری بچی کو سر کا درد ہے۔ میری نظر کیوں نہ پڑی اس ظالم منحوس سانپ پر، جو میری بچی کے لمبے بالوں میں جگہ بنا کر بیٹھ جاتا تھا۔" ماسٹرنی مناکشی اپنا سر پیٹنے لگیں۔ اور پھر اس دن مناکشی کو چتا کے حوالے کر دیا گیا۔

☆......☆......☆

دن معمول پر آنے لگے تو سنیل نے بھی اسکول جانا دوبارہ شروع کیا۔ اور ویسے بھی گھر میں اس کا دل بالکل نہ لگتا تھا۔ ساکشی جو نہیں تھی۔ ماں ہر وقت سر پر پٹی باندھے لیٹی رہتی تھی۔

آج اسکول سے واپس آتے ہوئے اسے پھر وہی سنیاسی بابا نظر آیا۔ سنیل کو دیکھتے ہی سنیاسی بابا کی آنکھوں میں خوف سا اتر آیا۔

"پرنام باباجی۔" سنیل وہیں بیٹھ گیا۔

"ہاں بالک سنا، لگتا ہے میرا اندازہ درست نکلا۔"

سنیل کے چہرے پر پھیلی پریشانی کو دیکھ کر سنیاسی بابا نے پیشین گوئی کی۔

"کیسا اندازہ باباجی؟" سنیل نے تھکے تھکے انداز میں سر اوپر اٹھایا۔

"تجھے اپنے جنم دن کی تاریخ یاد ہے؟" سنیاسی بابا نے سوال داغا۔

"3 جنوری 1990ء۔" سنیل نے حیرت زدہ سا ہو کر جواب دیا۔

"سال کا اگر پورا خانہ بناؤ۔ جنم کنڈلی کو دیکھو اور تمہارے برجوں کا ٹکراؤ۔ سب یہی بتا رہا ہے کہ تو ہی وہ ہے، جس کی اسے برسوں سے تلاش تھی۔" سنیاسی بابا کافی دیر حساب لگانے کے بعد بولا۔

سنیل سے حقیقت دریافت کرنے پر سنیاسی بابا نے اسے بتانا شروع کیا۔

"دیکھ بالک، جس طرح ہر جگہ ایک حکمران ہوتا ہے۔ جس کا حکم سب کو ماننا پڑتا ہے۔ اسی طرح سانپوں کا بھی ایک مہان دیوتا ہے۔ جو ایک بہت بڑا ناگ ہوتا ہے۔ زمین پر بسنے والے اگر تمام ناگوں کی جسامت کو اکٹھا کرو تو ایک مہان ناگ دیوتا بنتا ہے۔ جس کا حکم تمام سانپوں پر چلتا ہے۔ ہر سو سال بعد دیوتا ناگ کو بلی کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اس کی شرط یہ ہے کہ بلی جس آدمی کی دی جائے۔ اس کا جنم دن اور مہان دیوتا ناگ کا جنم دن ایک ہونا چاہئے۔ نیز اپنے جسم کے کسی بھی حصے پر ناگ کا نقش کندا کروانا چاہئے۔ پھر بلی کے تقاضے پورے ہوں گے۔

سو سال قبل تو لوگ اس طرح کے عجیب و غریب شوق رکھتے تھے۔ مگر اب کی صدی میں لوگوں کا شوق بدل گیا ہے۔ وہ نقشے تو اپنے جسم پر بنواتے ہیں مگر ایسے نہیں۔ مگر جو نقش تو نے اپنے ہاتھ پر بنوائے ہیں وہ سرتاپا ناگ دیوتا کا نقش ہے۔ تیری بلی وہ اس لئے قبول نہیں کرے گا کیونکہ تو اس کی مخلوق، اس کی رعایا یعنی سانپوں سے بہت محبت کرتا ہے۔ وہ تجھے بہت اچھے لگتے ہیں۔

لہٰذا اس صورت میں اسے، تیرے بجائے دو ایسے انسانوں کی بلی چاہئے۔ جو تیری کمی کو پورا کر سکے، جن کی رگوں میں تیرا ہی خون دوڑتا ہو۔ اور وہ دو انسان ہیں۔ تیری بہن، جس کی بلی لی جا چکی ہے اور اگلا نشانہ ہوگا تیری ماں۔"

"مگر باباجی، میرا دوست آکاش بھی تو اسی تاریخ کو پیدا ہوا ہے۔ کیا اسے بھی کوئی خطرہ ہے؟" سنیل کھویا کھویا سا بولا۔

"نہیں بالک، اس تاریخ کو بڑے جنم ہوتے ہوں گے مگر مہان دیوتا کی ساری شرائط کی کڑی تجھ سے ملتی ہے۔ حساب کے مطابق اماوس کی پہلی سیاہ رات کو تو پیدا ہوا تھا۔ اور پھر نقش بھی صرف تیرے ہاتھ پر کندہ ہے۔ میرے پاس ایک بہت طاقتور سانپ کا منکا ہے۔ میں اگر وہ تجھے دے دوں تو پھر تو اس سے آسانی سے نمٹ۔"

سنیاسی بابا کے الفاظ حلق میں ہی اٹک گئے۔ کیونکہ سنیل کی کرنجی آنکھیں پھر سے نیلی ہونے لگی تھیں۔

دفعتاً ہی سنیل کے منہ سے دوشاخہ زبان نکلی اور سنیاسی بابا کے ماتھے پر حملہ کر دیا۔ سنیاسی بابا پہلے ہی گنگ سا بیٹھا تھا۔

مہان ناگ دیوتا کے زہر کی پہلی بوند نے ہی سنیاسی بابا کی زندگی کا خاتمہ کر دیا تھا۔

میکانکی انداز میں سنیل اٹھا اور گھر کی جانب چل دیا۔ گھر کے باہر بہت سے لوگوں کا ہجوم تھا۔

سنیل گھبرا کر اندر داخل ہوا تو اس کی پیاری ماں، اس کا آخری سہارا، چارپائی پر سفید چادر اوڑھے ساکت پڑی تھی۔ ارد گرد عورتیں بیٹھی بین کر رہی تھیں۔

پتھرائی ہوئی نظروں سے سنیل ماں کو تکے جا رہا تھا۔ جس کے ماتھے پر دو چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے، ماں کا چہرہ نیلا کانچ جیسا ہوا جا رہا تھا۔ سوراخ میں سے ہلکا ہلکا خون ابھی بھی رس رہا تھا۔

عینی شاہدین کے مطابق انہوں نے گھر سے اس کے ماں کے شور کی آوازیں سنیں تو اندر آئے اور دیکھا تو ایک کالا سانپ تیزی سے بھاگا جا رہا تھا۔ اور اس کی ماں ماتھے پر ہاتھ رکھے چلائے جا رہی تھی۔ بہت ڈھونڈا مگر

سانپ کا بعد میں کچھ پتہ نہ چلا۔

☆......☆......☆

ماسٹرنی مناکشی کو چتا کے حوالے کیا جا چکا تھا۔ اب سنیل اپنے بھرے گھر میں بالکل اکیلا رہ گیا تھا۔ رشتہ دار و عزیز رسمی تعزیت کے بعد جا چکے تھے۔

اس کا کم سن دماغ سوچوں کے انبار تلے دبا پڑا تھا۔ سنیاسی بابا کی باتیں ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں گھوم رہی تھیں۔

لوگوں کی بابت اسے پتہ چلا تھا کہ سنیاسی بابا کو کسی زہریلے ناگ نے ڈس لیا ہے اور وہ بھی اس دنیا سے جا چکے ہیں کیسے انتقال کر گئے۔ اس سے سنیل مکمل طور پر لاعلم تھا۔

"سنیاسی بابا تو رہے نہیں، اب میری مدد کون کریگا؟" یہ سوچ سوچ کر سنیل کا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔

"پر اب مجھے مدد کی ضرورت ہے ہی کب؟" سب کچھ تو میں کھو چکا ہوں۔ میرے پاس کھونے کے لئے اب ہے ہی کیا؟" اب اس دنیا میں میرے جینے کا کوئی آسرا نہیں ہے۔" تنہا صحن میں لیٹے سنیل کی بند آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

"اچانک اس کی آنکھیں جھٹ سے کھلیں۔ ایک بار پھر اس کی آنکھوں کا رنگ بدلنے لگا۔ میکانکی انداز میں اس نے ٹانگیں چارپائی سے اتار دیں اور دروازہ کھول کر باہر نکل آیا۔

رات کے دس بج رہے تھے۔ گاؤں کی فضاء میں ہو کا عالم طاری تھا۔

روبوٹ کی طرح چلتا ہوا سنیل برگد کے پرانے پیڑ تلے آ کر کھڑا ہو گیا۔ برگد کی شاخ پر بیٹھا الو تیزی سے جھولنے لگا اور آوازیں نکالنے لگا۔ اتنے میں دور کہیں سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز آنے لگی۔

نیلی کانچ جیسی پتھرا آنکھوں کو سنیل نے گھوڑے کی ٹاپوں کی سمت موڑا۔

وہ سرمئی رنگ کا بہت صحت مند گھوڑا تھا۔ گھوڑا سوار کے کندھوں تک آئے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔

اس نے مانگ درمیان سے نکال کر اپنی نیلی کانچ آنکھوں میں بہت سارا سیاہ رنگ انڈیلا ہوا تھا جو کسی جل کا گمان دے رہا تھا۔ سفید دودھ جیسے ہاتھوں گھوڑے کی باگیں تھام رکھی تھیں۔

گہرے سرمئی رنگ کا گھوڑا عین سنیل کے پاس آ کر رک گیا۔

تب سنیل کو پتہ چلا کہ اس گھڑ سوار کے پیچھے ایک بیس بائیس سال کی عورت بھی بیٹھی تھی۔ جس کے بہت لمبے بال تھے۔ اور جس کی بھنویں آدھے ماتھے تک پھیل ہوئی تھیں۔

ان سے ملو، یہ ہماری پتنی ہیں۔ "شادتری" اس گھڑ سوار نے اپنے گلابی ہونٹ کھولے اور پیچھے بیٹھی عورت کی جانب اشارہ کیا۔ نیلی کانچ جیسی آنکھوں سے سنیل نے اس عورت کی جانب دیکھ کر سر ہلایا۔ جواباً سفید جوڑا پہنے بیٹھی عورت نے اپنا سر بائیں کندھے پر جھکا دیا۔ جس سے اس کے سیاہ بال سرک کر اس کے چہرے پر پھیل گئے۔ جس سے اس کا آدھا چہرہ چھپ گیا۔

"دکرا" تم نے ہمیں پسند کیا۔ اس کے اوسار ہم تم سے لگاؤ رکھتے ہیں۔ انسانوں کے اس سنسار میں تمہارا دل نہیں لاگے گا۔ اسی کارن ہم تمہیں یہاں سے لینے آئے ہیں۔ تم نے ہمیں نیا جیون دیا۔ اب تمہارا ادی کار بنتا ہے کہ ہم تمہیں شانتی پر ہوں۔ چلو ہمارے ساتھ، ہمارے سنسار میں۔

"ناگ مہان دیوتا نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔"

سنیل کے ہاتھ پر بنے ناگ کے نقش میں سے سفید رنگ کی شاعیں نکلنے لگیں اور سنیل کی نیلی کانچ آنکھوں میں جذب ہونے لگیں۔

دفعتاً ہی سنیل نے اپنا ہاتھ اوپر کیا اور مہان ناگ دیوتا کے ہاتھ پر رکھ کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

سرمئی گھوڑا تیز دوڑتا ہوا اماوس کے اندھیروں میں گم ہو گیا۔

خوف

محمد عثمان علی-میاں چنوں

منظر اتنا خوفناک اور دہشت ناک تھا کہ دیکھنے والوں کے رونگٹے کھڑے ہوگئے، ایک شخص زمین پر پڑا تھا اور لاکھوں کی تعداد میں خونی مکڑیاں اس شخص کے پورے وجود پر چمٹ کر رہ گئی تھیں۔

دہشت وحشت سے لبریز خونی واقعہ جسے دیکھ کر لوگ انگشت بدنداں ہو کر دہل گئے تھے

اسٹابرن نے کنکریٹ کے پتھر پر مکڑی کو اپنے جوتے سے کچل ڈالا۔ مکڑی نے بچنے کی بے حد کوشش کی مگر بے سود وہ ایک لمحے سے بھی کم وقفے میں اسٹابرن کے جوتے کے نیچے آ گئی......

ایک ثانیے سے بھی کم وقفے تک مکڑی اس کے وجود کے ہزاروں من جیسے بوجھ تلے دبی رہی۔ چیچ......کی نہایت دھیمی آواز......مدھم سی سرسراہٹ......سے وہ مکڑی میدہ بن گئی۔ اس کی ٹانگیں آدھا انچ سے بھی کم سائز کی تھیں۔ اور اسٹابرن کا قد پانچ فٹ تین انچ تھا۔ اس نے پاؤں مکڑی پر سے اٹھا کر پتھریلی جگہ پر رگڑا، پھر اسے گھاس پر گھسانے لگا اور آخر میں دروازے کے پائیدان سے جوتے کا تلا رگڑ کر صاف کیا۔ پھر وہ آگے بڑھتے ہوئے بڑبڑاہٹ بھرے انداز میں بولا۔

"معلوم نہیں، گاڈ نے ان مکڑیوں کو کیوں پیدا کیا

ہے؟" اپنے ہونٹ پر زخم کے چھوٹے سے مندمل نشان کو ملتے ہوئے ......زبان پھیرتے ہوئے اس نے رک کر اپنے دونوں جوتے اتارے اور انہیں ہاتھ میں لے کر کچن میں گیا اور وہاں انہیں پرانے اخبار میں رکھ کر دوسرے جوتے پہن لئے......

اسٹابرن کو مکڑیوں کے نام سے نفرت تھی اور مکڑیوں کے وجود سے......نہایت، سخت نفرت......اس نے یہ مکان اس لئے خریدا تھا کہ مکڑیوں والے کرائے کے فلیٹوں سے نجات مل جائے۔ وہ حال ہی میں اس گھر میں شفٹ ہوا تھا۔ اُسے پہلی مرتبہ اس گھر میں یہ واحد مکڑی نظر آئی تھی۔ لیکن تھینکس گاڈ کہ یہ مکڑی گھر سے باہر گارڈن میں ملی تھی گھر کے اندر نہیں......وہ چلتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچ گیا۔ کمرے میں ایک جانب قد آدم آئینہ موجود تھا۔ وہ اس جانب ہوگیا۔ قد آدم آئینے کے سامنے پہنچ کر وہ اپنے سراپے کا جائزہ لینے لگا۔ نظر بھر بھر کر دیکھنے لگا۔ وہ خود کو باور کرانا چاہتا تھا کہ اس کے سامنے ایک 36 سالہ گزرے ہوئے بالوں، لٹکی ہوئی مونچھوں اور ڈھیلے بدن کا "اکاؤنٹنٹ" نہیں...... بلکہ ایک دراز قد کسرتی جسم کا مالک کڑیل نوجوان کھڑا ہے۔ اس نے سیاہ رنگ کی ڈریس پینٹ شرٹ کے اوپر سیاہ رنگ کا ہی اوور کوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کے سر پر ہلکے سیاہ رنگ کی ہی فلیٹ ہیٹ موجود تھی۔ اسی دوران اسے جینی کو فون کرنے کا خیال سوجا۔

"جینی سے ملے ہوئے غالباً چھ ماہ تو ہو ہی گئے ہیں......اس نے سوچا۔" اگر جینی اسی طرح بہانے بناتی......دیئے لئے رہی تو وہ اسے چھوڑ کر دل بستگی کے لئے کوئی اور لڑکی تلاش کرلے گا......"

یہ بھی اس کی خود فریبی تھی۔ جس سے وہ آئینے کے سامنے دوچار ہو چکا تھا۔ پھر وہ پلٹا اور ایک طرف ٹیبل پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے ریسیور اٹھاتے ہوئے کان سے لگایا اور ساتھ ہی کی پیڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے نمبر پریس کرنے لگا......دوسری جانب بیل جانے کی مخصوص آواز سنائی دینے لگی۔ پھر تیسری چوتھی بیل پر دوسری جانب سے ریسور اٹھالیا گیا۔

"ہیلو......یس"......ریسیور میں سے نسوانی سی آواز سنائی دی۔

اسٹابرن کے منہ سے ہلکی سی سانس خارج ہوگئی

"اسٹابرن ......تم ہو......؟ اس سے پہلے کہ اسٹابرن کچھ کہتا۔ دوسری جانب سے تھکی تھکی آواز میں کہا گیا۔

"ہاں ڈارلنگ۔ میں اسٹابرن ہوں۔ but تم نے کیسے پہچان لیا......؟" اسٹابرن نے ابتہاج بھرے لہجے میں کہا۔ اس کے چہرے پر سرشاری دوڑ گئی تھی۔

"ارے چھوڑو، تم ایوری ڈے ہی مجھے فون کرتے ہو......" جینی نے بولتے ہوئے کہا۔ "اور پوچھتے ہو کہ آج کہاں چلنا ہے؟"

"اوہ ok تو پھر بتاؤ۔ آج کہاں چلنا ہے......؟" اسٹابرن نے شگفتہ لہجے میں کہا۔

جینی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور پھر بولی۔ "اسٹابرن......! اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں کہاں جانا چاہتی ہوں۔ ایک چانپ کی پلیٹ، پھر سینما اور کافی کا ایک ایک کپ...... اس کے بعد تم مجھے گھر چھوڑنے آؤ گے۔"

اسٹابرن معنی خیز لہجے میں بولا۔ "تو پھر کوئی اور بات کرو ناں......؟"

"کیا......؟"

"مجھے اپنے گھر مدعو کرلو یا خود میرے ہاں چلی آؤ......!"

"اسٹابرن۔ کیا تمہارے دماغ میں ایک طرفہ ٹریفک رواں دواں رہتی ہے؟" جینی جھلا کر بولی "کتنی بار کہہ چکی ہوں کہ میں ایسی ویسی لڑکی نہیں ہوں۔ مجھ سے فضول باتیں مت کیا کرو......"

"اوکے۔ اوکے"...... اسٹابرن جلدی سے بولا۔ "تو تم ہی بتاؤ کہ آج کہاں چلنا ہے......؟"

اس بار جینی نے سرد سانس لیا اور کہا۔ "میرا خیال ہے کہ ہم ایک پلیٹ چانپ پیٹ میں اتاریں گے۔ اس

کے بعد فلم دیکھیں گے اور پھر آخر میں کافی پئیں گے۔"

اسٹابرن بولا۔ بڑا خوف ناک پروگرام ہے۔ اوکے۔ تو سات بجے ملیں گے۔"

"ہاں ضرور"......جینی نے کہا۔ اور ریسیور رکھ دیا۔

کلک کی آواز کے ساتھ رابطہ منقطع ہوگیا۔

اسٹابرن نے ریسیور کریڈل پر رکھا اور پھر وہ اپنے سر پر سے فلیٹ ہیٹ اتار کر ایک جانب بیڈ پر اچھالتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس نے دروازہ کھولا اور پھر باتھ روم میں گھس گیا۔ اس نے تاول ہینگر سے لٹکایا اور پھر بیسن پر نظر پڑتے ہی وہ فوراً دو، تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس کی تیز اور کینہ توز نظریں واش بیسن پر جم گئیں تھیں۔ سفید، صاف و شفاف واش بیسن پر ایک کالی مکڑی بیٹھی ہوئی تھی۔ اسٹابرن کچھ کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ کالی مکڑی بیوہ ہے یا نہیں......تاہم اس نے ٹوائلٹ پیپر رول کی جانب ہاتھ بڑھایا اور تھوڑا سا ٹوائلٹ پیپر پھاڑ کر مکڑی کی جانب بڑے محتاط انداز میں بڑھا۔ مکڑی جوں کی توں واش بیسن پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ٹوائلٹ پیپر کی مدد سے مکڑی کو اٹھایا اور اس کو اتنا دبایا کہ اس بیچاری کا کچومر نکل گیا۔ حالانکہ وہ مکڑی اس کی نظروں میں قطعی بیچاری نہیں تھی۔

"خس کم جہاں پاک۔ جہنم رسید ہوگئی"...... وہ اپنے ہونٹ پر موجود زخم کے مندمل نشان کو دانتوں تلے دباتے ہوئے بڑبڑایا۔

"جب میں بچہ تھا تو تجھے بڑا مزہ آیا تھا۔ ناں...... اب دیکھ لیا......؟ بھگت لیا نا......؟"

اس نے کاغذ اور مکڑی کو واش بیسن میں پھینک کر پانی بہادیا۔ پھر جا کر کچن میں سے واش بیسن کو دھونے کا پاؤڈر لے آیا۔ اور اسے برش سے رگڑ رگڑ کر دھونے لگا۔ یہاں تک کہ اس کا ہاتھ تھک گیا۔ اب نہانے کے لئے ٹائم نہیں بچا تھا۔ سات بجنے والے تھے۔ وہ باتھ روم سے بغیر نہائے باہر نکلا۔ الماری میں سے دھلے ہوئے کپڑے نکال کر پہنے اور تمام جسم پر خوب سینٹ چھڑکنے لگا۔ گردن پر اور بغلوں میں خوب پاؤڈر لگالیا۔

"گندہ نہیں رہنا چاہیے۔"......اس نے خود کلامی کی۔ "گندگی سے مکھیاں آتی ہیں۔ اور مکھیاں مکڑیوں کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔"

☆......☆......☆

حسب معمول انہوں نے ایک سستے سے ہوٹل میں ایک ایک پلیٹ چانپ کھائی، پھر فلم دیکھی۔ وہاں سے نکل کر ایک ایک کپ کافی کا پیا۔ اس کے بعد اسٹابرن جینی کو گھر چھوڑنے گیا۔ حسب معمول جینی نے اس کی حوصلہ شکنی کی۔ ہمیشہ کی طرح وہ بے نیل و مرام گھر لوٹا۔ کار کھڑی کر کے اس نے پورچ پر قدم رکھا ہی تھا کہ کوئی چیز اس کے چہرے سے لپٹ گئی۔ کوئی اور نہیں......نیم مضبوط اور لیس دار چیز، بلاشبہ وہ مکڑی کا جالا تھا۔ وہ بوکھلا کر جالے کو چہرے پر سے ہٹاتا ہوا چلا چلا کر لکڑی کو تلاش کرنے لگا۔

"خبیث......ذلیل......کہاں ہے تو......؟"

"چ......" ایک ستون پر اسے ایک متحرک شے نظر آئی۔ وہ نیچے اتر رہی تھی۔ ایک چھوٹی سی کالی مکڑی تھی۔ اسٹابرن نے اس پر زور سے پاؤں مارا۔ نشانہ چوک گیا۔ اس نے دوسری بار بھرپور کوشش کرتے ہوئے دوبارہ پاؤں مارا اور اس مکڑی کو کچل کر رکھ دیا۔ مکڑی پہلی ہی ضرب کی تاب نہ لاتے ہوئے پرلوک سدھار گئی۔ اس کے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے...... ہوگئے۔ نام و نشان تک مٹ گیا۔ مگر اسٹابرن پاؤں مارتا رہا...... مارتا رہا...... یہاں تک کہ وہ ہانپنے لگا۔ اس کا سانس پھول گیا۔ اس مکڑی کا رشتہ کسی اور مخلوق سے ملاتے ہوئے جوتے کو پورچ پر اور پھر پاپوش پر رگڑا۔ اور انہیں اتار کر ہاتھوں میں پکڑے ننگے پاؤں اندر داخل ہوگیا۔ روم میں پہنچ کر وہ پہلے جوتوں کے جوڑے کے ساتھ اخبار پر رکھنے لگا ہی تھا کہ اچانک وہ پیچھے ہٹ گیا۔

پہلے رکھے ہوئے جوتوں کے جوڑے پر ایک کالی مکڑی بیٹھی ہوئی تھی۔

"اف......! یہ گھر تو ان مکڑیوں کا دعوت گھر بنا ہوا ہے"...... اسٹابرن نے تقریباً چلاتے ہوئے کہا۔ "میں

اب یہاں نہیں رہ سکتا، ان مکڑیوں کے نرغے میں بالکل نہیں رہ سکتا۔ دو چار جوڑے کپڑے لیتا ہوں اور کسی ہوٹل میں چلتا ہوں۔ لیکن...... اگر الماری میں بھی مکڑیاں ہوئیں تو؟ کسی کونے میں چپکی ہوئی ہوں گی۔ میرا انتظار کررہی ہوگی کہ کب میں الماری کھولوں اور وہ مجھ پر چھلانگ لگادیں! اس کا ذہن اسے ماضی میں لے گیا۔ جب وہ تین سال کا تھا تو ایک دن وہ مکڑی کے جال میں الجھ گیا تھا......

اس نے ذہن جھٹکا اور جوتے پہنے بغیر جرابوں میں ہی باہر نکل کر کار میں بیٹھا اور اسے اسٹارٹ کرتے ہوئے وہاں سے روانہ ہوگیا۔

☆......☆......☆

اس نے جینی کے گھر پہنچ کر کار روکی اور کال بیل کا بٹن تیزی کے ساتھ بار بار دباتا چلا گیا۔

"کو......کو......ون......؟ ہے...... اے اے......؟ کیا...... کام اے...... ہے......؟" جینی کی غنودگی بھری آواز لاؤڈ فون سے اسے سنائی دی۔

"میں ہوں...... اسٹابرن......" اس نے جواب دیا۔

"اسٹابرن......؟ تم......اس وقت......اتنی آدھی رات کو......؟" جینی کی غصیلی آواز سنائی دی۔

"میں تم سے فوراً ملنا چاہتا ہوں......" اسٹابرن نے کہا۔

چند لمحوں کا ایک طویل وقفے کے بعد شبہے سے لبریز آواز آئی۔ "کیوں......؟"

اسٹابرن نے تذبذب سے ہونٹ چبائے...... سکوڑے اور سوچا۔ "جینی کو بتاؤں یا نہیں؟ اسے معلوم ہے کہ مجھے مکڑیوں سے سخت نفرت ہے۔ لیکن اگر اسے یہ بتادوں کہ جوتے چھوڑ کر بھاگا بھاگا آیا ہوں تو وہ مجھے بزدل سمجھے گی یا پاگل کہے گی......"

"میرے گھر میں کھٹمل اور مچھر بہت ہیں......" اسٹابرن نے بات بناتے ہوئے کہا۔

"وہ تو سب کے گھر میں ہیں۔" جینی نے جیسے منہ بسور کر کہا تھا۔

اسٹابرن تھوک نگل کر بولا۔ "مگر اس گھر میں بے شمار ہیں۔"

"کسی دوا چھڑکنے والے کو بلالو"......! جینی نے جان چھڑانے کی خاطر مشورہ دیا۔

"بلاؤں گا......لل......لیکن مجھے اس وقت سونے کے لئے جگہ چاہیے۔"

"اف......" جینی نے تیز آواز سنائی دی پھر طویل وقفہ ہوا اور پھر بولا۔ "کھٹمل اور مچھر ہیں کتنے......؟"

"دو......مکڑیاں۔" اسٹابرن نے بے ساختہ کہہ دیا۔

"دو مکڑیاں......؟" جینی سرد مہری سے بولی۔ "تم نے مجھے رات کو ایک بجے یہ شکایت کرنے لئے جگایا ہے کہ تمہارے گھر میں دو مکڑیا آگئی ہیں؟ جاؤ......اور جا کر کیک کھاؤ اسٹابرن اور کسی ہوٹل میں رات گزارو۔ صبح دوا چھڑکنے والے کو بلوا لینا۔ اب مجھے دوبارہ پریشان مت کرنا۔ گڈ نائٹ۔" اور پھر کاک کی آواز کے ساتھ لاؤڈ فون آف ہوگیا۔

اسٹابرن نے کئی بار بیل بجائی۔ لیکن اس بار کوئی جواب نہیں آیا اور وہ دل برداشتہ ہوکر وہاں سے چلا آیا۔

☆......☆......☆

صبح کتنی ہی جگہوں پر فون کرنے کے بعد اسٹابرن کو دوا چھڑکنے والی کمپنی کا ایڈریس مل گیا۔ جس کے آدمی فوری طور پر آسکتے تھے۔ اس نے وہاں بات کی تو کچھ دیر کے بعد دوا چھڑکنے والا کمپنی کا ایک چھوٹا سا ٹرالر وہاں پہنچ گیا۔ اس میں پائپ، ربڑ کی موٹی موٹی نالیاں اور اس پیشے سے متعلق دیگر چیزیں اس طرح بھری ہوئی تھیں۔ جیسے کسی پناہ گزین خاندان کا سامان ہو۔ کمپنی کے دونوں آدمی آپس میں باپ بیٹا تھے۔ بڑا مائیک اور چھوٹا مائیک ہلنس۔ بڑا مائیک سارے کونے کھدروں کا معائنہ کرنے لگا۔ اور چھوٹا مائیک جو کسی بیل OX سے کم نہ تھا۔ فٹ بال کے کھلاڑیوں کی سبز جرسی پہنے ٹرالر کے انجن کی باڈی پر بیٹھا ہوا اورنج جوس کا ڈبہ پائپ لگائے پینے میں

مصروف تھا۔ وہ اسٹابرن کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے اسے بے وقوف سمجھ رہا ہو۔ بڑا مائیک سارے کونے دروازوں، کھڑکیوں کے پیچھے اور چھجے وغیرہ کھنگال چکا تو اپنے لئے لمبے اوور آل سے گرد جھاڑتا ہوا اسٹابرن کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کے سر کے سفید بالوں سے مکڑی کے جالے کے ٹکڑے چپکے ہوئے تھے۔ اسٹابرن کو یہ دیکھ کر کراہیت آئی۔ لیکن بڑا مائیک لاتعلقی سے ایک گرد زدہ لفافے کی پشت پر کچھ لکھتا رہا۔

"ہاں جناب۔ آپ کے گھر میں مکڑیاں موجود ہیں......" بالآخر اس نے اسٹابرن کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ "بہت ساری مکڑیاں اور دوسرے کیڑے مکوڑے بھی ہیں۔ دیگر حشرات الارض......"

"مجھے دوسرے کیڑے مکوڑوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ تم صرف مکڑیوں کی بات کرو۔ ان سے چھٹکارا پانے میں کیا خرچ آئے گا؟" اسٹابرن نے ٹھیٹ کاروباری لہجے میں کہا۔

بڑا مائیک اپنے سامنے کے ٹوٹے ہوئے دانتوں کے درمیان سے سیٹی کی سی آواز نکال کر ہنستا ہوا بولا۔ "ہم دواؤں کی دھونی سے ان حشرا اور دیگر بلاؤں کو بھگا دیں گے۔ بس کوئی آٹھ نو سو ڈالر لگیں گے۔"

اسٹابرن نے اپنے ہونٹ پر زخم کے نشان کو چبا کر بولا۔ "دھونی دینے کے علاوہ بھی کوئی سستا نسخہ ہے؟"

"ہاں ہے۔ مکڑیوں کو ایک ایک کرکے مسل ڈالیں......" بڑے مائیک نے اپنے مذاق پر خود ہی ایک بھونڈا قہقہہ لگایا۔ چھوٹا مائیک بھی منہ پھاڑ کر ہنسنے لگا تو اس کا تمام جسم ہلنے لگا۔ یوں لگتا تھا جیسے کوئی ویگ لرز رہی ہو۔

"چھ سو ڈالر......" اسٹابرن نے جز بز ہوکر کہا۔ "اس سے زیادہ نہیں۔"

بڑا مائیک کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ "جب آپ اتنی رقم دینے پر تیار ہو جائیں تو مجھے فون کرلیں۔ نمبر تو آپ کے پاس ہے ہی۔ ویسے معائنہ کروانے کی فیس نہیں لی جائے گی۔ اس کے معاوضے میں شامل ہوگی۔"

اسٹابرن نے محسوس کیا کہ وہ جال میں پھنس گیا ہے۔ اسی وقت جینی اپنی کار میں آپہنچی۔ اس کے بروقت آنے پر اسٹابرن کو یوں لگا جیسے کوئی شہزادی اپنے گرفتار شدہ محبوب سپاہی کو ظالم بادشاہ کی قید سے چھڑوانے آگئی ہو۔ کار سے اتر کر وہ اور چھوٹا مائیک ایک دوسرے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے دیکھنے لگے۔ اسٹابرن لپک کر اس کے پاس گیا۔

"مکڑیاں......" اسٹابرن نے جھینپ کر کہا۔ "میرے گھر پر مکڑیوں نے ہلہ بول دیا ہے۔ کیا تم مجھے تین سو ڈالر ادھار دے سکتی ہو؟"

"تین سو ڈالر......؟ تمہارا دماغ تو درست ہے اسٹابرن......؟" جینی تشویش ناک چہرہ بنا کر بولی۔

"آہستہ بولو۔" اسٹابرن نے اپنی آواز کو بھی دبا کر کہا۔ "مجھے دھونی دلوانے کے لئے تین سو ڈالرز کی ضرورت ہے جینی۔ اس کے لئے میں زیادہ سے زیادہ خرچ کرسکتا ہوں۔ اس وقت تین سو ڈالر کم پڑ رہے ہیں۔"

"تین سو ڈالرز۔ بہت ہوتے ہیں اسٹابرن۔"

"میں تمہیں واپس کردوں گا۔ ان پر منافع بھی دوں گا۔ تم مجھے قرض دے رہی ہو!" اسٹابرن نے عاجزی سے کہا۔

جینی نے اپنے بھاری بھرکم جسم کا بوجھ ایک ٹانگ سے دوسری ٹانگ پر بدلا اور ہنوز تذبذب سے بولی۔ "اچھا...... لیکن دھوکا نہیں ہونا چاہیے۔ معلوم نہیں میں یہ کیوں کررہی ہوں۔ مجھے تھوڑا سا سخت ہونا چاہیے تھا......"

"تم ایسی نہیں ہوسکتی......" اسٹابرن نے چاپلوسی سے کہا۔ "تم چیک کاٹو۔ تب تک میں اس بڈھے سے نمٹتا ہوں۔"

"مجھے بعد میں پچھتانا پڑے گا۔ خیر...... چیک بک کار میں ہے۔" وہ مڑتے ہوئے بولی۔

وہ چھوٹے مائیک کے سامنے گزری تو دونوں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔

باپ بیٹے نے کام شروع کردیا۔ اسٹابرن کو وہ رات کسی سستے سے ہوٹل میں گزارنی تھی۔ اس نے میزوں

کی درازوں اور الماریوں پر بظاہر مکڑی کی تلاش میں نظر ڈالی اور ساری چیزوں کا جائزہ لے کر چلنے لگا۔ وہ کار میں بیٹھا تو بڑے مائیک نے الوداعی انداز میں ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔ ”جب آپ کل صبح آئیں گے تو ساری مری ہوئی ملیں گی۔ سال بھر کے لئے ان سب کی چھٹی ہوجائے گی۔ میں شرطیہ کہتا ہوں۔ ایک سال تو آسانی سے عافیت میں گزر جائے گا۔

”گاڈ کرے، ایسا ہی ہو۔“ اسٹابرن نے زیرلب کہا اور کار اسٹارٹ کرتے ہوئے آگے بڑھادی۔

☆......☆......☆

دن یہ دن گزرتے رہے۔ اور پھر ایک مہینہ گزر گیا۔ اسٹابرن کمپنی کے معاوضے کی طرف سے نہیں بلکہ اس کے کام کی طرف سے مطمئن تھا۔ دھونی کے بعد اگلے دن اس نے گھر آکر دیکھا ایک ایک کونا چھان مارا تھا۔ مکڑی تو کیا......کوئی چھوٹا موٹا کیڑا مکوڑا اور پتنگا تک نظر نہیں آیا تھا۔ اب وہ زیادہ تر وقت گھر پر گزارتا تھا۔ جینی نے شام کو اس کے ساتھ جانا بند کردیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اسٹابرن پیسے بچائے تاکہ اس کا قرض اتار سکے۔ اس کی بات کو اسٹابرن نے بے حد سراہا۔

ایک شام کو وہ آرام کرسی پر نیم دراز چائے کی چسکیاں لیتا ہوا عینک لگائے ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک مکڑی ٹھیک اس کی عینک پر آگری۔ وہ اچھل پڑا اور چائے کا کپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔ فرش پر گرتے ہی کپ چھناکے سے ٹوٹا اور چائے پھیلتی چلی گئی۔ اس کے کپڑے تو بچ گئے تھے لیکن قالین نما دری خراب ہوگئی۔ اس نے بوکھلا کر عینک اتار پھینکی اور کرسی سے اٹھا تو ساتھ کی دیوار سے جا ٹکرا گیا۔ اچھا ہی ہوا کہ ٹی وی پر نہیں جا گرا تھا۔ جب دم میں دم آیا تو اس نے دری پر سے اپنی عینک اٹھائی۔ مکڑی تو کہیں غائب ہوگئی تھی۔ لیکن جالے کا ایک مہین تار عینک سے چمٹا ہوا تھا۔ بوڑھے مائیک کو کوستا ہوا وہ عینک کو باتھ روم میں لے گیا۔ اور اس کو خوب صابن لگا کر دھویا۔ پھر خشک ہونے کے لئے رکھ دیا اور کمرے میں آکر مکڑی کو تلاش کرنے لگا۔ اسے کہیں کوئی مکڑی نہیں ملی۔

اس نے تاؤ میں آکر مائیک کی کمپنی کے آفس میں فون کیا۔ لیکن وہ بند تھا۔ اس لئے وہاں رابطہ نہ ہوسکا۔ اس نے ڈائریکٹری میں مائیک کے گھر کا فون نمبر تلاش کیا اور وہاں فون کیا تو چھوٹا مائیک بولا۔

”کون ہے؟ کیا بات ہے؟“ اس نے کاہلی سے بھاری آواز میں پوچھا۔

”میں اسٹابرن بول رہا ہوں۔ تم نے ایک مہینہ قبل میرے گھر میں مکڑیوں کو مارنے کی دوا چھڑکی تھی......“

دیر تک کوئی جواب نہ ملا تو اسٹابرن بولا......”ہیلو......!“

”کیا ہے؟“ پھر وہی کاہلی سے لبریز آواز سنائی دی۔

”میں نے کہا تھا کہ تم نے میرے گھر سے مکڑیوں کو ختم کرنے کے لئے دھونی دی تھی اور دوا چھڑکی تھی اور گارنٹی بھی دی تھی کہ ایک سال تک مکڑی نہیں آئے گی۔ آج ہی ایک مکڑی ملی ہے۔“ اسٹابرن نے چبا چبا کر کہا۔

دوسری طرف پھر خاموشی چھا گئی۔ اسٹابرن نے دانت کچکچا کر کہا۔ ”میں چاہتا ہوں کہ تم کل آکر پھر دوا چھڑکو۔“

کئی لمحے گزر گئے۔ پھر چھوٹا مائیک بولا۔ ”یہ ہم نہیں کرسکتے۔“

”کیوں نہیں کرسکتے......؟“ اسٹابرن نے بپھر کر کہا۔

”دوسرے گھروں کا کام ہے۔“ چھوٹے مائیک نے لاپروائی سے بولا۔

”میرے گھر کے لئے بھی وقت نکالو میں کل صبح تمہارا ویٹ کروں گا۔ اگر تم نہ پہنچے تو تمہیں عدالت میں بلواؤں گا۔“ اسٹابرن نے دھمکی دی۔

”پھر کیا ہوجائے گا......؟“ چھوٹے مائیک نے ہنستے ہوئے کہا اور فون بند کردیا۔

وہ رات اسٹابرن نے مکڑی کے خوف ودہشت سے کروٹیں لیتے ہوئے گزاری۔ لیکن کوئی نظر نہ آئی۔ صبح

اس نے بستر سے اٹھ کر ناشتہ تیار کیا۔ پھر نہا کر فارغ ہوا۔ اس دوران میں کہیں کوئی مکڑی نظر نہیں آئی۔ تاہم وہ مائیک کا انتظار کرنے لگا جب دھوپ خوب چڑھ آئی تو مائیک کا ٹرالر اس کے گھر کے سامنے آکھڑا ہوا اور بڑا مائیک اتر کر اس کے پاس آگیا۔

”آپ نے میرے لڑکے سے کہا ہے کہ کھٹملوں کا کوئی پرابلم ہے؟“

”کھٹمل نہیں۔ صرف مکڑیاں......“ اسٹابرن نے جزبز ہوکر بولا۔ ”کل میں نے ایک مکڑی دیکھی۔“

”صرف ایک مکڑی؟ تو اس سے کیا؟“ بڑے مائیک نے کہا۔

”مگر تم نے پورے ایک سال کی گارنٹی دی تھی۔ اپنے معاہدے کا پاس کرو۔“ اسٹابرن نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

بڑے مائیک نے گھور کر اسے دیکھا اور خاموشی سے اپنا اوورآل کپڑوں پر چڑھا کر مکان کی طرف بڑھا۔ چند منٹ بعد وہ باہر آکر کہنے لگا۔ ”مسٹر آپ کے دماغ میں کیڑے کلبلا رہے ہیں۔ سارے گھر میں ایک بھی مکڑی نہیں ہے۔“

”کل خود میرے اوپر ایک مکڑی گری تھی اور میری جان ہی نکال دی تھی اس نے ----“ اسٹابرن نے احتجاجاً کہا۔

”ایک چھوٹی سی مکڑی نے جان نکال دی تھی......!“ بڑا مائیک گہرے طنزیہ لہجے میں بولا۔

”بات یہ نہیں ہے----“ اسٹابرن نے خجل مندی سے کہا۔ ”بلکہ یہ ہے کہ تم نے کہا تھا کہ سال بھر تک کوئی مکڑی نہیں آئے گی اور اب ایک مہینہ بھی نہیں گزرا کہ مکڑی آدھمکی۔ تم اس کے لئے کچھ کردو، ورنہ میں تمہیں عدالت میں گھسیٹوں گا۔“

بڑے مائیک نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا پھر دانت کٹکٹا کر بولا۔ ”اچھا میں دوا چھڑکتا ہوں!“

☆......☆......☆

دو روز بعد اسٹابرن نے سونے سے پہلے دانت صاف کرنے کے لئے ٹوتھ پیسٹ اور برش اٹھایا تو ایک مکڑی بڑی شان سے برش کے گداز بالوں پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ اچھل کر اس کے ہاتھ پر آگئی اور تیزی کے ساتھ چلتی ہوئی کلائی پر سے شانے پر پہنچ گئی۔ اس نے ٹوتھ پیسٹ اور برش پھینک کر ایک خوف ناک چیخ ماری اور مکڑی کو جھاڑنے کے لئے شانے پر ہاتھ مارنے لگا۔

گھبراہٹ کے عالم میں اس کا پاؤں ٹوتھ پیسٹ کے ٹیوب پر پڑ گیا۔ وہ ”پچک“ کی آواز کے ساتھ باہر نکلی اور باتھ روم کے فرش پر پیسٹ پھیل گیا۔ پیپرمنٹ کی تیز خوش بو آنا شروع ہوگئی۔ اتنے میں مکڑی اس کے چہرے پر آگئی۔ اس نے چہرے پر ایک زناٹے کا ہاتھ مارا تو اسے لگا جیسے اس کا ذہن ساتویں آسمان پر پہنچ گیا ہو۔ درد کی شدت کو وہ برداشت کرگیا تھا۔ مکڑی اس کے تھپڑ سے تو بچ گئی تھی مگر وہ فرش پر جا گری تھی۔ اسٹابرن نے اسے پاؤں سے کچلنا چاہا تو وہ فرش پر پھیلے ہوئے ٹوتھ پیسٹ میں گھس گئی۔ اسٹابرن نے اس پر پاؤں مارا تو پیسٹ اور زیادہ پھیلتا چلا گیا۔ جس کی وجہ سے اسٹابرن پھسل کر دھڑام سے فرش کے چکنے سینے پر آگرا۔ مکڑی کہیں نظر نہ آئی، نجانے وہ اتنی جلدی کہاں غائب ہوگئی تھی۔

اسٹابرن کو مائیک پر بڑا غصہ آیا۔ وہ باتھ روم سے نکل کر صحن میں آیا اور ٹیبل پر پڑے ہوئے ٹیلی فون کا ریسیور اٹھا کر مائیک کی کمپنی کے آفس میں کال کی۔ اس مرتبہ اسے فون پر بڑا مائیک مل گیا۔

”ہیلو......فرمایئے......“

”مکڑیاں پھر آگئیں ہیں......“ اسٹابرن نے بڑے ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

”اوہ۔ اچھا تو آپ ہیں مسٹر اسٹابرن......؟“ بڑے مائیک نے سرسری طور پر کہا۔

”ہاں ہاں......میں ہوں......“ اسٹابرن نے ترش لہجے میں بولتے ہوئے کہا۔ ”تم ان کالی بلاؤں کے لئے کیا کررہے ہو؟“

بڑا مائیک دیر تک خاموش رہا۔ پھر اس نے ٹھہر ٹھہر

کر چیلنج کرنے والے انداز میں کہا۔ ”میں وہاں آیا تھا، مگر مجھے تو کوئی مکڑی نظر نہیں آئی۔“

”مگر ابھی کچھ دیر قبل ایک مکڑی اچھل کر پہلے میرے ہاتھ اور کلائی پر اور پھر میرے چہرے پر آ گئی تھی؟“ اسٹاہرن نے مصالحانہ رویہ اختیار کیا۔

”پہلی بات تو یہ ہے کہ مسٹر اسٹاہرن کہ مکڑی ایک بزدل مخلوق ہے۔ انسانوں سے بے حد ڈرتی ہے......“ بڑے مائیک نے بزرگانہ انداز میں کہا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ آپ مجھے رگیدنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ مجھے مکڑی دکھائی نہیں دے رہی۔ پھر بھی میں نے آپ کے کہنے پر دوا چھڑک دی۔ اب میں صاف صاف کہتا ہوں کہ آپ کے گھر میں کوئی مکڑی وکڑی نہیں ہے۔“

”تو میرے ہاتھ پر جو آئی تھی وہ کیا چیز تھی؟“ اسٹاہرن نے جز بز ہو کر کہا۔

”ہو سکتا ہے کوئی جھینگر ہو......؟“ بڑا مائیک بڑے مزے سے بولا۔

”جھینگر......؟“ اسٹاہرن بری طرح سے اچھل پڑا۔ ”تم نے یہ بھی تو کہا تھا کہ دھونی دینے سے اور دوا چھڑکنے سے ہر قسم کے کیڑے مکوڑے دفع ہو جائیں گے۔ اس کے علاوہ جھینگر کی آٹھ ٹانگیں نہیں ہوتیں......“

دوسری جانب کلک کی آواز کے ساتھ خاموشی چھا گئی۔

”ہیلو...... ہیلو......“ اسٹاہرن نے بار بار کہا، مگر جواب ندارد۔ شاید بڑے مائیک نے فون بند کر دیا تھا۔

اسٹاہرن نے جھلا کر ریسیور کریڈل پر رکھ دیا اور ساتھ ہی وہ مائیک کو برا بھلا کہنے لگا۔ وہ رات بسر کرنے کے لئے جینی کے ہاں بھی نہیں جا سکتا تھا۔ وہ اسے گھر میں گھسنے بھی نہ دیتی۔ مزید برآں وہ اس کا مقروض بھی تو تھا۔ کسی دوسری دوا چھڑکنے والی کمپنی سے بھی بات نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس کے لئے رقم درکار تھی۔ بس اب صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا کہ وہ بذات خود کونے کھدرے میں مکڑیوں کی جائے پناہ تلاش کرے اور انہیں اپنے ہاتھوں سے نیست و نابود کر دے۔ اس کے بعد مائیک کی کمپنی کے خلاف عدالت میں دعویٰ دائر کر دے۔ اسے ان لوگوں پر مکڑیوں سے بھی زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ اور اسی غصے نے اس کے دل سے مکڑیوں کا خوف نکال دیا تھا۔ اس نے عہد کیا کہ وہ خود انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر ہلاک کر ڈالے گا۔ یہ ٹھان کر وہ اسی وقت ایک اسٹور پر گیا اور کیڑے مار تمام دوائیں خرید لیں۔ ایک فلیش لائٹ بھی لی اور واپس گھر لوٹا۔

راستے میں اس کا ذہن ایک بار ماضی کی لہروں پر دوڑنے لگا۔ وہ تین سال کا تھا اور ایک دن شام کے دھندلکے میں وہ فٹ پاتھ پر دوڑا جا رہا تھا، اسی دوران وہ ایک درخت کی کافی حد تک جھکی ہوئی شاخ کے نیچے سے گزرا تو اچانک مکڑی کا ایک بہت بڑا جالا اس کے سر اور منہ پر آ گیا۔ بری طرح سے لپٹ گیا۔ اس نے گھبرا کر چیخ ماری تو ایک بڑی سی کالی مکڑی اس کے منہ میں گھس گئی۔ اس نے بوکھلا کر مکڑی کو چبا ڈالا اور اس کا منہ ایک کڑوے لیس دار مادے سے لتھڑ گیا۔ اس کو بے اختیار ابکائی آ گئی۔ اس نے منہ کھولتے ہوئے تھوکا لیکن اتنے وقت میں مکڑی اس کے ہونٹ کو کاٹ چکی تھی۔ وہ تھوکتے ہوئے گھر بھاگا تو ہونٹ میں سوزش اور جلن ہونے لگی۔ گھر پہنچتے پہنچتے اس کا ہونٹ سوج گیا اور پھر گزرتے وقت کے ساتھ رفتہ رفتہ زخم بن گیا۔ کافی دنوں کے بعد جا کر وہ ٹھیک ہوا تھا۔ زخم البتہ مندمل ہو چکا تھا مگر اپنا گہرا نشان چھوڑ گیا تھا۔ اس وقت سے اسے مکڑیوں سے شدید نفرت بھی ہو گئی اور ساتھ ساتھ ان سے خوف بھی آنے لگا......

وہ ماضی کی اس بھیانک تصویر کو ذہن کے پردے پر دیکھتا ہوا گھر پہنچا اور کپڑے بدل کر اپنے ہتھیاروں سمیت مکڑیوں کو تلاش کرنے میں مصروف ہو گیا۔ اس نے سارا گھر چھان مارا۔ جب سے ایک کیڑا بھی نظر نہ آیا تو وہ فلیش لائٹ سنبھال کر تہ خانے میں اتر گیا۔ یہاں سیلن بھی تھی اور مٹی کی تہ پر تہ بھی چڑھی ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ اور کپڑے آلودہ ہو رہے تھے۔ لیکن وہ گھٹنوں کے بل جھک کر رینگتے ہوئے فلیش لائٹ انچ انچ زمین پر ڈالتا رہا۔ ادھر ادھر کا تیز نظروں سے جائزہ لیتا رہا۔ جب وہ ایک کونے میں گیا تو اسے مٹی پر چائے کے کپ جتنے

بڑے دائرے سے نظر آ گئے۔ جنہیں دیکھ کر اس کے پورے ذہن میں سنسناہٹ پیدا ہو گئی۔ اس کی آنکھوں میں عجیب سا تحیر پیدا ہو گیا۔

یہ دائرے زمین سے تھوڑے تھوڑے پہاڑیوں کی طرح اوپر کو ابھرے ہوئے تھے۔ وہ سمجھا کہ مٹی سیلن کی وجہ سے پھول گئی ہے شاید...... لیکن پھر اگلے لمحے اس کے ذہن میں اور خیال ابھرا کہ یہ مٹی جا بجا دائروں کی شکل میں ہی کیوں پھولی اور ابھری ہوئی ہے۔ چوکور، مربع شکل یا پھر کسی اور ڈھب...... صورت میں بھی تو ہو سکتی تھی؟ اس کا پس و پیش میں مبتلا ہوا۔ پھر اس نے اپنا ذہن جھٹکا اور فلیش لائٹ کی روشنی کا رخ اسی جانب کرتے ہوئے اسے زمین پر رکھا اور اسپرے پمپ سے دائروں پر چھڑکاؤ کرنے لگا۔

”پھس سوں...... پھس سوں......“ اسپرے ان دائروں پر گرنے لگی۔ چند لمحے بھی نہ گزرے تھے کہ اچانک دائروں کی ابھری ہوئی مٹی پھٹ گئی...... اور جس طرح گرم گرم دودھ کو ابال آتا ہے۔ بالکل اسی مانند ان میں سے کالی کالی مکڑیاں ابل پڑیں۔ اور ابل ابل کر تیزی کے ساتھ باہر زمین کی سطح پر بکھرتی چلی گئی۔ اک سے دو، دو سے چار اور چار سے آٹھ...... اور درجنوں کی تعداد میں کالی کالی ہیبت ناک مکڑیوں کا جیسے ریلا پھوٹ پڑا تھا۔

اسٹاہرن ایک لمحے کے لئے دہشت اور خوف کے مارے ساکت ہی ہو گیا تھا۔ اس کے بدن کا عضو عضو جیسے مفلوج ہو گیا تھا۔ اور ذہن منجمد سا...... وہ تمام مکڑیاں نیم دائرے کی شکل میں ایک دوسرے کے اوپر نیچے چڑھتے پھسلتے ہوئے...... اسٹاہرن کی جانب اس طرح بڑھیں جیسے تربیت یافتہ فوج کے سپاہی کسی دشمن پر یلغار کر رہے ہوں۔ ان کی رفتار نہ بہت زیادہ تیز رفتار تھی اور نہ ہی نہایت سست...... بلکہ نیم وا تھی۔ شاید یہ اسپرے کا کمال تھا، اس کے باوجود وہ مکڑیاں بڑے منظم طریقے سے اسٹاہرن کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ جیسے کوئی ان کی باقاعدہ کمان کر رہا ہو۔ اسٹاہرن کے سامنے زمین پر ایک متحرک سیاہ چادر سی بنتی اور پھیلتی چلی گئی۔ جب مکڑیاں اسٹاہرن سے صرف چند انچ کے فاصلے پر رہ گئیں تو اسٹاہرن کو جیسے ہوش سا آ گیا۔ وہ بااختیار خوف و ہراس سے لبریز دہشت ناک چیخ مار کر تمام چیزیں وہیں گراتے ہوئے دروازے کی جانب بھاگ کھڑا ہوا۔ دہشت کے عالم میں بھاگتے وقت اس کا سر دروازے کی چوکھٹ سے ٹکرایا تو اسے اندھیرے میں بھی ایک بڑا سا سورج نظر آ گیا۔ اس کے منہ سے ایک نہایت کرب آلود، درد و غم سے بھری ہوئی چیخ نکل گئی۔ اس کا ذہن چکر کھانے لگا۔ لیکن مکڑیوں کی فوج اس کے پیچھے دروازے تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے دوبارہ اپنے ذہن کو دائیں بائیں زور زور سے جھٹکا تو چکروں کا منظر غائب ہو گیا۔ وہ اپنے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر تیزی کے ساتھ تہ خانے کی دیوار اور دروازے سے پھر ٹکراتا ہوا باہر نکلا اور گرتا پڑتا سر پر پاؤں رکھ کر بھاگتا چلا گیا......

مکڑیاں تہ خانے سے باہر نہ نکلیں۔ جیسے انہیں اپنی سرحدوں کا تحفظ مقصود تھا۔ حملہ آور دشمن بھاگ کھڑا ہوا تھا اور اس کا پیچھا کرنا فوجی مصلحت کے بالکل خلاف تھا۔

اسٹاہرن مکان کے اندر پہنچا تو اس کا حلیہ بڑا قابل رحم تھا۔ ماتھے پر ایک بڑا سا گومڑ تھا۔ چہرے اور ہاتھوں پر خراشیں موجود تھیں۔ کپڑے مٹی سے لتھڑے ہوئے نہایت گرد آلود ہو رہے تھے۔ اور کہیں کہیں سے پھٹے ہوئے بھی تھے۔ سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ سانس تو قابو میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ بے دم ہو کر بستر پر آ گرا اور دیر تک پڑا چھت کو گھورتا رہا۔ اور جب جان میں جان آئی تو وہ اٹھا اور باتھ روم میں پہنچ گیا۔ ہاتھ منہ دھویا۔ پھر صاف کپڑے پہننے کے لئے اور خراشوں پر مرہم لگانے کے لئے اس نے ڈرتے ڈرتے ہوئے الماری کھولی کہ اندر کوئی مکڑی نہ بیٹھی ہو، مگر الماری صاف تھی، اندر کوئی مکڑی موجود نہ تھی......

اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اب وہ کسی بھی قیمت پر اس گھر میں نہیں رہے گا۔ اس گھر کو فوراً چھوڑ کر کسی اور جگہ مکان یا فلیٹ لے لے گا۔ لیکن یہاں سے جانے سے پہلے اس مائیک کے بچے سے دو دو بلکہ چار چار ہاتھ ضرور

کرے گا۔ اسے وعدہ خلافی کا مزہ لازمی چکھائے گا۔ خواہ اس کے لئے عدالت میں ہی کیوں نہ جانا پڑے۔ یہ ٹھان کر اس نے کپڑے تبدیل کیے اور پھر اپنے زخموں کی مرہم پٹی وغیرہ کی......

"اس مائیک کو میں نہیں چھوڑوں گا۔" اس نے بڑبڑاتے ہوئے کہا اور ریسیور اٹھاتے ہوئے مائیک کا نمبر ملایا۔

فون پر بڑا مائیک مل گیا۔ لگتا تھا کہ وہ بیٹھا شراب نوشی کر رہا ہے۔ اس نے خمار آلود آواز میں بولا۔ "ہیلو...... یس......"

"تم اسی وقت اور ابھی میرے گھر پہنچو......" اسٹابرن نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ وہ مکڑیاں میرے گھر کے تہ خانے میں ہیں...... سینکڑوں بلکہ ہزاروں کی تعداد میں موجود ہیں...... خوف ناک شکل کی ہیں۔ کالی کالی اور ہیبت ناک مکڑیاں......

"کیا......؟ کون بول رہا ہے؟ مسٹر اسٹابرن......؟" مائیک نے چونک کر تساہل بھرے انداز میں کہا۔ "اب کیا پرابلم ہے؟ اس وقت آپ مجھے کیوں تنگ کر رہے ہیں......؟"

"وقت ضائع مت کرو، اور فوراً سے پیشتر میرے گھر آجاؤ۔" اسٹابرن نے کہا۔ "مکڑیوں کا پورا سمندر ہے اور تم پروا نہیں کر رہے ہو؟"

دوسری طرف سے شراب کی غٹاغٹ حلق سے اترنے کی آواز سنائی دی اور پھر بوتل کے ٹیبل پر رکھنے کی آواز گونجی اور مائیک نے اسٹابرن کو چڑانے کے سے انداز میں کہا۔ "آپ شاید مجھ سے بھی کہیں زیادہ پیتے ہیں۔ آرام سے بستر پر لیٹ جایئے۔"

"بکواس مت کرو۔" اسٹابرن گرجا۔ میں کہہ رہا ہوں فوراً آجاؤ، اپنی آنکھوں سے دیکھو اور انہیں ختم کر دو۔"

"سنئے مسٹر اسٹابرن۔ میں سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کو وہم ہو گیا ہے۔ آپ کے ہاں کوئی مکڑی وکڑی نہیں ہے۔"

"ان کی پوری کالونی بلکہ ملک آباد ہے گدھے! تمہاری دھونی اور دوا ان تک نہیں پہنچ رہی ہے۔ وہ زمین کے اندر ہیں۔" اسٹابرن نے غصے سے لرزتے ہوئے کہا۔ "اگر تم نہ آئے تو گاڈ پراس میں تم پر دعوا کر دوں گا۔ تمہاری کمپنی کا سارا کاروبار تہس نہس کر دوں گا۔ سمجھے۔"

"اوہ، تم تو ناراض ہو گئے۔ اچھا اچھا ابھی آرہا ہوں۔ جسٹ فار یو ویٹ، مائیک نے فوراً سنبھل کر کسی قدرے بیزاری سے کہا۔ اور کسی زبان میں بڑبڑاتے ہوئے فون بند کر دیا۔

بڑے مائیک کو آنے میں پورا ایک گھنٹہ لگ گیا۔ اس دوران اسٹابرن کپڑوں کے چند جوڑے اور ضروری اشیاء سوٹ کیس میں رکھ کر جانے کے لئے دروازے پر تیار کھڑا تھا۔

"کہاں ہیں......؟" بڑے مائیک نے سازو سامان کے ساتھ ٹرالر میں سے اتر کر اسٹابرن کی طرف بڑھتے ہوئے بگڑتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"کم آن کرو کھاتا ہوں۔" اسٹابرن نے منہ بگاڑ کر بولتے ہوئے کہا۔

"یہاں کسی مکڑی کا کوئی وجود نہیں ہے......" بڑا مائیک بڑبڑاتا ہوا اس کے پیچھے مکان میں داخل ہوا۔

اسٹابرن اسے تہ خانے میں لے گیا۔ اور وہ فلیش لائٹ چاروں طرف پھینکنے لگا۔

"کہاں ہیں؟ ایک بھی تو نہیں ہے؟" بڑا مائیک کہتا جا رہا تھا۔ اسی وقت اسٹابرن چیخا۔ "وہ...... وہ...... وہ دیکھو...... ارے ہو......"

بوکھلاہٹ کے مارے اس کے ہاتھ سے فلیش لائٹ چھوٹ گئی۔ تہ خانے میں گھپ اندھیرا پھیل گیا۔ پھر ایک چیخ گونجی اور کسی بوجھ کے دھڑام سے گرنے کی آواز سنائی دی۔ اسٹابرن نے ٹٹول کر فلیش لائٹ اٹھائی اور اسے دوبارہ آن on کرتے ہوئے چلایا تو اس کی چیخیں نکل گئیں منظر اتنا خوف ناک اور دہشت ناک سے پرہول تھا کہ اسٹابرن کے بدن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بڑا مائیک زمین پر پڑا ہوا تھا۔ اور اس کے پورے چہرے، سینے، ہاتھوں پر متحرک سیاہ چادر چڑھتی جا رہی تھی۔ اس کے جسم کے چاروں اطراف مکڑیاں ہی مکڑیاں بکھری ہوئیں تھیں۔ جو کہ رینگ رہی تھیں۔ بھاگ دوڑ رہی تھیں۔ روشنی ہوئی تو وہ سب اسٹابرن کی طرف بڑھیں اور وہ فلیش لائٹ پھینک کر بھاگ کھڑا ہوا۔

وہ بھاگتا ہوا تہ خانے سے نکل کر گھر میں انٹر ہوا، سوٹ کیس اٹھایا اور بیرونی دروازے کی جانب سرپٹ بھاگا۔ پورچ میں سے اس نے کار نکالی اور ایکسی لیٹر پر پاؤں پوری قوت سے رکھتے ہوئے اس گھر کی حدود میں سے کافی دور نکل آیا۔ کچھ دیر کے بعد وہ ٹریفک سگنلوں کی پروا کیے بغیر سڑک پر کار دوڑائے جا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید خوف بکھرا ہوا تھا، ٹپک رہا تھا۔

جب وہ گھر کو بہت پیچھے چھوڑ آیا تو اس کے ہوش کچھ ٹھکانے آئے۔ اور وہ سوچنے لگا کہ کیا کر رہا ہے؟ کہاں جا رہا ہے؟ اسے کچھ نہ کچھ کرنا تھا۔ اس نے ایک پبلک فون بوتھ پر کار روکی اور دروازہ کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے ریسیور کریڈل پر اٹھا لیا۔ اس کے ہاتھ تیزی کے ساتھ مختلف نمبروں کو پریس کرتے جا رہے تھے۔

"ہیلو...... کون؟" رابطہ قائم ہوتے ہی جینی کی غنودگی بھری آواز سنائی دی۔

"جینی۔ میں ہوں۔ اسٹابرن۔" اس نے گمبھیر آواز میں بولتے ہوئے کہا۔

"اسٹابرن تم۔ اب تمہیں اتنی رات گئے مجھے نیند سے جگانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟" جینی نے اس بار تلخی سے بولا تھا۔

"میں ...... میں تم سے ملنا چاہتا ہوں......" اسٹابرن نے تقریباً روہانسی آواز میں کہا۔ "مجھے رہنے کے لئے جگہ چاہیے......"

"نہیں......" جینی نے تند و تیز لہجے میں کہا۔ وہ اب پوری طرح جاگ گئی تھی۔ اس وقت...... تو بالکل نہیں......"

"but جینی۔ میں ایک مصیبت میں پھنس گیا ہوں......" اسٹابرن نے عاجزی سے کہا۔

"کیسی مصیبت......؟" جینی نے اسی طرح تلخی سے پوچھا۔

اسٹابرن نے اپنے ہونٹ پر زخم کا نشان چبایا۔ "فون پر اسے یہ سب کیسے بتاؤں؟" اس نے دل ہی دل میں سوچا اور ملامت سے بولا۔ "میں میں...... فون پر بتا نہیں سکتا۔ فیس ٹو فیس بتاؤں گا......"

جواباً جینی نے کچھ نہایت آہستگی سے کہا جسے اسٹابرن سن نہ سکا۔ اس کے بجائے اسے پس منظر میں ایک مردانہ آواز سنائی۔ اسٹابرن اس آواز کو فوراً پہچان گیا۔ یہ آواز بڑے مائیک کے بیٹے چھوٹے مائیک کی تھی۔ وہ سمجھ گیا کہ اس وقت جینی کے روم میں چھوٹا مائیک موجود ہے۔ جس نے شاید اس کی جگہ لے لی ہے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ کون ہے تمہارے ساتھ......؟" اسٹابرن نے غصیلے لہجے میں پوچھا۔

دوسری طرف چند لمحوں کے لئے خاموشی چھائی رہی۔ پھر جینی کی لرزتی ہوئی بکری کی طرح منمناتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "کہاں کیا ہو رہا ہے؟ کوئی بھی تو نہیں ہے......؟"

اسٹابرن نے کچھ کہنے کے بجائے پھنکارتے ہوئے انداز میں ریسیور رکھ دیا۔ وہ کار کی جانب بڑھا تو اس کا سارا جسم کانپ رہا تھا۔ خیالات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ "مکڑیاں، بڑا مائیک...... جینی اور چھوٹا مائیک......"

اس نے کار اسٹارٹ کی اور اسے آگے بڑھا دیا۔ اس نے رات بسر کرنے کے لئے ایک سستے ہوٹل کا انتخاب کیا اور ایک کمرہ بک کروا لیا۔ اندر جا کر اس نے سوٹ کیس کھولا اور ناول اور کپڑے نکال کر باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے سوچا کہ نہا دھو کر تازہ دم ہو لینا چاہیے......

"نہانے کے بعد پولیس کو کال کر کے بڑے مائیک کے بارے میں انفارم کروں گا۔" اس نے خود کلامی کرتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے دروازہ بند کیا۔ تاول ہینگر کے ساتھ لٹکایا اور شاور کھولا۔ پانی کی ٹھنڈی اور باریک مگر موٹی

پھوار اس کے بدن پر پڑنے لگی۔ اس نے سستے ہوٹل کے گھٹیا صابن سے خوب مل مل کر نہایا۔ پھر ٹاول سے بدن خشک کیا اور دوسرے کپڑے پہننے لگا۔ تو وہ بے اختیار رک گیا۔

کوئی چیز کپڑے اور اس کی جلد کے درمیان سرسرا رہی تھی۔ اس نے ہاتھ تھوڑا سا نیچے کیا تو وہ تھرتھرا کر رہ گیا وہ ایک بڑی سی کالی مکڑی تھی۔ اس نے کپڑے اتارنے کے بجائے انہیں وہیں چھوڑا اور جلدی سے ٹاول جسم پر لپیٹ کر واش بیسن پر سے عینک اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو ایک کالی مکڑی اچک کر اس کے بازو پر آ گئی۔ اس نے جھٹکے سے اسے بازو پر سے جھاڑا اور عینک اٹھانے لگا تو وہ مکڑی کے جالے میں پھنسی ہوئی تھی۔ جس میں درجنوں کے حساب سے مکڑیاں اندر باہر چل رہی تھیں۔ رینگ رہی تھیں۔ اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ رک گئے۔ وہ عینک وہیں چھوڑ کر بھاگم بھاگ کمرے میں گیا۔ دوسرے کپڑے نکالنے کے لئے سوٹ کیس اس نے جوں ہی کھولا تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

سوٹ کیس میں بے شمار مکڑیاں رینگ رہی تھیں۔ وہ تیزی کے ساتھ ابل ابل کر...... اچھل اچھل کر باہر آنا شروع ہو گئیں۔ اسٹابرن تیزی کے ساتھ لڑکھڑاتے ہوئے پیچھے ہٹا اور بھاگ کر دروازے پر پہنچا۔ اس نے دروازہ کھولنے کے لئے ہینڈل کی جانب ہاتھ بڑھایا تو وہ خوف و ہراس سے لبریز چیخ مارتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ ہینڈل کی جگہ ٹینس کا ایک سیاہ رنگ کا بال ball نظر آ رہا تھا۔

چھوٹی چھوٹی مکڑیوں کے درمیان ایک بڑی سی مکڑی بیٹھی ہوئی تھی۔ جس کی ٹانگیں کم سے کم چھ انچ لمبی تھیں۔

”تم ...... تم کیا چاہتی ہو......؟ میں تمہارا نشانہ کیوں...... کیوں بن گیا ہوں؟ میں نے تم سب کا آخر کیا بگاڑا ہے؟ اس نے ...... سسکیاں لیتے ہوئے بڑے روہانسی انداز میں کہا۔ عینک کے بغیر اسے اب اور بھی کم نظر آ رہا تھا۔

اس نے دیکھا کہ کالے سمندر کی لہریں اس کی طرف بڑھتی آ رہی ہیں۔ وہ چاروں اطراف سے ان میں بری طرح سے گھر چکا ہے۔ پھنس گیا ہے، اور ٹیلی فون تک رسائی ناممکن ہو گئی تھی۔ مکڑیاں فرش پر تھیں۔ دیواروں پر رینگ رہی تھیں ...... فضا میں چھت کے ساتھ جالے ہی جالے جھول رہے تھے، اور مکڑیاں ان جالوں پر رینگ رہی تھیں، چل پھر رہی تھیں۔ عجیب سی آوازیں کمرے میں پھیل رہی تھیں۔ اسی وقت چھت پر سے مکڑیاں اس پر گرنے لگیں۔ وہ بچنے کی غرض سے ایک کونے میں دبک گیا۔

مکڑیاں تیزی کے ساتھ چلتی رینگتی اور بھاگتی اس کے اردگرد جمع ہو گئیں۔ پھر ان مکڑیوں نے اس کر گرد ملائم ...... مہین ...... اور نفیس جالے بننا شروع کر دیئے۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھیلتے ہوئے سائیڈوں پر جا لگیں۔ اس کی آنکھیں خوف و ڈر کے مارے نہایت سرخ اور پانی سے لبریز ہو گئیں تھیں۔ وہ خوف زدہ اور کرب ناک چیخیں حلق پھاڑ پھاڑ کر مارنے لگا تھا۔ اس کے حلق سے نکلنے والی دل خراش وفلک شگاف چیخوں سے پورا کمرہ گونجنے لگا تھا، تھرتھرانے لگا تھا۔

چیخوں کی آوازیں ہال میں سنائی دیں تو منیجر، ویٹرز اور دوسرے افراد اس سمت دوڑے۔ جہاں سے چیخوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ سب اندر پہنچے۔ ان سب کی آنکھیں مارے حیرت کے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ انہوں نے دیکھا کہ اسٹابرن کھلے ہوئے سوٹ کیس کے پاس فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں ”خوف“ کی شدت سے کھلی ہوئیں تھیں۔ اور وہ سوچنے سمجھنے کے شعور سے بہت دور چلا گیا تھا۔ ہر کسی کے چہرے سے زبردست حیرانی عیاں ہو رہی تھی......

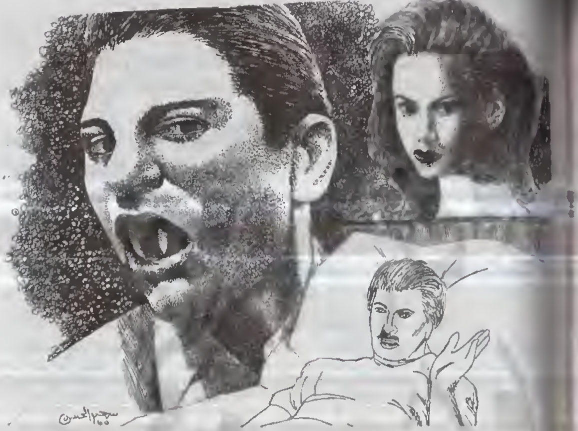

پیاسی دوستی

ایس حبیب خان۔ کراچی

نوجوان کے سینے میں صلیب پیوست تھی اور پھر اچانک کھڑکی کا پردہ ہٹتے ہی سورج کی روشنی جب نوجوان پر پڑی تو چشم زدن میں نوجوان کے جسم میں شعلے بھڑک اٹھے اور نوجوان کا جسم دھڑا دھڑ جلنے لگا۔

خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی ہوئی ایک دلخراش حیرت انگیز تحیر انگیز لہو منجمد کرتی کہانی

قہقہوں سے پورا کیفے گونج رہا تھا۔ کافی ختم کرنے کے بعد وہ پانچوں باہر آ گئے مگر ان کی مستیاں ختم نہیں ہوئیں۔ سارہ، برائن، جینیفر، کیون اور ریچل، یہ فرینڈز کا گروپ تھا اور اس طرح کی مستیاں ان کا معمول تھیں۔ ان کی دوستی کالج ختم ہونے کے بعد بھی قائم تھی۔ میوزک ان سب کی کمزوری تھی اور انہوں نے مل کر ایک ”راک بینڈ“ بھی بنایا تھا۔ برائن گٹار پلے کرتا تھا، کیون ڈرمز، ریچل کی بورڈ، سارہ بینڈ کی لیڈر تھی، اس کے علاوہ وہ گٹار بھی پلے کرتی تھی۔ اس نے جینیفر کے ساتھ مل کر دو، تین سانگ کمپوز بھی کیے تھے۔ جینیفر آج کل سانگ کے لئے شاعری کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

”جینیفر یار اور کتنا ٹائم لگے گا سانگ لکھنے میں؟ ایک بھی سانگ تیار نہیں ہوا، البم کیا خاک ریلیز کر سکیں

گے ہم!" سارہ نے کہا۔

"ہو جائے گی البم بھی ریلیز اور سانگ بھی تیار......" جینیفر نے ہنس کر آنکھ مارتے ہوئے کہا۔

"تم لوگ مذاق کرتے رہو، میں خود کوشش کرتی ہوں۔" گھر آکر وہ اپنے بستر پر اوندھی گر گئی۔ کافی دیر تک ایسے پڑے رہنے کے بعد اس نے بستر پر پڑا ہوا ریموٹ اٹھایا اور ٹی وی آن کر دیا۔ ادھر ادھر چینل بدلنے کے بعد اس نے ایک میوزک چینل پر ریموٹ روک لیا۔ اسکرین پر اس کے فیورٹ راک بینڈ کا کنسرٹ آرہا تھا، کوئی اور وقت ہوتا تو سب چھوڑ چھاڑ کر بیٹھ جاتی مگر اس وقت اس کی نظریں اسکرین پر تھیں مگر ذہن کہیں اور، پھر کافی دیر بعد اس نے ٹی وی آف کر دیا اور رائٹنگ ٹیبل پر آکر سانگ لکھنے کی کوشش کرنے لگی۔ جب کچھ نہیں سمجھ آیا تو اس نے پین زور سے ٹیبل پر پٹخ دیا اور ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں ڈال کر سر جھکا لیا۔

اگلے روز سارے دوست پریکٹس کرنے بیٹھے مگر ان کے پاس زیادہ کچھ تھا ہی نہیں جس کی وہ پریکٹس کرتے۔ "یار! ایسے کیسے کام چلے گا؟" کیون نے جھنجلا کر کہا۔ وہ لوگ سارہ کے گھر کے انڈر گراؤنڈ میں پریکٹس کرتے تھے۔

رات کا کھانا کھا کر سارہ گاڑی لے کر یوں ہی باہر نکل آئی۔ ڈرائیو کرتے ہوئے بھی وہ سانگ کے بارے میں ہی سوچ رہی تھی، اور اسے یہ پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ سی سائیڈ آگئی ہے۔ اس نے بریک لگائی اور کافی دیر اسٹیئرنگ پر سر ٹکا کر بیٹھی رہی پھر اس نے برابر کی سیٹ پر رکھا اپنا گٹار اٹھایا اور چلتی ہوئی پتھروں پر آکر بیٹھ گئی۔ وہاں زیادہ لوگ نہیں تھے اور اندھیرا بھی تھا۔ پھر سارہ کی انگلیاں گٹار پر حرکت کرنے لگیں۔ وہ آنکھیں بند کئے جانے کتنی دیر اپنی کمپوز کی ہوئی دھن لے کرتی رہی اور جب وہ تھک گئی تو اس کی انگلیاں رک گئیں مگر آنکھیں بدستور بند تھیں۔ اچانک تالیوں کی آواز پر اس نے اپنی آنکھیں کھولیں۔ تو اس کی نظریں اپنے سے تھوڑے فاصلے پر جا کر رک گئیں۔ تھوڑے فاصلے پر ایک نوجوان پتھر پر بیٹھا ہوا تالیاں بجا کر اسے داد دے رہا تھا۔ پھر نوجوان اٹھ کر اس کے قریب آکر بیٹھ گیا۔

"ہائے! آئی ایم وکٹر۔" اس نوجوان نے سر کو ہلکا سا جھکا کر کہا۔

نوجوان کے قریب آنے پر سارہ کے پورے جسم میں سنسناہٹ ہونے لگی۔ وہ نوجوان غیر معمولی حد تک لمبا اور صحت مند لگ رہا تھا، ڈارک براؤن بڑے بڑے سلکی بال اس کے چہرے پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی رنگت بہت سفید تھی اور آنکھوں میں عجیب سی چمک سفید رنگ کی الگ ہی نظر آرہی تھی، سرخ ہونٹ ایسے تھے جیسے ابھی خون چھلک پڑے گا۔

سارہ بغیر کچھ کہے ایک جھٹکے سے اٹھی اور تیز تیز قدم اٹھاتی آگے بڑھنے لگی اور پھر وہ چلتے چلتے جیسے بھاگنے لگی، جانے کیوں اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ جلدی سے اپنی گاڑی میں بیٹھی اور جھٹکے سے کار آگے بڑھا دی۔ کافی آگے نکل کر اس کو خود اپنی حرکت پر ہنسی آنے لگی۔ ادھر نوجوان نے وہ گٹار ہاتھ میں اٹھا لیا جو سارہ بوکھلاہٹ میں چھوڑ گئی تھی۔ ٹنگ! کی آواز نوجوان کی انگلی پھیرنے پر گٹار کی اسٹرنگ سے آئی تھی۔ اس نے سرگوشی کے انداز میں آہستہ سے کہا۔ "سارہ!"

سارہ اگلے روز اپنے فرینڈز کے ساتھ ایک ہوٹل میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھی، انہوں نے کھانا کھایا۔ بل پیڈ کرنے کے بعد گاڑی میں بیٹھ کر اسموکنگ کرتے ہوئے ادھر ادھر گاڑی دوڑاتے رہے، کار کے شیشے بند تھے، گاڑی میں کافی دھواں بھر چکا تھا۔ اب وہ گاڑی میں سارہ کے گھر کے قریب پہنچ گئے تھے انہوں نے سارہ کو گھر کے قریب اتار دیا۔ سارہ نے اپنے پرس سے چابی نکال کر گیٹ میں لگے تالے میں لگا دی کہ اسے کسی نے پیچھے سے آواز دی۔ "سارہ!" اس نے ادھر ادھر دیکھا مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔

"ادھر دیکھو یہاں!" آواز گھر سے دو قدم دور لگے بہت ہی اونچے درخت پر سے آرہی تھی۔ سارہ نے سر اٹھا کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اور پھر دھم سے ایک وجود نیچے کود گیا۔ سارہ حیران تھی کہ اتنی اونچائی سے کودنے پر بھی تو وہ لڑکھڑایا اور نہ ہی کوئی چوٹ لگی۔ پھر وہ چلتا ہوا قریب آیا تو چاند کی روشنی میں سارہ نے دیکھا کہ وہ وہی نوجوان تھا جو اسے سی سائیڈ پر ملا تھا۔ "وکٹر!" نوجوان نے ہنس کر کہا۔

"جی کوئی کام ہے آپ کو مجھ سے؟" سارہ نے انتہائی روکھے انداز سے کہا۔

"آپ ناراض کیوں ہو رہی ہیں؟ میں تو آپ کا گٹار واپس کرنے آیا ہوں۔" وکٹر نے کمر پر لٹکا ہوا گٹار اتارا اور سارہ کے ہاتھ میں تھما دیا۔ "سارہ جی!" اگر آپ کو میرا آنا ناگوار گزرا ہے تو معاف کیجئے گا۔ "یہ میری ڈیوٹی تھی، آپ کی امانت لوٹانا......"

یہ کہہ کر وکٹر مڑ کر جانے لگا تو سارہ کو یکدم شرمندگی کا احساس ہوا لہٰذا اس نے وکٹر کو آواز دی، وکٹر وہیں ٹھہر گیا مگر پلٹا نہیں۔ سارہ چلتی ہوئی اس کے سامنے گئی۔ وہ شرمندگی سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ "آئی ایم ایکسٹریملی سوری! وہ دراصل میں......"

"اٹس اوکے!" وکٹر نے نرمی سے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ سارہ کو یکدم یاد آیا تو اس نے چونک کر کہا۔ "آپ کو میرا نام کیسے معلوم ہوا؟"

"نام؟ یہ تو کوئی مشکل بات نہیں ہے، مجھے تو یہ بھی پتا ہے کہ آپ میوزک پسند کرتی ہیں۔" وکٹر نے مزید کہا۔

سارہ نے حیرانی سے پوچھا۔ "کیسے معلوم ہوا آپ کو؟"

اس بات کا میں نے اندازہ لگایا تھا کہ آپ کو میوزک میں دلچسپی ہے جبھی تو آپ اتنا اچھا گٹار پلے کرتی ہیں۔" وکٹر نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اپنے بارے میں تو کچھ بتائیں۔" سارہ بولی۔

"مجھے بھی میوزک سے دلچسپی ہے، ان فیکٹ میرا تو بینڈ بھی تھا مگر کسی وجہ سے وہ ٹوٹ گیا۔" وکٹر نے بتایا۔

"اوہ! ریئلی! میرا بھی بینڈ ہے مگر مین اسٹریم میں نہیں آیا ابھی۔ آپ میرے بینڈ ممبرز سے ضرور ملیئے۔" سارہ نے ایکسائیٹڈ ہوتے ہوئے کہا۔

"اوکے! مگر صرف رات میں۔" وکٹر کی آنکھوں میں جانے کیسی چمک ابھری اور پھر وہ بائے کہہ کر وہاں سے جانے لگا۔ سارہ بھی اپنے گیٹ پر آگئی پھر اس نے پلٹ کر کچھ کہنا چاہا۔ "وک......" مگر وہاں سنسان سڑک کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ سارہ کچھ دیر دیکھتی رہی پھر کندھے اچکا کر گھر کے اندر داخل ہو گئی اور پھر اس نے اپنے فرینڈز کو کال کر کے وکٹر کے بارے میں بتایا۔ وہ لوگ بھی خوش ہوئے۔

دوسرے روز رات ہوئی تو سب لوگ سارہ کے گھر پہنچ گئے اور وکٹر کا انتظار کرنے لگے سب سے زیادہ بے چین سارہ تھی۔ بیل بجتے ہی وہ مین گیٹ پر آئی پھر جیسے ہی اس نے گیٹ کھولا تو وہ دھک سے رہ گئی کیونکہ وہاں وکٹر کھڑا تھا۔ سارہ سنبھل گئی اور بولی! "پلیز کم!" وکٹر نے جیسے ہی گھر کے اندر قدم رکھا تو زنجیر سے بندھا کتا زور سے بھونکنے لگا اور اپنی زنجیر کو بھی جھٹکے دینے لگا۔ سارہ کتے کو مخاطب کر کے بولی! "ٹائیگر کیا ہوا؟" مگر کتا بے تحاشا بھونک رہا تھا۔

وکٹر چلتا ہوا کتے کے قریب آیا اور جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا۔ کتے کے تنے ہوئے کان نیچے جھک گئے اور وہ زمین پر دبک کر خاموش بیٹھ گیا۔

"وکٹر تم تو جادوگر ہو بھئی!" سارہ نے مذاق میں کہا پھر دونوں مسکراتے ہوئے اندر چلے گئے۔ بینڈ کے تمام باقی ممبرز نے وکٹر سے ملاقات کی اور اس سے بہت متاثر ہوئے۔ وکٹر کو راک میوزک کی کافی نالج تھی۔ پھر سب نے وکٹر سے ضد کی کہ وہ ان کی میوزک میں مدد کرے۔ اور پھر وکٹر مان گیا اور بولا! "سارہ کے لئے تو میں کسی بھی طرح کی ہیلپ کے لئے تیار ہوں۔" سب سے پہلے وکٹر نے ان کے بینڈ کا نام "نائٹ واکرز" رکھا۔

کیون بولا! ''یار سب ہمیں ''ویمپائرز'' سمجھیں گے۔'' تو کیون کی بات سن کر سب زور سے ہنسنے لگے۔

''ویمپائرز'' لفظ پر وکٹر کی آنکھوں میں ایک خاص چمک آئی تھی جو کسی نے محسوس نہیں کی۔ چند دنوں بعد وکٹر نے ''نائٹ واکرز'' کے لئے ایک نہایت شاندار سانگ کمپوز کیا۔ وہ سانگ ریلیز کیا ہوا! ''نائٹ واکرز کی دھوم پورے امریکہ میں مچ گئی۔ ہر لڑکے لڑکی کی زبان پر انہی کا نام تھا۔ لوگ پاگل ہو رہے تھے ان کے پیچھے۔

وکٹر نے سانگ اس شرط پر کمپوز کیا تھا کہ وہ یہ سب صرف سارہ کی دوستی کے لئے کر رہا ہے۔ اور وہ ہمیشہ پس پردہ رہ کر کام کرے گا اور اس کے کام کا تمام کریڈٹ آفیشلی طور پر سارہ کو ملے گا۔

اس طرح بینڈ میں جو کام وکٹر کرتا۔ وہ سارہ کے نام سے سامنے آتا۔ سارہ شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگی۔ سارہ نے وکٹر کو منع بھی کیا مگر وکٹر نے دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ ''اگر اس کی شرط منظور نہیں تو وہ چلا جائے گا۔'' مجبوراً سارہ کو اس کی بات ماننا پڑی۔

ایک رات جینیفر سارہ کے گھر سے واپس جا رہی تھی کہ آدھے راستے میں پہنچ کر اس کی گاڑی بند ہوگئی۔ ''شٹ!'' اس نے جھنجلا کر کار کو زور سے ٹھوکر ماری اور کار سے ٹیک لگا کر ہونٹوں میں سگریٹ دبا کر اسے سلگانے لگی۔ رات کافی ہوگئی تھی اور ٹھنڈ بھی ہو رہی تھی، جب کافی دیر تک کوئی نہیں آیا تو وہ مڑی ''شوں'' کی زوردار آواز جینیفر کو اپنی پیٹھ پر سنائی دی۔ جینیفر مڑی مگر وہاں کوئی نہیں تھا۔ اتنے میں سائیڈ سے پھر ''شوں'' کی آواز آئی اس نے سائیڈ میں دیکھا مگر وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ اسے خوف آنے لگا، اس نے جلدی سے گاڑی کا دروازہ کھولا اور آ کر اندر بیٹھ گئی اور دروازہ لاک کرلیا۔ اس نے نظر اوپر کی تو شیشے میں اسے پیچھے کی سیٹ پر وکٹر نظر آیا۔ جینیفر نے گھوم کر دیکھا مگر سیٹ خالی تھی۔ وہ واپس سیدھی ہوئی تو دھک سے رہ گئی کیونکہ وکٹر اس کی برابر کی فرنٹ سیٹ پر بیٹھا تھا۔ جینیفر کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

وکٹر نے اپنا منہ کھولا تو اس کے نوکیلے دانت لمبے ہونے لگے۔ اس سے پہلے کہ جینیفر کچھ کرتی وکٹر آگے بڑھ کر اس کی گردن پر جھک گیا۔ جینیفر نے وکٹر کو دھکیلنا چاہا مگر اس کی ایک نہ چلی۔ جینیفر کو اپنی گردن میں سوئی چبھتی ہوئی محسوس ہوئی پھر اس کی کوشش ڈھیلی پڑتی گئی اور آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہوگئیں۔

نائٹ واکرز نے اس دوران اپنا دوسرا البم ریلیز کیا۔ اس نے بھی دھوم مچادی۔ نائٹ واکرز کے فینز کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی، ہر کنسرٹ میں لوگ نائٹ واکرز کی پرفارمنس کا ویٹ کرتے تھے۔ ایک روز کنسرٹ ختم ہونے کے بعد وکٹر نے کیون سے کہا کہ ''اسے ایک جگہ چلنا ہے۔'' کیون فوراً تیار ہوگیا۔ وکٹر کیون کو لے کر ایک سنسان علاقے میں آگیا جہاں ایک جگہ پیلی سی لائٹ جل رہی تھی۔ وہ لوگ گاڑی سے اتر کر اندر چلے گئے وہ کوئی بار تھا جہاں سرخ روشنی تھی اور ہر طرف دھواں ہی دھواں بھرا ہوا تھا۔ کیون نے یہ جگہ پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی کافی لوگ چونک کر کیون کی طرف بڑھے مگر وکٹر کو دیکھ کر پیچھے ہو جاتے۔ کیون کو یہ جگہ اور لوگ عجیب لگ رہے تھے اس نے وکٹر سے پوچھا۔

''ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟''

''ایک منٹ'' کہہ کر وکٹر نے اسے بیٹھایا اور چلا گیا۔ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں دو گلاس تھے۔ اس نے ایک گلاس کاؤنٹر پر رکھ دیا اور دوسرا کیون کے ہاتھ میں تھما دیا۔ گلاس میں سرخ رنگ کا کوئی مشروب تھا۔ کیون نے جیسے ہی اس کا ایک سپ لیا تو اسے زوردار ابکائی آگئی۔ اس کے منہ میں خون کا ذائقہ واضح تھا۔ اس نے مشروب تھوکنا چاہا ہی تھا کہ وکٹر نے اسے روک دیا۔ ''نو...... نو!! مائی فرینڈ، یہ خاص ڈرنک تو راک اسٹارز کی پہچان ہے اور تم اس کی ناقدری کر رہے ہو؟''

''مگر اس کا ذائقہ تو بالکل......''

''بلڈ جیسا ہے ناں؟'' وکٹر نے کیون کی بات کاٹ کر کہا۔

''ہاں بالکل!'' کیون بولا......

''مگر دوست یہ بلڈ ہے نہیں تم مرد بنو اور پی جاؤ اسے۔'' کیون نے ناچاہتے ہوئے بھی وکٹر کے کہنے پر گلاس خالی تو کرلیا مگر اس کو شدید قسم کی متلی ہونے لگی وہ دوڑتا ہوا ایک سائیڈ میں بنے واش روم کی طرف گیا اور وہاں جا کر الٹیاں کرنے لگا۔ اس کو لگ رہا تھا کہ اس کا معدہ حلق میں آگیا ہو۔ اس نے واش بیسن کا نل کھول کر منہ پر پانی کے چھینٹے مارے اور کچھ دیر وہیں کھڑا رہنے کے بعد واپس آنے لگا۔

سامنے سے ایک لڑکی بھی آرہی تھی اس نے بلیک ٹاپ اور بلیو جینز پہنی ہوئی تھی، ہاتھ میں رسٹ بینڈ اور ناک میں بالی اور انتہائی ڈارک میک اپ کیا ہوا تھا۔ وہ دبلی پتلی لڑکی راک اسٹارز سے متاثر نظر آرہی تھی اس کا حلیہ تو کم از کم یہی کہہ رہا تھا۔ اور پھر لڑکی نے آ کر کیون کا راستہ روک لیا کیون نے دائیں طرف ہو کر اسے راستہ دینا چاہا تو وہ بھی دائیں طرف ہوگئی۔ کیون نے پھر بائیں طرف ہو کر اسے راستہ دیا تو وہ بھی بائیں طرف ہوگئی۔ وہ یہ جان بوجھ کر کر رہی تھی۔ کیون نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ لڑکی مسکرانے لگی اور پھر ایک جھٹکے سے اس نے کیون کے بال مٹھی میں جکڑ لئے۔ اس کا منہ کھلا اور اس نے اپنے نوکیلے دانت کیون کی گردن میں پیوست کردیئے۔ کیون نے اپنے آپ کو چھڑانے کے لئے پوری طاقت لگالی مگر اس نازک سی لڑکی کو ایک انچ بھی نہ ہلا سکا اور کیون بے ہوش ہوگیا لڑکی بے تابی سے اس کی گردن سے چمٹی ہوئی تھی۔ وکٹر نے آ کر لڑکی کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ لڑکی منہ پر لگا خون چاٹتی وہاں سے چلی گئی۔ وکٹر نے آگے بڑھ کر کیون کے زخم پر منہ رکھ دیا۔

کئی روز سے پریکٹس سیشن میں جینیفر اور کیون نہیں آرہے تھے۔ ریچل نے سارہ کے گھر سے نکلتے ہوئے کہا۔ ''کیون کا گھر راستے میں پڑتا ہے وہ اس سے ملاقات کرتی ہوئی جائے گی۔''

کیون ڈائننگ ٹیبل پر کھانا کھا رہا تھا۔ ریچل آئی تو کیون اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ''ٹھیک وقت پر آئی ہو ریچل، اسٹک بہت مزیدار ہے۔'' اس کی آفر پر ریچل نے کرسی کھینچی اور پلیٹ اپنے آگے رکھتے ہوئے بولی۔ ''کہاں تھے اتنے دن سے؟''

''بس میں تھوڑا ڈاؤن فیل کر رہا تھا۔'' کیون نے اسٹک منہ میں رکھتے ہوئے کہا۔ ریچل نے اسٹک پر کانٹا رکھا اور چھری اٹھائی اور بے دھیانی میں کیون کی طرف دیکھنے لگی۔ ''سی! آہ!'' کی آواز بے اختیار اس کے منہ سے نکل گئی۔ چھری کے لگنے سے اس کی انگلی سے خون نکل آیا تھا۔ کیون کی نظر خون پر پڑتے ہی اس کے نتھنے پھولنے پچکنے لگے، ساتھ ہی آنکھیں سرخ ہو کر جلنے لگیں۔ اس نے جھپٹ کر ریچل کی انگلی منہ میں لے لی اور بے تابی سے اسے چوسنے لگا۔ پہلے تو ریچل کو یہ نارمل لگا مگر بہت دیر گزرنے پر اس نے اپنا ہاتھ کھینچا مگر کیون نے اس کی انگلی نہیں چھوڑی۔ ''کیون، کیون!'' اس نے دوسری آواز چیخ کر دی اور ساتھ کیون کو جھنجھوڑ ڈالا۔

''اوہ آئی ایم سوری! وہ، وہ میں دراصل خون دیکھ کر بدحواس ہوگیا تھا۔'' پھر دونوں بینڈ کی باتیں کرنے میں لگ گئے۔

جینیفر نے جب ہوسٹم میں قدم رکھا تو وہاں سوائے برائن کے کوئی بھی نہیں تھا۔ باقی لوگ ابھی پہنچے نہیں تھے اور سارہ فون پر بات کر رہی تھی...... جینیفر کو مذاق سوجھا اور اس نے برائن کو پیچھے سے ڈرانے کا ارادہ کیا۔ برائن جھکا ہوا اپنے گٹار کی اسٹرنگ درست کر رہا تھا۔ جینیفر نے بڑی مشکل سے اپنی ہنسی روکی اور دبے قدموں برائن کی پشت پر آ کر کھڑی ہوگئی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے ڈراتی، اس کی نظر برائن کی گردن کی پھولی ہوئی رگ پر پڑی تو اس کی آنکھیں سلگنے لگیں۔ اس کے کانوں میں خون کی گردش کی آواز دوڑنے لگی۔ اس کا

منہ کھلا اور نوکیلے دانت باہر آگئے وہ بے اختیار برائن کی گردن پر جھک گئی اور اپنے دانت اس کی گردن میں گاڑ کر اس کا خون چوسنے لگی۔ برائن اس کے لئے بالکل تیار نہیں تھا اور پیچھے لڑھک گیا مگر جینیفر نے اس کی گردن کو نہیں چھوڑا۔ وہ برائن پر اوندھی گری ہوئی تھی اور برائن اس کے پیچھے بے ربط ہاتھ چلا رہا تھا۔ پھر اس پر غنودگی طاری ہوگئی۔

اچانک کسی نے جینیفر کے شانے پر ہاتھ رکھا تو اس نے غراتے ہوئے پیچھے دیکھا اس کے ہونٹ خون سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ وکٹر کا ہاتھ تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے انگلی کو ناں کے اشارے میں ہلایا اور برائن کی گردن کو صاف کردیا۔ جینیفر نے جلدی جلدی اپنا منہ صاف کیا اور برائن کو ہوش میں لانے لگی۔

ریچل نے ڈنر ختم کرکے اپنی پلیٹ کچن میں رکھی اور گیلری میں آکر کھڑی ہوگئی باہر بہت اچھی ہوا چل رہی تھی۔ کیوں نا تھوڑی سی واک کرلی جائے یہ سوچ کر اس نے جاگرز پہنے اور گھر سے نکل آئی۔ وہ اکثر ڈنر کے بعد نکل آتی تھی۔ اس کے بلاک کے اور لوگ بھی ایسا کرتے تھے۔ مگر آج وہ اکیلی تھی۔ پھر کافی دیر ٹہلنے کے بعد وہ تھک کر واپس آنے لگی۔ یکدم اس کے بائیں طرف سے کوئی کالی چیز اڑتی ہوئی گزری اس نے اس طرف دیکھا مگر وہاں صرف درخت ہی درخت تھے۔ وہ آگے بڑھنے لگی۔ پھر دائیں طرف کوئی چیز زور سے گزری، اتنی زور سے کہ اس کے پورے بال اڑ کر اس کے منہ پر آگئے۔ وہ خوفزدہ ہوکر بھاگنے لگی اور اپنے گھر میں داخل ہوکر دروازے سے ٹیک لگا کر گہرے گہرے سانس لینے لگی۔ پھر جب وہ بہتر ہوئی تو اپنے کمرے میں آکر بستر پر لیٹ گئی۔ خوف اب بھی اس کے اندر موجود تھا۔ اچانک اس کو چادر کے نیچے اپنے جسم پر کچھ رینگتا ہوا محسوس ہوا، اس نے ایک جھٹکے سے چادر ہٹا دی مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا، پھر وہ بستر میں دبک گئی اور کس کر آنکھیں میچ لیں۔

وکٹر کھڑکی سے اندر داخل ہوا اور ریچل کے بستر پر آکر بیٹھ گیا۔ ریچل نے اس کے بوجھ سے بستر دبنے کو محسوس کیا اور آنکھیں کھول دیں مگر وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔ اس نے جیسے ہی اپنے برابر میں دیکھا، وکٹر اس کے بستر پر موجود تھا، اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی وکٹر نے اس کو دھکا دے کر بستر پر لٹا دیا اور اس کی گردن پر جھک گیا، ریچل نے بوکھلا کر اسے دھکیلنا چاہا مگر اسے اپنی گردن میں سوئیاں اترتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر وہ لاکھ کوشش کے باوجود بھی اپنی گردن سے چمٹے ہوئے وکٹر کو نہ ہٹا سکی جو بے تابی سے اس کا خون چوس رہا تھا۔ پھر وہ ریچل کو بے ہوش چھوڑ کر کھڑکی سے چھلانگ لگا کر غائب ہوگیا۔

پولیس کو بھی اس علاقے سے ایسی لاشیں ملی تھیں جن کے جسم سے خون غائب تھا اور گردن پر دو سوراخ موجود تھے۔ مگر پولیس کوئی بھی سراغ لگانے میں ناکام رہی۔

سارہ نے اپنی کچھ چیزیں لیں اور گھر کی طرف مڑ گئی۔ ابھی وہ جا رہی تھی کہ اسے ایک غریب عورت نظر آئی جو چھوٹی موٹی چیزیں بیچ رہی تھی۔ سارہ کو اس پر ترس آگیا اور اس نے اس سے ایک لاکٹ خرید لیا جس پر بڑی سی صلیب بنی ہوئی تھی۔ گھر آکر اس نے لاکٹ دراز میں ڈال دیا۔

ڈور بیل بجی تو سارہ کچن میں سینڈوچز بنا رہی تھی۔ اس نے باہر جاکر گیٹ کھولا تو سب فرینڈز آگئے تھے، اس نے انہیں انڈر گراؤنڈ جانے کا کہا اور خود سینڈوچز تیار کرنے لگی، اسے خبر بھی نہیں ہوئی کہ کب برائن اس کے پیچھے آکر کھڑا ہوگیا تھا۔ برائن کی نظر سارہ کی گردن پر موجود پھولی ہوئی رگ پر تھی۔

اس سے پہلے کہ وہ سارہ پر جھپٹتا! کسی کے تیز دھار آلے جیسے ناخن اس کی گردن میں گھسنے لگے۔ برائن نے بڑی مشکل سے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں وکٹر کھڑا تھا، جس کی آنکھیں شعلہ اگل رہی تھیں۔ اس نے ایک جھٹکے سے برائن کو پیچھے کھینچ لیا۔ سارہ کو لگا اس کے پیچھے کوئی چیز اڑی ہے اس نے دیکھا تو وہاں کچھ بھی نہیں

تھا۔ وکٹر نے برائن کو زمین پر پھینک دیا اور دھاڑ کر بولا! ”اگر سارہ کو کوئی نقصان پہنچا تو وہ حشر نشر کردے گا!“

”مگر کیوں وکٹر؟“ برائن کے پیچھے موجود جینیفر نے سوال کیا۔

”یہ فرق کیوں؟“ ریچل بھی بولی۔

”وہ سارہ!“ وکٹر اتنا کہہ کر رک گیا۔

”سارہ کیا وکٹر؟“ کیون نے پوچھا۔

”سارہ میری دوست ہے!“ وکٹر نے بوجھل انداز سے کہا۔

”دوست؟ لاہور!! یہاں کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا اور اگر ہوتا بھی ہے تو ہم جیسا بننے کے بعد۔“ برائن نے اٹھ کر روکھائی سے کہا۔

”جو بھی ہو، میرے ہوتے ہوئے سارہ کے ساتھ کچھ نہیں ہوسکتا۔“ وکٹر نے دوٹوک انداز سے کہا تو سب خاموش ہوگئے کیونکہ وکٹر ان کا سربراہ تھا اور کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کی بات کی نفی کرسکے۔ اور پھر ایک ایک کرکے وہ لوگ وہاں سے چلے گئے۔ صرف وکٹر رہ گیا۔ سارہ آئی تو وکٹر نے بہانہ کرکے اس کو کہہ دیا کہ ”انہیں کسی کام سے بھیجا ہے۔“

وکٹر نے ویمپائر ہوتے ہوئے بھی سارہ کو کچھ نہیں کیا۔ کیوں؟ اس کا جواب خود وکٹر کے پاس بھی نہیں تھا۔ اپنے آپ کو سارہ کے خون سے دور رکھنا وکٹر کے لئے بہت مشکل تھا جو کہ اس نے سارہ کی دوستی میں کر رکھا تھا۔

”سارہ! مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔“ وکٹر نے سارہ کو مخاطب کیا۔

”ہاں۔ بولو وکٹر۔“

سارہ نے سینڈوچ ختم کرتے ہوئے کافی کا سپ لیا اور بولی۔

”سارہ مجھے کچھ بتانا ہے تمہیں، مگر مجھے ڈر ہے کہ تم وہ جان کر مجھ سے دوستی ختم نہ کرلو!“ وکٹر نے سنجیدگی سے کہا۔

”ایسا کیا ہے وکٹر؟“ سارہ نے چونکتے ہوئے کہا۔

”سارہ! میں انسان نہیں ویمپائر ہوں۔“ وکٹر نے سارہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

سارہ چند لمحے اسے خاموشی سے تکتی رہی پھر قہقہہ مارنے لگی اور بولی! ”آج کوئی ہے نہیں تو میں ہی ملی ہوں تمہیں بے وقوف بنانے کے لئے، مانا تم بینڈ کا نام ”نائٹ واکرز“ رکھا ہے تو اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم ”ویمپائر“ ہو۔

”سارہ پلیز! آئی ایم سیریس۔“ وکٹر نے سخت لہجے میں کہا اس کو سارہ کا یوں مذاق کرنا پسند نہیں آیا۔ سارہ چپ تو ہوگئی مگر وہ اب بھی ہلکے ہلکے ہنس رہی تھی۔ ”اچھا تو تم ویمپائر ہو؟ ثبوت دو۔“ اس نے وکٹر کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا......

وکٹر سارہ کے اور قریب آیا اور بولا! ”یاد کرو میں تم سے ہمیشہ رات میں ملتا ہوں، کبھی غور کیا کیوں؟“

”یہ تو کوئی ثبوت نہیں ہے۔“ سارہ بے پروائی سے ہنستے ہوئے بولی۔

”ٹھیک ہے!“ وکٹر نے سانس بھر کر بولا اور اپنی آنکھیں بند کیں اور چند لمحوں بعد کھولیں تو وہ خون بھری سرخ آنکھیں تھیں، اس کے ناخن لمبے ہونے لگے اور اس کے دہانے سے اس کے سائیڈ کے نوکیلے دانت باہر آنے لگے۔“

سارہ کی ہنسی کو یکدم بریک لگ گئے اور پیچھے ہٹنے لگی۔ وکٹر نے منہ جھکا کر اوپر اٹھایا تو وہ واپس اپنی نارمل حالت میں تھا۔

”سارہ جب سے ہماری پہلی ملاقات ہوئی ہے۔ میں نے تمہیں ہمیشہ سچا دوست جانا ہے۔“ یہ کہہ کر وکٹر سارہ کے پاس آنے لگا۔

”دور ہٹ جاؤ! خبردار جو میرے قریب آنے کی کوشش کی۔“ سارہ ڈر کر دروازے سے جا لگی۔ سارہ کی نظر اپنے برابر میں موجود دراز پر پڑی اسے یاد آیا کہ اس نے صلیب کا لاکٹ اس میں ڈالا تھا۔

”سارہ پلیز! مجھ سے ڈرو مت میں تمہارا

دوست ہوں۔" وکٹر نے بے بسی سے کہا۔

"تم جاتے ہو یا......" کہہ کر سارہ نے صلیب نکال کر وکٹر کی آنکھوں کے سامنے کردی۔ وکٹر نے جلدی سے اپنا ہاتھ آنکھوں کے آگے کیا اور لمحہ بھر میں غائب ہوگیا۔ سارہ کا دماغ سن ہوگیا تھا اور وہ وہیں گرکر بے ہوش ہوگئی۔

اگلے روز اس کے فرینڈز آئے تو ان کا انداز سارہ کو عجیب سا لگا۔ روکھا روکھا سا...... سارہ نے بات کرنے میں پہل کی اور بولی! "دوستو! اب وکٹر کا ہمارے بینڈ سے کوئی تعلق نہیں ہے، پوچھو گے نہیں کیوں؟ میں بتاتی ہوں کیونکہ......"

"وہ "ویمپائر" ہے۔" کیون نے بے رخی سے کہا۔ تو سارہ کو حیرت کا ایک زوردار جھٹکا لگا۔ "تم! جانتے ہو؟"

"ہاں!" جینیفر نے کہا۔

"مگر کیسے؟" سارہ حیران تھی کہ انہیں ڈر نہیں لگ رہا؟

"کیونکہ اس نے ہمیں بھی ویمپائر بنادیا ہے۔" ریچل نے بتایا اور پھر ایک ایک کرکے ان سب نے اپنا آپ اس پر ظاہر کردیا۔ سارہ سن ہوکر رہ گئی۔ پھر برائن بولا! "سارہ! ہمارے فرینڈ اور بینڈ لیڈر ہونے کے ناتے تو تمہیں بھی ویمپائر ہونا چاہیے کم اینڈ جوائن اٹ۔"

"دور رہو تم سب مجھ سے۔" یہ کہہ کر سارہ پیچھے ہٹنے لگی مگر اس کے پیچھے دیوار تھی وہ اس سے جا ٹکرائی۔ اس کے پاس بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں تھا پھر کیون اور جینیفر نے سارہ کو دونوں طرف سے پکڑ لیا۔ برائن آگے چلتا ہوا آیا اور سارہ کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔

"پلیز لیوی!" سارہ نے التجا کی مگر برائن تو کچھ اور ہی ہوگیا تھا اس نے اپنے نوکیلے ناخنوں سے سارہ کے بال ہٹائے تو اس کی سفید گردن نظر آنے لگی۔ برائن سارہ کی گردن پر جھک گیا اور سارہ کو سوئی اپنی گردن میں اترتی محسوس ہوئی۔ "آہ!" اس کے منہ سے آواز نکل گئی۔ پھر برائن ایک جھٹکے سے پیچھے ہوا اور ہوا میں اڑتا ہوا دور جا گرا۔

سارہ کو اب سامنے وکٹر نظر آرہا تھا۔ برائن پلٹ کر غرایا۔ "وکٹر! وس از ناٹ فیئر۔" ہم سب پہلے بھی خاموش ہوگئے تھے، مگر اب نہیں۔"

"کس میں ہمت ہے، وکٹر کے فیصلے کو چیلنج کرنے کی" وکٹر نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے سب کی جانب دیکھا۔ پھر اگلے لمحے اس کی شکل بدل گئی وہ بہت خونخوار ہورہا تھا۔ وہ اڑتا ہوا برائن کے سر پر پہنچ گیا اور اپنے دانتوں سے اس کی گردن ادھیڑ دی، پھر برائن کو پھینک کر وہ کیون کی طرف پلٹا اور اپنے لمبے لمبے ناخن کیون کے سینے میں گھسیڑ کر اسے چیر دیا اور اس کا دل مٹھی میں لے کر بھینچ دیا۔ پھر وکٹر نے اپنا رخ ریچل کی طرف کیا۔ ریچل خوفزدہ ہوکر بھاگنے لگی مگر وکٹر نے اسے موقع ہی نہیں دیا اس نے ریچل کو ایک ہاتھ سے گردن سے پکڑ کر ہوا میں اٹھالیا۔ ریچل اپنی ٹانگیں چلا کر اپنا بچاؤ کرنے کی کوشش کررہی تھی مگر وکٹر کے ناخن اس کے نرخرے میں گھستے چلے گئے۔

ادھر سارہ نے اپنے حواسوں پر قابو پالیا تھا وہ دوڑ کر گئی اور صلیب اپنی مٹھی میں دبا کر ایک کونے میں چھپ گئی۔ وکٹر نے جینیفر کو پکڑنا چاہا مگر وہ بھاگنے لگی اور قالین میں الجھ کر نیچے گر گئی۔ وکٹر جینیفر کے اوپر سوار ہوگیا اور گردن سے لے کر پیٹ تک اسے بھنبھوڑ ڈالا، اب جینیفر کا جسم گوشت کے لوتھڑے لگ رہا تھا...... جینیفر کا کام تمام کرنے کے بعد وکٹر ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا، وہ کوئی خونخوار درندہ معلوم ہورہا تھا جو خون میں لتھڑا ہوا تھا۔ پھر اس کی نظر کونے میں دبکی ہوئی سارہ پر پڑی اور اسے دیکھتے ہی چند لمحوں میں وکٹر اپنی نارمل حالت میں آگیا۔ پھر وہ اس کی طرف بڑھنے لگا، جوں جوں وکٹر قریب آرہا تھا۔ سارہ لرزتی جارہی تھی۔ وکٹر بالکل سارہ کے قریب آگیا...... سارہ کی نظر گھڑی پر پڑی سورج نکل چکا تھا مگر کھڑکی پر پڑے پردوں کی وجہ سے کمرے میں اندھیرا تھا۔

"سارہ! میرے ہوتے ہوئے کوئی تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا، میں تم سے......"

"آئی ایم سوری وکٹر!" سارہ نے وکٹر سے اتنا کہا اور پھر پوری طاقت سے اپنی مٹھی میں دبی ہوئی صلیب وکٹر کے دل کے مقام پر گھونپ دی! اور دوڑ کر کھڑکی کا پردہ ایک جھٹکے سے ہٹادیا۔ سورج کی روشنی سے پورا کمرہ نہا گیا اور "وکٹر چیخیں مار کر جلنے لگا، اس کی آنکھوں میں درد تھا اس دوست کے ایسا کرنے سے، جس کے لئے اس نے اپنے اصولوں اور خون کی طلب دونوں کو بھلادیا تھا۔"

"مجھے معاف کردینا وکٹر!" سارہ نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا پھر وکٹر جلتے جلتے راکھ بن کر بکھرنے لگا اور چند لمحوں بعد وہاں کچھ نہیں تھا۔ سورج کی روشنی پڑنے سے سارہ کے بینڈ ممبرز بھی جل کر راکھ بن گئے تھے۔ سارہ زمین پر بیٹھ کر دھاڑیں مار مار کر رو رہی تھی اس کی آنکھوں میں اس کے دوستوں کے چہرے ایک ایک کرکے گھوم رہے تھے اور وکٹر! سارہ کے لئے وکٹر نے کیا کچھ نہیں کیا؟ یہاں تک کہ ویمپائر ہونے کے باوجود اس نے سارہ کی حفاظت کی۔ "کاش! تم مجھ سے نہ ملے ہوتے وکٹر!" سارہ نے روتے ہوئے کہا۔ وہ رات سارہ کی زندگی کی بھیانک ترین رات تھی۔

دوسرے دن سارہ نے اپنے کپڑے بیگ میں ڈالے اور نیویارک اپنے مام، ڈیڈ کے پاس جانے کا فیصلہ کرلیا، ابھی تو اسے میڈیا کو اپنے بینڈ ممبرز کے بارے میں جواب بھی دینا تھا کہ "آخر وہ سب کہاں گئے؟" یہ سب سوچ کر اس کا دماغ ماؤف ہورہا تھا کہ وہ لوگوں سے کیا کہے گی؟ یہ جو کچھ بھی ہوا، سارہ کی عقل اس کو تسلیم کرنے سے قاصر تھی۔ اس نے فلائٹ کے بجائے ٹرین کا انتخاب کیا، کیونکہ جتنی مشہور وہ تھی ایئرپورٹ پر لوگوں کا ہجوم لگ جاتا اسے دیکھ کر، اس نے کمپارٹمنٹ میں داخل ہوکر گہری سانس لی اور بیٹھ گئی۔

اچانک اس کے کانوں میں عجیب سی آواز آنے لگی اور اس کے کان غیر معمولی حد تک کھڑے ہوگئے۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی پائپ سے پانی پورے پریشر سے گزر رہا ہو، اس نے اپنے کانوں پر دونوں ہاتھ رکھ لئے۔ مگر آواز بند نہیں ہوئی۔ پھر کمپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا اور ایک نوجوان کمر پر گٹار لٹکائے آکر بیٹھ گیا۔ سارہ کے کانوں میں گونجنے والی آواز اور تیز ہوگئی، اس کی کنپٹیاں سلگنے لگیں، اس کے نتھنے تیزی سے پھول پچک رہے تھے، اور وہ گہرے گہرے سانس لے رہی تھی، ساتھ ہی اس کی آنکھیں بھی دہک رہی تھیں، تازہ خون کی خوشبو، اس کی ناک سے ہوتی ہوئی اس کے جسم کے روئیں روئیں میں سمارہی تھی، اس کی سمجھ میں آرہا تھا کہ وہ آواز لڑکے کی رگوں میں گردش کرتے خون کے دوڑنے کی تھی، جو اس نے دور سے سن لی تھی۔ اس کے اندر خون کی پیاس سر اٹھانے لگی اور بے تابی سے وہ بار بار اپنے ہونٹوں پر زبان پھیرنے لگی۔

ٹرین چلنے لگی تو لڑکے نے اپنا گٹار اتار کر اسے بجانا شروع کردیا۔ گٹار کی آواز پر سارہ کا ذہن تھوڑا ہٹ گیا۔ لڑکے کی آنکھیں بند تھیں اور مدھم آواز میں گٹار بجائے جارہا تھا، جب وہ رکا تو سارہ نے تالیاں بجاتے ہوئے کہا۔ "ویل پلیڈ!"

"تھینکس! بائے دی وے مائی نیم از مائیکل!" لڑکے نے خوش اخلاقی سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

"آئی ایم سارہ" اس نے ہاتھ ملاتے ہوئے مسکرا کر کہا۔

"اوہ نو، آئی ڈونٹ بلیو اٹ! آپ! آپ "نائٹ واکرز" والی سارہ ہیں ناں؟ لڑکے نے خوشی سے اچھلتے ہوئے کہا اور اسی لمحے اس کا گٹار نیچے گر گیا، لڑکا گٹار اٹھانے کے لئے جھکا ہی تھا کہ سارہ نے اسے دبوچ لیا اور جھپٹ کر اپنے نوکیلے دانت لڑکے کی گردن میں گاڑ دیئے......

موت کا سفر

ذوالقرنین خان۔کوئٹہ

گوشار نے آگ کا گولا اپنے سامنے نوجوان کی طرف پھینکا مگر گولے نے اپنا رخ تبدیل کرکے گوشار کی طرف پلٹ گیا اور چشم زدن میں گوشار اس کی لپیٹ میں آکر تڑپنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے جل کر راکھ بن گیا۔

نادیدہ قوت کے نرغے میں پھنسے ہوئے نوجوانوں کی ایک لرزہ براندام کرتی خوفناک کہانی

شہر لاہور کا باسی ساجد قریشی جس کا زندگی میں صرف ایک ہی مقصد تھا۔ اونچے اونچے پربتوں کو اپنے پاؤں تلے روند دینا۔ بلند و بالا پہاڑوں پر چڑھ کر جب وہ نعرۂ مستانہ بلند کرتا......

''میں ہوں سب سے بلند'' تو اس کے چاروں طرف اس کی آواز کی بازگشت ہوتی تھی۔ فلک بوس پہاڑوں کو سر کرنے کے بعد وہ چوٹی پر کھڑا ہو کر اپنے ہاتھ پھیلا کر ان ٹھنڈی ہواؤں کو اپنے سینے میں بھرتا چلا جاتا جو شہروں میں رہنے والے روزمرہ کے کاموں میں پھنسے لوگوں کے نصیب میں نہیں۔ اس کے اندر ایک ایسی روح تھی۔ جو اسے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ دو تین ہفتوں سے زیادہ وہ گھر میں نہیں ٹک سکتا تھا۔ گھر میں رہنے کی اس کے پاس کوئی خاص وجہ بھی نہیں تھی کیونکہ وہ اس بھری پڑی دنیا میں اکیلا تھا۔ ماں بچپن میں فوت ہوگئی تھی۔ باپ بھی کچھ عرصہ پہلے راہی ملک عدم ہوگیا۔ اچھے وقتوں میں اس کے والد کئی دکانیں، بنانے میں کامیاب ہوگئے جن کے کرایوں پر ساجد بہت اچھے طریقے سے گزر بسر کر رہا تھا۔

دیوسائی کے بلند و بالا میدان سے ساجد کچھ دن پہلے ہی لوٹا تھا۔ چار ماہ کے تھکا دینے والے سفر کے بعد اس نے سوچا۔ ''ایک دو ہفتے آرام کرلیا جائے۔''

دن کے گیارہ بج رہے تھے وہ ابھی تک سویا ہوا تھا۔ اس کی سماعتوں سے ایک ناگوار آواز ٹکرائی۔ اس کا فون بج رہا تھا۔ پہلے تو اس نے نظر انداز کردیا مگر فون کرنے والا مسلسل نمبر ڈائل کر رہا تھا۔ وہ کسلمندی سے اٹھا، جا کر ریسور اٹھایا اور بہت بیزاری سے ''ہیلو'' کہا۔

دوسری طرف سے اسے بلند قہقہہ سنائی دیا۔ قہقہہ سنتے ہی بیزاری کی دبیز چادر اس پر سے فوراً ہٹ گئی۔ اور چہرے پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ دوسری طرف یعقوب تھا۔ اس کا لنگوٹیا یار۔ پوری دنیا میں اگر وہ کسی کو اپنا کہہ سکتا تھا تو وہ یعقوب تھا۔

''اوئے مردار سنا ہے تو کوہ مردار سے ہو کر آیا ہے۔'' یعقوب نے اپنے مخصوص لہجے میں کہا۔ ''کب سے تجھے ڈھونڈ رہا ہوں۔ ایک مہینہ اور واپس نہ آتا تو میں تیرا غائبانہ نماز جنازہ پڑھا کر قل بھی کروا چکا ہوتا۔''

''اتنی آسانی سے نہیں مروں گا خبیث، اور اگر کبھی ایسا کوئی پروگرام ہوا تو دونوں ساتھ جائیں گے۔ میرے بغیر تو کیا کرے گا اس دنیا میں۔'' ساجد نے اطمینان سے جواب دیا۔

''فٹے منہ! تیرے منہ میں مٹی کیچڑ! میں کیوں

جاؤں گا تیرے ساتھ۔ میری اگلے ماہ شادی ہے اور اپنی شریک حیات کے ساتھ میں کوئی نصف صدی گزارنے کا خواہش مند ہوں۔'' یعقوب نے پرمسرت لہجے میں کہا۔

''تو تیرے جیسے بیل کے لئے بھی کھونٹا میسر آ ہی گیا۔ ویسے وہ کون بدنصیب ہیں جنہوں نے اپنی بیٹی تجھ جیسے گھامڑ شخص کے حوالے کرنے کا رسک مول لیا ہے۔'' ساجد نے شرارت سے کہا۔

بیل یعقوب کی چڑ تھی اور لفظ گھامڑ سن کر یعقوب کے ذہن میں ان تمام کاموں کی پٹی چلنے لگی ہوگی جو اس نے ساجد کی ہمراہی میں سرانجام دیئے تھے۔

''بکواس بند کر۔'' یعقوب نے اپنا مخصوص جملہ بولا۔ ''دوستوں نے میری شادی میں آنا ہے بلکہ تو ایسا کر آج ہی رخت سفر باندھ لے۔''

''ویسے بھی آوارہ گرد بادلوں کی طرح میں ہوں، ٹھہرتا نہیں اس لئے میرا بستر تیار ہی رہتا ہے۔''

''آج تو نہیں ایک دو دن میں کوشش کرتا ہوں۔'' ساجد نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''بس پرسوں تک میرے پاس پہنچ جا۔ ورنہ تو جانتا ہے مجھے۔'' یعقوب نے دھمکی دیتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے ٹھیک ہے پہنچ جاؤں گا۔'' ساجد نے جلدی سے کہا، کیونکہ وہ ہمیشہ اس کی دھمکیوں سے مرعوب ہو جاتا تھا۔

یعقوب ایبٹ آباد میں رہائش پذیر تھا۔ ساجد نے لاہور سے ایبٹ آباد تک کا سفر بس میں طے کیا تھا۔ یعقوب اور اس کے گھر والے ساجد سے مل کر بہت خوش ہوئے۔ کافی دیر وہ سب مل کر پرانی باتیں کرتے رہے آخر کو بیس سال وہ لاہور میں ایک دوسرے کے ہمسائے رہے تھے۔ شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ یعقوب کی خوشی بھی دیدنی تھی۔ شادی کی تاریخ کافی قریب آ چکی تھی۔

ساجد ایک دن جب یعقوب کے گھر سے کچھ فاصلے پر موجود پہاڑی سے واپس آیا تو یعقوب راستے میں کھڑا نظر آیا جیسے وہ اس کا منتظر ہو۔

''قریشی! آج رات اپنے پرانے کپڑے پہننا اور دل کو مضبوط کر کے بیٹھک میں آنا۔'' یعقوب نے سنسنی خیز لہجے میں کہا اور فوراً وہاں سے چل دیا۔ یعقوب جب بھی ساجد کو قریشی کہتا تب ساجد کو بہت بڑا سرپرائز ملتا۔

رات کو محتاط قدموں کے ساتھ ساجد بیٹھک میں داخل ہوا مگر سب کچھ معمول کے مطابق تھا۔ یعقوب کے تمام دوست احباب، کزن حسب معمول بیٹھک میں موجود تھے۔ کبھی گانا گایا جاتا اور کبھی ایک دوسرے سے ہلکی پھلکی نوک جھونک کی جاتی۔ یہ سب دیکھ کر ساجد مطمئن ہو گیا۔ مگر اس کا یہ اطمینان عارضی ثابت ہوا۔

اچانک وہاں موجود جوانوں نے اس پر ہلا بول دیا۔ تھوڑی دیر میں اس کے جسم پر قمیض کی جگہ چیتھڑے رہ گئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد یہی حال دولہا کے تمام دوستوں کا ہوا اور پھر دولہا بھی زد میں آ گیا۔ یہ وہاں کی رسم تھی۔

اس طرح ہنستے مسکراتے شادی اختتام کو پہنچ گئی۔ بہت بحث ومباحثے اور اس یقین دہانی کے بعد کہ ساجد اب ان سے ملتا رہے گا۔ اس کی گلو خلاصی ہوئی اور وہ واپسی کے لئے عازم سفر ہوا۔

واپس تو وہ لاہور ہی جا رہا تھا مگر اپنے طریقے سے۔ آتے ہوئے بھی وہ بہت بور ہوا تھا۔ اب اس کا ارادہ تھا کہ وہ ایبٹ آباد سے سیدھا حویلیاں جائے گا، وہاں سے وہ کوٹلہ جو ایک چھوٹا سا گاؤں تھا وہاں پہنچے گا۔ آگے کا سفر اس نے پیدل کرنا تھا۔ اونچے نیچے پہاڑوں کو پار کر کے کیالہ سے ہوتے ہوئے کوٹلہ پہنچنا تھا اور پھر آگے کی منزل چھانگا گلی تھی وہاں سے وہ مری پہنچ جاتا۔

ساجد جیسے مہم جو شخص کے لئے یہ کوئی مشکل بھی نہیں تھا۔ اس نے دنیا کی مشکل ترین چوٹی K-2 تک پہنچ جانا تھا مگر اپنے ساتھ انگریز کوہ پیما کو بچاتے ہوئے جو ہزاروں فٹ نیچے گہری کھائی میں گرنے والا تھا، ساجد اپنی ٹانگ تڑوا بیٹھا۔ اور اپنے دیرینہ خواب کو تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔

وہ حویلیاں بازار میں اشیاء خورد ونوش اور کچھ

ری سامان لینے کے لئے رکا اور دوبارہ سفر شروع کر دیا للہ کے دشوار گزار پہاڑی راستوں پر پیدل وہ آگے ھتا جا رہا تھا۔ اس کے اندازے کے بالکل برعکس پہاڑ انی اونچے تھے۔ یہ بات اس کے لئے باعث مسرت تھی۔ پہاڑ جتنا بلند ہوتا ساجد کا جذبہ بھی اتنا ہی اونچائی پر پرواز کرتا۔ راستے میں اسے جابجا درختوں کے جھنڈ دکھائی دے رہے تھے۔ اتنے خوبصورت مناظر، اس نے صرف سوات میں ہی دیکھے تھے۔

اسے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ ناران یا کاغان میں چل رہا ہے۔ انہیں مناظر میں گم وہ چلا جا رہا تھا۔

اچانک چوک کے قریب کالے ماسک منہ پر چڑھائے سیاہ لباس میں ملبوس اسلحہ برداروں نے اسے گھیر لیا۔ اس سے پہلے کہ وہ صورتحال کا اندازہ لگا پاتا۔ ان میں سے ایک نے اپنی گن اس کی طرف سیدھی کی اور ٹریگر دبا دیا۔ اسے اپنی گردن میں شدید درد محسوس ہوا۔ وہ تیورا کر گرا، اس کے ہوش حواس اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔

ساجد کی جب آنکھ کھلی تو اپنے آپ کو کشادہ اور آرام دہ پلنگ پر لیٹا ہوا پایا۔ شب خوابی کا مخصوص لباس اس کے جسم پر موجود تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، یہ ایک چھوٹا مگر خوبصورت کمرہ تھا۔ پلنگ کے ایک طرف اس کا سامان پڑا تھا۔ وہ اٹھا اور شیشے کے سامنے جا کھڑا ہوا بغور گردن کا معائنہ کرنے پر بھی، کسی قسم کا کوئی نشان یا زخم اسے نہ مل سکا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہے؟ اس نے کھڑکی سے پردہ ہٹا کر باہر جھانکا مگر باہر صرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ گھڑی پر نگاہ ڈالی تو رات کے تین بج رہے تھے۔ اسے پیاس محسوس ہو رہی تھی وہ اٹھا اور سامنے ٹیبل پر رکھے جگ سے پانی نکال کر جیسے ہی گھونٹ بھرا تو خالی معدے میں وہ ایک گھونٹ بہت گراں گزرا، اسے ہلکا سا درد محسوس ہوا۔ اسے طبیعت پر چھائی پژمردگی کی وجہ بھی سمجھ میں آ گئی۔ اس کا معدہ خالی تھا۔ وہ ایک طرف کونے میں رکھے فریج کی طرف بڑھا، فریج میں سینڈوچ اور پیزا موجود تھا۔ پیٹ بھرنے کے بعد اس نے دوبارہ کمرے کا جائزہ لیا۔

حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس کمرے میں دروازہ موجود نہیں تھا۔

کمرے کی دیواروں کو ٹٹولا مگر اسے کوئی سراغ نہ ملا۔ تھک ہار کر وہ دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا اور خود کو حالات کے رحم وکرم پر چھوڑ دیا۔

دوسری مرتبہ اس کی آنکھ الارم سے کھلی۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا گزشتہ واقعات ایک ایک کر کے اس کے ذہن کے پردے پر نمودار ہونے لگے۔

اچانک اسے کمپیوٹرائزڈ آواز سنائی دی۔ لب ولہجہ انگریزی تھا۔

''ساجد قریشی! آپ براہ مہربانی تیار ہو کر نیچے ہال میں تشریف لے آئیں۔''

ساجد نے دیکھا سامنے دیوار میں دروازہ نمودار ہو چکا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھا اور اس دروازے کی سمت بڑھا۔

مگر اس کے اندازے کے برعکس وہ باہر جانے کے راستے کے بجائے جدید طرز کا باتھ روم تھا۔ حقیقت میں اسے، اس وقت اس کی اشد ضرورت بھی تھی۔ وہ فوراً اندر گھس گیا۔ غسل کرتے ہوئے اس نے یہ عجیب بات محسوس کی کہ صابن اسی برانڈ کا تھا جسے وہ برسوں سے استعمال کر رہا تھا۔ ٹوتھ کریم بھی وہی تھی۔ غسل کر کے وہ ہشاش بشاش ہو گیا۔ باتھ روم سے باہر آ کر اس نے اسی طرح کا ایک اور دروازہ کھلا پایا۔ وہاں جھانکا تو وہاں ایک بہت قیمتی سیاہ تھری پیس سوٹ اور بہت خوبصورت بیش قیمت جوتے، اس کے منتظر تھے۔ وہ جلدی سے تیار ہو کر جب باہر نکلا تو اب ایک اور دروازے کو کھلا دیکھا۔

''یا خدایا! اب یہ کیا ہے؟'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑایا وہ آگے بڑھا مگر اس مرتبہ اسے سامنے ایک رہداری دکھائی دی۔ راہداری کے دونوں اطراف دروازے دکھائی دے رہے تھے نرم کارپٹ پر چلتا ہوا وہ کچھ حیرانی اور کچھ پریشانی سے آگے بڑھ رہا تھا۔ سامنے سیڑھیاں نظر آ رہی تھیں، وہ مضبوط قدموں سے ان سیڑھیوں پر چلتا نیچے پہنچ گیا۔

اب اس کے سامنے کالے شیشے کی دیوار تھی۔ وہ

اس دیوار کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی وہ قریب پہنچا شیشے کی دیوار کا کچھ حصہ بیچ میں سے خودکار طریقے سے ایک طرف سرک گیا۔ وہ اندر داخل ہوگیا۔ ہال میں ایک خوبصورت گول میز موجود تھی، اس کے گرد دس کے قریب کرسیاں رکھی تھیں اور وہاں بلیک سوٹ میں چار لوگ موجود تھے۔ وہ آگے بڑھا اور ان چاروں سے باری باری مصافحہ کرکے ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے یہاں کیوں بلایا گیا ہے اور یہ سب کیا ہے؟" ساجد نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

مگر وہ چاروں ہونقوں کی طرح اس کی طرف دیکھتے رہے۔

ساجد نے غور کیا تو اس پر اپنی بیوقوفی عیاں ہوگئی وہ سب کے سب غیر ملکی لگ رہے تھے۔ اردو، ان کو خاک سمجھ آتی، ابھی وہ اپنا سوال انگریزی میں دہرانے ہی والا تھا کہ اس کی سماعتوں سے ایک آواز ٹکرائی۔

"آپ لوگ اس صورتحال سے حیران ہوں گے، تھوڑا انتظار کیجئے آپ کو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔" یہ بات اردو اور انگریزی میں کہی گئی۔ اس کے علاوہ چینی اور عربی میں بھی یہی کچھ کہا گیا۔ ایک اور زبان بھی استعمال کی گئی مگر ساجد یہ اندازہ نہیں لگا سکا کہ وہ کون سی زبان تھی۔ مگر اب سب پر سکون تھے اور ساجد کو اندازہ ہوگیا تھا۔ وہ سب بھی اسی کی طرح یہاں لائے گئے ہیں۔ انہیں وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ۔

ہال میں ایک سیاہ چوغے میں ملبوس ایک شخص داخل ہوا، چوغے کے ساتھ جڑی ٹوپی نے اس کے چہرے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ قریب آنے پر ساجد کی نظر اس کی مخروطی نرم و نازک انگلیوں پر پڑی۔

"اچھا تو یہ وہ صاحب ہیں۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا وہ آکر صدراتی کرسی پر براجمان ہوگئی۔ ساتھ ہی اس نے ایک جھٹکے سے اپنی ٹوپی اتار دی۔ اس کے خیرہ کن حسن نے وہاں بیٹھے تمام لوگوں کو مبہوت کردیا۔ مگر حسن کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں میں بھیڑیئے کی سی درندگی تھی۔ وہ مسکرائی اور سامنے رکھی بٹن نما شے اپنے کان میں ٹھونس لی۔ اور سب کو اشارہ کیا، سب نے اپنے اپنے کانوں میں وہ بٹن نما چیز لگالی۔

"تو جینٹلمین! اب ہم ایک دوسرے سے گفتگو کرسکتے ہیں۔"

"میں یہ جاننے کے لئے بے چین ہوں، مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟ اور آپ کون ہیں؟"

وہاں بیٹھا ایک شخص پہلو بدل کر بولا۔ تب ساجد کو ان بٹنوں کی افادیت کا معلوم ہوا، وہ ٹرانسلیٹر تھے، ایک زبان کا دوسری زبان میں ترجمہ باآسانی کرلیتے تھے۔

"مسٹر لی شینخوف صرف آپ کو نہیں بلکہ سب کو یہ جاننے کی جلدی ہے، یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ آپ اطمینان رکھیے، آپ کو سب معلوم ہو جائے گا۔" اس حسینہ نے مدھم آواز میں کہا۔ "پہلے تعارف ہو جائے۔"

"یہ ہیں محترم ساجد قریشی، اس دنیا کے بہترین کوہ پیماؤں میں سے ایک، پہاڑوں سے انہیں عشق ہے۔

مہم جوئی ان کا جنون ہے، ان کا نعرہ ہے۔ "میں ہوں سب سے بلند" اور یہ پاکستان سے ہیں۔"

ساجد کو اپنے بارے میں یہ سب کچھ اس حسینہ کے منہ سے سن کر بہت اچھا لگا۔ مگر اپنے نعرے کے بارے میں سن کر وہ بھونچکا رہ گیا۔

"یہ ہیں مسٹر مارٹن، اس حسینہ نے ساجد کے ساتھ بیٹھے ایک پتلے مگر جسمانی لحاظ سے مضبوط شخص کی طرف اشارہ کرکے کہا۔ "یہ دنیا کے بہترین نشانہ باز ہیں، آنکھوں پر پٹی باندھ کر بھی یہ معمولی حرکت پر نشانہ لگا سکتے ہیں، اور سب سے بڑی بات یہ ہر قسم کا ہتھیار چلا سکتے ہیں اور نشانہ لگا سکتے ہیں۔ ان کا تعلق امریکہ سے ہے۔" "یہ شیخ احمد سعود ہیں۔" حسینہ نے اپنے سامنے بیٹھے ایک ہٹے کٹے شخص کی طرف اشارہ کیا۔ "دنیا کے طاقتور انسانوں میں سے ایک۔ ریچھوں سے نہتے ہو کر لڑنا، ان کا شوق ہے۔" وہاں موجود سب لوگوں نے اس خوفناک شخص کو حیرت سے دیکھا۔

ان کا تعلق یمن سے ہے۔

"یہ لی شینخوف ہیں، ان کا تعلق روس سے ہے اور یہ ...ضیات ہیں۔ ان کے پاس، ایک ایسا علم ہے جو ...یا میں اور کسی کے پاس نا ہو۔ یہ ایک ہی وار سے ...ے بڑی چٹان کو توڑ سکتے ہیں۔"

لی شینخوف یہ سن کر جیسے سکتے میں آگیا ہو۔ اس ...اپنا یہ ہنر بہت چھپا کر رکھا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا ...کہ یوں کسی کے علم میں آجائے گا۔

"اور آخر میں جی آن ہو، ان کا تعلق چین سے ہے یہ بہت ماہر نقشہ نویس ہیں۔ یہ جس جگہ کا ایک مرتبہ ...ائنہ کرلیں۔ دس سال بعد بھی یہ بہت آرام سے اس ...گہ کا نقشہ بنالیں گے۔"

"یہ سب ڈرامہ بند کرو سیدھی طرح مطلب کی ...ات پر آؤ۔" احمد سعود نے اکھڑپن سے کہا، اس کی آواز ...بھی اسی طرح جاندار تھی۔

"احمد بہت جلد تمہیں پتہ چل جائے گا یہ کیا ڈرامہ ہے اور، اس میں تمہارا کردار کیا ہے؟" اس حسینہ نے سرد لہجے میں کہا۔

اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ ان سب کو جسموں میں عجیب سی سنسنی دوڑ گئی۔

"مجھے ڈراموں میں کام کرنے کا قطعاً شوق نہیں اس لئے میرا وقت برباد مت کرو۔ ورنہ میں تمہیں اور تمہاری ڈرامہ ٹیم کو تہس نہس کردوں گا۔" احمد نے بپھرے ہوئے لہجے میں کہا۔ وہ اس سسپنس سے بیزار ہوگیا تھا۔

"خود پر قابو رکھو احمد میں نہیں چاہتی تم جیسا طاقت ور شخص بے موت مارا جائے۔"

اس حسینہ نے غصے سے کہا۔ اور ایک بٹن دبا دیا۔

بٹن کے دبتے ہی فرش ایک طرف سے کھسکنے لگا اور تیزی سے ان کے پیروں کے نیچے سے نکل گیا۔ حیرت انگیز طور پر وہ گرے نہیں۔ انہیں کچھ دیر بعد سمجھ آیا، وہ انتہائی شفاف شیشے پر موجود تھے۔ اگلا منظر ایسا تھا کہ احمد سعود جیسا بہادر اور طاقتور انسان بھی گنگ ہو کر رہ گیا، ان سے چند فٹ نیچے دو شارک مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ جیسے ہی فرش شفاف ہوا تھا وہ تیزی سے چکر لگانے لگیں، اپنے بھیانک دانتوں کی نمائش کرتے ہوئے مسلسل ان پر جھپٹتیں، ان کا خوفناک منہ جیسے ہی قریب آتا ان سب پر لرزہ طاری ہو جاتا حالانکہ انہیں معلوم تھا کہ بیچ میں مضبوط شیشے کا فرش ہے۔

وہ اس منظر میں کھوئے ہوئے تھے کہ اس حسینہ کی آواز گونجی "احمد میں اگر چاہوں تو سیکنڈوں میں تمہیں ان بھوکی شارک کے حوالے کردوں۔ مگر میں اور میری تنظیم یہ چاہتی ہے کہ تم سب ہمارے لئے ایک کام کرو۔ اس کے بدلے دنیا میں جو تم چاہو گے وہ ملے گا۔"

"اور اگر ہم انکار کردیں تب کیا ہوگا؟" جی آن ہو اپنی نحیف آواز میں بولا۔

"تو......" اس حسینہ نے تو پر زور دیا اور بولی۔

"بھیانک موت تمہارا انتظار کررہی ہے۔ تمہارے پاس اب کوئی راستہ نہیں۔"

"ہم نے کرنا کیا ہے؟ تم کام بتاؤ۔" مارٹن پانی کی بوتل کھولتے ہوئے بولا۔

"ہاں یہ سوال کام کا ہے۔ تمہیں ایک صندوق حاصل کرنا ہے۔ مگر اس صندوق کی جگہ کسی کو نہیں معلوم صرف پہیلیوں کے ذریعے تم لوگوں نے اندازہ لگانا ہے۔ اور صندوق ڈھونڈنا ہے۔ اس کی تفصیل کل تمہیں بتادی جائے گی۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور اٹھ گئی۔

اس کی مسکراہٹ میں کچھ ایسا تھا جو آنے والے خطرات کی پیش گوئی کررہا تھا۔

رات تک وہ اپنے کمروں میں محصور رہے۔ رات سونے کے بعد ساجد کی جو آنکھ کھلی۔ تو حیرت کا ایک جھٹکا اس کا منتظر تھا۔ وہ برف کے لق و دق میدان میں پڑا تھا۔ اس کے جسم پر برفانی لباس تھا۔ اسے ذرا بھی ٹھنڈ محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ صبح کا وقت تھا ہلکی ہلکی روشنی ہو چکی تھی مگر سورج ابھی تک پہاڑوں کی اوٹ لئے ہوئے تھا۔ ساجد نے پیچھے دیکھا تو اس کے باقی ساتھی بھی موجود تھے۔ احمد ایک طرف رکھے بیگوں کا معائنہ کررہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ سارے اکٹھے ہوگئے۔ ٹرانسلیٹر ز ڈیوائس کی وجہ سے وہ باآسانی ایک دوسرے

کی بات سمجھ سکتے تھے۔

"حضرات!" "یہ موت کا سفر ہے۔" اس وقت وہاں تم پانچ نہیں بلکہ چھ ہو۔ چھٹی "موت" ہے جو تمہاری ہمسفر ہے۔ ساجد قریشی کی جیب میں وہ کاغذ ہے جو تمہیں، اس صندوق تک لے جاسکتا ہے۔ اب تم صرف اس صورت میں زندہ رہ سکتے ہو جب تم یہ کام پایۂ تکمیل تک پہنچا دو۔ دوسری کوئی صورت نہیں۔ تمہاری کامیابی کے لئے دعا گو۔" اس کے ساتھ ہی ان کے کانوں میں لگے ٹرانسلیٹر میں خاموشی چھا گئی۔ وہ کافی دیر تک اسے پکارتے رہے۔ مگر پھر کوئی آواز سنائی نہیں دی۔

ساجد نے جلدی سے جیب سے کاغذ نکالا۔ اس کاغذ میں ان پانچوں کی زبانوں میں پہیلی نما عبارت تھی۔

فلک بوس پربتوں کی شان
سفید کمبلوں کے درمیان
تیر جہاں سینے سے ہو پار
تیرگی میں ہے اس کا نشان

وہ چاروں کافی دیر بیٹھے اس معمے کو حل کرتے رہے مگر انہیں کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

"یوں بیٹھے رہنے سے بہتر ہے کہ ہم آگے بڑھیں۔ پہلے مصرعے میں پہاڑوں کا ذکر ہے ہمیں پہاڑوں کی سمت چلنا چاہیے۔" ان میں سب سے عمر رسیدہ چی آن ہو نے کہا۔

اس کی یہ بات سن کر ساجد کے ذہن میں ایک جھماکہ ہوا۔ "فلک بوس پربتوں کی شان" اس مصرعے کی تکرار اس کے ذہن میں ہونے لگی۔ سامنے آسمان کو چھوتی ایک پہاڑی چوٹی پر اس کی نظر پڑی۔ اس کی بلندی اس کی بناوٹ اور نوکیلے پن کو دیکھ کر ہی ہیبت طاری ہوجاتی تھی۔ "بلاشبہ یہی فلک بوس پربتوں کی شان ہے۔" اس نے جب اپنے اس خیال سے اپنے ساتھیوں کو آگاہ کیا تو وہ سب اچھل پڑے۔ اس کی اس رائے سے سب متفق تھے۔

کوہ پیما ہونے کے ناطے ساجد ان کا لیڈر تھا۔ وہ سب بیلٹ میں رسی جوڑ کر ایک دوسرے سے منسلک ہوگئے۔ اور اس پہاڑی کی طرف جانے لگے۔ سورج طلوع ہوگیا تھا۔ اور اس کی کرنیں جب برف پر پڑ کر منعکس ہوتیں تو آنکھوں کو چندھیا دیتیں۔ سیاہ شیشوں والی عینک اگر آنکھوں پر نہ ہوتی تو وہ ضرور اندھے ہوجاتے۔

وہ کافی اوپر آچکے تھے، درجہ حرارت بہت منفی تھا۔ بلندی ناپنے والے آلے کو دیکھ کر انہیں پتہ چلا کہ وہ 14 ہزار فٹ کی بلندی پر تھے اور وہ آہستہ آہستہ اوپر جانے لگے۔ ایک مقام پر ساجد نے ان کو سرگوشیوں میں مطلع کیا۔ "کوئی بھی اونچی آواز ان کے لئے موت کا پیامبر ثابت ہوسکتی ہے۔" اس وقت وہ ایک بہت بڑے برفانی تودے کے نیچے سے گزر رہے تھے۔ نہایت خاموشی سے وہ آہستہ آہستہ اوپر چڑھ رہے تھے کہ انہیں کچھ غراہٹیں سنائی دیں۔ سر اوپر اٹھا کر دیکھا تو بھیڑیوں کا ایک غول ان کو دکھائی دیا۔ بھیڑیئے اپنے خوفناک جبڑوں کی نمائش کرتے ہوئے غرا رہے تھے۔ مارٹن نے تیزی سے اپنی گن نکال لی۔ اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا ساجد نے جھپٹ کر گن اس سے چھین لی۔

"پاگل ہوگئے ہو تم، کیا کررہے ہو۔" مارٹن نے ساجد سے گن لینے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

"یہاں اگر گولی چل گئی تو یہ برفانی تودہ ہمیں ہمیشہ کے لئے صفحۂ ہستی سے مٹادے گا۔ بھیڑیوں کے مقابلے میں برفانی تودہ زیادہ خطرناک ہے ہم سب یہاں صرف خنجر استعمال کریں گے۔"

خنجر کا سن کر احمد کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ اور بولا۔ "دیر کس بات کی چلو آگے بڑھتے ہیں۔"

چی آن ہو اور لی شیخوف کو پیچھے چھوڑ کر وہ آگے بڑھنے لگے۔ بھیڑیوں کو بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ ان کا شکار بھاگنے کے بجائے حملہ کررہا ہے۔

تھوڑی دیر بعد تینوں اوپر پہنچے جہاں دنگل کے لئے تھوڑی سی جگہ موجود تھی۔ ساجد کو تب احمد کی وحشیانہ

طاقت کا اندازہ ہوا۔ جب اس نے احمد کو ایک بھیڑیئے کو پچھلی ٹانگوں سے پکڑ کر چیرتے دیکھا۔ پھر اس نے ایک اور بھیڑیئے کو ٹانگوں سے پکڑا اور پوری طاقت سے گھما کر نیچے کھائی میں پھینک دیا۔

اتنی دیر میں مارٹن، خنجر پھینک کر دو بھیڑیوں کو شکار کرچکا تھا۔

اچانک ایک بھیڑیئے نے زقند بھری اور ساجد کی طرف آنے لگا۔ ساجد کو اور تو کچھ نہیں سوجھا وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور خنجر والے ہاتھ کو بلند کردیا۔ بھیڑیا اپنی جھونک میں ساجد کے سر پر سے ہوتا ہوا آگے جا گرا اس کی انتڑیاں اس کے پیٹ سے باہر آچکی تھیں۔

احمد کو تو شغل ہاتھ آگیا تھا۔ جیسے ہی بھیڑیئے اس پر حملہ کرتے وہ کمال مہارت سے ان کی ٹانگیں پکڑ لیتا۔ اور گھما کر نیچے ہزاروں فٹ گہرائی میں پھینک دیتا۔ تھوڑی دیر میں میدان صاف ہوگیا۔

جوش میں آکر احمد نے ایک زوردار نعرہ لگایا۔ اور وہی ہوا جس کا ساجد کو ڈر تھا۔ برف تیزی سے سرکنے لگی۔ ساجد نے اپنا بیگ اٹھایا اور جلدی سے ایک بڑی چٹان کے نیچے کھڑا ہوگیا۔ احمد اور مارٹن نے بھی اس کی پیروی کی۔ لی شیخوف بھی اوپر آچکا تھا، وہ بھی تیزی سے چٹان کی طرف بڑھا۔ اس سے پہلے وہ وہاں تک پہنچتا۔

برف کی سفید چادر نے ان سب کو ڈھانپ لیا۔ جب تک برف گرتی رہی، انہیں سانس لینے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ برف کے تھمتے ہی ساجد کو اپنے پھیپھڑے سمٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔

برف کی دبیز تہہ نے ہوا کا راستہ بند کردیا تھا۔ اس نے ہاتھ پیر چلائے مگر وہ منوں برف تلے تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ وہ تڑپنا چاہتا تھا۔ مگر برف نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ اس کی روح قفس عنصری سے نکلنے ہی والی تھی کہ کسی نے اسے برف سے کھینچ کر باہر نکال لیا۔ ساجد نے دھندلائی آنکھوں میں دیکھا وہ احمد سعود تھا۔ احمد ہی نے مارٹن اور لی شیخوف کو برف سے نکالا۔ چی آن ہو کا کچھ پتہ نہیں تھا وہ کہاں گیا۔ چاروں مل کر اسے تلاش کرتے رہے۔ مگر وہ کہیں نہیں ملا۔ ان کے پاس صرف ایک بیگ رہ گیا اسلحے کے نام پر صرف خنجر اور مارٹن کے پاس ایک پسٹل تھا جس میں 12 گولیاں تھیں۔ بیگ اٹھا کر وہ آگے بڑھنے لگے۔

رات انہوں نے خیمہ لگا کر بسر کی، ایک آدمی کے لئے بنائے گئے خیمے میں تین دبک گئے اور چوتھا باہر پہرہ دیتا رہا۔ اگلا دن بہت تھکا دینے والا تھا۔ سورج کی روشنی نے برف کو نرم کردیا تھا کہیں تو چار فٹ ان کے پاؤں برف میں دھنس جاتے۔ شام تک وہ چلتے رہے۔ رات کو انہوں نے خیمہ لگایا۔ تھوڑی دیر بعد ہوا چلنے لگی۔ ہوا بڑھتے بڑھتے اتنی شدید ہوگئی کہ ان کا خیمہ چیتھڑوں میں تبدیل ہوگیا۔ باقی پوری رات وہ چاروں ایک دوسرے کی طرف پشت کئے جڑ کر بیٹھے رہے۔ اتنی خوفناک ہوا سے پہلے کبھی ان کا واسطہ نہیں پڑا تھا۔

صبح کے وقت ہوا کا زور ٹوٹا۔ تھکاوٹ کے باوجود وہ آگے بڑھنے لگے۔ انہیں کسی غار کی تلاش تھی جہاں وہ آگ جلاسکیں۔ ان کی خوراک بھی ختم ہوگئی تھی۔ شام تک وہ ایک کشادہ میدان میں پہنچ گئے۔ اب ان کا سانس بھاری ہورہا تھا۔ 18 ہزار فٹ کی بلندی تک وہ پہنچ چکے تھے۔ جابجا چٹانیں نظر آرہی تھیں لی شیخوف ایک چٹان پر بیٹھ گیا۔

اس کی بظاہر عام سی حرکت بہت مہنگی پڑی۔ وہ سفید چٹان نہیں بلکہ برفانی ریچھ تھا۔ جو نیند کے مزے لینے کے لئے کچھ عرصہ پہلے ہی یہاں لیٹا تھا۔ اپنے اوپر وزن محسوس کرکے وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ لی شیخوف دور جا گرا مارٹن نے جیب سے پسٹل نکالا اور پھرتی سے فائر کیا گولی ریچھ کے سر میں لگی، وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ ہلچل محسوس کرکے 5 ریچھ اٹھ کھڑے ہوئے۔ احمد کی بدقسمتی کہ وہ تین ریچھوں کے نرغے میں آگیا۔

احمد نے ایک ریچھ کی گردن اپنے بازوؤں میں دبالی، دوسرے ریچھ نے اپنے بڑے بڑے خوفناک دانت احمد کے کندھے میں پیوست کردیئے۔ احمد نے پوری

قوت سے دھاڑا۔ مارٹن جو احمد سے لپٹے ریچھوں کا نشانہ لے رہا تھا۔ لی شیخوف بدحواسی میں اس سے جا ٹکرایا۔

دونوں ایک دوسرے سے الجھ کر گر پڑے۔ ایک ریچھ یکا یک ان کے سروں پر پہنچ گیا۔ ساجد نے جیب سے خنجر نکال لیا۔ اور آگے بڑھ کر احمد کے کندھے میں دانت پیوست کرنے والے ریچھ کی گردن میں دستے تک خنجر گھسیڑ دیا۔ درد کی شدت سے ریچھ غرایا اور تیزی سے مڑا۔ ساجد کے سینے پر اس کا پنجہ لگا تو وہ اڑ کر 12 فٹ دور جا گرا۔ پھر کسی نے آکر ساجد کو جھنجوڑا۔ ساجد غنودگی میں جاتے جاتے ہوش کی دنیا میں لوٹ آیا۔

آنکھیں کھولتے ہی روح فرسا منظر اس کے سامنے تھا۔ احمد کا نرخرہ کٹ چکا تھا۔ اور داعیٔ اجل کو لبیک کہہ چکا تھا۔

لی شیخوف بھی زخمی تھا اس کے بازو پر زخم آئے تھے۔ مارٹن کی وجہ سے وہ محفوظ تھے۔

احمد کو وہیں برف میں دفن کر کے وہ بہت احتیاط سے غار میں داخل ہوئے مبادا کوئی ریچھ اندر خواب خرگوش کے مزے نہ لوٹ رہا ہو۔ وہ ایک چھوٹا سا غار تھا۔ آگ جلا کر وہ بیٹھ گئے۔ کتنے دنوں بعد وہ آگ تاپ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر خراٹے لے رہے تھے۔

وہ اس علاقے سے کافی مانوس ہو چکے تھے۔ ہر روز صبح اٹھتے اور تھوڑا گھوم کر واپس آجاتے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کریں۔ پہاڑی بالکل دیوار کی مانند تھی اوپر جانا، وہ بھی بغیر سامان کے ناممکنات میں سے تھا۔ اسی کشمکش و پیچ میں دن گزرتے رہے۔ ایک صبح جب ساجد اٹھا تو اس نے عجیب منظر دیکھا۔ غار میں ریچھ کی نرم نرم کھالیں بچھی تھیں۔ مارٹن تمام ریچھوں کی کھالیں اتار لایا تھا۔ کھالیں دیکھ کر ایک بار پھر ساجد کے ذہن میں بجلی کوندی۔

"سفید کمبلوں کے درمیان"

پہیلی کا دوسرا مصرعہ اس کے ذہن میں آ گیا۔ سفید کمبلوں سے سفید ریچھ مراد تھے۔ وہ خوشی سے اچھل اٹھا۔ وہ بالکل صحیح جگہ پر موجود تھے۔ اس نے جب یہ بات لی اور مارٹن کو بتائی تو وہ دونوں بھی خوشی سے اچھل پڑے۔ وہ تو ان کاغذ کے پرزوں کو بھول ہی چکے تھے۔ اب وہ تینوں تیسرے مصرعے کا بھید ڈھونڈنے لگے۔ پورا ہفتہ گزر گیا، مگر کچھ سمجھ نہ آیا۔

ایک دن لی پہاڑی کا معائنہ کر کے واپس آیا تو جوش کی وجہ سے اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔

اس نے تیسرے مصرعے کا بھید بھی تلاش کر لیا تھا۔ وہ ساجد اور مارٹن کو لے کر وہاں پہنچا۔

دونوں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک چٹان پہاڑ سے اس طرح باہر نکلی ہوئی ہے جیسے وہ تیر کا پچھلا حصہ ہو، جو کہ پہاڑ کے سینے میں گھس گئی ہو۔

"تیر جہاں سینے سے ہو پار"

وہ ایک دوسرے سے گلے لگ کر خوشی کا اظہار کرتے رہے۔ مگر ابھی انہیں چوتھا اور اہم سراغ تلاش کرنا تھا۔ وہ روزانہ آکر اس چٹان کے نیچے کھڑے ہو جاتے مگر وہی ڈھاک کے تین پات انہیں کچھ نہ ملا۔

ساجد اس رات لیٹا آخری مصرعہ دہرا رہا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ آخری فقرے میں کیا نشانی سمجھائی گئی ہے۔ ایک مرتبہ پھر اس کے دماغ میں دیا سا روشن ہوا۔ اس نے جھنجوڑ کر لی شیخوف اور مارٹن کو اٹھایا۔ دونوں خوفزدہ ہو گئے۔ مگر جوش مسرت سے چمکتا ہوا ساجد کا چہرہ دیکھ کر ان کو بھی اندازہ ہو گیا۔

ساجد تیزی سے باہر نکلا اور اس چٹان کی سمت دوڑا جو تیر کے پچھلے حصے سے مشابہ تھی۔ وہاں پہنچ کر وہ دھک سے رہ گئے۔ ان کا خون منجمد ہو گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ اس تیر کے عین نیچے سے سبز رنگ کی روشنی نکل رہی تھی۔ صاف دکھائی دے رہا تھا اندر کوئی غار تھا جس کے سامنے بہت بڑا پتھر تھا۔ پتھر نے پوری طرح غار کو بند نہیں کیا تھا۔ جہاں سے خلا رہ گیا تھا وہیں سے روشنی باہر آ رہی تھی۔

مصرعے میں تیرگی یعنی تاریکی کا ذکر تھا، یہ روشنی

ف تاریکی میں ہی نظر آسکتی تھی۔ دن میں کوئی بھی سبز روشنی کا سراغ نہیں پا سکتا تھا۔

رات میں اپنے تجسس پر قابو پا کر وہ واپس گئے۔ تمام رات انہیں خوشی سے نیند نہیں آئی۔ صبح سویرے روشنی ہوتے ہی وہ تینوں اس بند غار کی سمت چل پڑے۔

لی شیخوف رسی کے ذریعے پتھر کو ناپنے لگا۔ ساتھ ہی وہ اس چٹان پر خنجر کی مدد سے نشان لگاتا جاتا۔ کافی دیر وہ پیمائش کرتا رہا، آخر وہ پتھر کا مرکز تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ جس پر اس کے بقول ایک ہی وار سے اتنے بڑے پتھر کو ٹکڑے ٹکڑے کیا جا سکتا تھا۔ اس کے پاس کوہ پیماؤں والی مخصوص ہتھوڑی موجود تھی۔ لی شیخوف نے پہلے پتھر کے تین مختلف حصوں پر چوٹ لگائی۔ اور آخر میں ایک بھرپور وار پتھر کے اس حصے پر کیا جسے وہ مرکز کہہ رہا تھا۔

ایک دھماکہ ہوا۔ ہر طرف گرد اڑنے لگی۔ اتنی بلندی پر سانس لینا پہلے ہی دوبھر ہو رہا تھا۔ گرد نے اسے اور بھی مشکل بنا دیا۔ ساجد اور مارٹن تیزی سے پیچھے بھاگے اور گرد کے طوفان سے نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ وہ کچھ دیر گرد کے ختم ہو جانے کا انتظار کرتے رہے۔

دونوں لی شیخوف کی طرف سے پریشان تھے۔ اب گرد تقریباً ختم ہو چکی تھی۔ وہ آگے بڑھے "لی" انہیں چھوٹے بڑے پتھروں کے انبار تلے دبا نظر آیا جو زندگی کی قید سے آزاد ہو چکا تھا۔ غار کا دہانہ کھل چکا تھا۔ دونوں نے پہلے لی شیخوف کو پتھروں کے نیچے سے نکالا اور برف میں دفن کر دیا۔ تھوڑی دیر تک اس کی قبر پر افسردہ بیٹھے رہے۔

"چلو اب اندر چل کر جائزہ لیتے ہیں۔ وہ صندوق موجود بھی ہے کہ نہیں۔" مارٹن نے افسردگی سے ساجد کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

لی کی موت پر، ساجد بھی بہت دلگرفتہ تھا۔

ساجد نے آہستہ سے سر ہلایا اور دونوں غار کی جانب بڑھے۔ غار کے اندر داخل ہوتے ہی ان کا واسطہ سبز روشنی سے پڑا۔ تھوڑا سا آگے جا کر انہیں وہ صندوق دکھائی دے گیا۔ جس کی وجہ سے وہ اتنی بڑی مصیبت میں مبتلا ہو گئے تھے۔ صندوق ایک شیشے میں بند تھا۔ صندوق کے دونوں اطراف دو گولے پڑے تھے، سبز روشنی ان ہی میں پھوٹ رہی تھی۔

ساجد نے تیزی سے صندوق کی طرف بڑھنا چاہا۔ مگر مارٹن نے نرمی سے اسے روک دیا۔ وہ یہ سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ مارٹن نے اسے کیوں روکا، اس نے مارٹن کو تیزی سے صندوق کی جانب بڑھتے دیکھا۔ مارٹن نے جیسے ہی صندوق کے پاس پہنچ کر صندوق اٹھانا چاہا۔ ساجد نے اسے اڑ کر دائیں طرف جاتے دیکھا جہاں وہ دیوار سے ٹکرا کر نیچے گرا، اور اس کی چیخ نکل گئی۔

کسی نادیدہ قوت نے اسے اچھال دیا تھا۔ مارٹن نے آؤ دیکھا نہ تاؤ جھٹ جیب سے پسٹل نکالا اور یکے بعد دیگرے دو فائر صندوق کی طرف کیے۔ اور اپنے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔ اس کے سینے اور گردن کے پاس سے خون کا فوارہ بلند ہوا اور زمین پر پھیلتا چلا گیا۔

ساجد تیزی سے بھاگ کر مارٹن کے پاس پہنچا

وفا کا رشتہ

امریکی فوج کے رنگروٹوں کے ایک کیمپ میں سب رنگروٹوں نے اپنے اپنے صندوق پر گرل فرینڈ کی تصویر چپکائی ہوئی تھی جبکہ جونی نے صندوق پر اپنی موٹر سائیکل کی تصویر چپکائی ہوئی تھی جو اسے بہت پسند تھی اور جسے وہ گھر چھوڑ آیا تھا۔

ایک روز سب رنگروٹوں نے اس بات پر اس کا بہت مذاق اڑایا تو جونی جل کر بولا۔ "موٹر سائیکل کی تصویر لگانا گرل فرینڈ کی تصویر لگانے سے لاکھ درجے بہتر ہے۔" جب میں واپس جاؤں گا تو موٹر سائیکل کم از کم گھر پر موجود تو ملے گی۔"

(شرف الدین جیلانی - ٹنڈو الہ یار)

مگر جسم خاکی سے اس کی روح پرواز کرچکی تھی۔ ساجد نے بہت قریب سے مارٹن کے زخموں کا معائنہ کیا تو اس پر عیاں ہوگیا۔

گولیاں لگنے کی وجہ سے مارٹن کی موت واقع ہوئی تھی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا حالانکہ گولیاں تو اس شیشے کو لگنی چاہیے تھیں جس میں صندوق موجود تھا۔ شیشے سے صندوق نکالتے ہوئے مارٹن کی حالت ساجد ملاحظہ کرہی چکا تھا، اب وہ قریب سے دیکھنے لگا۔ اس نے وہاں عجیب چیز دیکھی۔ صندوق جس جگہ رکھا ہوا تھا، وہاں دو گڑھے تھے، ایک چھوٹا تھا اور ایک اس سے کچھ بڑا۔ صندوق کے ساتھ گولے بھی دو ہی رکھے تھے ایک چھوٹا اور دوسرا بڑا اور ان میں سے سبز روشنی نکل رہی تھی۔

اس نے ڈرتے ڈرتے ہاتھ بڑھایا اور چھوٹا گولا اٹھا کر چھوٹے گڑھے میں رکھ دیا۔ مزید ہمت کر کے بڑا گولا بڑے گڑھے میں رکھ دیا۔

جیسے ہی وہ اس کام سے فارغ ہوا۔ دروازہ بند ہونے جیسی زوردار آواز پیدا ہوئی۔ صندوق کے گرد موجود شیشہ یک لخت غائب ہوگیا اور صندوق کا ڈھکنا کھل گیا۔

صندوق میں ایک انڈہ موجود تھا جو شاید کسی دھات سے بنا تھا۔ چاند کی چاندنی سے مشابہ ٹھنڈی ٹھنڈی سفید روشنی اس میں سے پھوٹ رہی تھی۔ اس کے قریب ہی ایک سفید پرچی رکھی تھی۔ ساجد نے وہ انڈہ اور پرچی دونوں اپنے قبضے میں لے لیے۔ اور باہر جانے کے لئے مڑا اس کے علاوہ اس کے دماغ میں اور کوئی بات نہیں تھی کہ وہ تسلی سے اپنے رہائشی غار میں پہنچے اور وہاں بیٹھ کر اس انڈہ نما چیز پر غور کرے۔

وہ غار سے باہر نکلا ہی تھا کہ اسے گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ تھوڑی دیر بعد ایک پہاڑی سے اسے کچھ اترتا ہوا دکھائی دیا، جیسے ہی وہ کچھ قریب آئے، ساجد کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ خدا کی پناہ وہ بھیڑیئے تھے قد کاٹھ میں وہ شیر کو بھی مات دیتے تھے، وہ لمحوں میں ساجد تک پہنچ گئے۔ وہ تعداد میں آٹھ تھے انہوں نے آکر ساجد کو گھیر لیا، ساجد کا خون خشک ہوگیا تھا۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں واضح طور پر لرزش دیکھی جاسکتی تھی۔

ان بھیڑیوں میں سے ایک طاقتور بھیڑیا آگے بڑھا اور اپنے جسم کو زور سے جھٹکا دیا۔ اگلے ہی لمحے وہ انسانی روپ میں ساجد کے سامنے موجود تھا۔ یہ وحشت ناک منظر دیکھ کر ساجد پر جیسے سکتہ طاری ہونے لگا اور اگر وہ مضبوط حواس کا مالک نہ ہوتا تو اب تک حواس سے بیگانہ ہو چکا ہوتا۔ اس شخص نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا، جو کچھ دیر پہلے ایک خونخوار بھیڑیا تھا اور بولا۔ ”لاؤ یہ مجھے دو۔“ اس کا اشارہ اس روشنی بکھیرتے انڈے سے مشابہ گولے کی جانب تھا۔

ساجد ویسے ہی گم صم کھڑا رہا۔

”میں نے تم سے کہا! یہ مجھے دو، تمہیں سمجھ میں نہیں آرہا۔“ ساجد کے اس طرح کھڑے رہنے پر اس شخص کو تاؤ آگیا۔ اور وہ کرخت لہجے میں بولا۔

اس طرح بولنے کا خاطر خواہ فائدہ ہوا اور ساجد ہوش کی دنیا میں واپس آگیا اور نرمی سے گویا ہوا۔

”میں تمہیں یہ دے تو دوں مگر اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ تم یہ لینے کے بعد مجھے زندہ چھوڑ دو گے۔“

اسے یہ بات حیران بھی کررہی تھی وہ شخص چاہتا تو آگے بڑھ کر وہ بیضوی گولا اس سے چھین بھی سکتا تھا مگر وہ مانگ رہا تھا۔

”دیکھو! میں تمہیں آخری بار کہہ رہا ہوں یہ میرے حوالے کردو، ورنہ میرے ایک اشارے پر میرے ساتھی تمہیں چیر پھاڑ کر رکھ دیں گے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ تھوڑا آگے آگیا مگر اس نے وہ گولا زبردستی چھیننے کی کوشش نہیں کی۔ اس بے بسی کو ساجد نے محسوس کرلیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولا۔

”آگے بڑھو اور چھین لو۔ میں تمہیں یہ نہیں دے سکتا۔“

یہ الفاظ سنتے ہی اس شخص کی اور اس کے قریب موجود بھیڑیوں کی بے چینی عروج پر پہنچ گئی۔ اور وہ ساجد کے گرد چکر لگانے لگے۔ ساجد کو اپنی موت بالکل

سامنے نظر آرہی تھی۔ پھر اس شخص کی آواز ساجد کی سماعت سے ٹکرائی۔

”میں نے تمہیں ایک موقع دیا تھا مگر اب تم سے ہمارا، ہی نمٹے گا۔“ یہ کہہ کر اس نے دوبارہ بھیڑیئے کی ہیت اختیار کرلی اور اپنے ساتھیوں سمیت واپس چلا گیا۔

اس کے یوں واپس چلے جانے کا گمان ساجد کو نہ تھا۔ کافی دیر وہ وہیں سر پکڑ کر بیٹھا رہا اور اس دہشت ناک منظر کی دہشت سے نکلنے کی کوشش کرتا رہا۔ جب کچھ سنبھلا تو اپنے غار کی طرف چل دیا۔

غار میں وہ تمام صورتحال پر غور کررہا تھا بیضوی گولا اس کے سامنے دھرا تھا۔ دفعتہً گولے کی روشنی بڑھنے لگی، ساتھ ہی باہر سے آنے والی روشنی کم ہونے لگی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے جو کچھ دیکھا بڑے بڑے سورماؤں کا پتا پانی کرنے کے لئے کافی تھا۔ غار میں ایک بہت بڑا اژدہا داخل ہورہا تھا۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ بڑی مشکل سے غار میں داخل ہو پارہا تھا۔ جب وہ اس کے کافی قریب پہنچ گیا تو اژدہے نے زور سے سانس خارج کی۔ ایک لمحے کے لئے ساجد کو اپنے پھیپھڑے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے..... اگلے ہی لمحے اس اژدہے نے اپنے جبڑے کھولے اور ساجد کو سالم نگل لیا۔ اژدہے کے منہ میں جاتے ہی ساجد پر بے ہوشی طاری ہونے لگی۔ اس کے حواس اس کا ساتھ آہستہ آہستہ چھوڑ رہے تھے۔ اس کی نظر بیضوی گولے پر پڑی جو پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ وہ سینے تک اژدہے کے منہ میں جاچکا تھا۔ اژدہا دھیرے دھیرے اسے نگل رہا تھا۔

ساجد نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ بے گور و کفن کی موت مرے گا۔ وہ کسی اژدہے کے پیٹ میں جا کر تحلیل ہو جائے گا۔

یک لخت اس کے جسم پر کئی گنا بوجھ بڑھ گیا۔ اسے ایسا لگا کہ اس کے جسم کی تمام ہڈیاں چور چور ہوجائیں گی۔ اسے ایک زوردار جھٹکا لگا اگلے ہی لمحے وہ اژدہے کے منہ سے باہر تھا۔ اس کا انگ، انگ دکھ رہا تھا۔ سارے جسم پر چپچپا مواد پھیلا ہوا تھا۔ جس سے بدبو کے بھبھکے اسکے نتھنوں میں گھس رہے تھے۔ وہ غار سے باہر موجود تھا۔

سامنے وہی حسینہ موجود تھی پانچوں افراد کو موت کے اس سفر پر گامزن کرنے کی ذمہ دار تھی ان پانچوں میں سے چار موت کے منہ میں جاچکے تھے اور ساجد ابھی تک بچا ہوا تھا مگر جس طرح کے حالات تھے اسے غالب یقین تھا کہ وہ بھی جلد اپنے ساتھیوں سے جاملے گا۔

”تو تم یہ ہمیں نہیں دو گے۔“ اس حسینہ نے بیضوی گولے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

ابھی تک کے واقعات سے ساجد اتنا تو سمجھ چکا تھا وہ لوگ گولا زبردستی اس سے نہیں چھین سکتے تھے۔

وہ اسے ڈرا کر اور اذیت دے کر گولا اس سے لینا چاہتے تھے مگر اس طرح کہ وہ ڈر کر گولا خود ان کے حوالے کرے۔ ہوسکتا تھا وہ بیضوی گولا ان کے حوالے کرتا اور وہ اسے عدم آباد پہنچا دیتے۔ اس نے نفی میں سر ہلایا۔

نفی میں سر ہلاتے دیکھ کر اس حسینہ کے چہرے پر غصے اور جھلاہٹ کے ملے جلے آثار نمودار ہوگئے۔

”تم اپنے آپ کو تیس مار خان سمجھتے ہو، تم سوچ بھی نہیں سکتے کہ تمہارے ساتھ کیا ہوسکتا ہے۔“ اس نے پاؤں پٹختے ہوئے کہا۔

”اس سے برا اور کیا ہوسکتا ہے۔“ ساجد نے دل ہی دل میں سوچا مگر کچھ بولا نہیں۔ ٹھنڈ اس کے جسم کو سن کرچکی تھی۔ درد کا احساس بھی ختم ہوگیا تھا۔ اب وہ خود کو کافی بہتر حالت میں محسوس کررہا تھا۔

”دیکھو تمہارا اس سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، تم یہ ہمارے حوالے کرو اور یہاں سے واپس چلے جاؤ۔ ہم تمہاری مدد کریں گے۔“ اس مرتبہ اس حسینہ نے نرمی سے کہا۔

مگر ساجد اس کی باتوں پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھا۔ اس کا دل نہیں مان رہا تھا وہ لوگ اتنی آسانی سے اسے جانے دیں گے۔ اس گفتگو میں وہ بھیانک اژدہے

کوبول ہی گیا تھا جو نجانے کہاں غائب ہو چکا تھا۔

ساجد کو یوں چپ دیکھ کر ایک مرتبہ پھر وہ پیچ وتاب کھانے لگی۔ ''میرے غضب کو دعوت مت دو۔ دو مرتبہ ہم نے تمہیں چھوڑ دیا۔ اور اگر تم یہ سمجھنا شروع ہو گئے ہو کہ ہم تم سے گولا چھین نہیں سکتے تو تم صحیح سمجھے ہو مگر تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ہم تمہیں مار نہیں سکتے۔ تمہیں مار کر صرف اتنا نقصان ہوگا کہ یہ گولا وہیں واپس چلا جائے گا جہاں پہلے تھا۔ اب تم خود فیصلہ کرلو۔ یا تو اس کھیل سے نکل جاؤ یا ہم تمہیں زندگی سے ہی نکال دیتے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی سفاکیت پورے عروج پر تھی۔

ساجد دوراہے پر کھڑا تھا۔ ایک طرف اگر آگ تھی تو دوسری طرف کھائی۔ اس کا فیصلہ اس کے لئے زندگی کی نوید بھی بن سکتا تھا اور موت کا پیغام بھی۔ وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔

اسے یوں پریشان دیکھ کر اس حسینہ کے لبوں پر پہلی مرتبہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''ساجد قریشی اپنے آپ کو مت تھکاؤ، مجھ پر بھروسہ کرو، یہ گولا میرے حوالے کردو اور لوٹ جاؤ اپنی دنیا میں۔'' اس نے ساجد کو ناصحانہ انداز میں کہا۔

ساجد کچھ دیر کشمکش و پیچ میں رہا۔ پھر بولا۔

''مجھے نہیں معلوم کہ تم کون لوگ ہو مگر میں اتنا ضرور سمجھ گیا ہوں کہ انسانی زندگی کی تمہارے ہاں ذرا بھی وقعت نہیں ہے اور کچھ دیر پہلے میرے ساتھ جو ہو چکا ہے۔ اس سے یہ بات صاف ہو چکی ہے کہ تم لوگ کسی صورت مجھے نہیں چھوڑو گے۔ اس لئے میں یہ تمہیں نہیں دوں گا۔'' ساجد نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

اچانک ساجد کی سماعتوں سے مردانہ آواز ٹکرائی۔ ''سمراس تم کس بحث میں الجھ گئیں یہ ایسے نہیں مانے گا، اسے مزا چکھانا پڑے گا۔'' وہی خوفناک شخص نجانے کہاں سے نمودار ہو گیا تھا جو بھیڑیئے کے روپ میں ساجد کے پاس آیا تھا۔

''گوشار سنبھل کر۔ پاگل مت بنو......'' مگر اس سے پہلے کہ وہ حسینہ کچھ اور بولتی، وہ شخص آگ کا گولا تیار کر چکا تھا۔ اگلے ہی لمحے اس نے پوری قوت سے ساجد کی طرف پھینکا۔ گولا تیزی سے ساجد کی طرف آیا۔ مگر اگلے ہی لمحے اپنا رخ بدل کر گوشار ا کی طرف مڑ گیا اور حیرت سے بت بنے گوشار کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ چند لمحوں بعد وہاں صرف راکھ رہ گئی، سمراس نے ایک چیخ ماری اور گوشار کی طرف لپکی اس کے پہنچنے سے پہلے ہوا راکھ کو منتشر کر چکی تھی۔

''اب میں تمہیں نہیں چھوڑوں گی، کسی قیمت پر بھی نہیں۔'' یہ کہہ کر سمراس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اگلے ہی لمحے ساجد ہوا میں اڑا اور تیزی سے قریبی کھائی کی طرف بڑھا۔ چند ثانیوں بعد وہ کھائی میں تیزی سے گر رہا تھا۔ نوکیلی چٹانیں تیزی سے قریب آرہی تھیں۔

اس مرتبہ بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ بھیانک انجام سے پہلے ساجد نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ کافی دیر تک اس نے آنکھیں بند رکھیں۔ پھر جب کچھ نا ہوا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔ دھب سے وہ نیچے گرا مگر نا تو، اس کی کوئی ہڈی ٹوٹی اور نا ہی کوئی درد محسوس ہوا۔ ایک اور حیرت ناک بات یہ تھی کہ وہ لق ودق صحرا میں موجود تھا اور سامنے ایک عمارت موجود تھی۔ جب سے وہ اغوا ہوا تھا قدم قدم پر تحیر سے اس کا سامنا ہوا تھا۔ عجیب وغریب حالات نے اسے مبہوت کئے رکھا تھا اور اب پھر وہ بھونچکا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ صحرا میں شدید گرمی تھی اس نے جلدی جلدی کوٹ اتارا پینٹ کے اوپر پہنا برفانی پاجامہ بھی اتار کر پھینک دیا۔ سرد علاقے سے فوراً گرم علاقے میں آنے کی وجہ سے اس کے جسم میں چونٹیاں سی رینگ رہی تھیں۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا یہ سب کیا ہے۔ وہ عمارت کی طرف بڑھ گیا۔

اس وقت صحرا کی تپتی دھوپ اور سلگتی ریت سے بچنے کے لئے ضروری تھا کہ وہ عمارت میں گھس جاتا۔ وہ جیسے ہی عمارت کے اندر داخل ہوا تو حیرت کا ایک اور جھٹکا اس کا منتظر تھا۔ اندر کی تو دنیا ہی اور تھی۔ پرانے زمانے کے محلوں کی مانند سجا سنورا ہال اس کے سامنے تھا۔ باوردی دربان موجود تھے۔ وہ جیسے ہی اندر داخل

ہوا۔ ایک دربان نے نہایت ادب سے ایک کمرے کی سمت اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''جناب عالی! آپ کو اس کمرے میں تشریف لے جانا ہے۔''

اس نے تعجب سے دربان کو دیکھا۔ ''میں ساجد ہوں۔'' اس نے دربان کو اپنا نام بتایا۔

''جی میں جانتا ہوں۔ ہمیں خاص طور پر حکم ملا ہے کہ آپ کی اس کمرے تک رہنمائی کی جائے۔'' دربان نے ایک مرتبہ پھر ایک کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ساتھ ہی وہ ساجد کے ہاتھ میں پکڑے بیضوی گولے کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

ساجد کمرے کی طرف چل دیا کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا تو وہاں تین شخص موجود تھے تینوں بوڑھے تھے۔ ''اپنی دنیا میں ہم آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں۔'' ان تینوں میں سے ایک بولا۔

''اپنی دنیا'' ساجد نے حیرت سے بوڑھے کی بات دہرائی۔ ''جی اپنی دنیا یعنی جنات کی دنیا۔''

''ج......جن......جنات'' ساجد نے ہکلاتے ہوئے کہا حالانکہ اتنے واقعات کے بعد اسے سمجھ جانا چاہیے تھا۔

''آپ تشریف رکھیں، سالار تشریف لانے والے ہیں وہی آپ کو تفصیل سے سب کچھ بتائیں گے۔''

تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ گڑگڑاہٹ کے ساتھ دیوار میں ایک دروازہ نمودار ہو گیا، وہاں سے ایک بہت فربہ جسامت والا شخص داخل ہوا اس کے احترام میں تینوں بوڑھے کھڑے ہو گئے۔ ساجد کو دیکھ کر اس کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی جو اس کے استقبال میں کھڑا تھا۔

''تشریف رکھیں۔'' اس نے گونج دار آواز میں کہا۔

''محترم سالار! یہی وہ نوجوان ہے جو ہرکات کا مالک بن چکا ہے۔ اور اس وقت ہرکات اس کے ہاتھ میں ہے۔'' بوڑھے نے چمکتے گولے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''نوجوان ہماری دنیا کے بڑے بڑے لوگوں نے ہرکات کو حاصل کرنے کی جان توڑ کوششیں کیں مگر ہماری نالائق بیٹی کی وجہ سے وہ ایک انسان کے ہاتھ لگ گیا۔ تم شاید پوری بات نہیں جانتے۔'' سالار نے ساجد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

ساجد نے نفی میں سر ہلا دیا۔ منہ سے کچھ نہیں بولا۔

سالار نے تفصیل سے تمام بات ساجد کو بتائی۔ جس کے مطابق سالار کی بیٹی سمراس کو ہرکات حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ مگر کسی جن یا جن زادی کے لئے یہ نہایت کٹھن کام تھا۔ ہرکات کو حاصل کرنے کے پانچ مراحل تھے اور ان کی دنیا کی تاریخ میں صرف ایک مرتبہ ایک جن چوتھے مرحلے تک پہنچا مگر تحت الثریٰ کے طلسم کا شکار ہو گیا۔

سمراس نے بہت سوچ بچار کے بعد وہ طریقہ اختیار کیا جو آج تک کسی کے ذہن میں نہیں آیا تھا۔ وہ انسانوں کی دنیا میں داخل ہوئی اور ایک نیٹ ورک بنا لیا۔ بہت عرق ریزی سے اس نے ایسے بندے تلاش کرنا شروع کیے جو ہرکات کو باہر نکال لائیں، اس نے انسانوں کے گروپ بنا کر ان برفانی پہاڑوں کی طرف بھیجنے شروع کر دیئے، پہلے پہل تو اسے ناکامی ہوئی مگر پھر ساجد والے گروپ نے کافی کامیابی حاصل کرلی اور آخر میں ساجد کئی دفعہ موت کے منہ میں جاتے جاتے بچا۔ جب وہ سبز روشنی والے پتھر گڑھے میں ڈال رہا تھا، اگر وہ بڑا پتھر پہلے ڈال دیتا تو وہیں جل کر خاکستر ہو جاتا۔ اور اگر وہ بیضوی گولے کے ساتھ سفید پرچی نا اٹھاتا تو گولے کے اثر کی وجہ سے پگھل جاتا اور سب سے بڑھ کر اگر وہ گوشار یا سمراس کے حوالے ہرکات کر دیتا تو وہ اسے قتل کر دیتے۔ سمراس کی ساری منصوبہ بندی فیل ہو چکی تھی۔ کامیابی سے اتنے قریب پہنچ کر وہ ناکام ہو گئی تھی وہ تو اپنی طرف سے ساجد کو موت کے منہ میں پہنچانے کا پورا انتظام کر چکی تھی۔ مگر ہرکات کا مالک اتنی آسانی سے نہیں مرتا وہ نہیں جانتی تھی۔

پھر سالار کے حکم سے اسے اس کے محل میں پہنچا دیا گیا۔

''مجھے ایک بات سمجھ نہیں آئی وہ ہمیں بالکل صحیح

جگہ بھی تو پہنچا سکتی تھی پھر اسے اتنا لمبا چکر چلانے کی کیا ضرورت تھی؟" ساجد نے اپنی الجھن کا اظہار کیا۔

"نہیں وہ ایسا نہیں کر سکتی تھی اسی لئے اس نے پہیلی نما اشعار تراشے۔ ہرکات کے اردگرد بہت سخت پہرا ہے۔ اور جب تم اوپر آ رہے تھے تو انہوں نے تمہارے ذہن کو پوری طرح کھنگال لئے تھے مگر انہیں شبہ نہیں ہوا۔ تم لوگ صندوق کی تلاش میں تھے۔ پہرے داروں کو علم نہیں تھا کہ ہرکات صندوق میں بند ہے۔ اس لئے وہ دھوکہ کھا گئے۔ اور انسانوں کا ہرکات سے کچھ لینا دینا بھی نہیں اور بلاوجہ وہ مداخلت کر نہیں سکتے تھے اس لئے تم ہرکات تک پہنچ گئے۔" سالار نے تفصیل سے جواب دیا۔

"اور تمہارا ساتھی واقعی کمال کا تھا، غار میں تم صرف اسی کی وجہ سے داخل ہوئے۔ اس نے کمال مہارت سے غار کے سامنے موجود پتھر توڑ ڈالا اس سے پہلے پہرے دار کچھ سمجھتے تم اندر داخل ہو گئے۔"

"دیکھیں محترم سالار میں اس گورکھ دھندے میں پڑنا نہیں چاہتا تھا۔ آپ کی بیٹی نے یہ کھیل شروع کیا۔ اور مجھے کتنی اذیت دی۔ آپ کو معلوم ہے۔" ساجد نے رنج اور غصے کی ملی جلی کیفیت سے کہا۔

"ہم نے آپ کو یہاں اسی لئے بلایا ہے۔ آپ اس مصیبت سے نکل جاؤ۔ اور جہاں تک سمراس کی بات ہے، وہ آدھی سزا تو بھگت چکی ہے۔ اس کا منگیتر کوشار مارا گیا ہے۔ اور باقی کی تمام عمر کے لئے سمراس کو سمندر برد کر دیا جائے گا۔" سالار کے لہجے میں دکھ اتر آیا۔ آخر کو وہ باپ تھا۔

"اوہ! مجھے بہت افسوس ہے مگر ان سب میں سمراس کا اپنا قصور ہے۔" ساجد نے سالار کے دکھ کو محسوس کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں اور وہ سزا بھی بھگتے گی مگر میں یہ چاہتا ہوں کہ تم ہرکات کی ملکیت سے دستبردار ہو جاؤ۔" سالار کے لہجے کی گھن گرج واپس آ گئی تھی۔ اپنے دکھ کو اس نے اپنے جلال سے ڈھانپ دیا تھا۔

"یعنی آپ چاہتے ہیں کہ یہ میں آپ کو دے دوں؟" ساجد نے کہا۔

"نہیں اب تم اسے کسی کو نہیں دے سکتے ورنہ ہمیشہ کے لئے فنا ہو جاؤ گے۔ تمہیں اسے وہیں پہنچانا ہو گا۔ جہاں سے تم اسے لائے ہو۔" سالار نے ہرکات کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "مگر ایک بات یاد رکھنا ہم تمہیں وہاں پہنچا سکتے ہیں مگر مسئلہ یہ ہے کہ جیسے ہی تم ہرکات واپس رکھو گے ہمارا تمہارا رابطہ ختم ہو جائے گا۔ وہاں سے تمہیں بحفاظت واپس پہنچانے کا اختیار ہم کھو بیٹھیں گے۔"

"تو پھر میں گھر کیسے پہنچوں گا؟ نجانے وہ دنیا کا کون سا خطہ ہے۔ اور مجھے ضرورت کیا ہے، اور میں مزید اپنی جان خطرے میں ڈالوں۔" ساجد نے تلملا کر کہا۔ "ایک تو وہ یہ گولا اپنی جگہ پر رکھے پھر موت کو بھی گلے لگائے۔" یہ سوچ کر ہی اس کا فشارِ خون تیز ہونے لگا۔

"ضرورت ہے تمہیں کہ تم اپنی جان خطرے میں ڈالو ورنہ تمام عمر سسکتے رہو گے۔ اور سب سے زیادہ نقصان تمہارے چاہنے والوں کا ہو گا۔ زندگی بھر تم کوئی رشتہ نہیں بنا سکو گے۔ تمہارا کیا خیال ہے ہرکات ایک انسان کے پاس دیکھ کر ہماری دنیا کے لوگ اسے چھوڑ دیں گے۔ نہیں بالکل نہیں۔ ساری عمر تمہیں حالت جنگ میں رہنا ہو گا ایک کے بعد دوسرا حملہ۔

وار پر وار آخر کب تک بچو گے۔ تمہیں تو ہرکات استعمال کرنا بھی نہیں آتا۔ تمہارے ساتھ زیادتی ہوئی حالانکہ قصوروار اپنے انجام کو پہنچ چکے مگر پھر بھی ہم تم سے ہمدردی محسوس کر رہے ہیں اس لئے تمہیں یہاں اٹھا لائے۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔" سالار نے تند لہجے میں کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ "اور جاتے جاتے آخری بات تمہیں بتاتا چلوں۔ انسان اس علاقے کے کافی قریب ہیں۔ ذرا سی ہمت اور کوشش سے تم ان تک پہنچ سکو گے۔ آج کا دن اور رات تمہارے پاس ہے خوب سوچ لو۔"

بہت سوچ بچار کے بعد ساجد نے سالار کی بات مانتے ہوئے اس جگہ پہنچ گیا جہاں سے ہرکات کو حاصل کیا تھا۔

برفباری شدید ہو چکی تھی وہ اسی غار میں بیٹھا ہوا جہاں مارٹن نے ریچھ کی کھالیں لا کر رکھی تھیں۔ اب رات کو وہ اسی جگہ پہنچا چکا تھا اور سالار کی نشاندہی کے مطابق اس نے مشرق کی طرف سفر کرنا تھا۔ صبح اٹھ کر مشرق کی سمت چل پڑا۔ سفر کے لئے تمام ضروری سامان اور کھانا سالار نے مہیا کر دیا تھا۔ وہ مسلسل آگے بڑھتا رہا۔ ایک ہفتہ ہونے کو آ گیا مگر برف کے سمندر سے نہیں نکل سکا حالانکہ وہ مسلسل چل رہا تھا اور بہت تھوڑی دیر کے لئے آرام کرتا۔ برفانی علاقوں میں ویسے بھی بھوک اور نیند دونوں بہت کم ہو جاتی ہیں۔ اس کی خوراک بھی ختم ہو رہی تھی۔

ایک ہفتہ مزید گزر گیا خوراک ختم ہو رہی تھی مگر انسان تو انسان کسی جانور پر بھی اس کی نظر نہ پڑی پہاڑوں سے اگر اسے عشق نہ ہوتا تو اب تک وہ ہمت ہار چکا ہوتا۔ وہ آگے بڑھتا رہا، دشوار گزرگاہوں کو اپنے عزم سے عبور کرتا رہا۔ خوراک اس کے پاس ختم ہو گئی۔ جسم میں نقاہت در آئی۔ آخر انسان تھا۔ ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ پہاڑ سے نکل کر ایک چٹان کے چھجے تلے وہ لیٹا ہوا تھا۔ اس نے جیبوں میں ہاتھ مارا شاید کچھ کھانے کو مل جائے۔ کچھ کھڑکھڑاہٹ سی محسوس ہوئی تو دیکھا وہی سفید پرچی جو ہرکات کے ساتھ رکھی ملی تھی جیب سے نکل آئی۔ اسی طرح سفید اور بے شکن۔ اس نے پرچی کو دیکھا تو منہ سے بے اختیار نکلا۔ "کاش! کچھ کھانے کو مل جاتا۔" پرچی کو پھینک کر وہ کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

اگلے ہی لمحے اس کی ناک سے انواع اقسام کے کھانوں کی خوشبو ٹکرائی۔ پہلے تو وہ وہم سمجھ کر مسکرا دیا مگر جب مسلسل خوشبو محسوس کرتا رہا تو مڑ کر دیکھا۔ حیرت سے اس کی آنکھیں پھیل گئیں اس کے سامنے دسترخوان بچھا ہوا تھا انواع قسم کے کھانے موجود تھے۔ اس نے سیر ہو کر کھایا۔ مشروب بھی خوب پیا۔ جب بھوک مٹ چکی تو ایک خیال سے اس کے جسم کو جھٹکا لگا۔ وہ جلدی سے اٹھا اور وہ پرچی تلاش کرنے لگا۔ اسے یقین واثق تھا کہ یہ سب اسی پرچی کی کرامات تھیں جسے اس نے بے کار سمجھ کر پھینک دیا تھا۔ مگر وہ پرچی غائب ہو چکی تھی۔

برفانی ہواؤں نے نجانے اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا۔ ساجد اب کف افسوس ملنے کے سوا کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ کھانے سے اسے کافی توانائی ملی تھی، باقی بچا کھچا کھانا اس نے ایک تھیلے میں سنبھال لیا اور آگے بڑھنے لگا۔

رات تک وہ ایک مناسب جگہ تلاش کر چکا تھا۔ کچھ جھاڑیاں بھی اسے نظر آ گئیں۔ اس نے انہیں آگ لگانے کی ٹھانی اور جیب سے لائٹر نکالنے کے لئے ہاتھ کوٹ میں ڈالا۔ اگلے ہی لمحے وہ اٹھا اور زوردار قسم کا بھنگڑا ڈالنے لگا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر عجیب عجیب آوازیں نکالنے لگا اور وہ یہ سب کچھ کرنے میں حق بجانب بھی تھا۔ اس کے ہاتھ میں وہی سفید پرچی تھی۔ جسے کھو کر اسے زندگی میں سب سے زیادہ افسوس ہوا تھا۔ اس نے پرچی کو ہاتھ میں تھاما اور زور سے بولا۔ "ان جھاڑیوں میں آگ لگ جائے۔"

اگلے ہی لمحے جھاڑیاں تڑ تڑ جل رہی تھیں۔ ساجد نے ایک بار پھر خوشی سے سرشار ہو گیا اور تسلی سے بیٹھ گیا۔ اور زوردار آواز سے بولا۔

"میں اپنے فلیٹ میں پہنچ جاؤں۔" مگر کافی دیر گزر گئی کچھ بھی نہ ہوا۔ اس نے ایک بار پھر کہا۔ مگر معاملہ جوں کا توں رہا۔ اس نے پرچی ہاتھ میں لی اور کھانے کا کہا مگر اس بار کھانا بھی نہیں آیا۔ اس کی طبیعت مضمحل ہونے لگی۔ وہ بے چین ہو کر لیٹ گیا۔ پتہ نہیں یہ سب کیا تھا۔ اتنی خوشی کے بعد ایک دم پھر مایوسی کا اندھیرا چھا گیا تھا۔ امید کا سورج جھلک دکھا کر غائب ہو چکا تھا۔

ساجد نے اپنی آنکھیں موند لیں۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اسے گرمی لگنے لگی۔ بہت عرصے بعد اسے گرمی کا احساس ہوا تھا۔ شاید آگ کا اثر تھا۔ اس نے آنکھیں کھول دیں۔ مگر یہ کیا؟ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ "یا

میرے مولا! یہ کیا ماجرا ہے؟ کہیں میں اندھا تو نہیں ہوگیا۔" اس نے دل ہی دل میں سوچا اور لرز کر رہ گیا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا، پھر اٹھ کر کھڑا ہوگیا اور باہر نکلنا چاہا تو اس کا پاؤں زور سے کسی چیز سے ٹکرایا تو وہ منہ کے بل گرا، اس وقت اسے کسی گاڑی کی آواز سنائی دی ساتھ ہی کچھ روشنی ہوگئی، وہ وہیں سجدے میں گر گیا کیونکہ وہ اپنے فلیٹ میں موجود تھا۔

رات کا وقت تھا اور تمام لائٹس آن کی اور جلدی جلدی کپڑے تبدیل کیے۔ برفانی کپڑوں میں اسے شدید گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ کپڑے تبدیل کر کے فارغ ہی ہوا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی اس نے دروازہ کھولا تو سامنے سیکورٹی گارڈ کھڑے تھے۔ وہ بند فلیٹ میں جلتی لائٹ دیکھ کر آئے تھے۔ ساجد کو سامنے پا کر حیران رہ گئے۔

اس نے ادھر ادھر کی باتیں کر کے انہیں مطمئن کردیا۔ وہ پرچی کے بھید کے بارے میں سوچ سوچ کر حیران ہوتا رہا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔

صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو اپنے کمرے میں ایک بوڑھے شخص کو دیکھ کر حواس باختہ ہوگیا، اور وہ اچھل کر بیٹھ گیا اسے یوں اچھلتا دیکھ کر بوڑھا گویا ہوا۔

"گھبرائیں نہیں۔ محترم ساجد، میں سالار کے پاس سے آیا ہوں۔ امید ہے آپ پہچان گئے ہوں گے۔ مجھے سالار نے بھیجا ہے کیونکہ آپ کو ہماری وجہ سے بہت ساری جان لیوا مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا اس لئے انہوں نے مجھے آپ کے پاس معذرت کرنے کے لئے بھیجا ہے۔ اور ساتھ ہی آپ کے لئے یہ نذرانہ بھی بھیجا ہے۔" اس نے ایک سنہری تھیلی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

ساجد اس کو پہچان چکا تھا۔ اس لئے اب وہ مطمئن تھا اور اس کی باتیں سن کر مزید مطمئن ہوگیا تھا۔

"میری طرف سے محترم سالار کا شکریہ ادا کیجئے گا۔" ساجد نے کہا۔

یہ سن کر بوڑھا اٹھ کھڑا ہوا اور ساتھ ہی تھیلی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"محترم! اس تھیلی کی ایک خصوصیت ہے کہ اس میں جو چیز ڈالی جائے وہ کبھی ختم نہیں ہوتی، امید ہے آگے آنے والی زندگی میں یہ آپ کے لئے بہت مفید ثابت ہوگی اور اب مجھے اجازت دیجئے۔"

اجازت کا سن کر ساجد کے ذہن میں یک لخت ایک خیال آیا۔ اور وہ بولا۔

"بزرگ مجھے پرچی کے 'پراسرار بھید' نے پریشان کردیا ہے، کیا آپ مجھے کچھ بتائیں گے؟"

پرچی کے بارے میں سن کر بوڑھا مسکرایا اور ساجد کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"وہ پرچی نہیں، ہرکات کا محافظ طلسم تھا اور وہ جس کے پاس ہو اس کی تین خواہشیں پوری ہوتی ہیں۔ جب تک خواہشات پوری نہ ہوجائیں تب تک طلسم اپنے حاصل کرنے والے سے دور نہیں جاسکتا۔ خواہش پوری کرنا طلسم کی اپنی منشاء پر منحصر ہے، فوراً پوری کردے یا کچھ دیر کے بعد۔ جیسے ہی خواہشات پوری ہوتی ہیں طلسم خود بخود ہرکات کے پاس پہنچ جاتا ہے۔"

بات مکمل کر کے بوڑھے نے خدا حافظ کہا اور غائب ہوگیا۔

ساجد نے تھیلی کو ہاتھ میں لیا اور کھول کر دیکھا تو اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ تھیلی کے اندر بیش قیمت ہیرے موجود تھے اور بقول سالار کے اس میں موجود چیز کبھی ختم نہیں ہوسکتی۔

مطلب یہ کہ ساجد کے وارے نیارے ہوگئے تھے اب ساری زندگی عیش و آرام اس کا مقدر تھا۔ کوہ پیمائی کا شوق ساجد اب صرف ان پہاڑوں کو سر کر کے پورا کرتا ہے جن پر اس کے بیوی بچے بھی چڑھ سکیں وہ بھی دو تین سال میں ایک بار۔ کیونکہ نایاب ہیروں کی تجارت سے اسے فرصت ہی نہیں ملتی جو لوگوں کی نظر میں وہ افریقہ سے لاتا ہے مگر حقیقت ساجد کو ہی معلوم ہے۔

شکاری

ناصر محمود فرہاد۔ فیصل آباد

نوجوان کے سامنے جب بچاؤ کا کوئی راستہ نہ رہا تو اس نے مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق عفریت کے سامنے جانے کا سوچ لیا، اور پھر اپنی سوچ کو عملی جامہ پہنا کر عفریت کے سامنے چلا گیا کہ پھر اچانک......

ہر اچھائی برائی قسمت میں نہیں لکھی ہوتی بلکہ اس کا ذمہ دار انسان خود ہوتا ہے

پہلا دن پورا دن اس بحری ٹینکر سے نیچے اترنے میں لگا۔ جہاز کی اکلوتی لائف بوٹ سمندر میں ڈوب چکی تھی۔ اینڈمن لے کر جانے والا ہمارا بحری جہاز بھی اب ڈوبنے کے قریب تھا۔ رات میں آنے والا ہیبت ناک طوفان گزر چکا تھا اور اس وقت سمندر پرسکون تھا اور اس میں تیرنے والی واحد چیز، وہ بہت بڑا برفانی تودہ تھا جس سے رات کے وقت ٹکرا کر ہمارا جہاز بری طرح ٹوٹ گیا تھا اور اس پر لگنے والی آگ نے جہاز کو بری طرح جلانے کے ساتھ ساتھ تقریباً سارے عملے کو اگلے جہان پہنچا دیا تھا۔ اب وہ برفانی تودہ بڑے آرام اور سکون سے سمندر کی سطح پر ایک بہت بڑے عفریت کی مانند محو سفر تھا، اور اب میں اسی پر پناہ لینے پر مجبور تھا حالانکہ یہ بہت عجیب تھا۔

یہاں اس برفانی تودے پر اب میرے پاس

ریڈیو ہے نہ بیرونی دنیا سے رابطے کا کوئی ذریعہ کہ میں کسی کو اپنی موجودہ حالت سے آگاہ کرسکوں۔ آہستہ آہستہ میں ٹینکر والی جگہ سے دور ہٹ رہا تھا۔ سمندری ہوا مجھے اس تودہ سمیت جنوب مشرق کی طرف دھکیل رہی ہے۔ اس کی رفتار میرے اندازے کے مطابق آدھا ناٹ فی گھنٹہ ہے اور اس کا رخ خلیج کے گرم پانیوں کی طرف ہے۔ اب سب سے اہم سوال یہ سامنے آن کھڑا ہوا ہے کہ میں جس برفانی تودے پر موجود ہوں کیا اس کے مکمل طور پر پگھلنے سے پہلے کوئی امدادی ٹیم مجھے بچا پائے گی یا نہیں کیونکہ جوں جوں یہ تودا گرم پانیوں کی طرف بڑھے گا تو تیزی سے پگھلتا جائے گا۔

اس قسم کے برفانی تودے تازہ پانی سے بنے ہوتے ہیں اس لیے مجھے یہ تسلی ہے کہ میں پیاس سے نہیں مروں گا، لیکن ایک سوال ضرور منہ کھولے میرے سامنے کھڑا ہے کہ بھوک سے کب تک لڑسکوں گا۔ جہاز کے عرشے سے نیچے اترنے سے پہلے جہاز کے کپتان کے کمرے سے میں نے امدادی سامان کا ایک پیکٹ اپنی کمر سے باندھ لیا تھا جس میں ہک اور مضبوط رسیوں کے علاوہ مچھلی پکڑنے کا سامان بھی موجود تھا۔ میرا خیال ہے کہ اب مجھے ان کی مدد سے مچھلی پکڑنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ اپنی بھوک مٹا سکوں۔

میرا امدادی سامان اور لباس مکمل طور پر واٹر پروف ہے لیکن اس کے اندر مجھے گرمی لگ رہی ہے۔ پورے جسم سے پسینہ بہہ رہا ہے مگر مجھے امید ہے کہ میں اتنی جلدی مروں گا نہیں۔

تیسرا دن: عجیب بات ہے ایک بھی مچھلی کانٹے میں نہیں پھنسی، حتیٰ کہ ان کا کوئی نشان بھی پانی میں نظر نہیں آرہا۔ ہاں بہت دور شائبہ پڑتا ہے کہ وہ دائرے میں چکر لگا رہی ہیں مگر وہ تودے کے قریب نہیں آرہی ہیں کہ میں ان کا شکار کرسکوں، لگتا ہے وہ جان بوجھ کر مجھے نظر انداز کررہی ہیں۔

کھلے آسمان پر سورج آگ برسا رہا ہے اور سایہ دار جگہ کی تلاش میں آج میں نے سارے تودے کا ایک چکر لگایا، یہ بہت طویل و عریض نہیں ہے اس لیے جلد ہی چکر مکمل ہوگیا۔ اس کی ہموار سطح بہت شاندار ہے۔ اس کی مخروطی شکل کہیں کہیں بالکل ہموار ہے مگر جہاں ڈھلوان ہے وہ بھی اتنی زیادہ نہیں ہے کہ اس پر چلنے میں دشواری ہو، لیکن جس عجیب بات نے مجھے پریشان کیا وہ یہ کہ اس کی سطح اتنی ملائم نہیں جتنی باقی برفانی تودوں کی میں نے دیکھی ہے۔ یہ تودہ ٹھوس برف سے بنا ہوا ہے اور بالکل پتھر کی مانند سخت ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے یہ بہت قدیم ہے اور اس پر سینکڑوں موسموں کا اثر ہے۔ سورج کی کمزور حدت اور بارشوں نے اس کی سطح کو دانے دار بنا دیا ہے۔ اس کی سطح میں گڑھے بن چکے ہیں، کچھ میرے ہاتھ سے زیادہ بڑے نہیں ہیں لیکن ایک اتنا بڑا نظر آیا کہ میں رینگ کر اس کے اندر جاسکتا ہوں۔ وہ گڑھا غار کی مانند نظر آرہا ہے، مگر اندر تو بہت ٹھنڈ ہوگی، اگر میں اس کے اندر بیٹھ کر اس کے بیرونی منہ کو بند کردوں تو بچاؤ کا سامان پیدا ہوسکتا ہے، جسم گرم رہ سکتا ہے اور رات آرام سے گزر سکتی ہے۔ اس طرح کے مزید گڑھے نما غار بھی مجھے ملے ہیں، میں بعد میں آرام سے ان کا معائنہ کروں گا۔

چوتھا دن: آج میں تودے کی سطح پر بنے گڑھوں کا معائنہ کررہا تھا، ایک تو اتنا بڑا ہے کہ اس کے اندر راستے بھی بنے ہوئے ہیں، کچھ سرنگوں کی مانند ہیں۔ آج میں ان میں سے سب سے بڑے غار کے اندر اترا جو مجھے بہت دور اندر تک لے گیا، میں دیکھنا چاہتا تھا کہ یہ کہاں جاکر ختم ہوتا ہے۔ میرا اندازہ تھا کہ چند میٹر چلنے کے بعد یہ بند ہوجائے گا، مگر وہ تو چلتا ہی گیا کچھ دور چلنے کے بعد اس میں سے مزید کئی رستے نکلتے نظر آئے۔ مجھے یوں لگا کہ میں ان میں گم ہوجاؤں گا۔ کئی مقامات پر مجھے سرنگ کی چھت نیچے ہونے کی وجہ سے گھٹنوں کے بل چلنا پڑا اور ایک آدھ جگہ تو رینگ کر بھی راستہ طے کرنا پڑا۔ میں کئی دفعہ جانے پہچانے راستوں سے بھی گزرا۔ اس سے میں نے نتیجہ نکالا کہ یہ تودہ اندر سے ایسی کئی سرنگوں سے اٹا پڑا ہے جو ایک دوسرے سے

جڑی ہوئی ہیں اور یہ فرنچ پنیر کے ٹکڑے کی مانند اندر سے کھوکھلا ہے۔ پھر مجھے اس کا مرکز مل گیا۔

اس برفانی تودے کے نیچے ایک کھلی جگہ ہے، ایک چھوٹا سا ہال ہے جو تقریباً بیس قدم کے محیط پر مشتمل ہے، لگتا ہے یہاں سے برف پگھل چکی ہے، مگر کیسے...... یہ علم نہیں۔ دیواریں پگھلی ہوئی ہیں اور فرش کے عین درمیان پانی کھڑا ہے، میرے ٹخنے اس کے اندر بھیگ رہے ہیں۔ یہاں کچھ روشنی ہے، کہیں کہیں سے سورج کی روشنی کی کچھ شعاعیں اندر گھس کر ماحول کو ملگجا بنا رہی ہیں، مگر اس روشنی میں واضح طور پر کچھ دیکھنا ممکن نہیں۔

ہلکی روشنی میں میری نگاہیں دھیرے دھیرے آس پاس کا جائزہ لینے لگیں، میں ہر چیز کو بغور دیکھ رہا تھا کہ اچانک ایک جگہ میری نظریں ٹک گئیں۔ پہلے پہل تو مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا پھر کچھ کچھ اندازہ ہونے لگا۔ برف کی شفاف تہوں کے اندر مجھے کسی جاندار کا جسم نظر آرہا تھا جو برف کے اندر دفن ہوچکا تھا۔ یہ اندازہ کرنے میں مجھے کافی دیر لگی کہ برف کی دیواروں میں کس قسم کا جاندار یا چیز دفن ہے۔

ان کی تعداد تین تھی۔ پہلی نظر میں تو یوں لگا جیسے یہ کوئی انسانی جسم ہے مگر بغور دیکھنے سے اندازہ ہو کہ یہ اعضا انسانی نہیں ہیں۔ برف کے اندر مجھے گیند کی طرح گول کچھ چیزیں نظر آرہی تھیں۔ ان کا سائز تقریباً میرے سر کے برابر تھا اور وہ سب گیندیں ایک ٹیوب نما چیز سے جڑی ہوئی تھیں جس کا سرا پیچھے کہیں برف کے اندر دفن تھا۔ ناکافی روشنی کے سبب دور تک دیکھنا ناممکن تھا۔ سائے لہرا رہے تھے۔ ایک گولا بدنما اور ٹوٹا ہوا نظر آرہا تھا جب کہ باقی دونوں چمکدار اور ٹھوس تھے۔

میں ان کے متعلق کوئی اندازہ لگانے سے قاصر تھا۔ تب اچانک مجھے برف کی اس دیوار سے ایک پنجہ باہر نکلا دکھائی دیا جس کے دو بڑے بڑے ناخن تھے جو کسی تیز دھار بلیڈ کی مانند تھے اور یہ بالکل جھینگا مچھلی کے پنجوں کی مانند تھا۔ کسی عقاب کی چونچ کی مانند مڑے ہوئے ان کی کل لمبائی تقریباً چار فٹ تھی اور یہ پنجہ تقریباً آدھا دیوار سے باہر تھا۔

میں چونک گیا، ایک دم میرے ذہن میں جھماکا ہوا۔ دیوار میں نظر آنے والے تین گولے درحقیقت اس عفریت کی آنکھیں تھیں۔ یقیناً اس برف کے تودے کے اندر کوئی عظیم الجثہ عفریت دفن تھا، کوئی ایسا عفریت جس کے متعلق دیکھا یا سنا نہیں گیا تھا۔ یہ کوئی قشری (خول دار) جانور تھا جو لاکھوں نہیں تو ہزاروں سال ضرور قدیم تھا۔

میں کافی دیر کھڑا اسے گھورتا اور اس پر غور کرتا اور حیران ہوتا رہا۔ میں نے اپنے ہاتھوں سے ان بڑی بڑی آنکھوں کے سامنے برف صاف کرنے کی کوشش کی تاکہ میں ان کو بہتر طریقے سے دیکھ سکوں۔ فرش پر کھڑے پانی کی وجہ سے نیچے نہیں بیٹھ سکتا تھا، اس لیے مجھے جھک کر ان کو دیکھنا پڑ رہا تھا۔ سہارا لینے کے لیے میں نے اپنا ایک ہاتھ برف سے باہر نکلے ہوئے پنجے پر رکھا اور اپنا وزن اس پر ڈال دیا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے اس پنجے میں حرکت محسوس ہوئی پہلے تو میں نے اسے اپنا وہم سمجھا مگر جب دوبارہ یہی کچھ ہوا تو میں ایک دم چیخا اور اس ہال سے باہر بھاگا۔ دیواروں سے ٹکراتا، گرتا پڑتا، سانس لینے کی کوشش کرتا، سرنگوں سے سر ٹکراتا، میں باہر نکلا۔ باہر سورج کی روشنی اور کھلی ہوا نے مجھے سہارا دیا۔

باہر جب دم میں دم آیا اور میں کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو میں نے اپنے آپ کو کافی احمق تصور کیا۔ یقیناً وہ پنجہ متحرک ہوا ہوگا کیونکہ میرا پورا وزن اس پر تھا اور میرے ہاتھوں کی حدت کی وجہ سے برف پگھلی اور اس کی وجہ سے وہ پنجہ اپنی جگہ سے ہلا ہوگا۔ ورنہ اس کے زندہ ہونے کا کیا جواز تھا۔ وہ کئی سال سے برف میں دفن تھا۔ اس میں زندگی کا کیا سوال...... یہ ناممکن ہے......

چھٹا دن: بہت بھوک لگ رہی ہے۔ کوئی مچھلی نہیں پھنسی، آسمان پر کوئی پرندہ بھی نہیں ہے۔ تاحد نظر پانی ہے، زمین کا کہیں نام و نشان نہیں۔ میں اس وسیع و عریض نیلگوں پانی کی چادر پر بالکل تنہا ہوں۔ صرف

برفانی تودے کے چٹخنے اور چلنے کی آواز آرہی ہے۔ بہت بھوک لگی ہے۔ مجھے دوبارہ اندر جانا چاہیے اور کوشش کر کے اپنے شکاری چاقو کی مدد سے اس بہت بڑے پنجے کو برف سے نکال لینا چاہیے۔ اس پنجے کا گوشت میری بھوک مٹا سکتا ہے۔ کہیں پڑھا تھا کہ سائنس دانوں کی ایک ٹیم کو سائبیریا میں ایک برفانی تودے کے اندر سے پوری طرح جما ہوا، نایاب نسل کا بالوں والا عظیم الجثہ ہاتھی ملا تھا۔ وہ سائنس دان تھے اور تجربہ کرنا چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے اس جانور کے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹا اور آگ پر بھون کر کھا گئے۔ انہوں نے بتایا کہ اس کا ذائقہ عجیب اور بہت برا تھا مگر ان سائنس دانوں میں سے کوئی بھی اسے کھا کر بیمار نہیں پڑا تھا۔

مجھے حوصلہ ہونے لگا ہے۔ میں سرنگ میں تھوڑی دور تک اندر جاؤں گا اور وہاں ہوسکتا ہے اور بھی پنجے ہوں جو میرے کھانے کے لیے کافی ہوں۔ مگر مجھے اندر جاتے ہوئے انجانا خوف ہے۔ میں اپنے آپ کو یقین دلا رہا ہوں کہ وہ مردہ ہے، مرچکا ہے اس میں زندگی کہاں۔

ساتواں دن: آخرکار مجھے اندازہ ہوگیا بلکہ پتہ چل گیا کہ کوئی مچھلی اس برفانی تودے کے قریب کیوں نہیں پھٹک رہی ہے یقیناً وہ اس عفریت سے خوف زدہ ہیں جو اس کی برفانی دیواروں کے اندر موجود ہے۔ کیا وہ زندہ ہے...... اوہ میرے خدا!...... اگر وہ واقعی زندہ ہے تو اب کیا ہوگا؟۔

اپنا شک اور بھوک مٹانے کے لیے میں دوبارہ اس سرنگ میں گھسا۔ میں اس پنجے کو کاٹنا چاہتا تھا۔ اب سرنگ میں جانا قدرے آسان تھا کیونکہ ہر گزرتے لمحے کے ساتھ برف پگھلنے کے سبب راستے وسیع ہوتے جا رہے تھے۔ ان کی دیواریں چکنی ہو رہی تھیں۔ جوں جوں یہ برفانی تودہ جنوب کے گرم پانیوں کی طرف بڑھ رہا ہے، اتنی ہی تیزی سے یہ پگھلتا جا رہا ہے۔ لیکن میں محسوس کر رہا ہوں کہ اس کے پگھلنے کی رفتار، درجہ حرارت بڑھنے کی نسبت زیادہ تیز ہے۔ اس کا سبب شاید اس جاندار کے جسم کی گرمی ہے جو نیچے برف میں دفن ہے۔

یہ سوچتے ہی میرا دل تیزی سے دھڑکنا شروع ہوگیا۔

کیا وہ سانس لے رہا تھا۔

میرا خیال تھا کہ یہ آواز اس کے سانس کی نہیں بلکہ یہ ہوا تھی جس کی آواز میں نے سنی تھی۔ ہوا سرنگ میں داخل ہوکر اس کی دیواروں سے ٹکرا کر چکراتی ہوئی جب باہر نکلی تو تیز سیٹی نما آواز پیدا ہو رہی تھی۔ مجھے اندازہ لگانا تھا کہ یہ آواز کس تسلسل سے آرہی تھی اور اس کے درمیان وقفہ کتنا تھا۔

میں یقیناً اس صورت حال میں کسی عفریت کا سامنا کرنے کو تیار نہ تھا۔۔۔

یہ...... کوئی عام کیکڑا نہیں تھا۔ اس قسم کے جاندار کے متعلق میں نے پہلے کبھی کچھ سنا یا پڑھا نہیں تھا، حالانکہ میری زیادہ عمر انہی سمندروں پر سفر کرتے گزری تھی۔ یقیناً ماہر حیوانات ان کے متعلق جانتے ہوں گے۔ اگر یہ جاندار کیکڑے کی نسل سے تھا تو پھر یقیناً یہ زیادہ تیزی سے حرکت کے قابل نہ تھا کیونکہ کیکڑے عموماً بہت سست رفتار ہوتے ہیں، اور پھر ابھی تو یہ جاندار اس برفانی تودے کی تہہ میں دفن تھا، اس کو وہاں سے نکلنے اور حرکت کرنے کے لیے یقیناً بہت زیادہ توانائی کی ضرورت ہوگی۔ اس کی ٹانگوں کی شکل سیاہ سانپ جیسی تھی اور موٹائی میری ٹانگوں کے برابر۔ یقیناً ان سے بچنا آسان کام تھا۔

ان میں سے ایک تو میرے چہرے کے قریب ہی تھا اس کی اندرونی سطح پر تقریباً ایک انچ گول منہ بنا ہوا تھا جس میں سے سوئیوں کی مانند نوکیلے دانت باہر کو جھانک رہے تھے۔ ان پر موجود چکناہٹ نے مجھے خوف زدہ کردیا۔ ہوسکتا ہے یہ زہریلے بھی ہوں۔

جب میں نے اس عجیب جانور کو دیکھا تو خوف کے مارے میری چیخ نکل گئی اور میں فرش پر گر گیا، گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی تو میری ٹانگ مڑ گئی اور تقریباً ٹوٹتے ٹوٹتے بچی مگر میں نے اس کی پرواہ نہ کی اور گرتے پڑتے باہر کی طرف بھاگا، کھلے آسمان تلے آکر سانس لی، میری

کوشش تھی کہ ہر ممکن حد تک اس سرنگ سے دور رہوں۔ میرا ذہن اس خیال سے ماؤف ہو رہا تھا کہ اس برفانی تودے پر میں اکیلا جاندار نہیں ہوں، کوئی اور بھی میرے ساتھ ہے جس سے مجھے بچنا ہوگا۔

جب ذرا سانس بحال ہوئی تو میں بیٹھ گیا، مجھے اپنے پاگل پن پر ہنسی آرہی تھی۔ اس کیکڑے کی حرکت کیچوے سے بھی کمزور تھی اور یقیناً اس سرنگ سے باہر آنے میں اسے پورا دن لگ جائے گا۔ اگرچہ مجھے اس کے جسم کی طوالت کا اندازہ نہیں تھا۔

میں پرسکون ہونے لگا کیونکہ میں اپنی توانائی ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ایک ہفتے کی بھوک نے مجھے کمزور اور تھکا دیا تھا۔ اب اس طرح کی خوف زدہ بھاگ دوڑ میرے مفاد میں نہیں تھی کیونکہ مجھے اپنے بچاؤ تک زندہ رہنا تھا۔ مگر سارا دن خوف کی ایک عجیب سی لہر میرے پورے جسم پر چھائی رہی۔ جب رات ڈھلی تو میں سردی سے کپکپانے لگا، مجھے نیند بھی آرہی تھی۔ تودے کے اوپر مجھے ایک گڑھا مل گیا۔ یہ سرنگ نہیں تھی مگر میں اس کے اندر سما سکتا تھا۔ میں نے اپنے گرد کمبل لپیٹا اور اس گڑھے کے اندر اتر گیا۔ میں کچھ دیر سونا چاہتا تھا تاکہ اپنی توانائی بحال کرسکوں اور آئندہ کا لائحہ عمل طے کرسکوں۔

لیکن اس قسم کی صورت حال میں طویل اور گہری نیند لینا ممکن نہیں ہوتا۔ یوں لگا جیسے محض ایک لمحے کو آنکھ جھپکی ہو، مگر جب آنکھ کھلی تو ہر طرف صبح کی روشنی پھیل چکی تھی۔ یوں لگا جیسے گذشتہ روز کا سارا خوف بے بنیاد تھا جو سورج کے چڑھنے کے ساتھ ہی ہوا میں تحلیل ہوگیا ہو۔ میں نے کمبل سے نکل کر ایک نئی صبح کا استقبال کیا۔ ہوسکتا ہے آج مجھے کھانے کو کوئی مچھلی مل جائے یا پھر ہوسکتا ہے کسی بحری جہاز کی نظر مجھ پر پڑ جائے۔ موجودہ صورت حال میں منفی کی بجائے مثبت سوچ میری مدد کرسکتی تھی۔

میں نے ہاتھ اٹھا کر ایک بھرپور انگڑائی لی اور چاروں طرف ایک نظر دوڑائی۔

میری انگڑائی ادھوری رہ گئی، میں دم بخود رہ گیا۔ تین مختلف سرنگوں میں سے اس عفریت کی تین ٹانگیں باہر کو رینگ رہی تھیں اور میری طرف بڑھ رہی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ میں کہاں ہوں۔ وہ مجھے تلاش کرسکتا تھا۔

وہ بھی میری طرح بھوکا اور شکار کی تلاش میں تھا۔

نواں دن: (بھاری قدموں کے دوڑنے کی آوازیں اور پھر ہانپنے کا شور......) میں تودے کی دوسری طرف چلا گیا تاکہ کیکڑے کے لمبے لجلجے بازوؤں سے بچ سکوں۔ وہاں چلا جاؤں جہاں وہ مجھے نظر نہ آسکیں یا میں ان کو نظر نہ آسکوں۔ برفانی تودے کی دوسری سمت آ کر مجھے محسوس ہوا کہ میں یہاں محفوظ ہوں اس لیے میں آرام کرنے کے لیے رک گیا، مگر جلد ہی پھر اٹھ گیا۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ اب وہ کیکڑا کہاں ہے لیکن وہ مجھے کہیں نظر نہ آیا، میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

دسواں دن: سیاہ آسمان پر کروڑوں ستارے موتیوں کی طرح جھلملا رہے ہیں، ان کی دھیمی روشنی میں سمندر کا پانی بھی سیاہی مائل نظر آرہا ہے اور اپنی پوری شان سے اپنی عظمت اور دبدبے کا ہلکی ہلکی غراہٹ سے اعلان کرتا ہوا ہر چیز نگلنے کو تیار ہے۔ برفانی تودہ اپنی ہی روشنی میں چمک رہا ہے۔ مگر اب وہ کیکڑے کی ٹانگوں سے بھرا ہوا ہے۔ وہ درجن بھر کے قریب ہوں گے۔ جو پیچ و تاب کھاتے اور مچلتے ہوئے سرنگوں سے باہر نکل رہے ہیں اور بے تابی سے برف پر رینگتے ہوئے اپنے پیچھے گہرے نشان چھوڑتے جا رہے ہیں۔ میں ان سے بچ سکتا ہوں۔ لگتا نہیں کہ وہ میرا تعاقب کر رہے ہیں کیونکہ برف پر ان کے رینگنے کے نشانات بے ربط ہیں، شاید وہ میرے تھک جانے کا انتظار کر رہے ہیں کیونکہ میں جہاں جاتا ہوں ان کو اپنے پیچھے اور قریب پاتا ہوں۔ شاید وہ میرے جسم کی خوشبو اور گرمی کو پہچانتے ہیں یا پھر ان کو میرے قدموں کی چاپ سننے کی صلاحیت حاصل ہے۔ وہ اس انتظار میں ہیں کہ میں کوئی غلطی کروں اور وہ مجھے دبوچ لیں۔

اس بات کو سمجھنا مشکل تھا کہ یہ کوئی درجن بھر بھوکے سانپ نہیں بلکہ یہ اس ایک عفریت کے کئی ہاتھ ہیں جو نیچے برف میں دفن ہے۔ وہ ایک جانور جو میری

جان کے درپے ہے۔ کیا اس سے مقابلہ کرنے کا کوئی طریقہ ہے، کوئی ایسی چیز مل سکتی ہے جس سے میں اس کو ہلاک کرسکوں۔ شاید مجھے خالی ہاتھ ہی کوشش کرنا ہوگی۔

میری پہلی ترجیح خوراک کی تلاش تھی کیونکہ مجھے توانائی درکار تھی۔ اب تو خوف کے مارے میں سوبھی نہیں سکتا، وہ کہیں بھی اس تودے پر مجھے تلاش کرسکتا ہے۔ صرف ایک کام ایسا ہے جو میں درست طریقے سے کرسکتا ہوں مگر اس میں خطرہ بہت ہے۔ مجھے بس یہ کرنا ہے کہ کسی طریقے اس کے قریب جا کر اپنا وار کردوں، ان میں سے ایک بازو کے قریب جاؤں، اتنا قریب کہ اس کے ٹکڑے کاٹ سکوں۔ شاید اس طرح میری بھوک مٹ جائے۔

گیارہوں دن: اوہ میرے خدا!...... کیا میں بیمار پڑ گیا ہوں۔ مجھے ایسی غلطی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں اس کیکڑے کی ٹانگ کے گوشت کا ہر لقمہ پھینکنے جارہا ہوں جس کو میں نے کاٹ کر کھایا۔ اس کا ذائقہ نہایت واہیات ہے جیسے کوئی جراثیم کش دوا ہو۔ میں اپنے جسم میں کمزوری محسوس کررہا ہوں، موت کو اپنے قریب محسوس کررہا ہوں اس لیے اس بدذائقہ کھانے کو زہر مار کرنا پڑے گا، یہ زہر اپنے معدے میں اتارنا پڑے گا۔ میری آنتیں جل اٹھیں۔ اگر میں اس کو اچھی طرح صاف کرلوں تو شاید اس کا ذائقہ بہتر ہو جائے مگر بھوک شدید ہے۔

بارہواں دن: اس عفریت نے میری ٹانگ کو جکڑ لیا ہے جس کی وجہ سے اس میں سے خون بہہ رہا ہے مگر زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں ہے صرف اس عفریت کے دانتوں نے میری ٹانگ پر چند خراشیں ڈالی ہیں جس سے جلد سرخ ہوگئی ہے اور خون بھی نکل رہا ہے۔ اتنا تو اس کا حق بنتا ہے کیونکہ میں اس کی ٹانگ کے گوشت کا کچھ حصہ کھانے کے بعد کچھ توانائی محسوس کررہا ہوں۔ لگتا ہے اس کا زہر انسانی جسم کے لیے نقصان دہ نہیں ہے۔

اب میں دوبارہ سونا نہیں چاہتا۔ جونہی آنکھ جھپکتا ہوں یوں لگتا جیسے ہزاروں کیکڑے ایک ساتھ میری طرف بڑھ رہے ہوں۔ اس کے بازوؤں یا ٹانگوں جو بھی کہہ لو کے چلنے کی رفتار بھی اب پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی ہے۔ ایک نے تو میری ٹانگ کو تقریباً دبوچ ہی لیا تھا مگر میں نے اس کو کاٹ کر اپنے جسم سے علیحدہ کردیا اور اپنی ٹانگ بچائی۔

مناظر دھندلا رہے ہیں کانوں میں سیٹیاں گونج رہی ہیں، میں نے اس ریکارڈر کو آٹو میٹک پر سیٹ کردیا ہے کہ جونہی یہ میری آواز سنے تو ریکارڈنگ شروع کردے کیونکہ اب میرے ہاتھوں میں اتنی سکت نہیں کہ بار بار اس کے بٹن کو سیٹ کرسکوں۔

بارہواں دن (مزید): (زوردار دھماکہ) کیا تم نے یہ سنا...... یہ بہت تیز آواز تھی میری آنکھ اسی کی آواز سے کھلی ہے۔ کیکڑے کے بازو بھی میرے بہت قریب پہنچ چکے ہیں۔ مجھے اب اپنی جگہ سے ہلنا ہوگا اسی لیے اب میں اس طرف جارہا ہوں جہاں سے دھماکے کی آواز آئی ہے۔ یہ خطرناک ہوسکتا ہے مگر اس کے متعلق جاننا ضروری ہے...... اوہ میرے خدا!...... تودے کا ایک بہت بڑا حصہ علیحدہ ہوکر پانی میں جاگرا ہے کیونکہ اب یہ زیادہ تیزی سے پگھل رہا ہے۔ گرم پانی اور عفریت کیکڑے کے جسم کی گرمی کی وجہ سے لگتا ہے جلد ہی یہ تودہ برف کے ٹکڑوں میں بٹ جائے گا پھر مجھے اسی پانی میں تیرنا پڑے گا جس میں وہ عفریت نما کیکڑا موجود ہوگا۔

جہاں سے برف کا ٹکڑا ٹوٹ کر گرا ہے وہاں سے میں نیچے اس تودے کے قلب میں جھانک سکتا ہوں جہاں اس کیکڑے کا مرکزی جسم موجود ہے۔ وہ جگہ اب کیکڑے کے بازوؤں سے بھرا پڑا ہے برف پگھلنے کی وجہ سے وہ برفیلی قید سے آزاد ہوچکے ہیں اور یہاں وہاں سانپوں کی مانند کلبلا رہے ہیں۔ وہ تعداد میں بے شمار ہیں اور ان کی حرکت زیادہ تیز نہیں مگر وہ مسلسل حرکت کررہے ہیں۔ اس عفریت کو تو نیند کی بھی ضرورت نہیں۔ میرے خدا!...... آخر یہ عفریت کتنا بڑا ہے۔ سمندری حیات کے ماہرین ہمیشہ کہتے ہیں کہ اس

دنیا کے سمندروں میں ہماری سوچ سے بھی زیادہ بڑے برفانی تودے موجود ہیں، اور ان میں سے بیشتر کا تقریباً نوے فیصد حصہ ہمیشہ پانی کے نیچے رہتا ہے۔ ان برفیلے منجمد تودوں کے اندر قدرت نے کیا کیا اور کس کس قسم کے جاندار اور چیزیں محفوظ کررکھی ہیں یہ تو صرف قدرت ہی جان سکتی ہے۔ یہ برفانی تودہ بھی جس پر میں موجود تھا اتنا ہی پانی کے نیچے موجود تھا اور ابھی اور کتنے عفریت اس کی ٹھنڈک میں پناہ لیے ہوئے ہیں مجھے تو معلوم ہی نہیں، وہ کس قسم کے ہیں؟۔ کیا وہ دوسری قسم کے جاندار ہیں یا پھر اسی طرح کے کیکڑے ہیں جن کے بازو اور پنجے بھوکے قاتلوں کی طرح میرے تعاقب میں ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ اس سمندر میں طوفان نوح سے قبل کے زمانہ کے اس قسم کے کئی جاندار موجود ہوں گے۔ بولنے سے بھی مجھے تھکاوٹ محسوس ہورہی ہے مجھے اپنی توانائی بچانا ہوگی۔

تیرہواں دن: میری زبان پر ایک قطرہ گرا ہے، بالکل ننھا منا سا...... میں گھنٹوں سے جاگ رہا ہوں۔ کیا میں اپنے آپ کو دھیرے دھیرے مار رہا ہوں؟۔ شاید ہاں...... مگر خوف مجھے جگائے رکھتا ہے۔ جب بھی کیکڑے کے بازو میرے قریب پہنچتے ہیں میں بھی رینگ کر ان سے دور ہٹ جاتا ہوں کیونکہ اب مجھ میں دوڑنے یا چلنے کی سکت باقی نہیں ہے۔ مجھے ابھی تک کیکڑے کا وہ پنجہ یاد آرہا ہے جو میں نے تودے کے نیچے برف میں دبا ہوا دیکھا تھا۔ ان بازوؤں پر ایسے پنجے نہیں تھے جو میں اب یہاں تودے کے اوپر رینگنے والے بازوؤں پر دیکھ رہا تھا۔ تو کیا وہ کوئی اور عفریت تھا ان سے علیحدہ...... آخر یہ کتنے تھے؟۔ یہ بازو تو صرف میری جلد چھیل سکتے تھے لیکن وہ پنجہ تو مجھے دو ٹکڑوں میں کاٹ سکتا تھا۔

اوہ میرے خدا!...... ایک تو ابھی تک میرے جوتے کو چھو رہا ہے۔ میں اس کو دیکھ نہیں پارہا مگر مجھے جان بچانے کے لیے بھاگنا ہوگا۔

چودہواں دن: کراہیں...... آہیں...... سمندر کی لہروں کا شور۔

سولہواں دن: میرا بایاں بازو تو گیا۔ اس طرف کا جوتا بھی...... جہاں میرا پاؤں برف سے ٹکرا رہا ہے۔ مجھے کچھ بھی محسوس نہیں ہورہا۔ پاؤں سیاہ پڑتا جارہا ہے۔ جسم بری طرح کپکپا رہا ہے۔ مگر وہ کیکڑا ابھی تک اسی سست روی سے حرکت کررہا ہے۔ میرے پاس موقع ہے، میں اپنے اس ریکارڈر کو جس میں ابھی تک میں بیتنے والے سارے واقعات کو ریکارڈ کرتا رہا ہوں، واٹر پروف کمبل میں لپیٹ کر باندھ رہا ہوں تاکہ یہ محفوظ رہے۔ پھر ہوا سے بھر کر ایک کور اس پر چڑھاؤں گا تاکہ یہ سمندر کے پانی میں تیر سکے اور ڈوبے نہیں۔ پھر میں اپنی پوری قوت سے اسے سمندر میں اچھال دوں گا۔“ اگر تم یہ سن رہے ہو اور تمہیں میری بات کا یقین ہے تو تم اس عفریت کو ختم کردو اپنی بندوقوں، توپوں سے اس کو سمندر کی تہہ میں دفن کردو۔“

لیکن شاید تم یہ کام نہ کرسکو کیونکہ میں جیت جاؤں گا اور باقی بچے کچھے تودے پر بیٹھ کر تمہارے جہازوں کا انتظار کروں گا۔ معلوم نہیں اس کیکڑے کے جسم میں اس کا دماغ اور دل ہے یا شاید نہیں...... اب میں نیچے سرنگ میں جارہا ہوں جہاں میں اس کی آنکھوں میں جھانک سکوں اس کے جسم کا مرکزی حصہ تلاش کرسکوں اس کا دل یا پھر دماغ اور اس کو ختم کردوں...... یا شاید وہی مجھے، میرے جسم کو ٹکڑوں میں بانٹ دے۔ سرنگ عفریت کے بازوؤں سے بھری ہوئی ہے مگر اب میں ان سے نہیں ڈرتا۔

اب میرے پاس ڈرنے کے لیے ہے ہی کیا...... باقی بچا ہی کیا ہے۔

یہ بازو سرنگ کے باہر محافظوں کی طرح کھڑے ہیں باقاعدہ ہوا میں بلند لہراتے ہوئے مگر میں بھی پوری طرح تیار ہوں۔

میرے لیے دعا کرنا۔

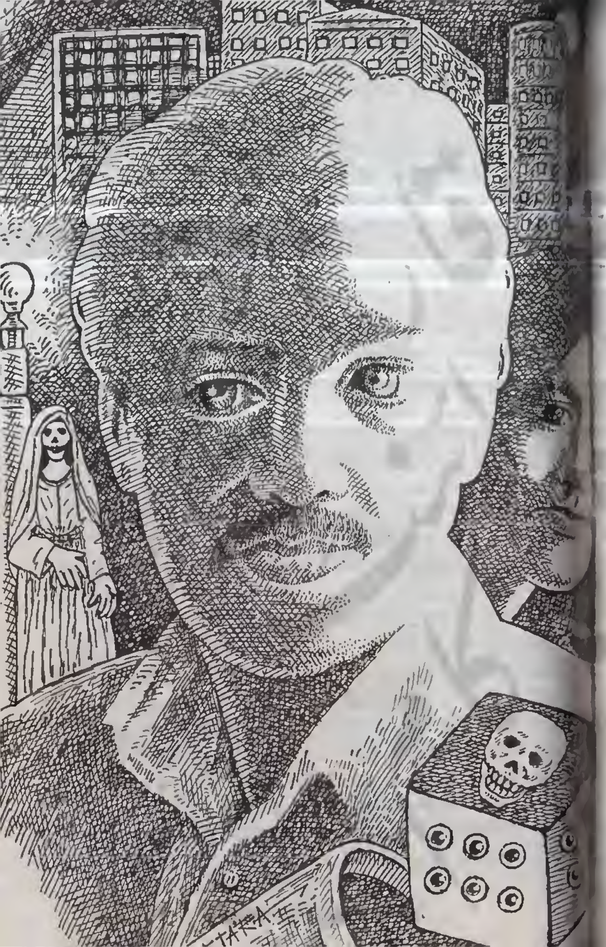

شمیکا

ڈاکٹر اختر ہاشمی۔کراچی

قسط نمبر 4

ایک انسان اور ایک ماورائی مخلوق کی چاہت و خلوص اور دیدہ دلیری پر مبنی شر کے خلاف برسر پیکار، خوفناک حیرت ناک عجیب و غریب حالات و واقعات کے گرد گھومتی ہوئی سوچ کے افق پر محو پرواز اپنی نوعیت کی ناقابل فراموش دلفریبی سے معمور، دل میں کسک پیدا کرتی اپنی مثال آپ داستان حیرت جو کہ پڑھنے والوں کے ذہن سے برسوں محو نہ ہوگی۔

اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کیلئے دل پر اثر کرنیوالی ایک زبردست اور حیرت انگیز روداد

"**شاید** وہ جن اپنے مسکن کی طرف آ رہا ہے۔" شمیکا نے خود کو مجھ سے جدا کرتے ہوئے کہا۔

"اب ہمیں کیا کرنا ہوگا؟" میں نے ششدر ہو کر پوچھا۔

"دیکھو یہ جن سرکش ہے، اسے اس لڑکی کے بالوں سے محبت نہیں ہے بلکہ وہ اس کے جسم پر قابض ہونا چاہتا ہے کہ ساری عمر اس کو اپنی ہوس کا نشانہ بنائے رکھے اور اسے جسمانی اذیت سے دوچار رکھے اور اس پر جنسی تشدد کرتا رہے۔ لہٰذا اس سرکشی جن کو باز رکھنے کے لیے اور اس من موہن لڑکی کو اس کی گرفت سے نکالنے کے لیے ہمیں اسے جلانا ہوگا تاکہ آئندہ کبھی وہ اس لڑکی کو تنگ اور پریشان نہ کر سکے۔" شمیکا نے اس کا علاج بھی مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"جب وہ جن یہاں اس کمرے میں داخل ہوگا تو وہ تمہیں دیکھ کر ٹھٹک جائے گا اور غصے سے آگ بگولہ ہو جائے گا۔ تب وہ تم پر حملہ آور ہوگا کہ تمہارے ہاتھ میں اس کی محبوبہ کے بال ہوں گے۔ تم اس وقت ماچس کی سلائی جلا کر ان بالوں میں آگ لگا دینا۔ جیسے جیسے بال جلتے جائیں گے، ویسے ویسے اس کی جھوٹی محبت دم توڑتی جائے گی اور وہ خود کو جل کر خاکستر ہوتا جائے گا۔ اس کے راکھ ہونے کے بعد وہ لڑکی ہمیشہ کے لیے اس کے اثر سے آزاد ہو جائے گی۔" شمیکا کا اندازہ درست تھا۔ پلک جھپکتے میں وہ کمرے کے اندر آن موجود ہوا تھا۔ میں نے ایک ہاتھ سے اس لڑکی کے بال اور دوسرے میں دیا سلائی پکڑ رکھی تھی۔ وہ واقعی مجھے دیکھ کر پہلے ٹھٹک کر رک گیا۔ پھر غصے سے آگ بگولہ ہوتے ہوئے مجھ پر پھنکارا۔ اس سے پہلے وہ مجھ پر حملہ آور ہو کر بال میری گرفت سے چھڑانے میں کامیاب ہو جاتا۔ میں نے دیا سلائی کو جلا لیا تھا۔ تب وہ چیخا۔

"دیکھو ایسا مت کرو۔ مجھے میری محبوبہ سے جدا مت کرو۔ تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا۔ میری محبوبہ کی رضا مندی پوچھ کر ہمیں ملانے کا۔ مگر تم نے وعدہ خلافی کی ہے۔ جیسے جیسے بالوں کو آگ جلا رہی تھی، اسے جلن سی محسوس ہونے لگی تھی۔ اچھا چلو چھوڑو۔ بجھا دو یہ آگ۔ میں وعدہ کرتا ہوں اس لڑکی کا پیچھا چھوڑ دوں گا۔ اس کی دنیا سے بہت دور چلا جاؤں گا۔ پھر پلٹ کر نہیں آؤں گا۔ مجھے دیکھو مت جلاؤ۔ چھوڑ دو مجھے۔" اس کی آہ و فغاں دیکھ کر میرا دل نرم پڑ گیا۔ میرا دل پسیج گیا تھا۔ میں نے شمیکا کی طرف حسرت بھری نظروں سے دیکھا۔ مگر اشارہ پا کر میں دوبارہ سخت دل ہو گیا۔ بالوں کے

جلنے کے ساتھ وہ جن بھی جل کر راکھ ہوگیا تھا۔ شمیکا نے چارپائی اور چوکی کو کمرا کردیا اور مجھے لے کر اس ویران و سنسان گھر سے باہر آگئی۔

ہم پر نظر پڑتے ہی بوڑھے ماں باپ کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے۔

”تم دونوں کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے۔ تم نے نہ صرف ہماری اکلوتی بیٹی کی زندگی بچالی ہے بلکہ اسے دوسری زندگی عطا کی ہے اور ہمیں بے سہارا ہونے سے بھی بچالیا ہے۔ ہم تمہارا احسان ساری عمر نہیں بھولیں گے۔“ اس کے ماں باپ نے تشکرآمیز لہجے میں ہمارا شکریہ ادا کیا۔

”بابا ہمیں آپ کی بیٹی کے تمام بال منڈوانے ہوں گے تاکہ ہم اسے اور اس کے جلے ہوئے بالوں کو دفن کردیں تاکہ آئندہ کبھی کوئی آسیب اس کو تنگ و پریشان نہ کرسکے۔“ میں نے باباجی سے کہا تھا۔

”تو کیا مجھ پر کسی آسیب کا سایہ ہوگیا تھا جو میری یہ حالت ہوگئی ہے۔“ بابا کی بیٹی نے ہم سب کو اجنبی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں گڑیا ......تم آرام کرو۔ رفتہ رفتہ تمہیں سب کچھ سمجھ آجائے گا۔ فی الحال ہمیں اپنے بال مونڈ لینے دو۔“ شمیکا نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

”نہیں میرے بال ہی تو میری جان ہے اور میرا کزن بھی انہیں کا اسیر ہے۔ کہیں وہ......“ لڑکی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

”نہیں گڑیا......تمہارا کزن تم سے سچی محبت کرتا ہے تو وہ تمہیں ہر حالت میں اپنا لے گا اور پھر تمہارے بال ہمیشہ کے لیے ایسے تھوڑی رہیں گے۔ ان بالوں کے بعد نئے بال آجائیں گے۔ ایک سال بعد پھر تمہارے وہی حسین، دل کش، لمبے، سیاہ، گھنے، چمک دار اور ریشمی بال ہوں۔ تم کہو گی تو میں تمہارے کزن سے بات کرکے اس کے دل کا حال جان لوں گی۔“ شمیکا نے اسے سمجھاتے ہوئے بال مونڈنے شروع کردیئے۔ وہ باتیں بھی کرتی جارہی تھی اور اپنا کام بھی۔

پھر شمیکا نے جلد اپنا کام ختم کر کے مونڈے ہوئے، جلے ہوئے بالوں کے ساتھ وہ بال بھی زمین کھود کر دفن کردیا اور فرش کو ہموار کردیا۔ اب شمیکا کے چہرے پر سکون کے آثار نظر آرہے تھے۔ اس سے پہلے ہم رخصت ہو کر چلے جاتے ، دروازے پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ ہم سب نے دروازے کی طرف گردن گھما کر دیکھا تو ایک دراز قد اور وجیہ شخص کمرے کی طرف تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا آرہا تھا۔

”یہی میری بچی کا کزن ہے، میری بہن کا لڑکا۔“ بابا نے سرگوشی کے انداز میں شمیکا کو بتایا۔

”کیا ہوا میری کزن کو، مجھے شہر سے لوٹنے پر امی نے بتایا تھا کہ نیلما کی طبیعت بہت خراب ہے، اس لیے میں سامان رکھ کر فوراً چلا آیا۔ سانس دم بھی نہیں لیا۔ کہاں ہے میری نیلما۔“ نوجوان کے چہرے پر کرب کی پرچھائیاں نمودار ہورہی تھیں۔

”تو تم نیلما کے کزن ہو۔ کیا تم واقعی نیلما سے بے پناہ محبت کرتے ہو؟“ شمیکا نے آگے بڑھ کر اس نوجوان سے پوچھا۔

”آپ لوگ کون ہیں اور یہ باتیں کیسے جانتے ہیں۔“ نیلما کے کزن کے سوال کا جواب دینے کے بجائے شمیکا نے خود سوال کیا۔

”دیکھو مسٹر، نیلما کو ایک بیماری نے اپنی گرفت میں لے لیا تھا، جس کی وجہ سے اس کے وہ تمام حسین بال جھڑ چکے ہیں جو تمہیں پسند تھے۔ لہٰذا اب وہ اس درخت کی مانند ہے جس کے خزاں کے موسم میں تمام پتے گر جاتے ہیں۔ کیا تم اس صورت میں بھی اس سے محبت جتاتے رہو گے۔“ شمیکا نے اسے کریدتے ہوئے پوچھا۔ وہ دوڑ کر اندر کمرے میں گیا۔ واقعی نیلما گنجی ہوگئی تھی۔ اس کے کزن کو ایک دھچکا لگا اور وہ دل پکڑ کر اس کے قریب بیٹھ گیا۔ وہ خود کلامی کے انداز میں گویا ہوا۔

”نیلما میں نے تم سے سچی محبت کی ہے۔ میری چاہت جسمانی نہیں روحانی ہے۔ ہم روح کی گہرائی سے ایک دوسرے کو چاہتے تھے، چاہتے ہیں اور چاہتے رہیں گے۔ یہ رنگ و روپ، حسن شباب اور جمال وجوبن آتی جاتی چیزیں ہیں۔ بھلا سدا کون جوان رہتا ہے۔ بچپن کے بعد لڑکپن، لڑکپن کے بعد نوجوانی، نوجوانی کے بعد جوانی، جوانی کے بعد ادھیڑ عمری اور پھر بڑھاپا آجاتا ہے۔ محبت کرنے والوں کے لیے ان چیزوں کی، ان کی بندشوں کی کوئی وقعت نہیں ہے۔ محبت کرنے والے روح سے محبت کرتے ہیں جو نہ کبھی بوڑھی ہوتی ہے اور نہ کبھی بدصورت۔ وہ سدا ایک جیسی رہتی ہے اور کبھی مرتی نہیں ہے۔ محبت ایک روح ہے۔ جبھی تو لوگ کہتے ہیں ”محبت مر نہیں سکتی۔“ ہمارے قدموں کی آواز سن کر وہ خاموش ہوگیا تھا، مگر اس نے ابھی تک نیلما کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام رکھا تھا۔

”بابا جان یہ نوجوان واقعی نیلما سے سچی محبت کرتا ہے اور نیلما اس کے ساتھ ہمیشہ خوش رہے گی۔ نیلما کے صحت یاب ہوتے ہی اس کے ہاتھ پیلے کردینا۔ ہماری دعائیں آپ سب کے ساتھ ہیں۔ اب ہم اجازت چاہیں گے۔“ شمیکا نے اجازت چاہی تو بڑی بی نے بڑے ممتا بھرے انداز میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی: ”بیٹی تم دونوں کی جوڑی سدا سلامت ہے۔ تمہیں دنیا بھر کی خوشیاں دیکھنا نصیب ہو، اور تمہاری گود کئی پھولوں سے بھری رہے۔“

شمیکا مسکراتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ میں نے باباجی سے ہاتھ ملاتے ہوئے ہزار ہزار کے جتنے نوٹ بٹوے میں سے نکالے تھے، تھماتے ہوئے کہا۔

”باباجی میری بہن نیلما کی شادی پر خرچ کردینا۔ خدا حافظ۔“ میں بھی شمیکا کے پیچھے پیچھے گھر سے باہر نکل آیا۔

”بڑی بی ہم دونوں کو میاں بیوی سمجھ رہی تھی۔“ میں نے جان بوجھ کر شمیکا کو اور حیا آلود کرنے کے لیے کہا۔

”تو کیا ہم میاں بیوی نہیں ہیں۔“ شمیکا نے نظریں جھکا کر سوال کیا۔ مجھے اس سے اس قدر بے خوفی کی توقع نہیں تھی کہ وہ بولڈ اسٹیپ لے لے گی۔ میرا بھی موڈ بڑی حد تک گفتگو کا ہو چلا تھا۔

”یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ ہم میاں بیوی ہیں۔“ میں نے دوسرا سوال کیا تو میرے لہجے میں حیرت نمایاں تھی۔

”میاں بیوی ہونے کے لیے ایک دوسرے کو قبول کرنا ہوتا ہے۔ اپنے نفس پر دوسرے کو اختیار دینا ہوتا ہے اور اس کے علاوہ کیا ہوتا ہے۔“ شمیکا نے مجھے لاجواب کرنے کا دل ہی دل میں فیصلہ کرلیا تھا۔ ایسا محسوس ہورہا تھا۔

”تو کیا ہم نے ایک دوسرے کو قبول کرلیا ہے۔ کیا ہم نے اپنے اپنے نفس پر ایک دوسرے کو اختیار دے دیا ہے۔“ میں نے اس بار واقعی حیرت سے کہا تھا۔ میں نے شمیکا کو چھیڑنے کے لیے اور مزے لینے کے لیے یہ بات شروع کی تھی مگر اس نے تو سنجیدگی اختیار کرلی تھی۔

”اگر ہم نے ایک دوسرے کو قبول نہیں کیا اور اپنے اپنے نفس پر ایک دوسرے کو اختیار نہیں دیا تو پھر وہ ویران و سنسان گھر میں کس بات کا اظہار کیا گیا تھا۔ اس گھر کی تنہائی میری اس چارپائی پر خاموشی کس بات کا ثبوت تھا۔“ شمیکا نے اپنے دل کی ترجمانی کرنے کی ٹھان لی تھی۔

”مگر میاں بیوی بننے کے لیے نکاح میں گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہمارا گواہ تو کوئی نہیں تھا۔“ میں نے آخری سوال کر ڈالا۔

”ہماری محبت اور ہمارے نکاح کا گواہ خدا ہے اور خدا سے بڑا گواہ اور سچا کوئی نہیں ہے۔“ شمیکا کے اس جواب نے مجھے واقعی لاجواب کردیا تھا۔ میں خاموشی سے اپنا بقایا سفر طے کرنے لگا۔

''کیا تمہیں اپنے کام میں کامیابی ہوئی۔'' مجھے خاموش دیکھ کر شمیرکا نے سکوت توڑ ڈالا تھا۔

''ہاں سرا تو مل گیا ہے۔ مجھے وہیں جانا ہے۔ انشاء اللہ بہت جلد اس مہم سے فارغ ہو کر ہم اپنے گاؤں چلیں گے، جہاں میں تمہیں اپنا لوں گا۔ دنیا والوں کو بھی گواہ بنا کر۔ ٹھیک ہے تم ان لوگوں کا خیال رکھنا۔ میں بہت جلد تم سے آملوں گا۔'' میں یہ کہہ کر رخصت ہو گیا اور شمیرکا اپسرا کے گھر چلی گئی۔

میں نے اریبہ سے رابطہ کیا اور ملنے کا کہا تو اس نے مجھے ایک جگہ کا نام بتایا، میں وہاں با آسانی پہنچ گیا تھا۔ چند لمحوں بعد اریبہ بھی آ گئی تھی۔ وہ مجھے لے کر ایک شان دار ریستوران میں چلی آئی۔

''ارسلان صاحب! مجھے بہت زور کی بھوک لگی ہے۔ آج میرا موڈ تھا کہ آپ کے ساتھ کسی اچھے سے ریستوران میں کھانا کھاؤں ٹھیک ایک بجا ہے اور بھوک کا وقت بھی ہو رہا ہے۔ اکثر ممالک میں ایک بجے ہی لنچ ٹائم ہوتا ہے۔'' اریبہ باتیں کرتی ہوئی ریستوران میں ایک طرف جانے لگی تو میں بھی اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا۔ اس ریستوران میں چھوٹے چھوٹے کیبن بنے ہوئے تھے جو بھی بک نظر آ رہے تھے۔ کیوں کہ یہاں پرائیویسی کا بہت خیال رکھا گیا تھا، جس سے یہ ریستوران اور اس کا ماحول وی آئی پی نظر آ رہا تھا۔ اریبہ نے ایک ویٹر کو نمبر بتایا تو وہ انھیں لے کر ایک گوشے کی طرف لپکا، جہاں ایک کیبن خالی تھا۔ شاید اریبہ نے پہلے سے بک کرا لیا تھا۔ اریبہ نے لنچ کا آرڈر دیا۔

''مس اریبہ! اس قدر تکلف کی کیا ضرورت تھی۔ میں سادہ سا کھانا پسند کرتا ہوں اور پھر فقط چائے کی ایک پیالی پر بھی تو اکتفا کیا جا سکتا تھا۔'' یہ بات میں نے ازراہ تکلف کہی تھی، ورنہ حقیقت تھی کہ مجھے بھی بھوک بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی اور پھر اس ریستوران میں پکوان کی خوشبو ہوا کے جھونکوں کے ساتھ آ رہی تھی جو بھوک بھڑکا رہی تھی۔ اس نے مجھ سے تکلف نہ کرنے کی التجا کی اور میں اس کے اصرار پر اس کے ساتھ کھانے میں مشغول ہو گیا۔ عجیب پُر لذت اور ذائقہ دار کھانا تھا۔ تبھی لوگ اپنے گھروں کے اور اپنی بیوی کے ہاتھوں کے پکوان چھوڑ کر ہوٹلوں کا رخ کرتے تھے۔ حالاں کہ بہت سے لوگوں کے گھروں میں کک یا اچھے پڑھے لکھے شیف ہوتے تھے جو کافی لذیذ اور ذائقہ دار کھانے بناتے تھے مگر پھر بھی ہفتے میں دو تین دن لوگ ہوٹلوں اور ریستورانوں کا رخ ضرور کرتے تھے، شاید یہی لذت اور ذائقہ ان کو یہاں کھینچ لاتا ہے۔

''کیا آپ ہر روز کھانا باہر کھاتی ہیں۔'' میں نے چکن کا ایک پیس لیتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں ایسی تو عادت نہیں ہے، میری گھریلو ملازمہ بہت اچھے پکوان پکا لیتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں لذت ہی نہیں، بے حد ذائقہ بھی ہے اور پھر اسے اچھے کھانے پکانے کا سلیقہ بھی آتا ہے۔ شاید اس نے یہ ہنر باقاعدہ سیکھا ہوا ہے۔ بس کبھی کبھار جب کسی دوست کے ساتھ ہوتی ہوں تو کسی اچھے سے ریستوران میں کھانا کھانے کو ترجیح دیتی ہوں۔'' اریبہ نے دوست کے لفظ پر زور دیتے ہوئے بتایا۔ میں کچھ دیر خاموش رہ کر کھانا کھاتا رہا۔ ہم کھانے کے دوران باتیں کرتے رہے تھے۔

''جی مس اریبہ...... کیا آپ نے کالج جا کر کچھ معلومات اکٹھی کیں؟' وہ بھی جیسے ان موضوع پر آنے کے لیے بے چین دکھائی دے رہی تھی۔ میرا سوال سنتے ہی بول اٹھی۔

''ہاں ارسلان۔ میں مقامی ایجوکیشن کالج گئی تھی۔ پرنسپل صاحب تجمل حسین زیدی صاحب سے بھی ملاقات ہوئی۔ میں نے اپنے آنے کا مقصد بیان کیا تو انھوں نے اس معاملے میں میری بہت مدد کی۔ ارباز خان کے دو پتے نوٹ کر کے دیئے۔ ایک عارضی پتا جو یہیں کا تھا اور دوسرا مستقل پتا جو کوئٹہ کا ہے۔ ارباز خان کے ایڈمٹ کارڈ پر اس کی تصویر کو بڑے غور دیکھا۔ یہ وہی شخص تھا جو صائمہ کے پڑوس میں آ کر رہا تھا اور پھر

رفتہ رفتہ ان لوگوں سے جان کاری پیدا کر کے صائمہ سے شادی کی تھی اور پھر جہیز سمیت صائمہ کو لے کر کوئٹہ چلا گیا تھا۔ تب اس نے اپنا نام ادریس خان بتایا تھا۔ یہ شخص اس قدر ذہین تھا کہ اس نے دونوں شادیوں کے موقع پر اپنی کوئی تصویر بننے نہیں دی تھی۔ اور مووی میکر کو منع کر دیا تھا۔ اسلامی شریعت کی آڑ لے کر۔ ہر اعتراض کرنے والے کو اس نے یہی بیان دے کر چپ کرا دیا تھا کہ اسلام میں تصویر کشی حرام ہے، اس لیے وہ نہ تو تصویر کھینچوانا چاہتا ہے اور نہ ہی مووی بنوانا۔ چوں کہ اس شخص کی نیت میں پہلے ہی سے فتور تھا، اس لیے اس نے اپنے پیچھے اپنے گناہ اور جرم کا کوئی نشان نہیں چھوڑا تھا۔ کالج کے فارم میں بھی جو تصویر لگی تھی، اس تصویر میں بھی اس کے چہرے سے رعونت اور فرعونیت ظاہر ہو رہی تھی۔ یہ شخص لازمی قاتل تھا۔ اس نے اپنی دونوں بیویوں کو قتل کیا ہوگا۔ میں نے اریبہ کے نوٹ کیے ہوئے پتے پڑھے۔ ایک پتا اسی گاؤں کے قریبی شہر کا تھا اور دوسرا پتا کوئٹہ ٹی وی اسٹیشن روڈ کا تھا۔

''ارسلان کیا سوچنے لگ گئے ہو۔؟'' اریبہ نے مجھے کسی گہری سوچ میں غرق دیکھ کر سوال کیا۔

''تم ٹھیک کہتی ہو اریبہ۔ اب ہم اس دورخے شخص تک آسانی سے پہنچ سکتے ہیں اور انسپکٹر روبینہ اکرم کی مدد سے اس پر ہاتھ بھی ڈال سکتے ہیں۔ کیوں نہ اس سلسلے میں مس روبینہ اکرم سے مشورہ کر لیا جائے۔'' میں نے اچانک خیال ظاہر کیا۔

''بالکل ٹھیک ہے۔ اس سلسلے میں وہ مخلص عورت ہمارے ساتھ پہلے بھی بے لوث مدد کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ اب بھی وہ تال مٹول سے کام نہیں لے گی۔'' اریبہ نے میری تجویز سے اتفاق کیا تھا۔ لہٰذا اس بار اریبہ نے انسپکٹر روبینہ اکرم کو اپنے گھر پر دعوت دے کر بلایا تھا۔ بحیثیت ایک دوست کے، تاکہ اس پر سکون ماحول میں اس سے اس موضوع پر گفتگو ہو سکے۔ روبینہ کو بھی کوئی اعتراض نہ ہو سکا۔ وہ بخوشی آج رات سات بجے اریبہ کے گھر آنے پر تیار ہو گئی۔ میں شام تک آنے کے لیے اریبہ سے رخصت ہونے کی اجازت چاہنے لگا مگر اس کے بے حد اصرار اور بے جا کی ضد نے مجھے وہیں روک لیا تھا۔ سہ پہر ہو چکی تھی۔ سورج آہستہ آہستہ مغرب کی سمت اپنا دن بھر کر سفر مکمل کر رہا تھا۔ دھوپ ڈھلتی جا رہی تھی۔ دھوپ کی جھلستی تپش میں شدت کی جگہ نرمی آ رہی تھی۔ دن کو تاریکی کا خوف ستانے لگا تھا۔

اریبہ نے چائے بنوا لی تھی۔ میں اب بھی صائمہ اور علیشا کے قاتل کے بارے میں منصوبہ بندی کر رہا تھا کہ اسے کس طرح اور کیسے گرفتار کیا جا سکے گا۔ شروعات کے لیے بھی میرے ذہن میں ایک ترکیب آ گئی تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ پہلے اس گاؤں سے قریب شہر میں جا کر ارباز خان کے عارضی پتے پر چھاپہ مارا جائے، غیر محسوس انداز سے۔ ہو سکتا ہے وہاں سے کچھ نشانات مل سکیں۔ یا اس کی کوئی خبر سننے کو میسر آئے۔ ہو سکتا ہے۔ یہیں سے کچھ مشکلات حل ہونے کے آثار نظر آ جائیں۔ اگر وہاں سے کچھ نہ مل سکا اور ناکامی ہوئی تو پھر ہمیں کوئٹہ کا رخ کرنا پڑے گا جو رانی پور اور چندن پور سے بہت دور تھا اور سرحد پار بھی۔ مگر میرے عزم و حوصلے اور ہمت کے راستے میں کوئی چٹان رکاوٹ نہیں بن سکتی تھی اور نہ کوئی سرحد اور بارڈر میرا راستہ روک سکتا تھا۔ دوسرے پتے پر ہمیں لازمی کوئی نہ کوئی خاطر خواہ کامیابی ضرور ہوگی، جس سے ہمیں ارباز خان تک پہنچنے میں سہولت ہو جائے گی۔

اگر اس کی گرفتاری عمل میں لانا مقصود ہوتی تو یقیناً اس موقع پر انسپکٹر روبینہ اکرم کے اختیارات کام آ سکیں گے اور اگر ارباز خان کا تعلق کسی بہت بڑے گروہ سے ہوا تب بھی اسپیشل پرمیشن کے لیے انسپکٹر روبینہ اکرم ہی کام آئے گی۔ تب اس شہر کے ڈی آئی جی یا آئی جی صاحب سے مل کر اس کے گروہ کی بیخ کنی کی کامیاب کوشش کریں گے اور اگر ارباز خان کسی گھناؤنے کاروبار میں اکیلا ہی ملوث پایا گیا تو پھر بھی کوئی بڑی دقت اور مشکل پیش آنے والی بات نہیں ہوگی۔ اس کے لیے

انسپکٹر روبینہ اکرم کے تعلقات ہی کافی رہیں گے۔ انسپکٹر روبینہ اکرم کو اس کی سینیارٹی کی بنیاد پر سلیکشن گریڈ کی وجہ سے حکومت نے مخصوص حالات میں محدود قسم کے اختیارات بھی دیئے ہوئے ہیں۔ اس تمام کارروائی میں پیسے کی بھی ضرورت پڑے گی جس کے لیے میرا جادوئی بٹوا کام آئے گا۔ کہتے ہیں۔ ''دولت سے ہر چیز خریدی جاسکتی ہے۔'' ہم کالی بھیڑوں کو دولت سے خرید کر ان سے اپنا کام نکلوا سکتے تھے۔

''چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے ارسلان۔'' اریبہ کی آواز نے مجھے خیالات کے جنگل سے باہر نکالا تھا۔ میں نے چائے کی چسکی لی تھی۔ ایک عجیب سے مزے کا لطف آیا۔ شاید چائے کا وقت بھی تھا۔

''ارسلان کیا تمہاری کوئی دوست بھی ہے۔ گہری دوستی ہو جس سے۔'' اریبہ نے چائے کا گھونٹ حلق سے نیچے اتارتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔ میں بھی سوچ رہا تھا کہ اریبہ مجھے ریستوران لے کر گئی۔ عمدہ ضیافت کی، زیادہ تر میرے ساتھ وقت گزارنے کی خواہش دل میں پال رکھی ہے۔ مجھے اس کی تنہائی سے بھی اندازہ ہوا تھا کہ عیش کے بعد وہ اتنے بڑے بھرے گھر میں تنہا ہو گئی تھی۔ جب کہ اس نے پہلی ملاقات میں بتایا تھا کہ ان کے والدین کا انتقال بہت پہلے ہو چکا تھا مگر اریبہ نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی تھی، جب کہ اس کی شادی کی عمر ابھی ڈھل نہیں گئی تھی۔ وہ جوان تھی۔ خوب صورت تھی اور روپیہ پیسہ، بنگلہ اور بینک بیلنس بھی اس کے پاس تھا۔ پھر اس نے اچھا سا جیون ساتھی چن کر گھر کیوں نہیں بسا لیا۔ شاید اسے اچھا سا جیون ساتھی جو اس کے معیار سے پورا اترتا ہو، نہ مل سکا ہو۔ شاید اس کی نظرِ انتخاب مجھ پر جم گئی ہے۔ میں اسے کسی غلط فہمی میں مبتلا رکھنا نہیں چاہتا تھا۔ اچھا ہوا جو اس نے اس موضوع پر گفتگو کا آغاز کر دیا تھا۔

''ہاں اریبہ، میری ایک دوست ہے، جس کا نام شمیکا ہے۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہیں اور یوں سمجھ لو، جیسے ہمارا نکاح بھی ہو چکا ہے مگر رخصتی باقی ہے۔ ہم دونوں ذہنی آہنگی کی بنا پر ہی ایک دوسرے کے قریب آئے ہیں اور ایک دوسرے کا ساتھ نبھانے پر کمر بستہ ہیں۔'' میں نے شمیکا کا غائبانہ تعارف کراتے ہوئے کشادہ دل سے سچ بیان کر دیا۔

''وہ ذہنی ہم آہنگی کیا ہے۔ جس نے تم دونوں کو ایک دوسرے کا جیون ساتھی بنا دیا ہے۔ وہ کون سا اٹوٹ بندھن یا رشتہ ہے۔ جس کے ذریعے تم دونوں نے خود کو نہ ٹوٹنے والے بندھن میں باندھ لیا ہے۔'' اریبہ نے مردہ دلی سے پوچھا تھا۔

''دراصل ہم نے خدمتِ خلق کا اپنے آپ سے عزم کیا ہوا ہے۔ ہم نے اپنی زندگیوں کو خدمتِ خلق کے لیے وقف کر رکھا ہے۔ میں نے بھی اور شمیکا نے بھی۔ یہی وہ ذہنی ہم آہنگی ہے جس نے ہمیں ایک دوسرے کے قریب کر دیا ہے۔'' میں نے اپنا مشن بیان کر دیا تھا۔

''کتنے خوش نصیب ہو تم دونوں جو ذہنی ہم آہنگی والا ساتھی مل گیا ہے۔'' میں اریبہ کا دکھ سمجھ سکتا تھا اور مجھے اس کی تنہائی کا خیال بھی تھا۔ اس نے ایک سرد آہ بھری تھی جو میرے دل کو چیر کر گزر گئی تھی۔ میں نے دل میں خیال کیا، اگر مجھے زندگی کے کسی موڑ پر ایسا لڑکا ملا جو اریبہ کے قابل ہوا تو یقیناً اسے اریبہ سے شادی کے لیے تیار کر لوں گا جو اریبہ کو بھی پسند آئے گا۔

شام ہونے کو تھی۔ میں نے اریبہ سے انسپکٹر روبینہ اکرم کو ریمائنڈ کرانے کے لیے کہا۔ اس نے فون پر اسے ریمائنڈ کرایا تو وہ گھر سے نکلنے ہی والی تھی اور اسی طرف آ رہی تھی۔ دس منٹ گزرے ہوں گے کہ انسپکٹر روبینہ اکرم نے بیل کا بٹن دبا دیا۔

''روبینہ میری دوست، میں نے تمہیں آج بھی اپنے کام ہی کے لیے زحمت دی ہے۔ تم سمجھ گئی کہ میں بھی کیسی مطلب پرست عورت ہوں۔ دراصل......''

''اریبہ...... تم اسے زحمت کا نام اور مطلب پرستی کا الزام کیوں دے رہی ہو۔ یہ تو میرا فرض ہے۔ میرا پیشہ ہے، اور میرا اخلاقی فریضہ بھی بنتا ہے کہ میں

اپنے پیشے سے متعلق مسائل کو حل کروں۔ جرائم کی بیخ کنی اور گناہوں کے سدباب میں ہر مظلوم کی حتی المقدور داد رسی کر کے مدد کروں اور ظالموں کو کیفرِ کردار تک پہنچاؤں۔ آپ لوگ بتائیں کہ کیا اس سلسلے میں کچھ پیش رفت ہوئی، میرے لیے کیا حکم ہے۔'' مس روبینہ اکرم نے واقعی دوستی کا حق ادا کرتے ہوئے پوچھا۔

''انسپکٹر صاحب...... ہمیں ارباز خان کے متعلق وہ ایڈریس اور اس کی ایک تصویر ملی ہے، جس سے اس سفاک قاتل کا چہرہ بے نقاب کرنے میں بھرپور مدد مل سکتی ہے۔'' اس بار اریبہ نے گفتگو کا آغاز کیا تھا۔

''کیا کہا...... ارباز خان کی تصویر اور ایڈریس مل گئے ہیں۔ تم یقین سے کہہ رہی ہو؟'' روبینہ نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''اب تو وہ شخص نہ صرف تمہارا بلکہ میرا بھی دشمن ہے۔ کیوں کہ وہ ایک مجرم ہے، خطرناک مجرم۔ کیوں کہ وہ دارالامان سے میری موکلہ کو اغوا کر کے لے گیا تھا۔ ذرا مجھے بھی تو اس کی تصویر دکھاؤ اور وہ ایڈریس دکھاؤ۔ میں بھی اس معاشرتی ناسور کی شکل دیکھوں، اس ایک مچھلی کو دیکھوں جس کی وجہ سے سارا تالاب گندا ہو رہا ہے۔'' روبینہ کی جستجو کو دیکھ کر اریبہ نے پرس سے ارباز کی تصویر اور نوٹ کیے ہوئے ایڈریس نکال کر دکھائے۔

''کیا...... یہ ارباز خان ہے۔ اریبہ تم یقین سے کہہ سکتی ہو کہ یہی ارباز خان ہے۔'' روبینہ نے اپنی جگہ سے اس طرح کھڑے ہوتے ہوئے کہا، جیسے اسے بجلی کے کرنٹ کا جھٹکا لگ گیا ہو۔

''انسپکٹر صاحب! میں نے ارباز خان کو کئی روز تک اپنے گھر میں رہتے ہوئے دیکھا ہے۔ اس کی ایک ایک نقل و حرکت میرے ذہن پر نقش ہے۔ میں سات پردوں میں بھی اس کی آواز پہچان سکتی ہوں۔ ایک سرسری سی نظر میں اس کی شکل پہچان سکتی ہوں۔ چاہے اس نے بہروپ ہی اختیار کیوں نہ کیا ہوا ہو۔ وہ میرے سامنے کسی بھی روپ میں آ جائے، میری نظر سے چھپ نہیں سکتا۔'' اریبہ نے بڑے وثوق سے کہا۔

''ہاں روبینہ صاحبہ...... اریبہ ٹھیک کہتی ہے کیوں کہ وہ اس کا بہنوئی تھا۔ شادی کی ساری رسومات اس کے سامنے ادا ہوئی ہیں۔ یہ یقیناً اس کی ہر حرکت سے واقف ہو گی اور پھر ارباز خان کو اس تصویر کے حوالے سے میں بھی بخوبی پہچان سکتا ہوں جو مجھے صائمہ کی بہن نے دکھائی تھی۔'' میں نے روبینہ کی بات کو کاٹتے ہوئے کہا۔

''نہیں ارسلان صاحب، اور اریبہ میری پیاری دوست، آپ دونوں کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں اس لڑکے سے مل چکی ہوں جسے تم ارباز خان اور یہ ادریس خان کہہ رہے ہیں۔ اس میں کوئی بھی بری عادت نہیں ہے۔ یہ ایک پڑھا لکھا اور سنجیدہ لڑکا ہے۔ بااخلاق اور ملنسار بھی ہے۔ اس کے چہرے پر کوئی سفاکی اور قاتل پن کی کوئی تحریر نظر نہیں آتی۔'' روبینہ نے ہر زاویے سے ارباز خان کی تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''کیا آپ ہمیں بھی اس لڑکے سے ملوا سکتی ہیں، جس کو میں ارباز خان اور یہ ادریس خان سمجھ رہے ہیں۔'' اریبہ نے میرے دل کی ترجمانی کرتے ہوئے پوچھا۔

''کیوں نہیں ملوا سکتی۔ بالکل ملوا سکتی ہوں۔ لیکن آپ لوگ یہ بات ذہن میں رکھیے گا کہ جس شخص سے میں آپ کو ملوانے جاؤں گی وہ نہ تو ارباز خان ہے اور نہ ہی ادریس خان، اس کی شکل اس تصویر سے ضرور ملتی ہے مگر اس کا نام دلاور خان ہے جو اسلام آباد میں ایک ڈسپوزل سینٹر کو چلا رہا ہے اور اس کا ڈسپوزل سینٹر کسی ایک قسم کی اشیا کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ اس میں ضروریاتِ زندگی کی تمام اشیاء چھوٹی سے بڑی سستی سے مہنگی سب موجود ہوتی ہیں اور وہاں ہر دھات کی خرید و فروخت ہوتی ہے۔ ان کا کاروبار اندرونِ ملک سے بیرونِ ملک تک پھیلا ہوا ہے یعنی یہ سمجھ لو کہ یہ امپورٹ، ایکسپورٹ کا کام بھی کرتا ہے۔ دلاور خان بہت معزز اور شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔''

روبیہ نے دلاور خان کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملائے تو ہم دونوں دم بخود رہ گئے۔ کافی دیر خاموشی چھائی رہی۔ ہمیں کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے۔ کیوں کہ ارباز خان، ادریس خان کے بعد یہ دلاور خان کا تیسرا کردار کہانی میں در آیا تھا، جس نے اسے اور بھی پیچیدہ بنا دیا تھا۔

''مس روبینہ'' کہیں ایسا تو نہیں کہ ایک ہی کردار کے تین روپ ہوں۔ پہلے وہ ادریس خان بنا، پھر ارباز خان اور اب دلاور خان کے روپ میں آپ سے ملا ہو۔'' اریبہ نے مس روبینہ اکرم کی خفگی کا خیال کرتے ہوئے مدھم لہجے میں سوال کر کے اپنی رائے پیش کی تھی۔

''دیکھو اریبہ...... دودھ کا جلا ہوا چھاچھ بھی پھونک پھونک کر پیتا ہے۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتی کہ دلاور خان معصوم ہے لیکن اتنا ضرور وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ دلاور خان ان دونوں میں سے کوئی نہیں ہے۔ کیوں کہ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ دلاور خان ایسا نہیں ہوسکتا۔ اگر فرض کیا دلاور خان ان میں سے کوئی کردار ہوا تو تم دونوں سے میرا وعدہ ہے کہ میں اسے ایسی عبرت ناک سزا دلواؤں گی کہ موت بھی کانپ اُٹھے گی۔'' روبینہ کا چہرہ متغیر ہو کر یکسر بدل گیا تھا۔ وہ ابھی تک ارباز خان کی تصویر کو ہاتھ میں لیے تک رہی تھی۔

''میری پیاری دوست روبینہ! مجھے حق تو نہیں پہنچتا مگر پھر بھی تم سے بحیثیت دوست ایک ذاتی سوال کرنا چاہتی ہوں۔'' اریبہ نے اسے کریدنے کے انداز میں کہا۔ کیوں کہ وہ ایک قسم سے دلاور کی وکالت کر رہی تھی۔ اس کے پیچھے کوئی تو محرک تھا جو اس کے جذبات کو حرکت دے رہا تھا۔

''تم ایک نہیں دو سوالات کرسکتی ہو۔ چاہے وہ ذاتی ہوں یا قانونی کیوں کہ تم میری اچھی دوست ہو۔'' روبینہ نے مجھے اجازت دی تو میرا حوصلہ بلند ہوگیا۔

''آپ دلاور خان کو کیسے جانتی ہیں اور اس سے آپ کا تعلق کیا ہے؟'' اریبہ نے دل کی بات پوچھ ہی لی تھی۔

''میں جانتی تھی ارسلان اور اریبہ، آپ لوگ یہ سوال ضرور پوچھیں گے کیوں کہ میرے منہ سے ایک اجنبی کی تعریف سن کر سبھی حیران ہوتے ہیں۔ میں دلاور کو اس وقت سے جانتی ہوں جب میں اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ گئی تھی۔ تب دلاور خان سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ اس شخص نے ایک انسان ہونے کے ناتے میری ہر ممکن مدد کی تھی۔ میں اس کے اخلاق سے متاثر ہوئے بغیر رہ نہ سکی تھی۔ یہ تعلقات مزید استوار ہوئے تو وہ میرا اچھا دوست ثابت ہوا۔ اور جب دوستی پختہ ہوئی تو ہم ایک دوسرے کے منگیتر بن گئے۔ میں اس سے منسوب ہوچکی ہوں اور عنقریب دلاور خان سے میری شادی بھی ہونے والی ہے۔ بہرحال آپ ان باتوں سے مرعوب نہ ہوں۔ اور ہمت نہ ہاریں۔ مجھے حکم کریں کہ اس مہم کی ابتدا کہاں سے کرنی ہے۔''

''لیکن...... مس روبینہ۔''

''لیکن ویکن کچھ نہیں۔ آج جو باتیں ہوئی ہیں، انھیں یہیں رہنے دیں اور ہم ایک ملزم کی طرح دلاور سے ملتے ہیں۔ آج اور ابھی ہم ارباز خان کے پہلے ایڈریس پر چلتے ہیں تاکہ اس مہم کا آغاز ہو تو سکے۔ میں اپنے ماتحتوں کو اور موبائل گاڑیاں یہیں پر بلوا لیتی ہوں۔ آپ لوگوں کو بھی میرے ساتھ چلنا ہوگا۔'' روبینہ نے خود کو تیار کرتے ہوئے کہا۔ ہم بھی ذہنی طور پر تیار ہوگئے تھے۔ کوئی آدھے گھنٹے میں چائے کا دور ختم ہوا تو موبائل گاڑیاں اور اسٹاف آچکا تھا۔ ڈرائیور نے اپنے آنے کی اطلاع دی۔ یوں ہم سب سوار ہو کر گاؤں سے نکل کر ساتھ والے شہر کی طرف روانہ ہوگئے۔ ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھی۔ ڈرائیور کی تیز رفتاری اور مہارت کی وجہ سے ہم بہت جلد شہر میں داخل ہوگئے تھے۔ انسپکٹر روبینہ اکرم نے ڈرائیور کو ایڈریس سمجھاتے ہوئے اپنے ہدف کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔ مطلوبہ مکان کے سامنے گاڑی روک دی گئی۔ میں، روبینہ اکرم اور اریبہ مکان میں دستک دینے کے بعد داخل ہوئے تھے۔

کو اچانک سامنے پا کر سبھی خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔ ایک ادھیڑ عمر کا پٹھان شخص تھا جس نے حواس باختہ ہو کر پوچھا۔

''انسپکٹر صاحبہ...... آپ کو کس کا تلاش ہے۔ یہاں ہمارے سوا کوئی اور نہیں ہے اور ہم سبزی منڈی میں محنت مزدوری کرتا ہے۔'' پٹھان بابا نے اپنے انداز میں چند جملے کہے۔

''بابا اس نوجوان کو جانتے ہو؟'' انسپکٹر روبینہ نے ارباز خان کی تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا۔ بابا نے تصویر کو بغور دیکھا۔ جیسے پہچاننے کی بھرپور کوشش کر رہا ہو۔ پھر وہ تصویر کو ٹیوب لائٹ کی روشنی میں لے جا کر دیکھنے لگا۔ وہ کچھ سوچ کر خاموش ہوگیا۔

''دیکھو بابا، جھوٹ بولنے کی کوشش مت کرنا۔ ورنہ یہ جو میرے ہاتھ میں جادو کی چھڑی ہے نا، اسے سچ اگلوانے کا فن آتا ہے۔'' انسپکٹر روبینہ نے ہاتھ میں تھامی ہوئی بید کی چھڑی کو ہوا میں لہراتے ہوئے کہا۔

''نہیں انسپکٹر صاحبہ۔ ہم بھلا جھوٹ کیوں بولے گا۔ یہ ارباز خان ہے، جب یہ اس شہر میں ماسٹر کی پڑھائی کرنے کے لیے آیا تھا تو ہمارے فلیٹ میں میرے ساتھ ٹھہرا تھا۔ حالاں کہ ہم لوگ شنواری ہیں اور یہ آفریدی تھا۔ تم شاید نہیں جانتی کہ ان دو قبیلوں میں کس قدر نفرت پائی جاتی ہے اور صدیوں سے یہ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں۔ سینکڑوں نوجوان اس دشمنی کے ہاتھوں قتل ہوچکے ہیں۔ زمانہ بدل گیا ہے مگر یہ لوگ اپنی دشمنی نہیں چھوڑتے۔ بہرحال وہ تھا تو پٹھان، بے چین اور پریشان پھر رہا تھا۔ ہم نے ترس کھا کر اسے رہائش دے دی لیکن شرط یہ رکھی کہ وہ ہم سے کوئی تعلق نہیں رکھے گا۔ اپنا کام وہ خود کرے گا۔ اپنے کھانا پینا کا اہتمام بھی خود کرے گا۔ اس کے کاموں میں ہمارا بھی کوئی دخل نہ ہوگا۔ یہاں تک ہم ایک دوسرے سے بولے گا بھی نہیں۔ اس مکان کے ایک کمرے کی چابی اسے بنوا دے گا۔ اور ہم نے اس کے کمرے کا دروازہ اور چابی الگ کر کے رہائش دے دی۔'' اتنا کہہ کر پٹھان بابا خاموش ہوگیا۔

''دیکھو بھائی۔ ڈرو نہیں۔ دراصل ارباز خان نے پولیس میں نوکری کی درخواست دی تھی۔ جب وہ یہاں تعلیم حاصل کر رہا تھا اور پتا بھی اس مکان کا لکھوایا تھا۔ اب سرکار نے اسے ملازمت کے لیے بلایا ہے تو اس کا پتا نہیں چل رہا۔ ہم اس لیے تلاش کر رہے ہیں، کیوں کہ آج کل ملازمت بڑی مشکل سے ملتی ہے۔ خوش نصیبی اس کے دروازے پر دستک دے رہی ہے اور وہ غائب ہے۔ تم اگر ہمیں ارباز خان کا ٹھکانہ بتا دو تو ہم اسے اطلاع کر کے پولیس کی ملازمت دلا سکتے ہیں۔'' میں نے سفید جھوٹ سے کام لیتے ہوئے کہا۔ یہ نفسیاتی حربہ اس پٹھان پر کام کر گیا تھا۔

''ہاں صاحب۔ وہ جب یہاں سے گیا تھا تو کہہ رہا تھا کہ اس نے اپنی ہم جماعت لڑکی سے شادی کرلی ہے اور اب وہ کوئٹہ جا رہا ہے۔'' پٹھان بابا نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر دکھایا تو اس پر ارباز خان کا کوئٹہ والا ایڈریس لکھا تھا۔ یہ وہی تھا جو اریبہ کالج سے لے کر آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ علیشا سے شادی کرنے والا شخص ارباز خان ہی تھا۔ ایک مسئلہ تو حل ہوا۔ ممکن ہے ارباز خان کا دہرا کردار ہی ادریس خان ہو۔ ہم سب امید کی ایک نئی کرن لے کر گھر لوٹ آئے۔ راستے میں فیصلہ کرلیا گیا تھا کہ میں اور اریبہ کوئٹہ جا کر ارباز خان کا کھوج لگائیں گے۔ کہتے ہیں، ''مدعی چست ہو تو بگڑا ہوا کام بھی بن جاتا ہے۔'' انسپکٹر روبینہ اکرم کافی ذہین اور تجربہ کار تھی۔ اس نے کئی کیس تو اپنی ذہانت اور سوچ بچار سے ہی حل کر لیے تھے۔ اس نے اپنے سگے بھائی کو اسلام آباد فون کر دیا تھا جس میں اس نے کہا تھا کہ وہ خفیہ طور پر دلاور خان کی نگرانی کرے اور اس پر کڑی نگاہ رکھے۔ مختصراً اس نے معاملے کی نزاکت کی تفصیلات بھی بتا دی تھیں۔ کیوں کہ اس میں تو روبینہ کو بھی دلاور خان کی شکل ارباز خان سے مشابہ ہونے پر شک ہوگیا تھا۔ اس لیے روبینہ اکرم نے اپنے بھائی شہزاد اکرم کو بھی چوکس کر دیا تھا۔

روبینہ چاہتی تھی کہ شادی سے پہلے ہی دلاور خان کی آزمائش ہو جائے گی۔ اس کارروائی میں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔ اریبہ نے مجھ سے ایک دن کی مہلت مانگی تا کہ بھرپور تیاری کے ساتھ اس مہم پر نکلا جائے۔ نجانے کب واپسی ہو۔ مجھے کوئی کام نہیں تھا۔ میں نے یہ دن شمیکا کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح شمیکا سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور اپسرا کے حالات کے ساتھ ساتھ عامل جادوگر کا انجام بھی معلوم ہو جائے گا۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ میں جس جگہ، جس مقام پر کھڑا ہو کر شمیکا کو حاضر کرنے کے جملے دہراتا، وہ اسی جگہ اور عین اسی مقام پر بہت جلد حاضر ہو جاتی تھی۔ میں اریبہ کے گھر سے نکل کر اسی ریستوران کی طرف چل پڑا تھا، جہاں ایک بار مجھے اریبہ نے پر تکلف ضیافت کھلائی تھی۔ آج میرا بھی جی چاہ رہا تھا کہ شمیکا کو اسی وی آئی پی ریستوران میں کھانا کھلاؤں اور ڈھیر ساری باتیں کردوں۔ میں نے اپنے منصوبے کے مطابق شمیکا کو حاضر کرنے والے جملے دہرائے تو وہ اسی شاہراہ پر آدھمکی جس پر میں گامزن تھا۔ میری آنکھوں میں خوشی کی چمک عود آئی اور اس کے چہرے پر تو ایسی تازگی بکھر گئی جیسے کسی گلاب کو بہار کی ہواؤں کے جھونکوں نے چھو لیا ہو۔

"ارسلان خیریت تو ہے نا۔" شمیکا نے ادھر ادھر نظریں گھماتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں سب خیریت ہے لیکن تم اس قدر فکرمند لہجے میں کیوں پوچھ رہی ہو۔" میں نے سوال کیا۔ کیوں کہ میری حیرت دو چند ہو گئی تھی۔

"دراصل جب تم مجھے یاد کرتے ہو اور ملنے کی خواہش میں ورد کرتے ہو تو میں ڈر جاتی ہوں۔ کہیں تم کسی مشکل یا مصیبت میں تو نہیں پھنس گئے ہو۔ یا کوئی دوسرا شخص موت اور زندگی کی کشمکش میں مبتلا تو نہیں ہے جس کی تم مدد کرنا چاہتے ہو۔ میں ایمرجنسی کی صورت حال میں ایک تجسس لیے فوراً حاضر ہو جاتی ہوں۔ جیسے اس سے پہلے نیلما کے ایمرجنسی کیس میں تم نے مجھے بلایا تھا۔ اگر میں اپنے کسی کام میں الجھی ہوئی ہوتی اور آنے میں دیر ہو جاتی تو پھر اس غریب کی زندگی موت میں بدل جاتی۔" شمیکا نے میری حیرت دور کرتے ہوئے کہا۔

"ہاں شمیکا...... تم ایک ہمدرد اور مخلص لڑکی ہو۔ میں اپنی خوش بختی پر جس قدر ناز کروں کم ہے کہ مجھے تم جیسی دوست، شریکِ سفر اور ساتھی ملی۔ جس کے دل میں نہ تو کسی قسم کا لالچ ہے اور نہ ہی کوئی مفاد، تم بے لوث ہو اور پُرخلوص بھی۔ تم لاکھوں میں ایک ہو شمیکا۔ چراغ لے کر ڈھونڈوں تو بھی پوری دنیا میں تم سی لڑکی نہیں مل سکتی۔" میں نے دل کی باتیں زبان سے ادا کر دی تھیں۔

مجھے نہیں معلوم تھا کہ عورت اس قدر جلد اپنی تعریف سن کر موم ہو جاتی ہے اور شرم و حیا سے پانی پانی بھی۔

"ہر انسان کو آئینے میں اپنا عکس ہی نظر آتا ہے۔ اپنی صورت ہی دکھتی ہے، آپ خود اچھے انسان ہیں، اس لیے آپ کو ہر انسان اچھا نظر آتا ہے۔" اس بار شمیکا نے اپنی تعریف کا بدلہ میری تعریف کر کے اتار دیا تھا۔ میں نے ٹیکسی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ ٹیکسی رک گئی تو ڈرائیور کو چائنا ریستوران چلنے کا کہا اور شمیکا کے ساتھ پچھلی سیٹ پر براجمان ہو گیا۔

"کیا بات ہے آج کوئی کام بھی نہیں ہے اور ریستوران بھی لے کر جا رہے ہیں۔ کوئی خوش خبری ہے کیا۔" شمیکا نے میری آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں خوش خبری تو کوئی نہیں ہے اور نہ کوئی اہم بات ہے۔ دراصل مجھے کوئٹہ جانا پڑے گا۔ میرے ساتھ اریبہ بھی ہو گی۔ اس کی بہن کے قاتل کو تلاش کرنا ہے۔ ہمیں کل جانا ہو گا۔ مجھے آج کی رات اکیلے بسر کرنا تھی۔ اس لیے سوچا کیوں نہ تم کو بلا لوں۔ اس طرح اپسرا کے حالات اور عامل جادوگر کا انجام بھی تمہاری

[سمجھ میں] معلوم ہو جائے گا۔" میں نے محسوس کیا کہ رات کے گہرا ہونے کے ساتھ ساتھ سردی میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ شمیکا نے میرے شانے سے سر لگا دیا تھا۔ ایک جھٹکے سے ٹیکسی رک گئی تھی۔ میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا تو ویران اور سنسان جگہ تھی۔ جہاں دور دور تک کوئی آباد جگہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

"کیا ہوا۔" میں نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا۔

"شہری بابو...... تم کسی گاؤں کو لڑکی کو بھگا کر لے جا رہے ہو۔ ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ اکثر شہری بابو آتے ہیں اور گاؤں کی بھولی بھالی لڑکیوں کو پیار و محبت کا چکر دے کر ساتھ لے جاتے ہیں اور چند مہینے جی بھر کر ان کے جسم سے اپنی ہوس پوری کرتے ہیں اور پھر جی بھرنے پر انہیں وقت اور حالات کی بے رحم موجوں کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ان کی ٹوٹی ہوئی ناؤ بن پتوار کے نجانے کس ساحل پر جا لگتی ہے یا پھر گرداب میں پھنس کر ڈوب جاتی ہے۔ وہ پلٹ کر بھی نہیں دیکھتے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے ریوالور نکالتے ہوئے کہا۔

"نہیں بھائی، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ ہم دونوں میاں بیوی ہیں اور اس گاؤں میں مہمان کی حیثیت سے عارضی طور پر رہائش پذیر ہیں۔ آج میزبانوں سے فرصت ملی تو اس گاؤں سے ذرا دور چائنا ریستوران میں جا کر کھانا کھانا چاہتے ہیں اور آپس میں کچھ باتیں بھی کرنا چاہتے ہیں۔ اس لیے تم سے چائنا ریستوران چلنے کے لیے کہا ہے۔ کوئی ہم کسی دوسرے شہر تھوڑی جا رہے ہیں۔" میں نے ٹیکسی ڈرائیور کی غلط فہمی دور کرنے کے لیے اس سے بے تکلف ہو کر بات کی۔

"تم کیا ہمیں بے وقوف سمجھتے ہو۔ ہم اپنے گاؤں کی مٹیاری کو نہیں پہچان سکتے۔ تم ایک شہری بابو ہو اور یہ ایک گاؤں کی الھڑ مٹیار، نہیں بابو نہیں۔ چلو جلدی سے نیچے اترو۔ ہم ابھی اپنے آدمیوں کو بلاتے ہیں۔ اور تم جیسے شہری بابو کی اصلیت سامنے لاتے ہیں۔" اس نے ٹیکسی کا دروازہ کھول کر ہمیں نیچے اترنے کے لیے کہا۔ میں حیران تھا کہ وہ مجھے مسلسل شہری بابو اور شمیکا کو گاؤں کی الھڑ مٹیار کہہ رہا تھا، ایسا کیوں۔ میں نے اس پہلو پر غور کیا تو بات مجھے فوراً سمجھ آ گئی۔ میں نے ایک نظر شمیکا کی جسامت پر ڈالی۔ اس کے سراپے کا بھرپور نظر سے مشاہدہ کیا۔ شمیکا اس وقت دیہاتی لباس میں ملبوس تھی۔ اس نے بنجارن والی چھوٹی سی کرتی اور آدھی پنڈلی تک کا کھلا ہوا لہنگا پہن رکھا تھا۔ لہنگے کی پٹی، پیٹ اور کمر پر یوں کسی ہوئی تھی جیسے ہم پینٹ میں بیلٹ ڈال کر کس لیتے ہیں۔ اس پٹی سے اس کی اسمارٹ نس کھل کر سامنے آ گئی تھی۔ چھوٹی سی کرتی پر ململ سی چنریا، اس کے سینے کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ اس ٹیکسی ڈرائیور کا غلط فہمی میں مبتلا ہونا غیر فطری نہیں تھا۔ اگر میں بھی دور سے شمیکا کو دیکھتا تو کوئی دیہاتی لڑکی ہی تصور کرتا۔ جب ہم ٹیکسی سے باہر نکلے تو اس نے پیروں میں اونچی سینڈل کی بجائے کھوسے پہن رکھے تھے اور سونے پر سہاگہ یہ کیا تھا کہ ہاتھوں کی چوڑیاں اتار کر موٹے موٹے سونے کے کڑے اور پیروں میں چاندی کی پازیب بھی پہن رکھی تھی جو اس کے قدم رکھنے پر چھن چھن کا شور مچا رہی تھی۔ رہی سہی کسر ان موٹے موٹے موتیوں کی مالاؤں نے پوری کر دی تھی جو شمیکا نے اپنے گلے میں کسی سنیاسی باوا کی طرح ڈال رکھی تھیں۔ شاید وہ سونے کے بڑے بڑے جھمکے اور بڑی سی چھتری والی لونگ بھی پہن لیتی اگر اس کے کان اور ناک ہماری عورتوں کی طرح چھید کیے ہوئے ہوتے۔

اچانک دور سے آتی ہوئی ایک اور ٹیکسی ہمارے قریب آ کر رک گئی جس میں سے چار ہٹے کٹے نوجوان برآمد ہوئے۔ ان میں سے ایک نے للچائی ہوئی نظروں سے شمیکا کا جائزہ لیتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں گھبرو، کیا یہی وہ شہری بابو ہے جس نے ہمارے گاؤں کی عزت کو خاک میں ملانے کا پروگرام بنایا ہے۔"

"ہاں سامبا، یہی ہے وہ شہری بابو۔ کہہ رہا ہے

کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں اور اس گاؤں میں مہمان کی حیثیت سے رہائش پذیر ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیور نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے جواب دیا۔

"کیوں رے شہری بابو، کیا تجھے ہمارا ہی گاؤں ملا تھا اپنی ہوس کو مٹانے کے لیے۔" دوسرا شخص نفرت سے بولا۔

"نہیں بھائی جان، میں نے کہا ناں کہ آپ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔" میں نے شمیکا کا ہاتھ تھامتے ہوئے پھر کہا۔

"واقعی ہم دونوں میاں بیوی ہیں اور آپ کے گاؤں کی لڑکی رینا کے گھر میں رہائش اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اس کی چچی اس بات کی گواہ ہے کہ ہم اس کے مہمان ہیں۔"

"کیا تم اپنا نکاح نامہ دکھا سکتے ہو جو اتنے وثوق سے کہہ رہے ہو کہ ہم دونوں میاں بیوی ہیں۔" تیسرے نوجوان نے ہمارے گرد گھیرا تنگ کرتے ہوئے پوچھا۔ اب مجھے خیال آیا کہ میں نے میاں بیوی کا لفظ کہہ کر غلطی کی تھی، کیوں کہ نکاح نامہ تو ہمارے پاس نہیں تھا اور نہ ہی باقاعدگی سے ہمارا نکاح ہوا تھا۔ یہ تو میں نے شمیکا کے دلائل سے قائل ہو کر مان لیا تھا کہ ہم نے ایک دوسرے کو اپنے نفس کا ملک بنا دیا ہے اور ایک دوسرے کو قبول کر لیا ہے جس کا گواہ خدا ہے۔ مگر انسان تو انسانوں کو گواہ مانتا ہے۔ میں نے گھبرا کر کہا۔

نہیں ہمارے پاس نکاح نامہ تو نہیں ہے۔"

"دیکھا بھائیوں، یہ شہری بابو خود ہی اپنے جال میں پھنس گیا۔ چلو اب سیدھے سیدھے ہمارے ساتھ چلو، اب تمہاری سزا و جزا کا فیصلہ ہمارا سردار کرے گا۔" ٹیکسی ڈرائیور نے مجھے دھکا دیتے ہوئے کہا اور میری پسلی سے ریوالور کی نال لگا دی۔ دو نوجوانوں نے مجھے بازوؤں سے کس کر پکڑ لیا تھا اور دو شمیکا کی طرف ہاتھ بڑھانے لگے تو میں نے دہاڑ کر کہا۔

"دیکھو میری بیوی کو ہاتھ مت لگانا۔ پہلے اپنے سردار کے پاس لے چلو، پھر جو وہ فیصلہ کرے گا، ہمیں بھی منظور ہوگا۔" میری دہاڑ سن کر وہ نوجوان وہیں ٹھٹک کر رک گئے۔

"ٹھیک ہے۔" ٹیکسی ڈرائیور نے ہمیں اسی ٹیکسی میں بیٹھنے کا اشارہ کیا جس میں ہم سوار ہو کر اس ویرانے تک آئے تھے۔ پھر وہ چاروں نوجوان بھی اپنی ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔ ہماری ٹیکسی روانہ ہوئی تو وہ لوگ بھی ہمارے پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ رات کا وقت تھا۔ ہر طرف سنسان اور ویران جگہ تھی۔ سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اندھیرے کا راج تھا۔ تیز رفتاری کی وجہ سے دس منٹ کے وقفے کے بعد ہم ایک جنگل میں داخل ہو رہے تھے۔ اس جنگل کے سرے پر ہی مندر تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور کی انگلی اب بھی ٹرائیگر پر تھی۔ وہ چاروں نوجوان بھی مست خرامی میں ہمارے ساتھ چلنے لگے۔ مندر کے پیچھے ایک بڑا سی حویلی نما عمارت تھی جو کہ اب شاید اجڑ چکی تھی۔ یا اسے یہاں کے لوگوں نے مخدوش قرار دے دیا تھا۔ شاید اس لیے ان لوگوں یعنی بدمعاشوں یا ڈاکوؤں نے اس پر قبضہ جما لیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ کوئی ڈاکوؤں کا بڑا گروہ ہے جو رات کے وقت گاؤں میں یا اس کے ملحق علاقوں میں لوٹ مار کرتا ہوگا اور دن کو بہروپ بدل کر اس گروہ میں شامل لوگ عام انسانوں کی طرح گاؤں میں رہتے ہوں گے۔ اس طرح کسی کو کانوں کان ان کے کالے کرتوتوں کی خبر بھی نہیں ہوتی ہوگی اور ان کا بھرم بھی قائم رہتا ہوگا۔ ایسے ڈاکوؤں کے گروہ کا کامیابی سے ڈاکا زنی کرتے رہنے کا ثبوت یہ بھی تھا کہ ان کے مخبر دن کو لوگوں میں گھلے ملے رہتے تھے جن سے اس گروہ کو خبریں ملتی تھیں کہ کس کے گھر میں اناج زیادہ ہے اور کس کے پاس مال و دولت کتنی ہے یا پھر کس کے گھر میں سونا چاندی یا ہیرے جواہرات کے زیور ہیں۔ اس طرح پکی خبر پا کر یہی لوگ جو دن میں گاؤں والوں کے ساتھ ان کے پڑوسی بن کر رہتے تھے، رات ہوتے ہی ڈاکو بن جاتے تھے اور وہی جا کر لوٹ مار کرتے تھے اور کامیاب رہتے تھے اس طرح یہ لوگ نہ صرف عوام بلکہ خواص چودھری وغیرہ اور پولیس کی نظروں میں بھی نہیں آتے تھے۔

لیکن شمیکا نے میرے کان میں سرگوشی کی تھی کہ اس کا خیال ہے کہ لوگ ڈاکو نہیں ہیں بلکہ راہ زن ہیں جو راستے میں رات کے وقت گھات لگا کر بیٹھ جاتے ہیں اور رات کے راہی اور دیگر مسافروں کو لوٹ لیتے ہیں۔ اس طرح یہ لوگ رات کو اپنے کارندے ٹیکسی ڈرائیور اور دیگر بہروپ کی صورت میں پھیلا دیتے ہیں جو مسافروں کو ڈرا دھمکا کر یا جبر و زیادتی سے لوٹ لیتے ہیں اور اپنے سردار کے پاس بہانے سے لے آتے ہیں تاکہ اس شخص میں مزاحمت کا حوصلہ بھی جواب دے جائے۔

شمیکا کا یہ خیال کسی حد تک درست بھی ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ٹیکسی ڈرائیور نے ہمارے ساتھ کچھ ایسا ہی سلوک کیا تھا کہ گھات لگا کر ہمارا پیچھا کیا اور پھر ہمیں اپنے جال میں پھانس کر ویرانے تک لے گیا اور پھر ٹیکسی رک کر ہم پر شک کیا۔ اگر اس ٹیکسی ڈرائیور کی یہ گھات نہ ہوتی تو اس کے ساتھی بغیر کسی اطلاع کے ہم تک کیسے پہنچ سکتے تھے۔ وہ خود بخود ہماری سمت چلے آئے اور ہمیں اپنے سردار تک چلے آنے پر مجبور کیا۔

میرے دل میں ایک خدشہ اور جنم لے رہا تھا۔ کہ یہ لوگ نہ ڈاکو ہیں اور نہ راہ زن و لٹیرے بلکہ یہ گروہ مجھے عزت کے لٹیرے اور ہوس کار زیادہ نظر آ رہے تھے۔ ان کی نظروں سے عیاشی چھلک رہی تھی۔ ان کے جسم اور پہناوے بھی عیاشوں سے کم نہیں تھے اور پھر ان کی حرکات و سکنات بھی یہ ظاہر کر رہی تھیں کہ ان کا نشانہ بھولی بھالی گاؤں کی غریب لڑکیوں کی عزت سے کھیلنا ہے۔ کیوں کہ جب ان کا سردار ایک آواز پر اس مخدوش حویلی نما عمارت سے باہر نکلا تو اس کی نظر سب سے پہلے شمیکا پر ہی جم گئی تھی اور وہ اسے کسی بھوکے بھیڑیے کی طرح گھور رہا تھا، جیسے وہ کوئی گوشت کا بغیر ہڈی والا ٹکڑا ہو اور خود بخود بھیڑیے کے منہ میں چلا جائے گا۔ اگر میرا یہ خدشہ درست تھا تو شمیکا ان کے لیے وہ ہڈی ثابت ہوگی جسے وہ نہ تو نگل سکتے ہیں اور نہ ہی اگل سکتے ہیں۔ وہ ان کے گلے میں اٹک جائے گی اور انھیں جان بچانا مشکل ہو جائے گا۔

"او کبرو۔ کون ہیں یہ لوگ۔" سردار کے سوال نے میری تصورات کا سلسلہ ختم کر دیا تھا۔

"سردار یہ شہری بابو ہمارے گاؤں کی عزت کو خاک میں ملانا چاہتا تھا۔ اس گاؤں کی گوری کو اپنی جھوٹی محبت کے جال میں پھانس کر شہر لے جا رہا تھا۔ جیسے کہ اس سے پہلے بھی کئی شہری بابو ایسا کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ ایک دو تو کامیاب بھی ہو گئے تھے۔ سردار یہ لوگ گاؤں کی بھولی بھالی لڑکیوں کو محبت کا جھانسہ دے کر اپنی ہوس کا شکار بناتے ہیں اور جی بھر جانے پر اسے کوٹھے والوں کے ہاتھ فروخت کر کے طوائف بننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔" ٹیکسی ڈرائیور نے کمال کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

"کیوں ری چھوکری۔ تجھے بھی لاج نہیں آئی۔ اپنے ماں باپ کی ناک کٹوانا چاہتی تھی۔ یہ جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ کیا یہ دیوانہ پن اسی شہری بابو کے ساتھ پورا کرنا تھا۔ تجھ سے اپنا جوبن سنبھالا نہیں جا رہا ہے تو لا ہمیں اس کا رکھوالا بنا دے۔ ہم اس کی حفاظت تجھ سے بہتر کریں گے۔" سردار نے آگے بڑھ کر شمیکا کا بازو تھامتے ہوئے کہا۔

"دیکھو کبرو، تم اس شہری بابو سے پوچھ گچھ کرو کہ اس کا تعلق کون سے شہر سے ہے اور کہیں یہ کسی بڑے گروہ کا ساتھی تو نہیں ہے۔ جس کا کام ہی یہ ہے کہ گاؤں کی سیدھی سادی لڑکیوں کو ورغلا کر شہر لے جاتے ہیں اور اپنی راتیں رنگین کرنے کے بعد انھیں کسی دوسرے گروہ کو بیچ دیتے ہوں یا پھر طوائف بنا کر جسم فروشی سے بھی دولت کماتے ہوں۔ ذرا اچھی طرح اگلوا لینا کہ اب تک کس کس گاؤں سے کتنی لڑکیاں اس طرح لے جا چکے ہیں۔ میں ذرا اسی گاؤں کی عزت کو خاک میں ملانے والی کا نام دیتا پوچھ لوں۔" سردار نے مجھے ان ظالم اور سفاک درندے نما نوجوانوں کے حوالے کرتے ہوئے شمیکا کو گھسیٹتا ہوا اسی مخدوش عمارت میں لے گیا۔ اچانک سردار کے قدم رک گئے۔

''اور ہاں گبرو، آج تم شراب بہت اچھی لائے تھے۔ ہرن کا گوشت کھانے کے بعد شراب نے نشہ دو بالا کر رکھا ہے اور سونے پر سہاگہ، تم اتنا اچھا اور بھرپور شباب بھی لے آئے۔ آج تمہیں تمہاری محنت اور وفا داری کا نہ صرف انعام واکرام ملے گا بلکہ میرے بعد حصہ بھی۔'' سردار نے مڑ کو پر خمار لہجے میں گبرو سے کہا۔ گبرو کا سینہ یہ الفاظ سن کر اور بھی چوڑا ہو گیا تھا۔

باقی نوجوان مجھے ایک درخت کی طرف لے گئے اور اس کے تنے سے مجھے ایک موٹے رسے کی مدد سے باندھ دیا گیا۔ باندھنے سے پہلے انہوں نے میری تلاشی بھی لی تھی۔ میرے پاس سے انہیں ایک بٹوے کے سوا کچھ نہیں ملا تھا۔ بٹوا اتنا چھوٹا تھا کہ وہ ہنسنے لگے اور اسے دیکھے بغیر ایک طرف کو پھینک دیا۔ بعدازاں یہ لوگ بیٹھ کر شراب نوشی کرنے لگے اور بھوکے بھیڑیوں کی طرح کسی ان دیکھے گوشت کے انتظار پر مجبور تھے۔ ان سب کو ایک ایک لمحہ، ایک ایک صدی کی مانند لگ رہا تھا۔ مجھے اس درخت سے باندھ کر اس حویلی کے نزدیک ہو گئے تھے۔ شاید وہ ایسا ہی کرتے ہو۔ شکار کو شکاری کے پنجے میں دے کر اس کی مجبور اور بے بس سسکیاں سن کر لطف اندوز ہوتے ہوں گے۔ وہ اس مخدوش عمارت کی دیواروں سے ٹیک لگا کر شراب نوشی کر رہے تھے۔

''لے یار گبرو، تو زیادہ شراب پی لے۔ آج تو سب سے پہلے تیری باری ہے۔'' ایک نوجوان نے اپنے ساتھی گبرو کے کاندھے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''کیا ہوا ہے۔ آخر شکار کو پھانسنے اور سردار تک پہنچانے کی محنت بھی تو میں نے کی ہے۔'' گبرو نے سرشاری میں جواب دیا تو اس کا سینہ فخر سے پھول گیا تھا۔

''ابے یار...... کافی دیر ہو گئی۔ ابھی تک ہرن کے زخمی ہو کر رونے کی آواز نہیں آئی۔'' دوسرے نوجوان نے کسی تشویش ناک لہجے میں اس طرف توجہ دلوائی تھی۔

''ہاں یار...... تو ٹھیک کہتا ہے۔ سردار نے شراب بھی کافی دیر پہلے پی لی تھی اور ہرن کا گوشت کھاتے ہوئے تو اسے اور دیر ہو چکی تھی۔ اب تو شکار کھیلنے کا بھرپور موقع تھا۔'' گبرو نے متجسس لہجے میں اپنے ساتھی کی ہاں میں ہاں ملائی۔ اس کے ساتھ ہی انہیں لکڑی کی کوئی چیز ٹوٹنے کی آواز آئی تو ان کی جان میں جان آئی۔

''ہاں دوست ہرن پر حملہ اب شروع ہوا ہے۔ سردار اپنے شکار کو آزاد کر کے جان بچانے کا بھرپور موقع دیتا ہے اور پھر کھلے جنگل میں شیر کی طرح گھات لگا کر بھاگتی ہرن کو دبوچتا ہے اور شکار کر کے اپنی ہوس کی آگ بجھاتا ہے۔'' تیسرے نوجوان نے سردار کے شکار کرنے کی روداد کسی فلم اسٹوری کی طرح سنائی، جیسے اس نے کبھی سردار کے شکار کرنے کے مناظر خود اپنی آنکھ سے دیکھے ہوں۔

لکڑی کی کوئی چیز ٹوٹنے کے بعد مسلسل چیزوں کے ٹوٹنے کی آوازیں فضاؤں میں بکھرتی رہیں۔ وہ سب کان لگا کر سنتے رہے۔ یہ آواز دوسری راتوں سے مختلف تھیں۔ اس کے بعد کسی کے گڑگڑانے اور رونے چلانے کی آوازیں آنا شروع ہو گئیں جس نے ان شرابیوں اور بدمعاشوں کا سارا نشہ ہرن کر دیا۔ کیونکہ یہ آوازیں نسوانی نہیں بلکہ مردانہ تھیں۔ کچھ دیر بعد گھٹی گھٹی حلق سے آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کوئی منوں بوجھ تلے دب کر آہ و فغاں کر رہا ہو۔ ہر شرابی کے ہوش و حواس جاتے رہے تھے۔ پھر قدموں کی آوازیں جو کسی کے بھاگنے پر مشتمل تھیں، آنے لگیں تو مخدوش عمارت کے در و دیواریں لرز اٹھیں۔ ٹوٹی پھوٹی اور بوسیدہ کھڑکیاں اور دروازے خود بخود بند ہوئے تو یہ بھیانک اور روح فرسا منظر دیکھ کر ان تمام کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ سب شرابی اپنی اپنی جگہ پر دم بخود کھڑے تھے۔ ان کے پاؤں من من بھاری ہو گئے تھے۔ مگر کسی میں اتنی جرات اور ہمت نہیں تھی جو اندر جا کر حقیقتِ احوال جان سکے۔

گبرو نے میرے چہرے پر نظریں جما کر دیکھا

تو وہاں اس کو سکون اور اطمینان نظر آیا۔ کیوں کہ میں جان گیا تھا کہ شمیکا نے اپنا کام شروع کر دیا ہے۔ وہ اپنی جناتی طاقتوں سے بھرپور کام لے رہی ہے اور سردار کو مزا چکھا رہی ہے۔ بلکہ ان بے گناہ اور مجبور و بے بس لڑکیوں کا انتقام بھی نہ لے رہی ہے جو اس ظالم، بے حیا اور زانی کی ہوس کا شکار ہو چکی تھیں۔ اس سے پہلے گبرو اندر جانے کی ہمت کرتا اور جرات مندانہ قدم بڑھاتا، ان کا سردار ایک کھڑکی کو توڑ کر ان کے سامنے آن گرا تھا۔ گبرو اور اس کے ساتھیوں نے دیکھا کہ سردار کے برہنہ جسم پر کسی درندے نما جانور کے پنجوں کے نشانات بہت گہرے ہیں اور ان سے فوارے کی صورت میں خون بہہ رہا ہے۔ سردار کے دراز بالوں کو اس بے دردی سے نوچا گیا تھا کہ وہ اکثر اپنی جگہ چھوڑ چکے تھے۔ جبڑے پر اس زور کا گھونسا مارا گیا تھا کہ سردار کا منہ ادھر سے ادھر پھر گیا تھا اور سامنے کے دانت بھی ٹوٹ گئے تھے۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں کی ہڈیوں کے ساتھ ساتھ ریڑھ کی ہڈی بھی ٹوٹ چکی تھی کیوں کہ وہ کوشش کے باوجود ہل نہیں پا رہا تھا۔ وہ بولنا چاہ رہا تھا مگر اس کی زبان اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ کوئی میری رسیاں کھول رہا ہے۔ ایک لمحے میں، میں آزاد ہو گیا تھا۔ یہ شمیکا تھی جو غائب حالت میں درخت کے پیچھے آ کر میری رسیاں کھولنے لگی تھی۔

''یہ تم نے بہت اچھا کیا جو ایسے خبیث انسان کو عبرت کا درس دیا۔ ورنہ یہ جب تک اس مرحلے سے نہ گزرتا خود کو طاقت کا خدا سمجھتا رہتا اور سیدھی سادی لڑکیوں کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتا رہتا۔'' میں نے سرگوشی کے انداز میں شمیکا سے کہا۔

''ابھی تو ٹرائکر تھا پوری فلم چلنا تو ابھی باقی ہے۔ بس تم دیکھتے جاؤ۔ آج میں تمہیں ایک نیا تجربہ بھی کراتی ہوں تاکہ تم اس عمل سے بھی گزر جاؤ اور مزید کندن بنتے جاؤ۔'' شمیکا نے بڑی سنجیدگی سے کہا تھا۔

''کیسا تجربہ شمیکا...... میں تمہاری بات کا مطلب نہیں سمجھا۔'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ارسلان آج میں تمہارے جسم میں داخل ہو کر تمہیں نیا تجربہ کرانا چاہتی ہوں تاکہ تمہیں معلوم ہو سکے کہ جب کوئی جن کسی انسانی جسم میں داخل ہوتا ہے تو اسے کیسا محسوس ہوتا ہے اور اس کو اپنے اندر کیسی کیسی تبدیلیاں محسوس ہوتی ہیں اور اس میں ایک انسان کے مقابلے میں کتنی گنا طاقت اور قوت بڑھ جاتی ہے۔'' شمیکا نے خود کو میرے جسم میں داخل کرنے کے لیے تیار کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن شمیکا کہیں ایسا کرنے سے میں۔''

''نہیں ارسلان، تمہیں کسی قسم کی تکلیف محسوس نہیں ہوگی مگر یہ نیا تجربہ عجیب سا ضرور لگے گا اور تم اس عمل سے بہت کچھ سیکھ سکو گے۔ اس طرح نہ صرف تمہاری جسمانی طاقت کی لگن بڑھ جائے گی بلکہ ذہنی قوت میں بھی بے پناہ اضافہ ہوتا محسوس کرو گے۔'' شمیکا نے مجھے دلاسا دیا۔

''ٹھیک ہے میں تیار ہوں۔ مجھے ہر قدم پر اب تمہارا ساتھ دینا ہے۔ تم میری شریکِ سفر ہی نہیں بلکہ شریکِ زندگی بھی ہو۔ بتاؤ مجھے کیا کرنا ہے۔'' میں نے خود کو ذہنی طور پر تیار کر لیا تھا۔ دراصل شمیکا چاہتی تھی کہ وہ میرے جسم میں داخل ہو کر میری جسمانی طاقت کو کئی گنا بڑھا دے اور پھر میں ان بدمعاشوں سے مقابلہ کر کے انہیں ان کے کیے کی سزا دوں اور مزا چکھاؤ۔ میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری بحث و مباحثے میں ان شرابیوں کو بھاگنے کا موقع مل جاتا۔ کیوں کہ وہ سمجھ تو چکے تھے کہ اندر جانے والی لڑکی کوئی عام لڑکی نہیں تھی۔ ورنہ آج سے پہلے بڑی بڑی منہ زور اور ہاتھ چھوڑ لڑکیوں کو سردار نے چند منٹوں میں قابو کر لیا تھا۔ بلکہ مرد مار عورتیں بھی اس کے آگے ہتھیار ڈال دیتی تھیں۔

''بس تم چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لو۔''

شمیکا کے کہنے پر میں نے آنکھیں بند کیں تو مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں صحرا کی تیز دھوپ میں آ کھڑا ہوا

ہوں۔ پھر مجھے گرم گرم لوئیں سی جسم میں لگتی محسوس ہوئیں اور ایک تیز ہوا کے گرم جھونکے نے میرے پورے جسم کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ رفتہ رفتہ یہ گرم ہوا میرے مساموں، ناک، آنکھوں اور منہ کے ذریعے جسم کے اندر داخل ہونے لگی۔ میرے پورے جسم میں ایک سنسنی سی دوڑ گئی۔ ایک بھرپور جھٹکا مجھے لگا اور میں اپنے آپے میں نہیں رہا۔ جب شمیکا میرے جسم میں داخل ہوگئی تو مجھے آنکھیں کھولنے کو کہا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا تو مجھے دور دور تک صاف نظر آرہا تھا۔ اتنی دور جتنی میری بینائی کی طاقت نہیں تھی۔ اب وجود اور جسم میرا تھا مگر اس پر اختیار شمیکا کو حاصل ہوگیا تھا۔ میں نے اپنے جسم پر ہاتھ پھیر کر دیکھا تو اس کی ہیئت اور جسامت میں کوئی تبدیلی واقعی نہیں ہوئی تھی۔ میرا دل، دماغ، ذہن اور آنکھیں بغیر کسی تغیر وتبدیل کے ویسے کی ویسے تھیں۔ ہاں مگر مجھے بار بار اپنے جسم کے اندر جلن کا احساس ہو رہا تھا ایسے جیسے کہ میں نے تیز دھوپ میں بھی لحاف اوڑھ رکھا ہو۔ بڑی عجیب وغریب گرمائش تھی۔ جس سے نہ تو مجھے پسینے آرہے تھے اور نہ ہی حبس اور گھٹن محسوس ہو رہی تھی بلکہ اس گرمائش سے دل میں بھی گھبراہٹ نہیں تھی ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے میں سردیوں میں دن کے دس بجے دھوپ میں بیٹھا ہوں اور دھوپ کی نرم نرم شعاعوں سے بدن سینک رہا ہوں۔

"جاؤ کبرو، اب تمہاری باری ہے۔ سردار نے یہی کہا تھا کہ تمہیں ایسا بھرپور شباب لانے پر نہ صرف انعام واکرام ملے گا بلکہ اس کے بعد اس میں سے حصہ بھی۔" میں نے کبرو کے پاس پہنچ کر اسے یاد دلایا۔

"نہیں میں اندر نہیں جاؤں گا۔ وہ کوئی عام لڑکی نہیں ہے۔ مجھے پتا ہوتا تو میں اسے یہاں تک لانے کی زحمت ہی نہیں کرتا۔ اور ہاں تم بھی کوئی عام انسان نہیں ہو۔ بھلا تم خود بخود رسیوں کی قید سے کیسے آزاد ہوگئے۔ مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔" کبرو نے دو قدم پیچھے ہٹتے ہوئے گھبراہٹ میں کہا۔

"کبرو اب تو تمہیں جانا پڑے گا۔ نجانے تم لوگوں نے کتنی بے گناہ لڑکیوں کو آلودہ کیا ہوگا۔ اب اس کی سزا بھگتنے کا وقت آیا ہے تو تم پیچھے ہٹ رہے ہو۔" میں نے ایک زوردار طمانچہ اس کے سیدھے رخسار پر جماتے ہوئے کہا۔ طمانچے کی آواز اس قدر زوردار تھی کہ رات کے سناٹے کا سینہ چیر کر دور دراز علاقوں تک گئی ہوگی۔

"ڈرو نہیں ساتھیو، آگے بڑھو، ہم پانچ ہے اور یہ اکیلا۔ چلو اس پر ٹوٹ پڑو اور اس کی بیوی نے جو ہمارے سردار کی حالت بنائی ہے، اس کا انتقام بھی اس سے لے لو۔" کبرو نے ان شرابیوں کی غیرت کو للکارا تو وہ ایک ساتھ آگے بڑھنے لگے۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے میرے سامنے وہ پانچ بدمعاش نہیں تھے بلکہ پانچ گیندیں تھیں جن کو میں ہر بار ایک زوردار کک لگاتا تھا اور وہ گول کی بجائے دیوار سے جاٹکراتی تھیں۔ یہ عمل اتنی بار دہرایا گیا کہ سردار کی طرح ان سب کی ہڈیاں اور پسلیاں ٹوٹ کر کرچیاں ہوگئی ہوں گی اور کچھ کا تو سرمہ بن گیا ہوگا۔ جب وہ اپاہج اور محتاج ہوگئے یعنی ایسی حالت کو پہنچ گئے کہ ٹھیک ہونے کے بعد بھی کسی عورت سے زیادتی کرنا تو دور کی بات ہے، سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ وہ سب بے جان لاشوں کی طرح ایک دوجے سے دور دور پڑے تھے اور کچھ کے تو اعضاء بکھرے ہوئے تھے۔ عجیب ہول ناک اور دہشت ناک منظر تھا جو میری زندگی میں پہلی بار رونما ہوا تھا۔ آج میں نے اپنی آنکھوں سے شمیکا کا غصہ، انتقام اور خون کی گرمی دیکھی تھی۔ اور اس کی جناتی طاقتوں کا بھی مکمل کر مشاہدہ کیا تھا۔ مانا وہ دسیوں عورتوں سے زیادہ طاقت ور تھی مگر وہ دسیوں جن عورتوں پر بھی بھاری پڑ سکتی تھی۔ شمیکا کوئی عام جن نہیں تھی۔ اس نے اپنی دنیا میں رہ کر بہت کچھ بننے کی کوشش کی ہوگی۔ جس طرح انسان اپنی حفاظت اور ناگہانی آفت اور مصیبت سے بچنے کے لیے جوڈو کراٹے، باکسنگ اور ہتھیار چلانے کا فن سیکھتا ہے، اسی طرح شمیکا نے بھی جنوں کے سردار قسطعلنا سے اپنی جناتی قوتوں کو واپس لینے کے لیے نجانے کیا

مشقتیں نہیں کی ہوں گی اور کیا کیا پاپڑ نہیں بیلے ہوں گے اور کیسی کیسی صعوبتوں سے گزر کر وہ کندن بنی ہوگی۔ بہرحال اس کی تمام تر کاوشیں اور محنت ومشقتیں بے کار نہیں گئی تھیں۔ آج انسانیت کی خدمت کرنے میں اس کی امداد کو موجود تھیں اور سارے حربے اس کے معاون و مددگار بن گئے تھے۔

"اب یہ کام ختم ہوگیا ہے۔ دشمن اپنے کیفر کردار تک پہنچ گیا ہے۔ ہر ایک کو اس کے کیے کی سزا مل گئی ہے۔ کیا اب تم میرے جسم کو آزاد کردوگی؟" میں نے شمیکا سے پوچھا۔

"اتنی جلدی کیا ہے۔ مجھے اس قدر محفوظ پناہ گاہ ملی ہوئی ہے اور تم اسے خالی کرنے کا کہہ رہے ہو۔ میں نہیں نکلتی۔" شمیکا نے بچوں کی طرح ضد کی۔

میں نے سوچا کہ اگر میں جن ہوتا اور شمیکا آدم زاد اور میں اس کے جسم میں یعنی اپنی محبوبہ کے جسم میں حلول کر جاتا تو دنیا ومافیہا سے بے خبر ہوکر ایک عجیب سے لطف وسرور میں کھو جاتا اور محبت کے نشے سے مسرور ہوجاتا اور اس کے پرخمار وبدمست لمس سے سرشار ہوجاتا تو کیا ایسے میں مجھے کوئی باہر نکلنے کے لیے کہتا تو میں نکل سکتا تھا۔ نہیں ہرگز نہیں۔ تو پھر میرے دل کے اندر سے آواز آئی۔ پھر تم شمیکا کو اس کے محبوب، اس کے شوہر کے جسم کی پناہ گاہ سے۔ اس مست کردینے والے لمس سے، ذہن ودماغ کو معطر کردینے والی انسان کی خوشبو سے کیوں نکال دینا چاہتے ہو۔ میں لاجواب ہوکر خاموش ہوگیا۔

"کیا ناراض ہوگئے۔ چلو میں باہر آجاتی ہوں۔" شمیکا نے کسی انجانے خوف میں مبتلا ہوکر کہا۔

"نہیں خفا ہونے والی کوئی بات نہیں ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ تم باہر نہیں آئیں تو میں چائنا ریستوران میں کھانا کس کے ساتھ کھاؤں گا اور اپنے سامنے کس کو بٹھا کر آنکھوں کی پیاس بجھاؤں گا۔" میں نے بہانہ بنا کر کہا۔

"ٹھیک ہے میرے سرتاج، میں آپ کے سامنے آرہی ہوں۔ آپ خود کو سنبھالے رکھنا۔" شمیکا نے میرے جسم کو آزاد کرنے کا ارادہ کیا تو خود بخود میری آنکھیں بند ہونا شروع ہوگئیں۔ پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے جسم کی رگ رگ سے کوئی چیز کھینچ کر ایک جگہ جمع کر رہا ہو اور پھر ایک زوردار جھٹکا لگا جیسے بجلی کا کرنٹ لگتا ہے۔ ایک جھٹکے سے یوں محسوس ہوا جیسے کسی نے مجھے فلک سے اٹھا کر زمین پر پھینک دیا ہے۔ میرا وزن منوں ہلکا ہوگیا تھا اور اس گرمائش کا بھی کہیں نام ونشان نہیں تھا جو مجھے شمیکا کے میرے جسم میں حلول کر جانے سے محسوس ہوئی تھی۔

"آؤ چلتے ہیں۔" شمیکا نے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

"اب ہم کسی ٹیکسی میں نہیں جائیں گے بلکہ تم اپنی جادوئی شکتی سے چائنا ریستوران لے چلوگی تاکہ پھر اس قسم کی ناگہانی مصیبت پلے نہ پڑ جائے۔" میں نے شمیکا کو اور قریب کرتے ہوئے کہا۔

"میرے سرتاج، اس قسم کے معاملات کو مصیبت نہ کہیں۔ اس کے ذریعے تو قدرت ہم سے کمزور اور بے سہارا لوگوں کی مدد کروا رہی ہے اور ظالموں اور جابروں کو کیفر کردار تک پہنچا رہی ہے۔ ہوسکتا ہے اس طرح اس جگہوں سے ظلم وستم اور بربریت کا نام ونشان مٹ جائے۔" شمیکا نے مجھے نصیحت کے انداز میں سمجھانے کی کوشش کی۔ میں نے اپنے سامنے چائنا ریستوران کو دیکھا تو سفر وہیں پر رک گیا۔

"کیا ہوا آپ رک کیوں گئے۔" شمیکا نے بڑے ادب واحترام سے پوچھا۔ واقعی شمیکا نے مجھے اپنا شوہر دل وجان سے تسلیم کرلیا تھا۔ شاید شمیکا بھی شریف النفس مردوں کی طرح پاکیزہ اور صابر عورت تھی۔ تبھی اس نے سہاگ رات منانے کی طرف توجہ نہیں دی تھی اور نہ کبھی ایسی بات سے منع کیا تھا مگر یہ تو میں ہی چاہتا تھا کہ والدین کے سامنے باقاعدہ نکاح کرکے ایجاب وقبول کے ساتھ گواہوں کے سامنے شمیکا کو دلہن بنا کر کمرۂ عروسی میں لے جاؤں اور پھر ہم

اپنے دلدر دور کریں اور دل کے تمام ارمان پورے کر لیں اور تمام حسرت نکال لیں۔ ہم میں سے کسی کو ملن کی جلدی نہیں تھی۔ جب سے ہم نے ایک دوسرے کو دل سے اپنا بنالیا تھا تب سے ایک دوسرے سے جدا ہونے کا بھی خطرہ نہیں رہا تھا۔

"شمیکا اس لباس میں تم واقعی گاؤں کی سب سے حسین و جمیل اور بھرپور جوبن والی لڑکی لگ رہی ہو۔ جی چاہتا ہے تمہیں سامنے بٹھا کر کئی دنوں تک تکتا رہوں۔ مگر شمیکا اس ہوٹل میں، میں تمہیں اس دیہاتی لباس میں نہیں لے کے جاسکتا۔ لوگ ہمیں عجیب و غریب نظروں سے دیکھیں گے تو عجیب سا لگے گا۔" میں نے تعریف کر کے اس کو خوش کردیا تھا اور پھر لباس تبدیل کرنے کا تقاضا کیا تھا۔ یوں اسے ذرا بھی برا نہیں لگا۔

"چند لمحوں کے لیے رخصت کی اجازت چاہتی ہوں۔" یہ کہتے ہی شمیکا میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔ چند لمحوں کے بعد واپس آئی تو وہ بالکل سادہ سی شلوار قمیض میں ملبوس تھی۔ حسن وشباب و جوبن کسی لباس کا محتاج نہیں ہوتا۔ شمیکا کا بھرپور شباب اس سادہ سے لباس میں بھی پرکشش تھا۔ اس کے انگ انگ سے مستی چھلک رہی تھی۔ میں نجانے کیا سوچ کر زیر لب مسکرایا اور اس کے ساتھ چائنا ریسٹوران کی طرف گامزن ہوگیا۔ چند قدم چلنے کے بعد شمیکا نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا تھا کہ وہ مجھے اپنی جناتی شکتی سے اُڑ کر چائنا ریسٹوران تک لے جائے مگر میں نے اسے اشارہ سے منع کردیا۔

"بہت زور کی بھوک لگی ہے اور تم دیر کررہے ہو؟ کیوں!" شمیکا نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا اور وہ منہ بسورنے لگی۔

"میں چاہتا ہوں اس چاندنی رات میں تمہارے ساتھ چلنا کا مزا بھی لوں۔ دیکھو نا ہر کھیت و کھلیان، تمام درخت، شاخ اور پتے تک چاندنی میں نہا رہے ہیں۔ ہر طرف چاندنی کھل کر برس رہی ہے۔ اور موسم بھی کس قدر دل فریب اور سہانا ہے، ایسے میں تو عاشق اپنے محبوب کے وصال کی دعائیں کرتے ہیں، پرندوں کو ملن کی خواہش ستاتی ہے، شرابیوں کا دل جی بھر کر شراب پینے کو اور بدمست ہونے کو کرتا ہے، نوجوان لڑکیاں انگڑائیوں پر انگڑائیاں لیتی ہیں، ان کے دل میں چاہے جانے کی خواہش سر ابھارتی ہے۔ برہن بیٹھ کر اپنے نصیبوں کو روتی ہے اور فرقت کے مارے لوگ گھروں کو لوٹتے ہیں۔ بھلا ایسے موسم میں، میں اپنے جیون ساتھی کی قربت کا مزہ کیوں نہ لوں۔" میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ پہلے تو وہ حیران نظروں سے میرے شاعرانہ جملوں کو سنتی رہی مگر آخری جملے پر اس نے شرم سے نظریں جھکالیں۔ میں نے اس کے چہرے کو اپنی نظروں کی گرفت میں لیا تو وہ حیا سے گلنار ہورہا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے بہت دیر تک چلتے رہے۔ ہم ایک دوسرے کا لمس پاکر مخمور ہورہے تھے اور اپنی رو میں بہتے جارہے تھے۔ ہمیں ایسا محسوس ہورہا تھا جیسے ہم ہوا میں اُڑ رہے ہیں۔ ہمارے قدم زمین کو چھو نہیں رہے۔ چاندنی رات میں ایک حسین اور گداز جسم، ایک نوجوان اور سجیلے مرد کے ساتھ گھوم پھر رہا تھا۔ ہم یوں تو انسانوں کی جیتی جاگتی دنیا میں موجود تھے مگر ہم خیالات و تصورات کی الگ دنیا بسائے ہوئے تھے اور اس تصوراتی اور خیالی دنیا میں ایک دوسرے کی رفاقت و قربت میں محو دنیا و مافیہا سے بے نیاز ہوگئے تھے۔ چاندنی نے ہر چیز درخت، کھیت، پھول، پتے، ندیا، باغ و چمن یہاں تک کہ ویران راہ گزر کا بھی حسن بڑھا دیا تھا۔ انھیں خیالات میں گم ہم شاید چائنا ریسٹوران کی مخالف سمت آگئے تھے کیوں کہ جس قدر ہم چلے ہوں گے اب تک تو ریسٹوران کو آجانا چاہیے تھا۔ سامنے ایک ندیا نے ہمارا راستہ روک لیا تھا۔ تب ہمیں اپنی محویت میں راستہ ٹھیک جانے کا احساس ہوا۔ میرے ساتھ ساتھ یہ احساس شمیکا کو بھی ہوا تھا جیسے بہت زور کی بھوک لگی تھی اور وہ ندیا کے کنارے پر سکون انداز

میں کھڑی منظر کشی کا لطف لے رہی تھی۔

"شمیکا، تمہیں بہت زور کی بھوک لگی تھی چلو ریسٹوران چلتے ہیں۔" میں نے شمیکا کی محویت کو دیکھتے ہوئے اسے یاد دلایا۔ اس نے میری بات سنی ان سنی کردی یا پھر واقعی اسے میری بات سنائی نہیں دی تھی۔ وہ کہنے لگی۔

"ارسلان۔ دیکھو اس سہانے اور دل فریب موسم نے انسان تو انسان آسمانی مخلوق چاند کو بھی اپنے سحر میں مبتلا کردیا ہے۔ زمین میں جس قدر کشش ہوتی ہے، وہ اپنی کشش سے آسمانی مخلوق کو بھی اپنی طرف کھینچ لاتی ہے۔ دیکھو تو سہی چاند بھی آسمان سے زمین پر اتر آیا ہے اور اس ندیا میں نہا کر کس قدر فرحت اور تازگی محسوس کررہا ہے۔ یہ کرنوں کی سیڑھی اس بات کا ثبوت ہے کہ چاند اس کرنوں کی سیڑھی کے ذریعے ہی ندیا میں اترا ہے۔" شمیکا نے میرے کندھے پر اپنا سر ٹکاتے ہوئے کہا۔ میں نے اس کا نرم و نازک اور گداز جسم اپنے قریب تر کرلیا۔ نہ صرف قریب تر کرلیا بلکہ اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اپنے ساتھ لگا لیا۔ جس قدر جاں فزا لمحے تھے، میں الفاظ میں بیان نہیں کرسکتا۔ چاندنی رات کا سماں، دل فریب موسم، سہانے منظر، ٹھنڈی ٹھنڈی سانسوں میں فرحت سے بھرتی ہوا، خوش گوار فضا اور پھر ایک جوان و پرشباب جسم کی قربت نے مجھے مدہوش کردیا تھا۔ میں رعب جمال یار سے گنگ سا ہوگیا تھا۔ اس موسم میں شمیکا کا حسن دوآتشہ ہوگیا تھا۔ اس کے بدن سے بدمست کرنے والی مہک اٹھ رہی تھی۔ وہی مہک جو میں نے پہلی بار ذوق شیریں مٹھائی کی دکان میں محسوس کی تھی۔ میری نس نس میں مستی بھرتی جارہی تھی۔ سونے پر سہاگہ کہوں یا نہلے پر دہلا، کہ شمیکا نے ایک ادائے بے نیازی سے اپنا سر اٹھایا اور اپنی نرم و نازک انگلیوں کی مدد سے اپنے ریشمی، گھنی اور سیاہ گھٹاؤں جیسی زلفوں کو کھول دیا۔ زلفوں کا کھلنا تھا کہ بھینی بھینی خوشبوؤں سے ماحول معطر ہوگیا۔ میں نہ صرف شمیکا کی ریشمی زلفوں میں پیار سے انگلیاں پھیرنے لگا، ان سے کھیلنے بھی لگا تھا۔ اور اپنا چہرہ ان میں چھپا کر وہ بھینی بھینی خوشبو سونگھنے لگا۔ یہ مہک مجھے پھسلانے لگی، میرے قدم ڈگمگانے لگے۔ میرے جذبات بپھر رہے تھے۔ میں اپنے آپ پر قابو پانے میں ناکام ہوتا جارہا تھا۔

"دیکھو بالے، اگر تم نے مجھے چھونے کی کوشش کی تو میں اس ندیا میں کود کر جان دے دوں گی۔" اگر یہ نسوانی آواز میرے کان میں نہ آتی تو میں اپنے آپ سے کیا ہوا عہد خود ہی توڑ دیتا۔ اس دن کا انتظار مشکل ہوجاتا جب دن میں شمیکا کو اپنے والدین کے سامنے اپنانے کے بعد ارمان پورے کرنے کا کررہا تھا۔ شاید اس حرکت سے میں اس کی نظروں میں گر جاتا۔

"پیچو، دیکھو میری بات غور سے سنو، میں تم سے وعدہ کرتا ہوں اب زبردستی نہیں کروں گا۔" مردانہ آواز پر ہم چونکے تھے۔ یہ آواز کباب میں ہڈی ثابت ہوئی تھی۔ اس آواز نے ہمیں عیش و نشاط کے لمحوں سے باہر نکال دیا تھا۔ یہ آواز ہمارے لیے اذیت دہ ثابت ہوئی تھی۔ مگر ہمارے زندگی کا مقصد یہی تھا کہ بے بس اور کمزور انسانوں کی مدد کی جائے۔ مظلوموں کو ظالموں کے چنگل سے نجات دلائی جائے اور ان کے جور و ستم سے دور رکھا جائے۔

"نہیں بالے۔ تم نے اپنا اعتبار کھودیا ہے۔ میں نے تم کو ٹوٹ کر چاہا۔ شدید محبت کی، تم پر اعتبار کیا مگر تم نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی۔" نسوانی آواز کی بات سن کر میں نے اور شمیکا نے خود کو سنبھالا اور اس طرف قدم بڑھائے جس طرف سے آواز آرہی تھی۔ ہم نے اپنے آپ کو ایک درخت کی آڑ میں کرلیا۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ندیا کے بیچ میں ایک نوجوان دوشیزہ کھڑی تھی جس کا آدھا جسم ناف تک پانی میں ڈوبا ہوا تھا اور اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا سینہ ڈھانپ رکھا تھا۔ میں نے غور کیا تو محسوس ہوا کہ اس کی قمیض کا گریبان چاک ہوکر پیٹ تک آیا ہوا ہے جس کی وجہ سے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنے سینے کو ڈھانپ رکھا تھا۔

(جاری ہے)

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

خوشبو سے ہواؤں سے نہیں ملتے کچھ لوگ
موسم کی اداؤں سے نہیں ملتے کچھ لوگ
مل جائیں تو جیون کو سجادیتے ہیں لیکن
کھوجائیں تو دعاؤں سے نہیں ملتے کچھ لوگ
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

وفاؤں کے بدلے جفا دیتے ہیں
نہ کردہ گناہوں کی سزا دیتے ہیں
ہم ملتے ہیں جنہیں خلوص سے اکثر
وہی لوگ ہمیں دغا دیتے ہیں
(بشیراحمد پرواز......جنڈالوالہ)

لیڈر غم افلاس میں جو جیتا ہے
سرمایہ پرستی کا کفن سیتا ہے
شاید ہی مہینے میں کمائے مزدور
اک رات میں جتنے کی یہ مے پیتا ہے
(الیس امتیاز احمد......کراچی)

اگر تلاش کرو گے تو مل ہوجائے گا
مگر کون تمہیں میری طرح چاہے گا
تمہارے ساتھ یہ موسم گلابوں جیسا ہے احسان
تمہارے بعد یہ موسم بہت رلائے گا
(احسان سحر......زادے خیلا لوالہ-میانوالی)

اب تو اپنی طبیعت بھی جدا لگتی ہے
سانس لیتی ہوں تو زخموں کو ہوا لگتی ہے
(انتخاب: شمع پری......بوریوالہ)

درد ہے دل میں پر اس کا احساس نہیں ہوتا
روتا ہے دل جب وہ میرے پاس نہیں ہوتا
برباد ہوگئے ہم ان کے پیار میں
اور وہ کہتے ہیں اس طرح پیار نہیں ہوتا
(انتخاب: شفیق رضا......میاں چنوں)

قلم میں وہ طاقت نہیں جو دل کا درد لکھ سکے
زبان میں وہ پرواز نہیں جو اڑ کر تم سے مل سکے

میں اس پہ مرتی ہوں اس کو پتہ ہی نہیں
کیسے کہوں اسے بے وفا، وہ بے وفا تو نہیں
(ہمارانی......بوریوالہ)

موت مانگوں تو زندگی خفا ہوتی ہے
زہر لوں تو وہ بھی دوا ہوجاتی ہے
اب تو ہی بتا کہ میں کیا کروں نوری
جس کو چاہتا ہوں وہ بے وفا ہوجاتی ہے
(غلام نبی نوری......کھنڈیاں خاص)

ابھی کمسن ہو رہنے دو کہیں کھو دو گے دل میرا
تمہارے لئے ہی رکھا ہے لے جاناں جواں ہو کر
نہ کمسن ہوں نہ ناداں ہوں محبت کو سمجھتا ہوں
تمہارا کیا بھروسہ ہے مکر جاؤ جواں ہو کر
(راناظفراقبال......جنڈالوالہ)

اس طرح توڑا ہے تم نے دل میرا
کوئی صدا بھی نہ کرسکا میں کبھی
بعد تیرے نہ اٹھیں یہ ہاتھ میرے
کوئی دعا بھی نہ کرسکا میں کبھی
(منیراحمد ساغر......میاں چنوں)

مسلسل دل سلگنے سے دھواں ہوتا تو کیا ہوتا
جو سوزِ غم، جاوداں ہوتا تو کیا ہوتا
غنیمت ہے کہ آنکھوں سے رواں ہے اشک خون بن کر
غمِ الفت اگر دل میں نہاں ہوتا تو کیا ہوتا
(محمد عثمان علی......میاں چنوں)

ایسے لوگوں سے بھی ہم ملتے رہے دل کھول کر
جو وفا کے نام پہ سوداگری کرتے رہے
(محمد اسحاق انجم......کنگن پور)

کیوں چپکے سے وہ لوگ اتر جاتے ہیں دل میں
جن لوگوں سے قسمت کے ستارے نہیں ملتے!
(عمر دراز......کھنڈیاں خاص)

اے شمع مجھے پھونک دے
میں نہ میں رہوں تو نہ تو رہے
یہی عشق کا دستور
یہی حسن کو ہے منظور
(مس فوزیہ کنول......کنگن پور)

ٹوٹ جائے نہ کہیں ترک محبت کی قسم
تیرے قدموں کے نشانوں سے بہت دور چلے
(محمد عمران......کوٹھ کلاں۔ کنگن پور)

آنکھوں سے میری کون میرے خواب لے گیا
چشم صدف سے گوہر نایاب لے گیا
اس شہر میں خوش جمال کو کس کی لگی ہے آہ
کسی دل زدہ کا گریہ خوشاب لے گیا
کچھ ناخدا کے فیض سے ساحل بھی دور تھا
کچھ قسمتوں کے پھیر میں گرداب لے گیا
وہاں شہر بھی ڈوبتے ہیں یہاں بحث کہ انہیں
خم لے گیا ہے یا خم محراب لے گیا
کچھ کھوئی کھوئی آنکھیں بھی موجوں کے ساتھ تھیں
شاید انہیں بہا کے کوئی خواب لے گیا
طوفان ابرو باد میں سب گیت کھوگئے
جھونکا ہوا کا ہاتھ سے مضراب لے گیا
غیروں کی دشمنی نے نہ مارا مگر ہمیں
اپنوں کے التفات کا زہراب لے گیا
اے آنکھ واجد اب تو خواب کی دنیا سے لوٹ آ
مژگان تو کھول، شہر کو سیلاب لے گیا
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی..........کراچی)

منصف وقت کی تحریر بدل جاتی ہے
کوئی آجائے تو تعزیر بدل جاتی ہے
دیکھ لیتا ہوں جب پھول سا چہرہ اس کا
"آیت ہجر کی تفسیر بدل جاتی ہے"
ہاتھ پہ ہاتھ دھرے رہنے سے کیا ہوتا ہے
دل میں جذبہ ہو تو تقدیر بدل جاتی ہے
کوئی ہوتی نہیں تخفیف سزا میں میری
"فرق اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے"
اس لئے دور سے کرتا ہوں میں دیدار اس کا
پاس جاتا ہوں تو تصویر بدل جاتی ہے
یاد رکھوں بھی تو ہر خواب کا منظر کیسے
آنکھ کھلتی ہے تو تعبیر بدل جاتی ہے
(حکیم خان حکیم..........کامل پور موسیٰ)

عکس سارے آئینوں میں بٹ گئے
خواب میرے کرچیوں میں بٹ گئے
جو بنائے میں نے خوابوں کے محل
اس کے حصے دوستوں میں بٹ گئے
حق کا رستہ چھوڑ کر پایا ہے کیا؟
نور سارے ظلمتوں میں بٹ گئے
ہوگئے بے مول جو انمول تھے
اونی پونی قیمتوں میں بٹ گئے
زر کے پیچھے بھاگنے سے کیا ہوا؟
چین کھویا آفتوں میں بٹ گئے
زندگانی کم ہے چاہت کے لئے
لوگ کیسے نفرتوں میں بٹ گئے
دہر میں خانم خدا ہی آسرا
میرے اپنے دشمنوں میں بٹ گئے
(فریدہ خانم..........لاہور)

چاہتوں کے نگر میں میرا کوئی ہمنوا نہیں
فریاد لے کر جاؤں کہاں کوئی سنتا نہیں
خود غرض ہیں لوگ بیکار ہے ان سے دوستی
تیری پلکوں تلے دیپ کوئی جلتا نہیں
ملوں میں کس سے تیرے شہر میں اے ہمنشیں
دستور ہے انوکھا بچھڑ کے پھر کوئی ملتا نہیں
ہنسی تو کبھی زمانے کے ساتھ غم بھلا کے
پھر خوشی کا لمحہ عمر بھر کوئی رہتا نہیں
(محمد اسلم جاوید..........فیصل آباد)

راستے کا غبار ہیں آنسو
اذن پروردگار ہیں آنسو
مسجدوں میں جو زیب و زینت ہے
ان کی وجہ قرار ہیں آنسو
دست صانع پہ کوئی حرف کیوں نہ آئے
آنکھ کا کاروبار ہیں آنسو
ان کی تقدیر کتنی ارزاں ہے
خامشی کا فراز ہیں آنسو

مسکرائیں تو لوٹ لیتے ہیں
کیسے تخریب کار ہیں آنسو
یہ ضمیر نظر کا مخزن ہیں
آئینے کا وقار ہیں آنسو
خواب کا عکس تو نہیں دیکھا
کیا کہا؟ سایہ دار ہیں آنسو
ان کا قہر دبدبہ دل پر
شہر کے راز دار ہیں آنسو
(چوہدری قمر جہاں علی پوری......ملتان)

یارب میں تیری بارگاہ میں فریاد کرتا ہوں
تجھ کو ہر وقت ہر گھڑی میں یاد کرتا ہوں
آرزو میری یہ پوری کردے اے میرے رب
ساری عمر مانوں گا احسان میں تیرا
راتوں کو اٹھ اٹھ کر روتا رہا ہوں میں
دامن کو اشکوں سے اپنے بھگوتا رہا ہوں میں
خود کہا تو نے کہ مانگو مجھ سے تو دوں گا
میں ہوں تیرا رب عطا کروں گا ہر چیز تجھ کو
اے رب پورا کردے اپنے محبوب کا فرمان
کردے تو میری اپنی قدرت سے ہر مشکل آسان
(شرف الدین جیلانی......ٹنڈوالہ یار)

زمین پہ چل نہ سکا آسمان سے بھی گیا
کٹے جو پر تو پرندہ اڑان سے بھی گیا
بھلادیا تو بھلانے کی انتہا کردی
اب وہی شخص میرے وہم و گمان سے بھی گیا
کسی کے ہاتھ سے نکلا ہوا وہ تیر ہوں میں
ہدف کو چھو نہ سکا اور کمان سے بھی گیا
تباہ کرگئی مجھے پکے گھر کی خواہش
میں اپنے گاؤں کے کچے مکان سے بھی گیا
پرائی آگ میں کودا تو کیا ملا مجھ کو؟
اسے بچا نہ سکا اور اپنی جان سے بھی گیا
(انتخاب: ایم انس نہال......میاں چنوں)

زندگی میں زندگی کی ادا نہیں ملتی
مفت میں کسی کی دعا نہیں ملتی
تم لاکھ آزماتے رہو لوگوں کو
کسی سے دل نہیں ملتا تو کسی سے طبیعت نہیں ملتی
مجھے مغرور مت سمجھو دنیا والو!
ایک بس اس کی یاد سے مجھے فرصت نہیں ملتی
بات صرف محبت کی ہے اے دوست
کسی کو ملتی ہے بے حد تو کسی کو نفرت بھی نہیں ملتی
یوں تو ملتی ہے ہر چیز دنیا کے بازار میں
نہیں ملتی اگر کچھ تو وفا نہیں ملتی
(انتخاب: شفیق رضا......میاں چنوں)

رخسار ایسے ٹمٹماتے ہیں جناب کے
پہنے ہوں جیسے 'چاند' نے گجرے گلاب کے
لکھا ہے تیرا نام بھی 'چاہت' کے خواب سے
آؤ ورق دکھاؤں میں دل کی کتاب کے
اتنی پلا دے کہ جی بھر کے روئیں ہم
نکلیں ہماری 'آنکھ' سے آنسو شراب کے
اترا وہ اس طرح سمندر کی گود میں
جتنے بھنور تھے سوگئے پہلو میں آب کے
دیدار یار کیسے ہو آج کل
پہرے ہیں چاند سے چہرے پہ کالے نقاب کے
مل کے رات بھر بھی نہیں ملا احسان
سورج بتاگیا یہ دھوکے تھے خواب کے
(احسان......میانوالی)

تیرے شیش محل میں ٹھکانے ہی سہی
میری کٹیا میں بھی چراغ جلتے ہیں
تو لیتا ہے سانس فانوس کی فضا میں
میرے انگاروں پر خواب مچلتے ہیں
میرا لباس میری پہچان ہے
میرے لہو میں صداقت وطن کی
میں بیٹا ہوں دھرتی کی ماؤں کا

میری شہادت ہے عبادت وطن کی
میرے شعر میرے وطن کا اثاثہ ہیں
میری غزلوں میں ہے پیغام وطن کا
میرے تخیل شعلے اگلتے رہیں گے
میری نظموں میں ہے نام وطن کا
میرے دہکاں دھرتی پہ سونا اگائیں گے
پتھر جسم ہیں فولاد جن کے
قرض ہے وطن کا ان کے کندھوں پر
اس مٹی میں دفن ہیں اجداد جن کے
میرے جسم پر ہے وردی وطن کی امانت
میں وطن کی خاطر جان بھی لوٹادوں گا
میرا خون بھی کہے گا لا الہ الا اللہ
میں کلمہ کافر کو بھی پڑھا دوں گا
محبتوں کے کھلیں گے پھول یہاں پر
نسلوں کو ملے گی رہبری جن سے
افق سے اونچے ہوں گے پرچم
حوصلوں کو ملے گی پیمبری جن سے
(نامعلوم.........)

جب یاد آتی ہے مسکرا لیتے ہیں
کچھ پل ہر غم بھلا دیتے ہیں
کیسے بھیگ سکتی ہیں آنکھیں آپ کی
آپ کے حصے کے آنسو ہم بہالیتے ہیں
سرخ ہونٹوں پر جو تل نظر آتا ہے
قسم سے وہ جان سا جاتا ہے
ان کی آنکھوں کی مستی میں کھوگیا جو
وہ آدمی کہاں اٹھ پاتا ہے
ان کی زلفوں کے سائے تلے جو بیٹھ گیا
وہ آدمی کہاں اٹھ پاتا ہے
خود نوری آج تک پھنسا ہے اس جنجال میں
جو بھی اسے دیکھے اسے وہی ہر طرف نظر آتا ہے
(غلام نبی نوری......کھڈیاں خاص)

کوئی بچھڑ جائے جب ہم سے تو ہم شکوہ نہیں کرتے
بھری محفل میں کسی کو ہم رسوا نہیں کرتے
جس راستے پہ ہوں ہزاروں قدموں کے نشان
اس راستے سے اے دوست ہم کبھی گزرا نہیں کرتے
محبت کی مسافت میں جو ساتھ چھوڑ دے اپنا
مڑ مڑ کے اس شخص کو ہم کبھی دیکھا نہیں کرتے
ہر دکھ محبت کا خوشی سے جھیل لیتے ہیں ساغر
ہم دل کے زخموں کا کبھی چرچا نہیں کرتے
سنا ہے کاٹتے ہیں وہ ہجر کی رات آنکھوں میں
ہماری ہر شب ہی ایسی ہے کہ ہم سویا نہیں کرتے
آنسو اپنی آنکھوں کے چھپالیتے ہیں آنکھوں میں
منیر اگر ہنستے ہیں ہم تو کبھی رویا بھی نہیں کرتے
(منیر احمد ساغر......میاں چنوں)

نہ جانے کن خیالوں میں کھوئے رہتے تھے تم بھی ہم بھی
محبت اک دوجے سے پھر بھی کرتے تھے تم بھی ہم بھی
ملتے تھے تو کھوئے رہتے تھے چاہت کی باتوں میں
بچھڑتے تھے جب تو اداس رہتے تھے تم بھی ہم بھی
نغمے سنتے تھے محبت کے اور شعر لکھتے تھے
گلاب لا لا کر کتابوں میں رکھتے تھے تم بھی ہم بھی
عجب بے خودی تھی طبیعت میں یا عمر ہی ایسی تھی
چاہت کی سرشاری میں جانے کیا کچھ سہتے تھے تم بھی ہم بھی
باتیں بھی کرتے تھے عمر بھر ساتھ رہنے کی
اور جدائی کے خیال سے بھی ڈرتے تھے تم بھی ہم بھی
رکاوٹیں تو بہت تھیں مگر زمانے سے بے پرواہ ہوکر
اکثر ایک دوسرے سے ملنے کو نکل پڑتے تھے تم بھی ہم بھی
سمجھ میں ہی نہیں آتی تھیں باتیں تفریق و تقسیم کی
دل کی کہتے تھے اور دل کی سنتے تھے تم بھی ہم بھی
بہت اداس ہیں تم بن ہو سکے تو مل لو ایک بار
آج پھر وہی لکھتا ہوں جو کبھی لکھتے تھے تم بھی ہم بھی
(ذیشان اقبال عظمی-کراچی)

☆☆

آدمی اچھا ہوں یا ہوں برا
وقت ہی کردے گا اس کا فیصلہ
ہر کسی کو غم نہیں ہوتا عطا
بات ہے تقدیر کی سوچو ذرا
کس طرح مانگوں وفاؤں کا صلہ
جرم ناکردہ کی ملتی ہے سزا
رات دن روتا ہوں اپنے حال پر
دوستو، اپنا یہی ہے مشغلہ
بات کرتا ہوں زمانے کی مگر
ذکر آجاتا ہے پھر بھی آپ کا
دیکھ کر حسنِ بہاراں کی تپش
آرزوؤں کا نشیمن جل گیا
دردِ الفت کو سمجھنے کے لئے
ڈھونڈ کر لاؤ کوئی فکرِ رسا
داستان ہوجائے پھر تازہ مری
زخم دے جاؤ مجھے کوئی نیا
بھول جا رانا پرانی بات کو
آدمی سے ہو ہی جاتی ہے خطا
(قدیر رانا......راولپنڈی)

اشکوں کو سجائے بیٹھا ہوں
اک آس لگائے بیٹھا ہوں
الفت کی اندھیری راہوں میں
اک شمع جلائے بیٹھا ہوں
بس سانس کی ڈوری باقی ہے
ہر چیز لٹائے بیٹھا ہوں
خود اپنے ہاتھوں سے گھر کو
میں آگ لگائے بیٹھا ہوں
تیری دید کی پیاسی آنکھوں میں
کچھ دیپ سجائے بیٹھا ہوں
کچھ زخم محبت کے راغب
اس دل پہ سجائے بیٹھا ہوں
(راغب عثمان کیانی......راولپنڈی)

رنگوں میں ہے نور تیرا
خوشبو میں ہے سرور تیرا
تم جہاں پر بیٹھ کر جاتے ہو
تم جس چیز کو ہاتھ لگاتے ہو
میں وہاں بیٹھا رہتا ہوں
اس چیز کو چھوتا رہتا ہوں
تم جس چیز سے ہنس کر ملتے ہو
میں اس کو دوست بنالیتا ہوں
تم جس رستے پہ چلتے ہو
تم جس کو دیکھتے ہو
وہ خواب سرہانے رکھتا ہوں
میں تم سے ملنے جلنے کے کتنے بہانے رکھتا ہوں
میں ایسی محبت کرتا ہوں تم سے
تم کیسی محبت کرتے ہو
(ڈاکٹر ریاض قریشی......میاں چنوں)

ہو نظرِ کرم خیر الامم
عاشق ہے غم سے چور تیرا
کیسے آئے گا صبر و قرار
دیوانہ در سے دور تیرا
اور کہیں میں جاؤں کیوں
دل بن گیا ہے طور تیرا
(اقصیٰ رباب......فیصل آباد)

ٹوٹیں گی زنجیریں اک دن
کئی آزاد غلام ہوجائیں گے
جن کے سروں پر چھت بھی نہیں
کئی گھر آباد ہوجائیں گے
پرواز اٹھے گا شور اک دن
مزدور بھی شاد ہوجائیں گے
ٹوٹ کے شیش محلوں کے
چراغ برباد ہوجائیں گے
(بشیر احمد پرواز......جنڈانوالہ)

اچھا لگتا ہے
شام ڈھلے
تیز بارشوں میں
تمہیں سوچنا
تمہارے سنگ چلنا
کبھی نہ رکنا کبھی نہ تھکنا
تپتی دوپہروں میں
گھنے پیڑوں کے سائے میں
دسمبر کی گلابی سردیوں میں
دھوپ میں
بیٹھے رہنا اور تمہیں سوچنا
اچھا لگتا ہے۔
(نگہت اکرم......لاہور)

ہر آرزو لہو ہوتی جاتی ہے
یہ تیری چاہت بھی سرد ہوتی جاتی ہے
تیری یادوں کے جلتے ہوئے دیپ
دفا میں تیری نفرت ہوتی جاتی ہے
پکڑ نہ سکا کوئی بھاگتے ہوئے لمحوں کو
یہ ہوا بھی کتنی بے درد ہوتی جاتی ہے
کبھی جو تھی پھولوں سی رفاقت
وہ پھر دل میں کانٹے چبھوتی جاتی ہے
یہ جو منزل کی تلاش میں رہے سدا
پھر تھکن سفر کی گہری ہوتی جاتی ہے
جلنے دو یادوں کے اب چراغ جاوید
کسی کی محبت میں پھر کمی ہوتی جاتی ہے
(محمد اسلم جاوید......فیصل آباد)

وہ جو تیرا رقیب سا ہے
وہی تو میرا نصیب سا ہے
چلا تھا کبھی ہاتھوں میں ہاتھ لے کر
وہ جو! کسی اور کا حبیب سا ہے
زخمی ہوا جب بھی کبھی من میرا
بس وہی شخص میرا طبیب سا ہے
فاصلے کتنے بھی ہوں درمیاں مگر
میرے تو دل کے ہر پل قریب سا ہے
اک بات ہے اس میں نرالی سی
محبت میں کچھ کچھ غریب سا ہے
(محمد اسحاق انجم......کنگن پور)

محبت چاہئے ہر آدمی کو
نہیں احساس اتنا بھی کسی کو
برا کہتے ہیں سب آوارگی کو
کہاں سمجھے ہیں میری بے گری کو
ملی ہو جو کسی کا گھر جلا کر
لگادو آگ ایسی روشنی کو
میرے آنسو دعائیں کرتے رہے ہیں
نظر لگ جائے تیری ہستی کو
کتابیں چھین کر بچوں سے تو نے
کیا ہے قتل علم و آگہی کو
نہ ڈس لے شہر کی جھوٹی بناوٹ
تیری یہ گاؤں جیسی سادگی کو
یقیں مل جائے وہم و گماں سے
بنالے رہنما تو گمرہی کو
کراچی شہر کے لوگوں نے کبھی
مجھے سمجھا نہ، میری شاعری کو
کبھی نکلے واجد یہاں ایسا بھی سورج
مٹادے جو دلوں کی تیرگی کو
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی......کراچی)

کہاں ڈھونڈوں ایسا ہمسفر
جو مجھے اپنا بنا سکے
میں کہوں کہ رات ہوگئی
اور وہ! چاندنی لٹا سکے
میرے آنسوؤں کو وہ سمیٹ لے
کہ کوئی نہ مجھے رلا سکے
میری راہ میں جو ہوں مشکلیں
وہ اپنی پلکوں سے ہٹا سکے
مجھے رکھ لے اپنے حصار میں
کہ مجھے نہ کوئی چرا سکے
وہ ہو میرے اتنا قریب
کہ مجھے کسی کی یاد بھی نہ آسکے
کہ کاش!
کوئی ہو ایسا ہمسفر
جو مجھے اپنا بنا سکے
(رانا ظفر اقبال......جنڈانوالہ)

ہوا تھمی تھی ضرور لیکن
وہ شام جیسے سسک رہی تھی
کہ زرد پتوں کو آندھیوں نے
عجیب قصہ سنادیا تھا
کہ جس کو سن کر تمام پتے
سسک رہے تھے بلک رہے تھے
جانے کس سانحہ کے غم میں
شجر جڑوں سے اکھڑ چکے تھے
بہت تراشا تھا ہم نے تم کو
ہر ایک رستہ، ہر ایک وادی
ہر ایک پربت ہر ایک گھاٹی
کہیں سے تیری خبر نہ آئی
تو یہ کہہ کے ہم نے دل کو ٹالا
ہوا تھمے گی تو دیکھ لیں گے
ہم اس کے رستوں کو ڈھونڈ لیں گے
مگر ہماری یہ خوش خیالی
جو ہم کو برباد کر گئی تھی
ہوا تھمی تھی ضرور لیکن
بڑی ہی مدت گزر چکی تھی
ہمارے بالوں کے جنگلوں میں
سفید چاندی اتر چکی تھی
فلک پہ تارے نہیں رہے تھے
گلاب پیارے نہیں رہے تھے
وہ جن سے بستی تھی دل کی بستی
وہ لوگ سارے نہیں رہے تھے
یہ المیہ سب سے بالا تر تھا
کہ تم ہمارے نہیں رہے تھے
کہ ہم تمہارے نہیں رہے تھے
ہوا تھمی تھی ضرور لیکن
"بڑی ہی مدت گزر چکی تھی"
(انتخاب: قاسم رضا......چنیوٹ)

میری آنکھوں میں رواں
میرے ہونٹوں پہ بیاں
میری دھڑکن میں داستاں
میرے خیالوں میں آتا
ہائے......
تیرہ تیرہ تیرہ چہرہ
تیرہ تیرہ تیرہ چہرہ
یہ ہر سوں بکھرا دھواں
زمین فلک اور کہکشاں
جتعۂ نور ہو پھر جہاں
منظر منظر جب دکھائی دیتا
ہائے......
تیرہ تیرہ تیرہ چہرہ
تیرہ تیرہ تیرہ چہرہ
میرے ہواسوں میں بسا قبرستان
گوشہ گوشہ ہو یا مکاں
ذہن میں سوار تیری یاداں
ہر پل آنکھوں میں رہتا
ہائے......
تیرہ تیرہ تیرہ چہرہ
تیرہ تیرہ تیرہ چہرہ
اختلاج عالم تیری تنہائیاں
ہوجائے منہدم بھی سب گلستاں
تسبیح تسبیح کردوں تیری خوبیاں
کھلی آنکھوں میں نقش پاتا
ہائے......
خونِ دل دھڑکے کم رفتاں
اب تو عالم ہے لب جاں
تو ہی بتا کیا کرے عثماں
آخری پل ہوں دیدار چاہتا
ہائے......
تیرہ تیرہ تیرہ چہرہ
تیرہ تیرہ تیرہ چہرہ
(محمد عثمان علی......میاں چنوں)
☆☆

رقص موت

ایم الیاس

مکمل ناول

رات کے سناٹے کو چیرتی ہوئی ہوا کے دوش پر دلخراش اور دلدوز چیخ جب سنائی دی تو جاگتے لوگوں پر اچانک دہشت طاری ہوگئی۔ لوگ سہم کر کپکپانے لگے کہ اس کے بعد پھر اچانک لہولہان منظر نظر آیا۔

لفظ لفظ.........سطر سطر دل و دماغ کو مبہوت کرتی.........ڈراؤنی اور تحیر انگیز کہانی

گوپی نے بارہ برس کی عمر میں قدم رکھ دیا تھا۔ جب وہ پیدا ہوا تھا تو باپ نے اس کا نام گوپال رکھا تھا۔ جب وہ ایک برس کا ہوا تو اس کی ماں نے اسے گوپی کہہ کر پکارنا شروع کیا۔ کیوں کہ گوپی سری لنکا کا بہت بڑا اور مقبول گویا تھا۔ ماں باپ کے علاوہ سبھی اسے گوپی کہہ کر بلاتے تھے۔ اب جب کہ وہ بارہ برس کا تھا لیکن عمر کے لحاظ سے تو دس برس کا دکھائی دیتا تھا۔ وہ جس دنیا میں رہتا تھا وہ بھی اس کے قد کی طرح چھوٹی تھی......اس کی دو دنیائیں تھیں۔ اس کی ایک دنیا تو دو چوکور کمروں پر مشتمل تھی جو چھ منزلہ عمارت کی پانچویں منزل پر واقع تھی...... وہ کمرے گرمیوں میں بھٹی کی طرح دہکتے تھے اور نرک معلوم ہوتے تھے اور جب سردیاں آتیں تو وہ کمرے ڈیپ فریزر کی مانند یخ رہتے تھے۔ وہ سرد نرک ہوتا تھا۔ اس دنیا میں وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کی ماں اور پتا جی بھی تھے......اس کے چند دوست تھے جو اس کی عمر کے تھے۔ اس نے ہم عمر دوستوں سے ہی دوستی رکھی تھی۔ جن کے ساتھ نہ صرف وہ اسکول جایا کرتا تھا بلکہ سڑک، میدان اور ایک قریبی پارک میں کرکٹ یا فٹ بال کھیلا کرتا تھا۔

لیکن اس کی دوسری دنیا نہایت وسیع تھی۔ خلا کی مانند لامحدود......وہاں پر ہر کام کیا جاسکتا تھا۔ کوئی شخص کہیں بھی جاسکتا تھا۔ اپنی مرضی اور خوشی سے......نہایت آزادی تھی۔ کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں تھی......کوئی روکنے ٹوکنے والا نہیں تھا......کوئی دیوار نہیں تھی۔ کوئی زنجیر نہ تھی۔ اس دنیا میں جانے کا راستہ بھی نہایت آسان تھا۔ اس دنیا میں جانے کے لئے ایک پل بھی نہیں لگتا تھا۔ بس آنکھیں بند کرنے کی دیر کہ وہ اس لامحدود دنیا میں پہنچ جاتا......وہ تصوراتی دنیا تھی۔ جس کا وہ حکمران تھا۔ ایک فلمی ہیرو کی طرح......اسے یہ دنیا بہت پسند تھی۔ موقع ملتے ہی وہ تنہائی کا گوشہ تلاش کرتا اور آنکھیں بند کرکے صرف ایک ہی جست میں اس دنیا میں پہنچ کر کھو جاتا اس کا دل واپسی کو نہیں کرتا تھا۔

لیکن وہ اس دنیا کے بارے میں کسی کو بتاتا نہیں تھا۔ اس کی ماں اور پتا جی اسے باور کراتے تھے کہ اب وہ بڑا ہوگیا ہے۔ بچہ نہیں رہا ہے نہ تو اسے بچوں جیسی باتیں کرنی چاہئیں اور نہ سپنے دیکھنے۔ اگر وہ کبھی غلطی سے کسی بات پر اس دنیا کی کوئی بات کہہ بیٹھتا تو اس کی نہ صرف سرزنش ہوجاتی بلکہ بری طرح ڈانٹ ڈپٹ کر خاموش کرادیا جاتا۔ اس کے پتا جی بہت غصے والے تھے۔ پچھلے کچھ عرصے سے اس کے پتا جی نے اس کی پٹائی شروع

کردی تھی۔ اس کی ماں کہتی تھی کہ وہ یہ جھوٹ فلمیں دیکھ کر ایسا کرتا ہے۔ ماں باپ اس کی کسی سچ بات کا یقین کرنے کو تیار ہی نہیں ہوتے تھے۔ انہوں نے اس کی فلمیں دیکھنے پر پابندی لگادی تھی۔ فلمیں دیکھنے سے یہ فائدہ ہوا تھا اس کے سپنوں کی دنیا اور وسیع، سہانی اور رنگین ہوجاتی تھی۔ اس کے دل میں پتاجی کی پٹائی کا ایسا ڈر اور خوف بیٹھ گیا تھا اب وہ بڑا محتاط ہوگیا تھا اور کسی بھی بڑے کے سامنے سپنوں کی دنیا کی کوئی بات نہیں کرتا تھا۔

پھر ایک دن اس کی زندگی میں وہ رات آگئی جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا اور نہ ہی سپنے میں ایسا نظر آسکتا تھا۔

☆......☆......☆

جولائی کا مہینہ بڑا ظالم سفاک اور بے رحم تھا۔ ہر سمت آگ برس رہی تھی۔ اس نے بستر پر سونے کی بہت کوشش کی۔ گھنٹوں کروٹیں بدلتا رہا۔ ہر طرح کی جدوجہد اور کوشش کی لیکن سونے میں ناکام رہا۔ کمرے کی دیواریں دن بھر کی تمازت سے تپتی رہی تھیں اور جیسے جھلسا رہی تھیں۔ رات کے وقت بھی کمرا تنور بنا ہوا تھا۔ گوپی کو ایسا محسوس ہوا کہ اگر وہ تھوڑی دیر اس کمرے میں رک گیا تو اس کے سارے بدن میں آبلے پڑ جائیں گے۔ وہ تکیہ اٹھا کر کھڑکی کے ذریعے آگ سے بچاؤ والی کھڑکی پر آگیا۔ وہ باہر سیڑھیوں پر کھلی فضا میں سونا چاہتا تھا۔ اس حرکت پر اسے پٹائی کا کوئی خوف نہیں تھا۔ کیوں کہ پتاجی گھر پر موجود نہیں تھے۔ وہ رات کی شفٹ میں کام کرنے گئے ہوئے تھے۔

آگ سے بچاؤ والی ہنگامی سیڑھی لوہے کی بنی ہوئی تھی۔ وہ عمارت کے عقب میں کھڑکیوں کے ساتھ ساتھ اوپر چھت تک چلی گئی تھی۔

ہر منزل پر کھڑکی کے ساتھ ملا ہوا آہنی پلیٹ فارم تھا کہ آگ لگنے کی صورت میں عمارت کے مکین کھڑکی کے ذریعے اس چبوترے پر چڑھ کر سیڑھیوں کے ذریعے نیچے سڑک پر اتر کر اپنی جان بچاسکیں۔ اس آہنی چبوترے کے گرد لوہے کی ریلنگ لگی ہوئی تھی۔ گوپی گرمیوں کے موسم میں اکثر اس چبوترے پر سوجاتا تھا۔ ریلنگ کی وجہ سے نیچے گرنے کا خطرہ تو نہیں تھا...... لیکن کسی کے ستارے گردش میں ہوں تو وہ ریلنگ کی درمیانی جگہ سے لڑھک کر نیچے گر بھی سکتا تھا...... لیکن گوپی احتیاطاً ریلنگ کو ایک بازو کے حلقے میں لے کر سوتا تھا۔ اس طرح وہ نیند میں کروٹیں بدلنے پر قادر نہیں رہتا تھا۔ سوتے وقت وہ اپنا چہرہ کھڑکی کی طرف رکھتا تھا۔ سیڑھی کے دوسری جانب خلا تھا اور اسے تاریک خلا میں آنکھیں کھولتے ہوئے ڈر لگتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی بھوت اندھیرے میں کھڑا اسے گھور رہا ہے...... دن کی بات اور تھی۔ دن کے وقت وہ اکثر آہنی چبوترے پر بیٹھ کر نیچے سڑک کا نظارہ کرتا...... سڑک کے دوسری جانب واقع عمارت کے مکینوں کو اپنے فلیٹوں میں کام کرتا دیکھ کر اسے ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ کوئی فلم دیکھ رہا ہو۔

اس رات گوپی آہنی چبوترے پر آیا اور تکیہ رکھ کر چبوترے پر لیٹ گیا۔ باہر آگ کی تپش تو نہیں تھی۔ لیکن گرمی کی شدت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ کیوں کہ ہوا بند تھی۔ کچھ دیر بعد اس نے چھٹی منزل کے چبوترے پر جانے کا فیصلہ کیا۔ ممکن ہے وہاں کچھ ہوا چل رہی ہو۔ اس صورت میں شاید وہ گہری نیند سو بھی جائے۔ مگر وہ عمارت کی چھت پر سو نہیں سکتا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو چھت کی سطح پر تعمیراتی کام کے لئے بجری ڈال دی گئی تھی وہ ابھی تک پڑی ہوئی تھی۔ کام شروع نہ ہوسکا تھا۔ اس پر لیٹنے سے اس کے کنکر بدن میں چبھتے تھے۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ چھت پر تارکول کی موٹی تہہ بچھی ہوئی تھی جو گرمیوں میں پگھل کر نرم ہوجاتی تھی...... اور تارکول کپڑوں سے چپک جاتا تھا۔

وہ اپنا تکیہ اٹھا کر چھٹی منزل کے آہنی چبوترے پر آگیا۔ وہاں گرمی قدرے کم تھی۔ کیوں کہ چبوترے سے چند فٹ اوپر عمارت کی سپاٹ چھت تھی۔ جہاں سے کبھی کبھار ہوا کا کوئی ہلکا سا جھونکا چبوترے تک پہنچنے میں کامیاب ہوجاتا۔ وہ کچھ دیر تک چبوترے پر کسمساتا رہا اور پھر اس پر غنودگی طاری ہوگئی۔ اس گرمی میں گہری

نیند آنے کا کوئی سوال نہیں تھا۔ بس غنودگی ہی طاری ہوسکتی تھی۔

رات کو نہ جانے کس وقت اس کی آنکھ کھل گئی۔ اسے آنکھوں کے پپوٹوں پر روشنی کی چبھن محسوس ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے اس کا مدہوش ذہن چونک کر بیدار ہوگیا تھا۔ پہلے تو وہ یہ سمجھا کہ صبح ہوگئی۔ اتنی جلدی......؟ ابھی وہ چند لمحے پہلے ہی تو سویا تھا۔ اس نے آنکھیں کھول کر اوپر دیکھا تو آسمان تاریک تھا۔ کہیں کہیں تارے ٹمٹما رہے تھے۔ اس نے گردن گھما کر چھٹی منزل کی طرف دیکھا...... روشنی کی وہ پتلی دھار اس کھڑکی سے پھوٹ رہی تھی۔ کھڑکی پر پردے کھنچے ہوئے تھے۔ لیکن نیچے ایک درز چھوٹ گئی تھی۔ بند کمرے میں ایک بلب روشن تھا جس کی روشنی اس درز سے گزرتی ہوئی اس کی آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ اس کا چہرہ کھڑکی کی چوکھٹ سے متوازی تھا اور چوکھٹ سے بالکل قریب تھا۔ گوپی نے ذرا سا کھسک کر اس درز سے آنکھیں لگادیں۔ فوراً ہی کمرے کا اندرونی منظر روشن ہوگیا۔

کمرے میں ایک عورت اور ایک مرد موجود تھے۔ گوپی کو کبھی بھی تانک جھانک کر بڑوں کو دیکھنے کا شوق نہیں رہا تھا۔ نہ ہی وہ چھپ کر ان کی حرکات وسکنات کو دیکھتا تھا۔ لیکن ان دونوں کے غیر معمولی طرز عمل نے اس کے جذبہ تجسس کو بیدار کردیا۔ اس کے دل میں ایک اشتیاق سا بڑھنے لگا۔ اس لئے کہ ان کی حرکتیں ناقابل فہم تھیں...... مرد ایک کرسی پر بیٹھا کرسی پر سر رکھے سو رہا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ اپنی آنکھوں پر اس طرح رکھے ہوئے تھے کہ آنکھوں پر روشنی نہ پڑنے پائے...... میز پر شراب کی ایک بوتل اور دو خالی گلاس رکھے ہوئے تھے۔ جن کی تہہ میں اس وقت بھی شراب کی قلیل مقدار موجود تھی...... لیکن وہ سو نہیں پا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے جو ہاتھ موجود تھا اس کی دو انگلیاں ذرا سی کھلی ہوئی تھیں جن میں سے وہ عورت کی حرکات وسکنات کا مشاہدہ کررہا تھا۔

عورت پنجوں کے بل بڑی احتیاط سے بے آواز چل رہی تھی کہ آہٹ پیدا نہ ہو۔ جیسے وہ اس کی نیند اور آرام میں خلل نہ ڈالنا چاہتی ہو۔ اس کے ہاتھوں میں مرد کا کوٹ تھا جسے اس نے چند لمحے پہلے کرسی پر سے اٹھایا تھا۔ اس نے بڑا گہرا میک اپ کیا ہوا تھا۔ جس سے وہ خوب صورت کے بجائے بڑی مضحکہ خیز لگ رہی تھی۔ اس کی ماں اور اس عمارت کی لڑکیوں اور عورتوں کو اس نے ہلکے اور نفیس میک اپ میں دیکھا تھا۔ جو فلم کی اداکاراؤں کی طرح دکھائی دیتی تھیں۔ لیکن یہ کسی فلم کی چڑیل لگی تھی۔ وہ اسے ذرا برابر بھی خوب صورت نہیں لگی تھی۔ وہ میز سے پرے ہٹ کر رک گئی۔ اس کی پشت مرد کی طرف تھی۔ پھر وہ جلدی جلدی کوٹ کی جیبوں کی تلاشی لینے لگی۔ اس کے چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ تھی۔

مرد بالکل ساکت انگلیوں کے درمیان سے عورت کو بہ غور دیکھ رہا تھا۔ جیبوں کو ٹٹولتے ٹٹولتے عورت نے یک بارگی اچانک پلٹ کر مرد کی طرف دیکھا۔ فوراً ہی کھلی ہوئی انگلیاں آپس میں جڑ گئیں۔ عورت نے ایک گہرا سانس لیا۔ پھر وہ مطمئن ہوکر دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہوگئی۔ پھر نہ جانے اس عورت نے کسی اندرونی جیب سے ایک پتلی سی نوٹوں کی گڈی نکالی۔ اس نے کوٹ ایک طرف پھینک دیا۔ نوٹوں پر نگاہ پڑتے ہی نہ صرف اس کا چہرہ دمک اٹھا بلکہ آنکھیں فاتحانہ انداز سے چمکنے لگیں۔ یہ نئے نوٹوں کی گڈی تھی۔ عورت سر جھکا کر نوٹ گننے لگی۔

اچانک ہی گوپی کا سانس نیچے کا نیچے اور اوپر کا اوپر ہی رہ گیا۔ اس کی رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔

مرد کا ایک ہاتھ بڑی آہستگی سے میز کی سطح پر کسی سانپ کی طرح پھسلتا ہوا عورت کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہاتھ کی حرکت بہت ہی آہستہ اور غیر محسوس انداز سے تھی جسے عورت محسوس نہیں کرسکی۔ پھر وہ ہاتھ آہستہ آہستہ بالکل سیدھا ہوگیا۔ اس سانپ کی طرح جو پھن مارنے کے لئے ہوجاتا تھا۔ ہاتھ کی کھلی ہوئی موٹی موٹی فولادی انگلیاں عورت کے بدن سے چند انچ کے فاصلے پر رک گئیں۔ اب مرد بڑی احتیاط سے اور سنگین خاموشی سے میز کا سہارا لے کر کرسی پر سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ لیکن یہ

مسکراہٹ خوش گوار نہیں بلکہ زہریلی اور سفاک قسم کی تھی۔ گوپی کے سارے جسم میں خوف کی لہر بجلی کی رو کی طرح دوڑ گئی۔ عورت نوٹ گننے میں محو تھی۔ نوٹ بالکل نئے اور کرارے تھے اور انگلی پر بار بار تھوک لگا کر گن رہی تھی کہ نوٹ گننے میں غلطی نہ ہوجائے۔ اس لئے وہ مرد کی کسی حرکت کو محسوس نہ کرسکی۔ معلوم نہیں کیوں گوپی کو اس عورت سے انجانی ہمدردی سی ہوگئی تھی۔ اس کا ذہن چیخ چیخ کر عورت کو خطرے سے آگاہ کررہا تھا۔ لیکن عورت نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

مرد اچانک کرسی پر سے اچھل کر کھڑا ہوگیا جیسے اسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو۔ کرسی فرش پر الٹ گئی اور میز بھی الٹتے الٹتے بچی۔ اس کا پھیلا ہوا بازو عورت کی گردن میں سانپ بن کر رسی کی طرح لپٹ گیا۔ اس کی پشت اب بھی مرد کی طرف تھی۔ بازو کا حلقہ فوراً ہی تنگ ہوتا گیا اور عورت اس کی گرفت سے نکلنے کے لئے بری طرح مچلنے لگی۔ مرد نے دوسرے ہاتھ سے عورت کی کلائی پکڑ لی جس کی مٹھی میں نوٹ دبے تھے۔ عورت نے جلدی سے اپنا ہاتھ نیچے کرنے کی کوشش کی لیکن اسے دیر ہوچکی تھی۔ مرد کی آہنی گرفت کلائی پر مضبوط ہوگئی اور وہ آہستہ آہستہ عورت کا ہاتھ مروڑنے لگا۔

عورت نے درد کی شدت سے بے بس ہوکر ایسی آوازیں نکالی جیسے کوئی چوہیا کسی انسان کے پیر کے نیچے دب کر چیختی ہے۔

''چیخنے کی ضرورت نہیں......'' مرد نے غراتے ہوئے کہا۔ ''مجھے معلوم تھا کہ تم اس قسم کی حرکت کرو گی...... میں سو رہا ہوں تم یہ سمجھ رہی تھیں...... کیوں ٹھیک ہے نا......؟'' مرد تمسخر کے انداز سے ہنسا۔

''مجھے چھوڑ دو...... مجھے جانے دو......'' وہ ہذیانی لہجے میں چیخی۔

''ابھی نہیں جان......!'' عورت کا ہاتھ مزید بے رحمی سے مروڑتے ہوئے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ اس کے ہونٹوں پر سفاک مسکراہٹ رقص کررہی تھی۔ میں تمہیں ایسی سزا دوں گا کہ تم آئندہ کسی کے ساتھ یہ حرکت نہ کرو۔''

عورت درد کی شدت سے دہری ہوگئی۔ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''نارائن...... نارائن......! جلدی سے آؤ۔ میری مدد کرو۔'' ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ دانستہ اپنی آواز دھیمی رکھنی چاہتی ہے کہ جس کے لئے اسے خود پر جبر کرنا پڑ رہا ہے۔

فوراً ہی ایک جھٹکے سے کمرے کا دروازہ کھلا۔ دوسرا مرد اندر داخل ہوا۔ اس کی پھرتی سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دروازے کے ساتھ کان لگائے مستعد کھڑا تھا تاکہ ضرورت پڑنے پر عورت کی مدد کے لئے پہنچ سکے۔ دوسرا مرد جو کمرے میں جارحانہ انداز سے گھسا تھا۔ بجلی کے کوندے کی طرح لپکتا ہوا پہلے مرد کی پشت پر پہنچا۔ اس نے ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں کی اور نہ ہی مہلت دی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو ایک دوسرے میں پھنسا کر ہاتھوں کو سر سے بلند کیا۔ پھر جیسے ہی پہلے مرد کا سر ٹھیک زاویے پر آیا۔ اس نے پوری قوت جمع کرکے پہلے مرد کی گردن پر دو ہتڑ مارے۔ پہلا مرد بھری ہوئی بوری کی طرح فرش پر گر کر لڑھک گیا اور وہ فرش پر ایک لمحہ تک بے حس و حرکت پڑا رہا۔

عورت جھک کر فرش پر بکھرے ہوئے نوٹ سمیٹنے لگی۔ اس نے سارے نوٹ جلدی سے جمع کرکے نارائن کی طرف بڑھائے۔

''یہ لو...... اسے رکھ لو۔'' وہ اس وقت اپنی تکلیف بھول گئی تھی۔

''جلدی کرو...... ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا ہے۔'' نارائن نے غصے کو دباتے ہوئے کہا۔ ''تم بے وقوف ہو۔ حیرت کی بات ہے کہ تم اس کی شراب میں بے ہوشی کی دوا بھی ملا نہیں سکیں......؟ کیا وہ اچار ڈالنے کے لئے تھی؟''

''میں نے دوا ملائی تھی......! میں سچ کہہ رہی ہوں...... شاید اس جنگلی نے دیکھ لیا تھا مجھے دوائی ملاتے ہوئے۔''

''اچھا...... اب چلو نکلو بھی......'' نارائن نے جھنجلاتے ہوئے کہا۔ ''جب یہ ہوش میں آئے گا تو شہر کے

سارے پولیس والے ہمارے گرد جمع ہوں گے۔ وہ ہمیں نرغے میں لے لیں گے۔''

اس نے عورت کا ہاتھ تھام لیا اور دروازے کی طرف قدم بڑھائے۔

اچانک فرش پر پڑے ہوئے ساکن بدن میں حرکت پیدا ہوئی۔ پہلے مرد نے دونوں ہاتھوں سے نارائن کے پیر جکڑ لئے۔

نارائن لڑکھڑا گیا...... اور اپنا جسمانی توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح فرش پر گر گیا۔ پہلے مرد نے نارائن کی ٹانگیں چھوڑ دیں۔ پھر مچھلی کی طرح تڑپ کر نارائن کے اوپر آگیا۔ وہ دونوں مرد ایک دوسرے میں گتھم گتھا ہوگئے۔

نارائن کے مقابلے میں دوسرا مرد زیادہ پھرتیلا اور طاقت ور تھا۔ اس میں نوجوانوں جیسی توانائی تھی۔ جسم بھی بہت مضبوط تھا۔ وہ نارائن پر سوار ہوکر اس کے سر پر بے تحاشا اور بڑی بے رحمی سے مکے برسا رہا تھا...... یہ حقیقت بھی گوپی پر عیاں ہوگئی تھی کہ اگر وہ اسی طرح نارائن پر ہتھوڑے جیسے گھونسے برساتا رہا تو ایک لمحہ کے اندر اندر نرائن بے ہوش ہوجائے گا جو تابڑ توڑ ضربوں کی وجہ سے پہلے ہی اپنے ہوش و حواس گم کر بیٹھا تھا...... نارائن کے دونوں ہاتھ فرش پر بے جان انداز میں پھیلے ہوئے تھے اور اس کی تنی ہوئی مٹھیاں ڈھیلی پڑ گئی تھیں اور انگلیاں کھلنے لگی تھیں۔

عورت حواس باختہ انداز میں پورے کمرے میں دوڑ رہی تھی۔ اس کی حالت بھی بڑی غیر ہورہی تھی۔ اسے ایک ایسے ہتھیار کی تلاش تھی جو اس کے ساتھی نارائن کی مدد کرسکے اور اسے موت کے منہ میں جانے سے بچا سکے۔ اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ پہلا مرد اس کے ساتھی کی جان لینے سے باز نہیں آئے گا۔ وہ اپنے ساتھی کو ہر قیمت پر بچانا چاہتی تھی۔ اسے اپنے ساتھی کی جان اپنی جان کی طرح پیاری تھی۔ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کس طرح سے اس کی جان بچا سکے اور دشمن سے نجات حاصل کرے۔ اس نے سوچا۔

''کاش! اس کے پاس پستول ہوتا۔''

جیسے ہی اس کی نگاہ سنگمار میز پر پڑی تو وہ بجلی کی سرعت سے اس کی طرف بڑھی۔ اس کی دراز کھولی۔ پھر اس نے اندر سے کوئی چیز نکالی۔ جس سے منعکس ہونے والی چمک نے گوپی کی آنکھوں کو چندھیا دیا...... اور وہ اس چیز کو دیکھ نہ سکا۔ کیوں کہ عورت کی پشت اس کی جانب تھی۔ اسے تجسس سا ہوا کہ وہ چیز کیا ہوسکتی ہے......؟

وہ عورت اس شے کو مٹھی میں دبائے بڑی پھرتی کے ساتھ پلٹی اور نارائن کی طرف دوڑی۔ اس نے جھک کر وہ چیز نارائن کے ہاتھ میں تھما دی۔ پھر ایک طرف تیزی سے ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔

چند لمحوں کے بعد جب وہ چیز دونوں مردوں کے سروں سے بلند ہوئی تو گوپی اس چیز کو دیکھنے میں کامیاب ہوگیا۔

وہ درمیانی سائز کا تیز دھار چاقو تھا۔ نیچے دبے ہوئے نارائن کا اٹھا ہوا ہاتھ بڑی تیزی سے نیچے آیا اور چاقو اوپر والے مرد کے سر کی پشت میں دستے تک پیوست ہوگیا۔

اوپر والا مرد فوراً ہی ساکت اور بے جان ہوگیا۔ لڑائی بند ہوگئی۔ لیکن چاقو والا ہاتھ رکا نہیں۔ اس نے دائیں بائیں حرکت کی...... اور اندر مزید گھسا ہوا چاقو باہر نکل آیا اور پھر فوراً ہی ہاتھ اوپر بلند ہوا۔ اور چشم زدن میں دوبارہ چاقو اوپر والے مرد کی پشت میں دستے تک گھس گیا۔ بہت ہی خوفناک منظر تھا۔ اوپر والے مرد کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس کے پٹھے تن گئے...... گوپی کو ایسا محسوس ہوا جیسے اوپر والا مرد اپنے بدن کے اندر ہی چاقو کے زخم سے تڑپ رہا ہے۔ گوپی سمجھا تھا کہ وہ مر گیا ہے۔ لیکن وہ مرا نہیں تھا۔ کیوں کہ اس کا جسم ہولے ہولے کانپ رہا تھا۔ نیچے دبا ہوا مرد شاید چاقو کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھا۔ اس نے بڑی بے رحمی سے چاقو کھینچ کر باہر نکالا اور پھر تیسرا وار سابقہ انداز سے کیا۔ پھر وہ دونوں ہی ساکت ہوگئے۔ فرق صرف یہ تھا کہ ان میں سے ایک گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ جب کہ دوسرا بالکل ہی سانس نہیں لے رہا تھا۔

عورت بت بنی پھٹی پھٹی نظروں سے یہ منظر دیکھ رہی تھی۔ اس کا چہرہ بالکل سفید پڑ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ اس کے بدن میں لہو کی ایک بوند بھی نہیں رہی ہے۔

ایک لمحہ کے بعد نارائن نے اپنے اوپر پڑا ہوا بدن ایک طرف بے دردی سے ہٹایا۔ پھر پھرتی سے فرش سے کھڑے ہو کر اپنا جبڑا سہلایا۔ پہلے والے مرد نے بری طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔ اور اس کا جبڑا ابھی نشانہ بنایا تھا۔ درد اور تکلیف اسے اب بری طرح محسوس ہو رہی تھی۔ پھر وہ عورت کے قریب گیا۔ دونوں فرش پر پڑے ہوئے بے حس و حرکت بدن کو دیکھنے لگے۔

"کیا..... کیا..... یہ مر گیا؟" عورت نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ پھر اس نے سوالیہ نظروں سے نارائن کی طرف دیکھا اور خوف سے سرسراتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔ "کہیں ابھی اس میں جان تو باقی نہیں رہ گئی ہے؟"

نارائن نے عورت کا ہاتھ پکڑ کر اسے دلاسا دیا۔

"گھبراؤ نہیں..... روزانہ سینکڑوں افراد قتل ہو جاتے ہیں اور قاتلوں کا بھی کبھی سراغ نہیں ملتا..... پولیس مہینوں جھک مار کر بیٹھ جاتی ہے۔ بس..... اب تم خود کو قابو میں رکھو..... سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"میرا دل اندر سے بیٹھا جا رہا ہے۔" عورت نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ "میرے بدن میں ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے ہیں۔"

"تمہیں زیادہ خوف زدہ اور پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" نارائن نے عورت کو پھر تسلی دی۔ "اسے ایک ڈراؤنا خواب سمجھو....."

"کیا ایسے خواب نظر نہیں آتے ہیں.....؟"

"ہمارا بال تک بیکا نہیں ہوگا۔"

نارائن کچھ دیر تک عورت کا ہاتھ مضبوطی سے تھامے رہا۔ یہاں تک کہ عورت کا کپکپاتا ہوا ہاتھ ساکت ہو گیا۔

"مجھے کچھ پرانے اخبار دے دو۔" نارائن نے کمرے میں نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ "خون فرش پر پھیل رہا ہے۔ اسے روکنا ہے۔"

عورت چند لمحوں کے لئے کمرے سے باہر چلی گئی۔ جب وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں بہت سارے اخبار تھے۔ نارائن نے اس کے ہاتھ سے اخبار لے کر فرش کے نیچے اور اس کے چاروں طرف اخبار پھیلا دیئے۔ اس کام سے فارغ ہو کر وہ کرسی پر بیٹھ گیا جہاں کچھ دیر پہلے مقتول بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے اپنی سانسیں بحال کرنے کے بعد عورت کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"ذرا دروازے کی خبر لو..... دیکھو کسی نے کوئی آواز تو نہیں سنی..... آہستہ آہستہ تھوڑا سا دروازہ کھولنا اچھی طرح سے دیکھنا باہر کوئی تھا تو نہیں!؟"

عورت پنجوں کے بل چلتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ چند لمحوں کے بعد وہ واپس آ کر سرگوشی میں آہستہ سے بولی۔

"ٹھیک ہے....." اس نے مطمئن ہو کر سر ہلایا۔

"اب ذرا اس کھڑکی کی خبر لو لیکن پردہ مت ہٹانا....." اس نے تاکیدی لہجے میں کہا۔ "بس ذرا سا کھسکا کر دیکھ لو کہ کوئی اس طرف تو نہیں ہے.....؟"

عورت کھڑکی کی طرف بڑھنے لگی۔ گوپی اس طرح چونک کر پیچھے ہٹا جیسے بجلی کے زبردست جھٹکے نے اسے کھڑکی سے ہٹا دیا ہو۔ اس نے فوراً ہی ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں۔ اسے معلوم تھا کہ چند لمحوں کی بات ہے عورت کھڑکی تک پہنچ جائے گی۔ جب وہ پردہ کھسکا کر باہر جھانکنے لگی تب وہ اسے آہنی چبوترے پر نظر آ جائے گا۔ اس کے پاس چند لمحے تھے۔ وہ ان چند لمحوں میں سیڑھیاں اتر کے نیچے جا نہیں سکے گا۔ چاہے وہ انتہائی تیزی سے کیوں نہ اتر جائے۔ اور پھر وہ اتنے مختصر سے وقفے کے عرصے میں نیچے اپنے کمرے میں بھی نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اس کی عافیت اسی میں تھی کہ فوراً ہی سرعت سے کہیں چھپ جائے۔ اس کی نظر چبوترے کی ریلنگ پر لٹکتے ہوئے کمبل پر پڑی جسے سوکھنے کے لئے وہاں لٹکا دیا گیا تھا۔ گوپی آہنی چبوترے پر لوٹتا ہوا دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ جہاں کمبل لٹکا ہوا تھا۔ اس نے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر کمبل کھینچا اور ہاتھ پیر سکیڑ کر کمبل کے اندر دبک گیا۔ اس کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ کمبل کو اچھی طرح پھیلا کر اچھی طرح اپنا بدن ڈھانپ سکتا۔ وہ دل ہی دل میں بھگوان سے پرارتھنا کر رہا تھا کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ کمبل سے باہر نکلا نہ رہ گیا ہو۔

ایک لمحہ بعد کمبل پر روشنی کی ایک پٹی گری..... گوپی کمبل کے اندر روشنی کی پٹی کو محسوس کر سکتا تھا۔ اس کا مطلب یہ کہ عورت پردہ کھسکا کر باہر جھانک رہی ہے۔

"یہاں پلیٹ فارم پر کوئی سفید سفید چیز ہے۔"

گوپی نے عورت کی آواز سنی۔ اس کی شریانوں میں لہو جیسے منجمد ہو گیا۔ "ہاں..... یاد آیا۔ یہ تو ہمارا کمبل ہے جو میں نے یہاں کل سکھایا تھا۔" عورت کی آواز دوسرے لمحے سنائی دی۔ "نیچے پلیٹ فارم پر گر گیا ہے۔ میں ڈر گئی تھی۔ کیوں کہ مجھے ایسا لگا تھا کہ کوئی پلیٹ فارم پر لیٹا ہوا ہے۔"

"پردہ کھینچ دو....." مرد نے جھلاتے ہوئے کہا۔ "کیا وہاں کوئی تماشا ہو رہا ہے جو ساری رات کھڑی رہو گی؟"

فوراً ہی روشنی کی پٹی غائب ہو گئی۔ گوپی سمجھ گیا کہ کھڑکی کا پردہ عورت نے درست کر دیا ہے اور کھڑکی سے ہٹ کر اندر چلی گئی ہے۔ اس کی جان میں جان آئی۔ لیکن وہ پھر بھی خوف کے مارے کچھ دیر تک ساکت پڑا رہا۔ اس نے بالکل بھی حرکت نہیں کی۔

"یہ اس کے کاغذات ہیں۔" گوپی کو نارائن کی آواز سنائی دی۔ "اس کا نام ٹیکو تھا اور ایک کارگو بحری جہاز پر ملازم ہے..... چلو اچھا ہوا۔ کیوں کہ اکثر مال بردار جہازوں پر سے ملاح غائب ہوتے رہتے ہیں۔ پولیس ان کے متعلق زیادہ تفتیش نہیں کرتی اور نہ ہی کمپنی کو ان کی کوئی فکر اور پریشانی ہوتی ہے..... جلدی سے اس کی ساری جیبیں خالی کر دو۔ اس لئے بھی کہ کوئی کاغذ اور پرزہ ایسا نہ رہ جائے جس سے اس کی شناخت ہو جائے۔"

"اوہ..... اب اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ کون تھا.....؟ کہاں ملازم تھا.....؟ عورت کی آواز لرز رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے رو دے گی۔ "تم اس کے بارے میں یہ سب کچھ کیوں سوچ رہے ہو؟"

"فرق کیوں نہیں پڑتا.....؟" نارائن نے تیز لہجے میں پوچھا۔

"اصل بات یہ ہے کہ ہم نے اسے قتل کر دیا۔ یہ زندہ نہیں ہے جو ہمارے بارے میں کسی کو کچھ بتا سکے۔" عورت نے جواب دیا۔ "بھگوان کے لئے یہ سب چھوڑو..... ہمیں کسی جھمیلے میں پڑنے کے بجائے یہاں سے فوراً بھاگ جانا چاہئے۔"

"اب ہمیں بھاگنے کی ضرورت نہیں ہے۔" نارائن نے بڑے پرسکون لہجے میں کہا۔ "تم خود کو قابو میں رکھو۔ ہوش و حواس کھو دو گی تو سارا کام خراب ہو جائے گا۔ سمجھنے کی کوشش کرو کانتا.....! ہمیں یہاں سے فرار ہونے کی قطعی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں صرف یہ کرنا ہے کہ اس کی لاش یہاں سے ہٹا دیں..... کسی نے بھی اسے یہاں آتے ہوئے نہیں دیکھا تھا..... اور پھر کسی کو پتا نہیں کہ یہاں کیا ہوا۔ اگر ہم یہاں سے فرار ہو جاتے ہیں تو صبح ضرور کوئی نہ کوئی لاش دریافت کر کے پولیس کو اطلاع کر دے گا..... تم نے اس بات پر غور نہیں کیا۔ فلیٹ خالی کر کے جانا مصیبت کو دعوت دینا ہے۔ اس لئے ہم فلیٹ میں رہتے ہیں۔ اس لئے کہ ہماری عدم موجودگی ثابت کر دے گی اسے ہم نے قتل کیا ہے اور پھر پورے ملک کی پولیس سرگرمی سے ہمارے تعاقب میں لگ جائے گی۔ وہ آج نہ سہی کل نہ سہی..... لیکن کسی نہ کسی روز تو ہمیں گرفتار کر لے گی۔ ہم اس سے کب تک بچتے پھریں گے۔"

"پھر کیا کرو گے.....؟" عورت کے لہجے میں خوف تھا۔ "میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔ اندر سے دل بیٹھا جا رہا ہے۔"

"ہم اس کی لاش ٹھکانے لگا دیں گے۔" نارائن نے جواب دیا۔ "پولیس کو ہمارے خلاف کوئی ثبوت نہیں ملے گا۔ نہ ہی ہم پر وہ ہاتھ ڈال سکیں گے۔ بغیر ثبوت کے وہ ہمارا بال تک بیکا نہیں کر سکتے۔ پھر ہم یہاں پہلے کی

طرح رہیں گے۔ کسی کو ہم پر شک نہیں ہوگا۔“

گوپی نے چہرے سے کمبل ہٹا کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ نیچے چوکھٹ کے ساتھ پہلے جو درز رہ گئی تھی۔ اب وہ بھی غائب ہوگئی تھی۔ اب وہ انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ لیکن ان کے درمیان ہونے والی گفتگو پہلے کی طرح سن سکتا تھا۔ اسے ان کی گفتگو سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ سروکار نہیں تھا۔ وہ جلد از جلد وہاں سے ہٹ کر اپنے کمرے میں جانا چاہتا تھا۔ اس کے لئے ایک ایک لمحہ جان گسل ہوتا جارہا تھا۔ پھر وہ اوندھا ہو کر آہستہ آہستہ چبوترے پر کھسکنے لگا۔ اس کے پیر آہنی سیڑھی سے ٹکرائے۔ لیکن وہ اس ہلکی سی چوٹ کی پروا کیے بغیر کھسکتا ہی رہا۔ وہ چبوترے کے فولادی فرش سے چھپکلی کی طرح چپکا ہوا تھا۔ اس کے کانوں میں مرد اور عورت کے درمیان ہونے والی گفتگو کی آواز اب بھی آرہی تھی۔

”لیکن نارائن!“ عورت نے سپاٹ سے لہجے میں دریافت کیا۔ ”ہم اس کی لاش کو کہاں ٹھکانے لگائیں گے؟“

”ابھی بتاتا ہوں۔“ نارائن نے جواب دیا۔

”ذرا تم وہ تھیلے اٹھا کر لاؤ جن میں تم ہر ماہ سودا سلف خرید کر لاتی ہو۔“

گوپی بڑی احتیاط سے ایک ایک سیڑھی اتر رہا تھا۔ سیڑھیاں لوہے کی بنی ہوئی تھیں اور ان میں رنگ کرا ہوا تھا۔ گوپی کو احساس تھا کہ اگر وہ اندر کی آواز سن سکتا ہے تو وہ بھی باہر سے آنے والی آواز اتنی ہی آسانی سے سن بھی سکتے ہیں۔ اور پھر انہیں فوراً ہی باہر اس کی موجودگی کا پتا چل جائے گا۔ وہ بڑی احتیاط سے ہتھیلیاں ٹیک ٹیک گھٹنوں کے بل آہستہ آہستہ سیڑھیاں اتر رہا تھا۔

”نارائن......! اتنا بڑا آدمی اس تھیلے میں کیسے آسکتا ہے؟“ کانتا نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”تمہاری کھوپڑی میں عقل ہے تو سوچ کر دیکھو۔“ نارائن نے تیز لہجے میں کہا۔

”عقل ہے جبھی تو میں کہہ رہی ہوں۔“ کانتا نے کہا۔ ”اس میں ایک بچہ تو آسکتا ہے لیکن یہ نہیں آسکتا۔“

”یہ تھیلے کافی بڑے ہیں...... وہ ان دو تھیلوں میں باآسانی آجائے گا...... تم دیکھنا یہ ان تھیلوں میں کس طرح آسکتا ہے؟“ پھر کمرے میں چند لمحوں گہری خاموشی طاری رہی۔ پھر مرد کی بھاری آواز نے اس سکوت کو توڑا۔

”کانتا......! جلدی سے غسل خانے میں جا کر میرا استرا لیتی آؤ...... تاکہ میں اس کام سے جتنا جلد ہوسکے فارغ ہوجاؤں۔“

”نہیں...... نہیں...... نارائن نہیں...... پلیز!“ کانتا دہشت زدہ سی ہو کر احتجاج کرنے لگی۔

”میں نے تم سے کب کہا کہ تم کھڑے ہو کر ساری کارروائی دیکھو...... تمہیں دیکھنے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ میرا کام ہے میں کرلوں گا...... تم ایسا کرو۔ دوسرے کمرے میں انتظار کرو۔ جب میں آواز دوں تب تم آجانا۔ تمہیں یہ کمرا بالکل صاف نظر آئے گا۔“ نارائن نے کہا۔

گوپی رک گیا تھا۔ اس کا بدن برف کی طرح ٹھنڈا ہوگیا تھا۔ دوسری طرف خاموشی طاری ہوگئی تھی۔ گوپی پوری سیڑھی اتر گیا تھا۔ بس چند پائیدان رہ گئے تھے۔ اس کے بعد آہنی چبوترہ تھا جس کے ساتھ اس کی کھڑکی تھی۔

”ٹھیک ہے......“ گوپی کو مرد کی آواز سنائی۔

”اب ذرا یہ اخبار اٹھادو...... ہاں...... مجھے کمبل کی ضرورت پڑے گی...... باہر پلیٹ فارم سے کمبل لادو...... اس کے بعد تمہارا کام ختم...... تم دوسرے کمرے میں چلی جانا۔“

یہ سنتے ہی گوپی کے سارے بدن میں برقی رو دوڑ گئی۔ اس نے سانپ کی طرح پھیلتے ہوئے بقیہ پائیدان طے کیے اور چبوترے پر کھڑا ہوگیا اب وہ ایک جست لگا کر اپنے کمرے میں پہنچ سکتا تھا۔ اچانک اس کے پیر کسی چیز میں بری طرح الجھ گئے۔ اس نے جلدی سے نیچے دیکھا۔ اس کا سانس رک گیا۔ کمبل اس کے قدموں میں لپٹا ہوا تھا۔ گوپی کو اس کا احساس بھی نہیں ہوسکا تھا۔ اس نے جلدی سے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ ٹھیک اسی لمحے روشنی کی

ایک چوڑی پٹی اوپر والی کھڑکی سے نکل کر اوپر والے چبوترے پر پڑی۔

”کمبل...... اپنی جگہ نہیں ہے۔“ عورت نے مرد سے کہا۔ ”اوہ ہوشاید نیچے گر گیا ہے...... میں اب کیا کروں؟“

”بے وقوف......“ مرد کی غصہ سے بھری آواز گونجی۔ ”تم میں تو ذرا سی بھی عقل نہیں ہے...... تم چھوٹی بچی کی طرح پوچھ رہی ہو کہ میں کیا کروں......؟ روشنی گل کرکے جلدی سے باہر جاؤ احمق...... کیا تم اپنی حرکتوں سے ساری دنیا کو گواہ بنانا چاہتی ہو۔“

فوراً ہی روشنی گل ہوگئی۔ گوپی نے پیر جھٹک کر کمبل ہٹایا اور پھر جست لگا کر کمرے کی کھڑکی میں داخل ہوگیا۔ دوسرے لمحے وہ اپنے کمرے کے فرش پر کھڑا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اور نہیں کرسکتا تھا۔ اتنا وقت نہیں تھا کہ وہ کمبل اٹھا کر اوپر والے چبوترے پر ڈالتا۔ اگر اسے چند لمحوں کی مہلت مل جاتی تو کمبل سابقہ جگہ پر موجود ہوتا۔

”اوہ...... نارائن...... میرا کمبل ہوا سے اڑ کر نچلے پلیٹ فارم پر گر گیا ہے۔“ کانتا کی خوف میں ڈوبی ہوئی سرگوشی سنائی دی۔ ”چند لمحے پہلے تو یہاں پڑا تھا۔ وہ اب نیچے گر گیا۔ حالاں کہ ہوا اتنی تیز نہیں کہ اڑ کر گر جائے۔“

”یہ وقت ان باتوں کو سوچنے کا نہیں ہے...... ہوا سے ہی گرا ہے۔ کسی نے نہیں گرایا ہے۔ نیچے جا کر اٹھالاؤ۔“

گوپی کو آہنی سیڑھیوں پر قدموں کی ہلکی سی چاپ سنائی دی۔ جو قریب آتی جارہی تھی۔ وہ کھڑکی کے ساتھ والی دیوار کے ساتھ چپک کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے کمرے میں اندھیرا تھا۔ اگر وہ عورت کھڑکی سے جھانک کر دیکھتی اور روشنی بھی کرتی تھی تو وہ اسے نظر نہ آتا۔ کیوں کہ وہ کھڑکی کی دیوار سے چپکا ہوا تھا۔ قدموں کی چاپ بند ہوگئی۔ پھر گہری تاریکی میں ایک سفید سایہ لہرایا اور اندھیرے میں غائب ہوگیا۔ دوسرے لمحے قدموں کی چاپ بلند ہوئی اور دور ہونے لگی۔ پھر سناٹا طاری ہوگیا۔

”کمال ہے...... ہوا بالکل بند ہے...... حبس ہے...... پھر یہ کمبل کس طرح اڑ کر نیچے گر گیا...... ساڑی، پیٹی کوٹ، بلاؤز یا دوپٹہ اور چادر بھی ہوتی تو اس طرح نہ گرتی...... کہیں پتہ بھی نہیں ہل رہا ہوگا۔“ عورت نے بڑبڑاتے ہوئے کہا۔ ”کیا کسی بھوت نے گرادیا ہوگا۔“

چند لمحوں کے بعد اسے کھڑکی بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ پھر سکوت چھا گیا۔ گوپی چند لمحوں تک اسی طرح بے حس و حرکت کھڑا آہٹ لیتا رہا۔ پھر وہ اپنے بستر پر جا کر دراز ہوگیا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ انگاروں پر لیٹ گیا ہو۔

کمرا بدستور کسی تنور کی طرح دہک رہا تھا۔ ہر طرف سے آگ برس رہی تھی۔ وہ ایسی حالت میں قمیض اتار کر لیٹ جاتا تھا۔ لیکن اس نے قمیض اتارنے کے بجائے چادر اوڑھ لی۔ اس نے چادر کے اندر اپنا سر بھی چھپالیا اور بستر پر بری طرح کانپنے لگا۔ جیسے یہ دسمبر کا مہینہ ہو کڑاکے کی سردی پڑ رہی ہو اور ہڈیوں میں چھید کر رہی ہو۔

بہت دیر بعد اس کے بدن نے کانپنا بند کیا۔ اسے ایسا جاڑا کبھی نہیں لگا تھا۔ وہ کان لگا کر اوپر سے آنے والی آوازوں کو سننے کی کوشش کرنے لگا۔ اسے اوپر چلنے پھرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ اس نے محسوس کیا کہ اس وقفے میں وہ اپنی کیفیت پر قابو پاچکا ہے۔ وہ اس عورت اور مرد کے بارے میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کی نظروں کے سامنے نادیدہ منظر گھومنے لگا کہ اس وقت کیا ہو رہا ہوگا......؟ اس کمرے میں جہاں قتل کی واردات ہوئی ہے...... یہ تصور اتنا خوفناک لرزہ خیز اور دہشت انگیز تھا کہ ایک بار پھر اس کے جسم پر لرزہ طاری ہوگیا اسے سخت گرمی، حبس اور گھٹن میں بھی جسم میں کپکپاہٹ سی ہونے لگی۔ پھر ٹھنڈے پسینے چھوٹنے لگے پھر اسے گرمی لگنے لگی۔

بہت دیر تک اس طرح وقفوں کے ساتھ اوپر چلنے پھرنے اور گھسیٹے جانے کی آوازیں آتی رہیں...... اور پھر گہری خاموشی چھا گئی۔ اب اسے ایسا لگا جیسے اب اس فلیٹ میں وہ دونوں موجود نہیں ہیں...... گوپی نے سوچا۔ کہیں وہ دونوں مقتول کی لاش ٹھکانے لگانے کے لئے تو

نہیں چلے گئے ہیں۔ نہ صرف گہری خاموشی چھائی ہوئی ہے بلکہ کوئی آہٹ بھی تو نہیں ہو رہی ہے۔ گوپی اس وقت مکمل طور پر پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ نہ صرف لباس بلکہ چادر بھی اس کے پسینے سے بھیگ گئی تھی۔

اس کے بعد نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور رہی۔ پھر اس نے کھڑکی سے آسمان کی طرف دیکھا۔ پو پھٹ رہی ہے۔ آہستہ آہستہ غیر محسوس انداز سے تاریکی چھٹ رہی ہے...... پھر صبح کا اجالا پھیلنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد گوپی کو برابر والے کمرے میں اپنی ماں کے چلنے پھرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ آوازیں اب کمرے کے بجائے باورچی خانے سے سنائی دینے لگیں۔ اس کی ماں ناشتا تیار کر رہی تھی۔ لیکن وہ بستر پر دراز ہی رہا۔ اپنی ماں کا انتظار کرنے لگا۔ اس کی ماں کا معمول یہ تھا کہ وہ ناشتے کے لئے جگانے آتی تھی۔ وہ ماں کا انتظار کرنے لگا۔

چوں کہ وہ بستر پر لیٹے لیٹے بے زار ہو چکا تھا۔ اس لئے ماں کا انتظار کرنے کے بجائے بستر سے نکل کر اس نے لباس تبدیل کیا۔ ماں نے اس کی آہٹ سن کر پلٹ کر اسے دیکھا اور ایک دم سے چونک کر بولی۔ ”گوپی بیٹے! کیا بات ہے؟ ایسا لگ رہا ہے تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور تمہاری آنکھیں سوج رہی ہیں، جیسے رات سوئے نہیں۔“

”میری طبیعت تو ٹھیک ہے۔“ اس نے سر ہلایا۔ ”آج میری آنکھ جلدی کھل گئی تھی۔ کیوں کہ حبس تھا۔ پھر نیند نہیں آئی۔“

وہ رات کا اہم اور لرزہ خیز واقعہ اپنے باپ کو بتانا چاہتا تھا۔ ماں اس کی بات سن کر کہتی کہ شاید تم نے کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہوگا۔

وہ یہ بات گول کر گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس کے پتا جی رات کی ڈیوٹی سے واپس آ گئے۔ پھر وہ ناشتے کی میز پر بیٹھ گئے۔

وہ باپ کے برابر والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے دیکھا کہ ان کا موڈ خوش گوار ہے۔ اس نے چند لمحوں کے بعد جھک کر سرگوشی میں کہا۔

”پتا جی......! میں آپ سے ایک اہم بات کہنا چاہتا ہوں...... کیا آپ سننا پسند کریں گے۔“

”ضرور کہو بیٹے......!“ اس کے پتا جی مسکرائے۔ ”بھلا میں کیوں نہیں سنوں گا تمہاری بات۔“

”پتا جی......! ہمارے اوپر ایک مرد اور عورت رہتے ہیں نا۔“ اس نے رک کر کہا۔

”مجھے معلوم ہے......“ وہ سلائس پر مکھن لگاتے ہوئے بولے۔ ”میں نے انہیں اکثر اوپر نیچے جاتے ہوئے دیکھا۔ کبھی ان سے راہ و رسم اور تعارف نہیں ہوا۔ لیکن مجھے مرد کا نام معلوم ہے۔ ان کا نام شاید نارائن یا دھرمیندر ہے۔ وہ اچھے لوگ ہیں۔“

گوپی اپنے باپ کی طرف اور جھک گیا۔ اس نے پھر سرگوشی کے انداز میں کہا۔

”میں ایک بات بتاؤں...... شاید آپ میری بات کا یقین نہیں کریں گے...... کل رات انہوں نے اپنے فلیٹ میں ایک آدمی کو قتل کر دیا...... اور پھر انہوں نے استرے سے اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پلاسٹک کے دو بڑے تھیلوں میں بند کر دیا۔ تاکہ اس کی لاش کو کہیں پھینک آئیں......“

باپ کا چلتا ہوا منہ ایک دم سے رک گیا۔ انہوں نے سلائس اور کانٹا چھری آملیٹ کی پلیٹ میں رکھی۔ اپنی کرسی پر آہستہ آہستہ اس کی طرف اٹھے۔ پھر وہ گوپی کو گھورنے لگے۔ ان کے چہرے پر سرخی پھیل گئی۔

پہلے تو گوپی یہ سمجھا کہ اس کے پتا جی قتل کی لرزہ خیز واردات کے بارے میں سن کر خود اس کی طرح خوف زدہ ہو گئے ہیں۔ ان کی طبیعت خراب ہو گئی ہے۔ لیکن اس نے ان کے چہرے کے تاثرات سے اندازہ کیا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ خوف زدہ ہونے کے بجائے اسے غصہ بھری نظروں سے گھور رہے ہیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اسے کچا ہی چبا جائیں گے۔“

”رادھا...... ادھر آؤ......“ انہوں نے اس کی ماں کو آواز دی جو ابھی تک باورچی خانے میں تھی اور اپنے لئے ناشتا بنا رہی تھی۔ اس نے باورچی خانے سے جھانک کر دیکھا۔ پلو سے پسینہ پونچھا۔ ”کیا بات ہے۔“ وہ بولی۔

”اس نے پھر وہی حرکت شروع کر دی...... میں نے کیا تم سے نہیں کہا تھا کہ تم اسے فلم دیکھنے مت دیا کرو...... اس کی عمر دیکھو۔ یہ جاسوسی اور خوفناک فلمیں دیکھتا ہے۔ جیسے جاسوس بننا چاہتا ہو۔“ ان کے لہجے سے سختی اور غصہ نمایاں تھا۔

رادھا پریشانی کے عالم میں نچلا ہونٹ چبانے لگی۔ ”کیا اس نے پھر کوئی من گھڑت کہانی سنائی ہے؟“

”لیکن ماں میں......“ گوپی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ ”میں اب فلم کہاں دیکھتا ہوں۔“

باپ نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا تھپڑ دے مارا۔ ”خاموش...... میں جھوٹ بولنے والوں کو ایک منٹ بھی برداشت نہیں کر سکتا...... مجھے جھوٹ بولنے والوں سے سخت نفرت ہے۔ میں جھوٹ بات کرنے والوں کا منہ توڑ دیتا ہوں۔“

”آخر کیا کہا ہے گوپی نے جو آپ اس قدر غصہ ہو رہے ہیں؟“ رادھا نے پریشان ہوتے ہوئے پوچھا۔ اس کے شوہر نے جو بیٹے پر ہاتھ اٹھایا تھا اس سے ماں کے دل پر چوٹ لگی تھی۔ ”اس نے اب فلم دیکھنا بند کر دیا ہے۔ میں اسے اتنے پیسے نہیں دیتی ہوں کہ وہ فلم دیکھے۔“

”وہ ایسی بات ہے کہ مجھے اس کا دہرانا بھی پسند نہیں ہے۔“ پتا جی نے کہا۔

”وہ ایسی کیا بات ہے جو آپ مجھے بتانا بھی نہیں چاہتے......“ رادھا بولی۔ ”مجھے بھی تو پتا چلے کہ وہ بات ہے کیا آخر؟“

”میں وہ بات اس لئے بتانا نہیں چاہتا کہ ایک تو تم ڈر جاؤ گی۔ خوف و دہشت سے برا حال ہو جائے گا۔“ انہوں نے بیٹے کو سخت نظروں سے گھورا۔ ”تم پیسے نہیں دیتی ہو۔ لیکن کیا معلوم دوست اسے فلمیں دکھاتے ہوں۔“

”ماں......!“ گوپی نے ہمت کر کے احتجاجی انداز سے کہا۔ ”میں نے کوئی غلط یا جھوٹ بات......“

باپ نے پھر ایک اور ہاتھ اس کی گدی پر جما دیا۔ پھر انہوں نے اپنی پتنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سننا چاہتی ہو تو سنو...... اس کا کہنا ہے کہ اوپر فلیٹ والوں نے کسی کو قتل کر دیا۔ اس کی لاش کو استرے سے ٹکڑے ٹکڑے کر کے اور ان ٹکڑوں کو پلاسٹک کے تھیلوں میں چھپا دیا گیا۔ پھر انہیں باہر لے جا کر کہیں پھینک دیا۔“

دہشت سے رادھا کی آنکھیں پھیل گئیں۔ اس نے ناقابل یقین نظروں سے بیٹے کی طرف دیکھا۔ پھر وہ سنبھل کر تیز لہجے میں بولی۔

”گوپی...... گوپی...... تم کب یہ حرکتیں بند کرو گے۔ مسٹر نارائن اور ان کی پتنی کانتا بہت اچھے لوگ ہیں...... کانتا بھابھی تو بہت ہی اچھی عورت ہے۔ وہ بلی سے بہت ڈرتی ہے۔ اس میں اسے مار بھگانے کی ہمت تک نہیں ہوتی ہے...... وہ کل ہی تو مجھ سے ایک پیالی چینی مانگ کر لے گئی ہیں۔ ہر وقت مسکراتی رہتی ہیں۔ وہ لوگ کسی کو بھی مار نہیں سکتے۔“

”تمہارے بیٹے کا مستقبل مجھے بہت تابناک نظر آتا ہے۔“ ان کا لہجہ نہ صرف گمبھیر تھا بلکہ اس میں طنز بھی تھا۔ ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس لڑکے میں کیا خرابی ہے......؟ کیا ایسی اولاد میرے ہی نصیب میں تھی......؟ میرا سورگ باشی بھائی بھی ایسا نہیں تھا۔ ہمارے خاندان میں ایک بھی ایسی مثال نہیں ملتی...... تم خود ایسی نہیں ہو...... ہمارے خاندان میں اس جیسا ایک بھی نہیں تھا۔ آخر یہ لڑکا کس پر گیا ہے......؟ ایسا کیوں ہے......؟“ انہوں نے سانس لینے کے لئے توقف کیا۔ پھر بولے۔ ”کچھ بھی ہو۔ میں اسے سیدھا کر کے رہوں گا۔“

انہوں نے آستینیں چڑھاتے ہوئے کرسی کھسکائی۔ پھر اپنی نشست سے کھڑے ہو گئے۔ ”تم میرے ساتھ آؤ گوپال!“

گوپی نے مکھن لگا ہوا سلائس پلیٹ میں رکھا۔ اور پھر وہ چپ چاپ ان کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ اس نے ماں کی طرف بھی التجا بھری نظروں سے نہیں دیکھا۔ کمرے کے دروازے پر رک کر اس کے پتا جی نے اسے آخری موقع دیا۔

"کیا تم یہ بات ماننے کے لئے تیار ہو کہ...... تم نے جو کچھ کہا ہے...... وہ سراسر جھوٹ ہے...... تمہارے ذہن کی اختراع ہے؟"

"لیکن پتا جی......! میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں نے جو کچھ کہا ہے۔ اس میں ذرا سا بھی جھوٹ نہیں ہے۔" اس نے آنسو پیتے ہوئے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔ "مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟ آپ میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے ہیں؟"

اس کے پتا جی کے جبڑے سختی کے ساتھ بھنچ گئے۔ انہیں اس کی اس بات کا یقین نہیں آیا۔ "ٹھیک ہے اندر آؤ۔ میرے ساتھ۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر دھکا دیا۔ پھر انہوں نے کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

گوپی کی زور دار پٹائی ہوئی۔ ایک طرح سے انہوں نے اسے بری طرح دھنک کر رکھ دیا تھا۔ لیکن اسے زیادہ تکلیف نہیں ہوئی۔ جب تھپڑ پڑتا تھا تب تکلیف ہوتی تھی۔ وہ درد کی شدت سے چیختا بھی تھا۔ لیکن فوراً ہی تکلیف ختم ہو جاتی تھی۔ اس کے پتا جی اس قسم کے آدمی نہیں تھے جو غصے سے پاگل ہو جاتے ہیں اور بچوں کو روئی کی طرح دھنک کر دیتے ہیں۔ وہ ایک عام سے آدمی تھے۔ اصول پسند تھے۔ جو صحیح اور غلط کے درمیان بڑی سختی سے عمل کرتے تھے۔ اسے پیٹتے ہوئے پوری قوت میں استعمال نہیں کرتے۔ ان کا تھپڑ اتنی قوت رکھتا تھا کہ گوپی بلبلا کر روئے ان کے نزدیک اس پٹائی کا مقصد تشدد نہیں ہوتا تھا۔ نشانات نہیں پڑتے تھے۔ خون نہیں نکلتا تھا۔ لیکن ہوش ٹھکانے آ جاتے تھے۔ اس کی پٹائی کرتے کرتے ان کی سانسیں پھولنے لگیں تو انہوں نے اپنا ہاتھ روک لیا۔

اپنی دانست میں وہ اپنے بیٹے کی زبردست پٹائی کر چکے تھے۔ اس لئے انہوں نے اپنا ہاتھ روکا تھا۔ پھر انہوں نے اپنی چڑھی ہوئی آستینیں سیدھی کیں اور سسکیاں لیتے ہوئے گوپی کو دیکھا۔ اس کا غصہ فرو نہیں ہوا تھا۔ انہوں نے غصے بھرے لہجے میں مخاطب کیا۔

"اب تو کبھی جھوٹ نہیں بولے گا...... پتا چل گیا نا جھوٹ بولنے کی کیا سزا ہوتی ہے؟"

گوپی کو باپ نے ایک اور موقع دیا تھا۔ گوپی کم ضرور تھا لیکن بے وقوف نہیں تھا۔ اس میں ایک بڑے آدمی کا سا شعور تھا۔ اس نے اپنا سر اقرار کے انداز میں ہلایا۔ "میں کبھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔" گوپی یہ کہہ کر دروازے کی طرف بڑھا۔

"ٹھہرو......" اس کے پتا جی نے اسے جلدی سے کہا۔ ان کی ابھی پوری طرح تسلی و تشفی نہیں ہوئی تھی۔ "اب تم تسلیم کرتے ہو کہ تم نے کچھ دیر مجھ سے جھوٹ بولا تھا......؟ وہ من گھڑت کہانی تھی...... کسی ہارر فلم کی کہانی...... کیوں؟"

گوپی رک گیا۔ اس نے تھوک نگلنے کی کوشش کی۔ اس کے اور دروازے کے درمیان چند قدم کا فاصلہ تھا۔ وہ جواب دیئے بغیر جا نہیں سکتا تھا۔ وہ جواب دینے کے بجائے دروازہ کھولتا تو پتا جی اس کی گردن دبوچ کر جوتوں اور تھپڑوں سے اس کی درگت بنا دیتے۔ اس لئے اس نے خاموش رہنے میں اپنی عافیت سمجھی تھی۔

"جواب دو......" اس کے پتا جی نے تڑختے لہجے میں کہا۔

اس سوال نے عجیب سی صورت حال پیدا کر دی تھی۔ جس سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی۔ فرار کی تمام راہیں مسدود تھیں۔ اس کی پٹائی اس بات پر کی گئی تھی کہ اس نے ایک جھوٹی کہانی سنائی تھی تاکہ سنسنی پیدا کی جائے۔ ٹھیک ہے پہلے وہ فرضی کہانیاں سناتا تھا۔ جس سے اسے ایک خاص قسم کا لطف محسوس ہوتا تھا۔ لیکن یہ سلسلہ اس لئے بند ہو گیا تھا کہ اس کی سرزنش اور پٹائی ہوئی تھی اور فلم دیکھنے کی مخالفت کر دی گئی تھی۔ وہ محتاط ہو گیا تھا۔ لیکن اب آج اس کے پتا جی نے اس کی پٹائی کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی اسے بری طرح دھنک کر رکھ

دیا تھا۔ اب بھی ان کا غصہ ٹھنڈا ہوا تھا اور نہ تسلی ہوئی تھی اس بات کا اقرار کرنے پر وہ آئندہ جھوٹ نہیں بولے گا۔ اور پھر اس کے پتا جی یہ اقرار کروانے پر تلے ہوئے تھے کہ وہ صاف صاف یہ کہہ دے کہ اس نے جو کچھ کہا تھا وہ جھوٹ تھا۔ وہ ایک دوراہے پر آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ کدھر جائے...... کیوں کہ وہ سچ بولتا ہے تو اسے جھوٹا سمجھا جائے گا اور پھر سزا کا مقصد فوت ہو جائے گا۔ اس نے اس مشکل صورت حال سے نمٹنے کا ایک راستہ نکالا۔

"پتا جی......! جب کوئی اپنی آنکھوں سے کچھ دیکھتا ہے تو کیا وہ سچ ہو جاتا ہے؟" اس نے اپنے باپ کو سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

"یقیناً......" اس کے پتا جی نے اثبات میں گردن ہلائی۔ "تم اتنے چھوٹے بھی نہیں ہو کہ اتنی سی بات سمجھ نہ سکو۔"

"کیا آپ اس بات کو مانتے ہیں کہ سچ بولنا بہت مشکل ہوتا ہے؟" گوپی کو اس وقت ایک فلم کا مکالمہ یاد آ گیا۔ "سچ بہادر آدمی بولتا ہے...... آج کل لوگ جھوٹ بہت بولتے ہیں۔ جھوٹ بات بات پر بولا جاتا ہے۔"

"ہاں۔" اس کے پتا جی ایک دم سنجیدہ ہو گئے۔ "یہ بات کہنے کا مقصد کیا ہے؟"

"میں نے جو کچھ دیکھا ہے اور کہا ہے وہ سچ ہے......" گوپی نے یہ جانتے ہوئے بے خوفی سے کہا کہ اس کے پتا جی پھر آپے سے باہر ہو جائیں گے۔ اسے اس بات کی ذرہ برابر فکر نہیں رہی تھی کہ اس کا کچومر نکال دیا جائے۔ وہ سچ کے محاذ پر ایک بہادر سپاہی کی طرح ڈٹ گیا تھا۔ "یہ کوئی ہارر فلم کی کہانی نہیں تھی...... کیوں کہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے...... اور میں اس حقیقت کو جھٹلا نہیں سکتا۔"

اس جواب پر اس کے پتا جی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ ان کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہک اٹھیں وہ گرجے۔

"گویا تم اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے پر تل گئے ہو؟ زیادہ بہادر بننے کی حماقت مت کرو۔"

"پتا جی......!" گوپی نے کہا۔ "آخر آپ میری بات کی سچائی کو مانتے کیوں نہیں ہیں۔ میں نے ہر حال میں سچ بولنا آپ سے سیکھا ہے۔"

اس کے پتا جی نے اس کا کالر پکڑ لیا۔ پھر اسے پیچھے سے کھینچا۔ گوپی کو یقین ہو گیا کہ پہلے سے زیادہ اس کی خاطر تواضع کی جائے گی۔ لیکن اس کا خیال غلط ثابت ہوا۔ لیکن انہوں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کسی خیال کے زیر اثر اس کا کالر چھوڑ دیا...... اور دروازے کے قفل میں جو چابی لگی ہوئی تھی اور اسے نکال لی۔

"تم اس وقت اس کمرے میں ایک قیدی کی طرح رہو گے جب تک تم جھوٹ بولنے کا اعتراف نہیں کر لیتے......" وہ سخت لہجے میں بولے۔

پھر انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔ قفل میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی اور پھر چابی نکال لی گئی اور باہر کی طرف لگا دی۔

گوپی کسی ٹوٹی شاخ کی طرح کرسی پر گر گیا۔ پھر اس نے دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر اس سنگین نوعیت کی صورت حال پر غور کرنے لگا۔ اسے اس بات پر سزا ملی تھی کہ وہ جھوٹ نہ بولے۔ جب کہ وہ سچ بول رہا تھا اس کے والدین چاہتے تھے کہ وہ جھوٹ بولنا چھوڑ دے...... اور اس کے سچ بولنے پر زبردست پٹائی کی گئی تھی۔ گویا سچ بولنا جرم تھا...... آخر اس کے پتا جی اس کے سچ کو ماننے کے لئے کیوں تیار نہ تھے۔ اگر وہ تھوڑی دیر کے لئے اس کی بات کو سچ مان لیتے تو کون سی قیامت آ جاتی...... قانون کی مدد تو کی جا سکتی تھی۔ قتل کیا وحشیانہ فعل تھا اور کتنا بڑا جرم تھا۔ ایک شخص کو قتل کیا گیا تھا جو بے گناہ تھا۔ ایک ذرا سی بات پر اپنی شقاوت اور درندگی......

اس نے برابر والے کمرے میں آہٹ سے محسوس کیا کہ وہ چل پھر رہے ہیں۔ وہ ناشتا کر چکے تھے۔ رات کی ڈیوٹی سے واپس آئے تھے۔ لہٰذا اب وہ سونے کی تیاری کر رہے تھے۔ پھر اس نے جوتے فرش پر پھینکنے کی آواز سنی اور چند لمحوں کے بعد بستر کے اسپرنگ چرچرائے۔ اس کے بعد گہری خاموشی چھا گئی۔ گوپی کو معلوم تھا کہ وہ شام تک سوتے رہیں گے۔ یہ ان کی

معمولات میں شامل تھا۔ اسے اس بات کی آشا تھی کہ ماں اسے کمرے سے باہر نکال دے۔ اس نے سوچا۔ اسے جلدی کرنی چاہئے۔ ورنہ اس کی ماں کام پر چلی جائے گی۔ پھر وہ بھی شام کو آئیں گی پھر یہ سب کچھ سوچتے ہوئے اس نے آہستہ آہستہ اور وقفے وقفے سے دروازہ کھٹ کھٹانے لگا۔ اس نے آواز اتنی ہلکی رکھی تھی کہ اس کے پتاجی نیند سے بیدار نہ ہوسکیں۔ وہ جب گہری نیند میں ڈوب جاتے تھے۔ گہرے خراٹے لیتے تھے۔ اسے ان کے خراٹوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ انہیں نیند نے بری طرح دبوچ لیا ہے۔

"ماں......! ماں......!" اس نے دروازہ کھٹ کھٹاتے ہوئے ماں کو پکارا۔

کچھ دیر بعد اس کی کوششیں بار آور ثابت ہوئیں۔ باہر سے اس کی ماں نے دروازے پر جوابی دستک دے کر اپنی موجودگی سے باخبر کیا۔

"ماں......! مجھے باہر نکالو...... پلیز! میری پیاری ماں!"

"اسی میں تمہاری بہتری اور بھلائی ہے گوپی!" ماں نے سرگوشی میں جواب دیا۔ "تمہارے پتاجی نے کہا کہ "جب تک تم اعتراف نہ کرلو کہ تم نے جو کچھ کہا ہے وہ جھوٹ تھا۔ اس وقت تک تم باہر نہیں نکل سکتے...... تم اعتراف کرتے ہو گوپی! بولو۔ جواب دو۔"

"نہیں......" اس نے کہا۔ اس کا لہجہ پراعتماد تھا۔

وہ مایوس اور افسردہ ہوگیا۔ گہرا سانس لے کر دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کا دل اندر سے بجھ سا گیا تھا۔ خود اس کے والدین اس کی سچ بات پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھے۔ انہیں ضد آگئی تھی۔ اسے بھی...... وہ ہٹ دھرمی پر اتر آیا ہے۔ ان کا خیال تھا۔ لیکن ایسی بات نہ تھی۔ اب اسے کیا کرنا چاہئے......؟ وہ سوچنے لگا۔ کیا اسے خاموش رہنا چاہئے......؟ کیا اسے اعتراف کرلینا چاہئے کہ اس نے جھوٹ بولا ہے......؟ نہیں...... وہ ہرگز ہرگز سچائی کا گلا نہیں گھونٹے گا...... یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے جسے نظر انداز کردیا جائے۔ اگر وہ خاموش رہتا ہے تو یہ بھی جرم ہے...... اس لئے کہ انہوں نے ایک انسان کو قتل کیا ہے۔ اس بات کو چھپانا اتنا ہی بڑا جرم ہے۔ ایک قاتل کا...... اس کا فرض ہے کہ وہ بات کسی کو بتائے...... کسی ایسے شخص کو جو اس کی بات پر یقین کرلے...... اب اسے اوپر رہنے والوں مجرموں سے ذرا بھی ڈر خوف محسوس نہیں ہورہا تھا۔ کیوں کہ وہ دن کا وقت تھا۔ اس نے پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔

اچانک اس کے ذہن میں ایک خیال بجلی کا کوندا بن کر لپکا۔ وہ اپنی بے وقوفی پر بے اختیار مسکرا دیا۔ وہ بے کار میں باہر نکلنے کے لئے پریشان ہورہا تھا۔ وہ بڑے آرام سے کھڑکی کھول کر آگ سے بچاؤ والی ہنگامی سیڑھیوں کے ذریعے سڑک تک جاسکتا تھا...... اسے اس بات کی خوشی ہورہی تھی باہر نکلنے کی مشکل تو بڑی آسانی سے حل ہوگئی تھی۔ اب اسے دروازہ کھولنے کے لئے گڑگڑانے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔

اب دوسرا مرحلہ باقی تھا جو بہت زیادہ اہم اور بے حد ضروری تھا...... اب سوال ایسے آدمی کی تلاش کا تھا جو اس کی کہانی پر یقین کرلے...... ان حالات میں آخر بڑے کیا کرتے ہیں......؟ وہ سوچنے لگا...... وہ پولیس کو اطلاع دیتے ہیں جو مجرم کو پکڑ کر تختہ دار تک پہنچا دیتے ہیں۔ کسی انسان کو قتل کرنے کی یہی سزا ہوتی ہے...... اگر بڑے پولیس کو اطلاع دیتے ہیں تو وہ خود بھی پولیس کے پاس جاسکتا ہے۔ پولیس کے پاس جانے سے حاصل یہ ہوگا کہ وہ اس کی بات سنے گی۔ جھٹلائے گی نہیں...... اگر اس کے پتاجی اس کی بات پر یقین کرلیتے تو وہی پولیس کو اطلاع دیتے۔ وہ دردسری سے بچ جاتا۔ مگر اب یہ کام اسے خود ہی کرنا پڑے گا۔

چند لمحوں تک سوچ بچار کرنے اور ایک فیصلے پر پہنچنے کے بعد اس نے چٹخنی گرائی۔ پھر کھڑکی کے پٹ کھول دیئے۔ سامنے آہنی چبوترہ تھا۔ میدان صاف تھا۔ کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اب اسے روکنے والا کوئی نہ تھا۔ اس کی ماں کام پر جاچکی تھی۔ پتاجی گہری نیند سو رہے تھے رات بھر کے تھکے ماندے...... وہ چوکھٹ پر چڑھ کر

ے پر آگیا۔ اس نے آہستگی سے کھڑکی کے پٹ کردیئے۔ وہ پولیس کو اطلاع دے کر اسی راستے سے پس آجائے گا۔ کسی کو پتا نہیں چلے گا کہ وہ کمرے سے اہر گیا تھا۔ شام کو جب پتاجی بیدار ہوکر کمرے کا دروازہ کھولیں گے تو وہ اندر موجود ہوگا۔ سانپ بھی مرجائے گا۔ ٹھی بھی نہیں ٹوٹے گی۔

اسے اتنی اہم خبر پولیس اسٹیشن جاکر ہی بتانی چاہئے...... کسی چلتے پھرتے کانسٹیبل کو نہیں۔ کیوں کہ وہ اس قابل نہیں ہوتا ہے کہ ایسے اہم معاملات بھی کچھ کرسکے۔ اس کا کام صرف گشت کرنا اور کسی کو غیر قانونی حرکت پر پکڑنا ہوتا ہے۔

گوپی کو تھانے کے اندر داخل ہونے کے خیال ہی سے خوف آرہا تھا۔ لیکن اسے معلوم تھا کہ جو بے گناہ ہوتے ہیں انہیں تھانے سے نہیں ڈرنا چاہئے۔ پولیس اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا۔ نزدیک ہی تھا۔ جوں جوں وہ تھانے سے قریب ہوتا گیا ویسے ویسے اس پر پولیس کا خوف طاری ہوتا گیا۔ وہ بہت دیر تک تھانے کے دروازے پر کھڑا رہا۔ اس کے ذہن میں ایک عجیب سی کشمکش ہورہی تھی...... کیا وہ واپس چلا جائے......؟ وہ کل آکر پولیس کو اس واردات کے بارے میں اطلاع دے......؟ پولیس اس سے یہ پوچھے گی کہ وہ اب تک کہاں تھا۔ اس نے ایک دن دیر سے کیوں بتایا......؟ اس کے پاس اس بات کا کیا جواب ہوگا......؟ کیا وہ پولیس کو بتائے گا کہ اس کے پتاجی نے اس کی بات کا یقین نہ کرکے اسے کمرے میں بند کردیا تھا۔ اس طرح اس کے پتاجی بھی لپیٹ میں آجائیں گے۔

جب وہ یہ سب کچھ سوچ رہا تھا اس نے ایک بلی کو عمارت کے اندر جاتے دیکھا۔ اس نے سوچا جب بلی جاسکتی ہے تو وہ کیوں نہیں جاسکتا...... آخر تو وہ ایک انسان ہے اور اپنا فرض ادا کرنے آیا ہے۔ اس کی ہمت بڑھ گئی۔ پھر وہ خود بھی جھجکتا ہوا اندر داخل ہوگیا۔

میز کے پیچھے بیٹھے ہوئے پولیس والے نے بہت دیر تک اس پر توجہ نہیں دی۔ وہ سر جھکائے کاغذات دیکھ رہا تھا۔ اسے مصروف دیکھ کر وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ اس میں اتنا حوصلہ نہیں تھا کہ وہ پہل کرکے پولیس افسر کی توجہ اپنی طرف مبذول کراسکے۔ آخرکار پولیس افسر نے سر اٹھا کر دیکھا۔ پھر اس نے حیرت اور نرمی کے لہجے میں کہا۔

"کیا بات ہے بیٹے......؟ کیا تمہاری سائیکل چوری ہوگئی ہے......؟ یا کوئی چیز گم ہوگئی ہے......؟"

"نہیں جناب......!" گوپی نے اٹکتے ہوئے جواب دیا۔ "میں...... میں آپ کو کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"

"تم کیا بتانا چاہتے ہو......؟" پولیس افسر نے دوبارہ کاغذات پر نظریں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

گوپی نے بڑی احتیاط سے چاروں طرف دیکھا۔ پیچھے مڑ کے سڑک پر دیکھا۔ اسے ڈر تھا کہ کوئی اس کی گفتگو نہ سن رہا ہو۔ اس نے اچھی طرح سے اپنا اطمینان کرنے کے بعد سرگوشی میں کہا۔

"یہ بہت ہی اہم معاملہ ہے سر!" گوپی نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔ "پچھلی رات ایک آدمی کو قتل کردیا گیا ہے۔"

پولیس افسر نے چونک کر سر اٹھا کر گوپی کی طرف دیکھا۔ پھر اس بار اس نے گوپی پر توجہ مرکوز کی تھی۔ اس نے دریافت کیا۔

"کیا تم کسی آدمی کے قتل کیئے جانے کی اطلاع دینا چاہتے ہو؟"

"یس سر!" اس نے بڑے سعادت مندانہ انداز سے سر ہلا دیا۔ "پچھلی رات اس شخص کو اوپر والے فلیٹ میں قتل کیا گیا ہے۔"

گوپی خاموش ہوکر سوچنے لگا کہ...... کیا اتنا کہہ دینا کافی ہوگا......؟ کیا اب اسے واپس چلا جانا چاہئے......؟ پھر ایک خیال نے اس کے قدم روک لئے۔ آخر پولیس کو یہ کیسے پتا چلے گا کہ یہ واردات کہاں ہوئی ہے......؟ اسے پولیس کو نام پتا بھی بتانا چاہئے۔ یہ ضروری ہے، تاکہ وہ مجرموں کو گرفتار کرکے پھانسی پر چڑھا سکیں۔

پولیس افسر بے خیالی میں اپنا گال کھجاتے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔ "تم کوئی شرارت تو نہیں

کررہے ہو لڑکے......؟" پھر اس نے گوپی کے چہرے پر گہری نظر ڈالی۔ گوپی کے چہرے پر چھائی ہوئی سنجیدگی نے اس کا شک دور کر دیا۔

"نہیں سر......!" گوپی نے سر ہلا دیا۔

"اچھا دیکھو......" افسر بولا۔ "یہ میرا شعبہ نہیں ہے...... کیا تم شعبے کا مطلب سمجھتے ہو؟"

گوپی نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے جلدی سے اپنا سر اثباتی انداز میں ہلا دیا۔

"تم اس طرف وہ ہال دیکھ رہے ہو......؟" اس نے ہال کی سمت اشارہ کرکے کہا۔ "بس وہاں چلے جاؤ۔ وہاں جو صاحب بیٹھے ہیں انہیں اپنی کہانی سنا دینا...... وہ صاحب ہال کے دروازے پر نہیں ہوں گے۔ پہلا دروازہ چھوڑ کر دوسرے کمرے کے دروازے پر چلے جانا۔ وہیں پر وہ صاحب ہوں گے۔ جن کے بارے میں تمہیں بتا رہا ہوں۔ دیکھو...... پہلے دروازے میں مت گھسنا۔ وہاں جو آدمی بیٹھا ہے وہ بہت ظالم ہے۔ تمہاری عمر کے بچوں کو ناشتا میں کھا جاتا ہے...... سمجھ گئے نا......؟"

گوپی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ راہ داری عبور کرتا ہوا ہال کے دروازے پر رک گیا۔ پھر اس نے پلٹ کر پولیس افسر کی طرف دیکھا جو اس کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے ہاتھ ہلا کر گوپی کا حوصلہ بڑھایا۔ گوپی دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔

اس نے خوف زدہ نظروں سے پہلے دروازے کو دیکھا...... اور دبے دبے قدموں کے ساتھ بڑے محتاط انداز میں اس کے سامنے سے گزرا۔ اس کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ پھر اس نے دوسرے دروازے پر کانپتے ہاتھ سے دستک دی۔ دستک دیتے ہوئے اس کی جان نکل گئی۔ یہ حالت اس وقت طاری ہوئی تھی جب وہ اسکول میں طلب کیے جانے پر پرنسپل کے کمرے میں داخل ہوتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ اس سے بھی خوف زدہ تھا۔

"آ جاؤ......" اندر سے ایک تیز آواز نے پکار کر کہا۔

گوپی نے اپنے جسم کو حرکت دینے کی کوشش کی۔ لیکن وہ ناکام رہا۔

"کون ہے......؟" اس آواز نے جھلا کر پوچھا۔

"اب باہر رکنا اندر جانے سے بھی بدتر تھا۔ گوپی نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنی ہمت جمع کی۔ پھر قدم بڑھا کر اندر داخل ہو گیا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کرنا نہیں بھولا...... اگر کوئی طالب علم اندر داخل ہو کر دروازہ بند نہیں کرتا تھا تو اسکول کے پرنسپل اسے کمرے سے نکال کر دوبارہ اندر آنے کا حکم دیتے تھے۔

اندر ایک آدمی سادے لباس میں میز کے پیچھے لیٹا ہوا تھا۔ اس کی نظریں دروازے پر زمین سے چھ فٹ کی بلندی پر جمی ہوئی تھیں۔ دروازہ کھلا اور بند بھی ہو گیا۔ اس کے باوجود جب اس کی نظریں کسی وجود سے نہیں ٹکرائیں تو وہ چونک کر حیرت سے اپنی نظریں چار فٹ کی بلندی پر نے آیا۔ اس نے یہ سوچا۔ کیا دروازہ خود کھلا اور بند بھی ہو گیا؟

"یہ کیا ہے......؟" اس نے حیرت بھری آواز میں بے تکا سوال کیا...... اس نے یہ سوال گوپی سے نہیں بلکہ دروازہ یا کمرے کی چھت سے پوچھا تھا۔ دوسرا سوال اس نے گوپی سے ہی دریافت کیا۔

"تم کیسے اندر آئے......؟"

گوپی کو یہ سوال بھی بے تکا لگا۔ وہ اپنے پیروں پر چل کر آیا تھا۔

"سر! میں آپ کو قتل کی اطلاع دینے آیا ہوں۔" اس نے کہا۔

"پولیس افسر اپنی نشست پر سیدھا ہو گیا۔" کیا کہا...... قتل؟"

"یس سر! کل رات ہمارے اوپر والے فلیٹ میں انہوں نے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا...... پھر استرے سے اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے پلاسٹک کے دو بڑے تھیلوں میں بند کرکے باہر کہیں پھینک دیا۔"

گوپی خاموش ہو گیا...... اسے یقین تھا کہ پولیس افسر یہ سنسنی خیز اور لرزہ انگیز واردات سنتے ہی اس طرح اچھل پڑے گا جیسے اسے کرنٹ لگا ہو اور پھر تھانے میں

بھونچال آ جائے گا۔ پولیس گاڑیاں سائرن بجاتی ہوئی تیز رفتاری سے اس کے گھر کی طرف چل پڑیں گی۔ پولیس افسر چیخ چیخ کر احکامات دیں گے۔ فلموں میں تو ایسا ہی ہوتا ہے...... لیکن پتا نہیں اس افسر کو کیا ہو گیا ہے جو چپ چاپ بیٹھا اسے دیکھے جا رہا ہے۔ اسے لگا پولیس افسر بت بن گیا ہے۔

"کیا نام ہے تمہارا بیٹے!" افسر نے چند لمحوں کی خاموشی کے بعد دریافت کیا۔ "کہاں رہتے ہو؟"

گوپی نے اپنا نام اور پتا بتایا۔

"کیا تمہیں خواب نظر آتے ہیں......؟" اس نے قدرے نرم لہجے میں دریافت کیا۔ "خوف ناک خواب جنہیں دیکھ کر چیخ نکل جاتی ہے۔"

"یس سر......!" گوپی نے مؤدبانہ لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے ایسے خواب نظر آتے ہیں...... بہت نظر آتے ہیں۔"

پولیس افسر میز کی طرف جھکا۔ اس نے سامنے رکھے ہوئے داخلی مواصلاتی نظام کے آلے کا بٹن دبایا۔

"واس! ذرا ادھر آنا۔"

چند لمحوں کے بعد ایک دوسرا شخص کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بھی سادے لباس میں ملبوس تھا۔ جس کی وجہ ان افسران کی وقعت گوپی کی نظروں میں کم ہو گئی تھی۔ کچھ دیر وہ اس کے متعلق آپس میں صلاح مشورہ کرتے رہے۔ گوپی ان کی سرگوشیاں سن نہیں سکتا تھا۔ لیکن اسے احساس تھا کہ گفتگو کا موضوع خود اس کی اپنی ذات ہے۔ کیوں کہ وہ کبھی کبھی رک کر اسے بڑی عجیب نظروں سے دیکھنے لگے تھے۔ ان کے چہروں سے ظاہر ہونے والے تاثرات بھی غلط تھے...... اس نے جس بھیانک جرم کی اطلاع دی تھی جس کی وجہ سے پولیس افسران کا پریشان ہونا لازمی فطری امر تھا...... لیکن اس کے بجائے کبھی کبھی گوپی کو ان کے ہونٹوں پر دبی دبی اور تمسخرانہ مسکراہٹ نظر آ گئی تھی۔ جیسے وہ اس کے سامنے ہنسی روکنے کی کوشش کر رہے ہوں۔

پھر پہلے افسر نے اسے مخاطب کیا۔ "تو تم نے انہیں ایک آدمی کے ٹکڑے ٹکڑے کرتے ہوئے دیکھا تھا اور......"

یہ سراسر غلط بیانی تھی...... حقائق کو مسخ کیا جا رہا تھا۔ گوپی نے سچ بولنے کا تہیہ کیا ہوا تھا۔ وہ انہیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتا تھا کہ وہ اس کے بیان کو توڑ موڑ کرکے بیان کریں...... ہاں اگر چند ہفتے پہلے یہ بات اس کے سامنے کی جاتی تو وہ اس شان دار اور سنہرے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

"نہیں سر......!" اس نے افسر کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "میں نے انہیں لاش کے ٹکڑے کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ میں نے صرف اپنے کانوں سے سنا تھا کہ وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے پلاسٹک کے بڑے تھیلوں میں بند کر دیں گے اور پھر ان ٹکڑوں کو باہر کہیں پھینک دیں لیکن۔"

لیکن اس سے پہلے گوپی انہیں یہ بتاتا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے انہیں ایک آدمی کو قتل کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اوپر فلیٹ میں رہنے والے پڑوسی نے اس کی نظروں پر چاقو سے پے در پے تین وار کیے تھے۔ پولیس افسر نے فوراً ہی اس سے دوسرا سوال پوچھ لیا۔

"کیا تم نے اپنے والدین کو اس جرم کی اطلاع دی تھی؟"

یہ بڑا ہی غلط سوال تھا۔ جس نے اسے بری طرح چکرا کر رکھ دیا تھا۔ اسے جیسے کسی کڑے امتحان میں ڈال دیا تھا۔ اسے اس بات کا ڈر اور خوف محسوس ہو رہا تھا کہ جب وہ پوری سچائی سے اس سوال کا جواب دے گا تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا۔ سچ بولنے سے اس کا جو حشر ہوا تھا۔ اس لیے وہ ذہنی کش مکش میں مبتلا ہو گیا تھا۔ آخر اس نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

"جی...... جی ہاں......" اس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ "آواز اس کے حلق میں پھنس گئی۔

"تو پھر وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں آئے...... انہوں نے تمہیں تنہا یہاں کیوں بھیجا......؟ انہیں یہاں خود آنا تھا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں جو انہوں نے تمہیں رپورٹ درج کرانے یہاں بھیج دیا۔" اس نے کہا۔

گوپی نے خاموش رہ کر اس بلا کو ٹالنے کی کوشش کی۔

"جواب دو بیٹے......" اس نے بڑے نرم لہجے میں اصرار کیا۔

پولیس کے سامنے کبھی جھوٹ نہیں بولنا چاہئے۔ اس نے دل میں سوچا۔ اور پھر یہ معاملہ تو بہت ہی سنگین نوعیت کا ہے۔ اگر انہوں نے وردی نہیں پہنی ہوئی ہے تو کیا ہوا......؟ آخر ہیں تو پولیس افسران......"

"انہوں نے...... میری اس بات پر یقین نہیں کیا۔" گوپی نے قدرے تذبذب سے کہا۔ "اس لئے مجھے خود یہاں آنا پڑا۔"

"انہوں نے کس لئے تمہاری بات کا یقین نہیں کیا؟"

"ان کا خیال ہے کہ میں ہمیشہ جھوٹ بولتا رہتا ہوں۔" گوپی نے کہا۔ "میں نے جب اس واردات کے بارے میں بتایا تو انہوں نے کہا کہ میں نے کسی ہارر فلم کی کہانی سنائی ہے۔ حالاں کہ یہ بات قطعی درست نہیں ہے۔"

پولیس افسروں نے ایک دوسرے کی طرف معنی خیز نظروں سے دیکھا تو گوپی کا دل ڈوبنے لگا۔ وہ ان نظروں کا مطلب خوب سمجھتا تھا۔ وہ سچ بولنے کی جنگ ہار گیا تھا۔ پولیس والے بھی اس کے پتاجی کے ہم خیال بن گئے۔ انہیں بھی یقین ہو گیا تھا کہ یہ لڑکا جھوٹ بول رہا ہے۔ کوئی گھڑی ہوئی کہانی سنا رہا ہے۔ وہ ان کے شکوک کیسے دور کرے؟

"اچھا......" پولیس افسر نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔ "کیا تم واقعی جھوٹ بولتے رہتے ہو؟"

اس بات نے گوپی کے اندیشوں کی تصدیق کر دی۔ اس نے ہمت نہ ہاری۔ اس نے بڑے مضبوط لہجے میں احتجاج کیا۔

"نہیں سر!...... میں اب جھوٹ نہیں بولتا...... پہلے کبھی جھوٹ بولتا تھا لیکن اب بالکل بھی نہیں بولتا ہوں۔ میں نے جو کچھ بتایا ہے اس میں ذرہ برابر بھی جھوٹ نہیں ہے۔ آپ یقین کریں۔"

"پولیس افسر نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش کرا دیا۔

"کیا تمہیں معلوم ہوتا ہے کہ تم کب جھوٹ بولتے ہو اور کب سچ بولتے ہو......؟" کیا تم سچ اور جھوٹ کے درمیان فرق محسوس کر سکتے ہو؟" گوپی نے محسوس کیا اس کے چہرہ پولیس افسر کی نظروں کی گرفت میں ہے۔

"جی ہاں سر......!" گوپی نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔ "مجھے اس وقت اچھی طرح معلوم ہے کہ اس وقت میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں......"

وہ دھیمی دھیمی آواز میں آپس میں مشورہ کرنے لگے۔ گوپی کو اندھیرے میں امید کی ایک کرن نظر آئی۔ اگر اس کا جواب معقول نہ ہوتا تو وہ آپس میں تبادلہ خیال نہ کرتے۔ اس سے کہتے کہ تم اچھے بچے کی طرح گھر جاؤ اور آرام کرو۔ آئندہ کبھی وقت خراب نہ کرو۔ وقت بڑا قیمتی ہوتا ہے۔

"ہم اس معاملے کی تفتیش ضرور کریں گے بیٹے!" پہلے افسر نے اسے یقین دہانی کراتے ہوئے تسلی دی۔ پھر اس نے پلٹ کر اپنے ساتھی کی طرف دیکھا۔

"داس......! تم ذرا دیکھو کہ یہ کیا چکر ہے۔ لیکن اس بات کا خیال رکھنا کہ ہم ابھی سرکاری طور پر کوئی قدم اٹھا نہیں سکتے اور نہ ہی اٹھا رہے ہیں۔ یہ تفتیش جو بھی ہوگی وہ غیر سرکاری ہوگی۔ تم سیلز مین بن کر جا سکتے ہو۔ انہیں کوئی چیز فروخت کرنے کی کوشش کرو۔ برقی ریزر ٹھیک رہے گا۔ ان کے پاس استرا ہے۔ ہو سکتا ہے تم اس بہانے استرا بھی دیکھ لو۔ میرے لاکر میں ایک برقی ریزر ہے۔ نمونے کے طور پر وہی لے جاؤ۔ یہ پتا ہے۔ وہ لوگ......؟" اس نے سوالیہ نظروں سے گوپی کی طرف دیکھا۔

"چھٹی منزل پر!" گوپی نے بتایا۔ "بالکل ہمارے اوپر......"

وہ چھٹی منزل کے کرائے دار ہیں۔" اس پیڈ سے پرچہ پھاڑ کر اس کے حوالے کر دیا جس پر گوپی کا نام پتا لکھا ہوا تھا۔

"اب میرے لئے یہی فضول اور تکلیف دہ کام رہ گیا ہے۔" داس کے چہرے پر ناگواری اور بے زاری پھیل گئی۔ اس کا لہجہ اکھڑا ہوا سا تھا۔ چوں کہ اپنے افسر کے سامنے دم نہیں مار سکتا تھا اس لئے وہ نام و پتے کا کاغذ جیب میں ٹھونستے ہوئے باہر نکل گیا۔

"بیٹا!...... تم باہر ہال میں بیٹھ جاؤ۔ وہاں بنچ پڑی ہوئی ہے۔ داس تھوڑی دیر میں آ جائے گا۔ اس کے بعد ہم اطمینان سے گفتگو کریں گے۔"

گوپی ہال میں آ کر بنچ پر بیٹھ گیا۔ وہ خالی پڑی ہوئی تھی۔ اسے چالیس منٹ کا اذیت ناک انتظار کرنا پڑا۔

پھر داس نامی پولس افسر واپس آ گیا۔ اس نے گوپی کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ وہ سیدھا کمرے میں کسی جانور کی طرح گھس گیا۔ وہ امید بھری نظروں سے دروازے کی طرف دیکھنے لگا...... اسے یقین تھا کہ چند لمحوں کے بعد آندھی و طوفان کی طرح دروازہ کھلے گا اور پہلا افسر چیخ کر اسے اندر بلائے گا۔ پورے پولیس اسٹیشن میں بھونچال آ جائے گا۔ در و دیوار ہلنے لگیں گے۔

لیکن کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ کسی نے دروازہ نہیں کھولا۔ کوئی بھونچال نہیں آیا۔ بند دروازے کے باہر اسے داس نامی پولیس افسر کی آواز سنائی دے جاتی تھی اور پہلا افسر ہنسنے لگتا تھا۔ کچھ دیر بعد کمرے کا دروازہ کھلا اور داس نامی پولیس افسر نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورتے ہوئے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ کسی بھیگی بلی کی طرح چپ چاپ اندر جا کر بیٹھ گیا۔ چند لمحوں تک دونوں افسر اسے خاموشی سے دیکھتے رہے۔

"ایک بات تو بتاؤ بیٹے......!" پہلے افسر نے اسے بڑے پیار بھرے لہجے میں مخاطب کیا۔ اس کے پتاجی نے زندگی میں کبھی ایسے پیار بھرے لہجے میں مخاطب نہیں کیا تھا۔ اس لہجے نے اسے بڑا متاثر کیا تھا۔ "تم نیچے اپنے کمرے میں اوپر کی آوازیں سن سکتے ہو...... میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ کمرے کی چھت بہت پتلی ہوتی ہے۔ اس لئے اوپر کی آوازیں نیچے سنائی دینی چاہئیں۔"

"جی...... جی ہاں......" گوپی نے سر ہلاتے

میک اپ کی اہمیت کیا ہے؟۔

جب میک اپ اچھا ہو تو حسن میں نکھار، دلکشی نظر آتی ہے اور پھر میک اپ کرنے میں ہر خواتین کا اپنا ہنر، سلیقہ اور نفاست بھی ظاہر ہوتا ہے۔

پیاری بہنیں! ایک بیوٹیشن ہونے کے ناطے، میں کہہ سکتی ہوں کہ میک اپ بھی ایک فن ہے۔ ہر کام میں ماہر ہونے کی لئے تربیت اور پریکٹس ضروری ہے اور بغیر کسی ماہر کے سہارے کے کسی بھی کام میں ماہر ہونا مشکل ہے اور میک اپ کے فن مین ماہر ہونے کے لئے پیاری بہنوں کے لئے یہ کتاب بڑی تگ و دو اور محنت شاقہ سے تیار کی گئی ہے۔ بڑی حد تک یہ کتاب خواتین کے لئے میک اپ میں معاون و مددگار ثابت ہوگی اس کتاب میں میک اپ کے علاوہ جلد کی حفاظت ہاتھ پیروں کی حفاظت، بناؤ سنگھار، اور جدید دور کی میک اپ کی اشیاء کے متعلق بھی اہم معلومات فراہم کی گئی ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ صحت مند رہنے کے راز بھی اس کتاب میں درج ہیں۔

صابری دارلکتب

قذافی مارکیٹ اردو بازار لاہور

ہوئے جواب دیا۔ یہ سوال اس کے لئے غیر متوقع اور اچانک تھا اور وہ اس کا مقصد سمجھنے سے قاصر تھا۔ ”تم نے گزشتہ شب جو کچھ سنا تھا وہ ریڈیو سے نشر ہونے والا ڈرامہ تھا!“

”نہیں جناب!“ گوپی نے فوراً ہی تردید کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ غلط ہے ان کے پاس کوئی ریڈیو نہیں ہے...... اگر ریڈیو ہوتا تو روزانہ بجتا۔ گانے، ڈرامے اور دوسرے پروگرام سنائی دیتے۔ آکاش وانی کے پروگرام......“

”ان کے پاس ریڈیو ہے......“ داس نامی پولیس افسر نے اس کی بات کاٹتے ہوئے میز پر گھونسا مارا۔ پھر اس نے گوپی کو ایسی نظروں سے گھورا جیسے وہ اسے کچا چبا جائے۔ کا ارادہ رکھتا ہو۔ ”میں ابھی اس فلیٹ سے آرہا ہوں۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے ان کے ہاں ریڈیو رکھا ہوا دیکھا ہے۔ جس کی آواز تیسری منزل تک آتی ہے، میں چودہ برس سے پولیس کے محکمے میں ملازم ہوں...... کل کا یہ لونڈا مجھے سبق پڑھانے کی کوشش کررہا ہے۔“

”ٹھیک ہے...... ٹھیک ہے...... ذرا صبر اور تحمل سے کام لو۔“ پہلے افسر نے اپنے ساتھی کو ٹھنڈا کرتے ہوئے کہا۔

”میں نے کبھی آوازیں نہیں سنی تھیں سر!“ گوپی نے تکرار کے انداز میں کہا۔ ”میں نے یہ سب کچھ کھڑکی سے جھانک کر اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ کھڑکی سے......“ اس کی آواز گلے میں رندھ گئی۔

ٹھیک ہے بیٹے......! میں مانتا ہوں کہ تم غلط نہیں کہہ رہے ہو۔“ پہلے افسر نے اسے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔ ”کان جو کچھ سنتے ہیں اسے آنکھ نہیں دیکھ سکتی...... تم کھڑکی سے انہیں دیکھ رہے تھے...... لیکن تمہارے کانوں میں ریڈیو سے نشر ہونے والے ڈرامے کی آوازیں آرہی تھیں۔ تم یہ سمجھے کہ یہ گفتگو ان کے درمیان ہورہی ہے......“

”رات تم کس وقت کھڑکی سے جھانک کر انہیں دیکھ رہے تھے؟“ داس نے غراتے ہوئے گوپی سے [illegible] کیا۔ وہ ابھی تک برہم تھا اور اسے اس بات پر طیش تھا کہ [illegible] ابھی تک اپنے جھوٹ پر ڈٹا ہوا تھا۔ اس کی عمر دیکھو، با[illegible] برس کی۔ لیکن کس قدر ڈھیٹ ہے۔

”مجھے...... پتا نہیں کیا وقت ہوا تھا۔ میرے پاس گھڑی نہیں تھی۔ کافی رات ہوگئی تھی۔ کیوں کہ ہر طرف گہری تاریکی تھی۔

”میں بتاتا ہوں کیا وقت تھا۔“ داس بھڑک کر تلخ لہجے میں کہنے لگا۔ ”وہ پروگرام رات گیارہ بجے سے بارہ بجے تک آکاش وانی سے نشر ہوتا ہے۔ چوں کہ سری لنکا میں مقامی لوگ بھی آکاش وانی کا یہ پروگرام بہت شوق سے سنتے ہیں۔ ہندوستانیوں کی بڑی آبادی ہے جس کے باعث یہاں کے لوگ بھی ہندی سمجھتے ہی نہیں بلکہ بولتے ہیں...... اس زبان میں بڑی مٹھاس ہے۔ اس کے باوجود سری لنکن زبان میں آکاش وانی بدھ کو ڈراما نشر کرتا ہے۔ ہر بدھ کو وہ پروگرام نشر ہوتا ہے۔“ اس نے توقف کرکے گوپی کو خونخوار نظروں سے گھورا۔ پھر وہ اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ اس عورت کا نام کانتا ہے۔ اس نے خود مجھے بتایا کہ گزشتہ شب نشر ہونے والا ڈرامہ بہت ہی خوف ناک تھا۔ دہشت ناک اور رونگٹے کھڑے کردینے والا...... جس کی وجہ سے اس کے شوہر نے اس سے ایک گھنٹے تک کوئی بات نہیں کی۔ وہ خود یہ پروگرام بڑے شوق سے سنتی ہے۔ بدھ کے دن کا یہ پروگرام جس کا وہ بڑی بے چینی سے انتظار کرتا ہے، لیکن اس کے پتی کو یہ پروگرام پسند نہیں، اسے زہر لگتا ہے...... اس نے یہ بات بھی کہی کہ اس نے اپنے شوہر کو چڑانے کی غرض سے اس کی آواز بلند رکھی تھی۔“

پہلے افسر نے الجھی ہوئی نظروں سے گوپی کی طرف دیکھا جو سر جھکائے خاموش بیٹھا تھا اور اس نے داس کی بات بڑے غور اور توجہ سے سنی تھی۔ اس افسر کی نگاہیں جیسے کہہ دے رہی تھیں...... ہاں تو بیٹے......! اب تم کیا کہتے ہو؟ وہ سچ بولنے کی جنگ ہار چکا ہے۔ اب اس نے اپنی ذلت آمیز شکست تسلیم کرلی تھی۔

جب بڑے کسی بچے کو جھوٹا تصور کرلیتے ہیں تو پھر دنیا کی کوئی طاقت انہیں اپنا خیال تبدیل کرنے پر مجبور نہیں کرسکتی۔ وہ بت بنا بیٹھا تھا۔ اب اس کے پاس کہنے کے لئے بہت کچھ تھا لیکن اس کے سچ کو تاخت وتاراج کردیا گیا تھا۔ اب کہنا فضول ہی تھا۔

”اس کے علاوہ اس عورت نے مجھے یہ بھی بتایا کہ...... اس کا پتی شیو کرنے کے لئے استرا نہیں...... بلکہ سیفٹی ریزر استعمال کرتا ہے۔ اس نے مجھے سیفٹی ریزر بھی دکھایا...... اب یہ بتاؤ کہ سیفٹی ریزر سے کس طرح ایک انسان کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کئے جاسکتے ہیں......؟ یہی نہیں...... میں نے پلاسٹک کے دو بڑے تھیلے بھی کمرے میں رکھے ہوئے دیکھے تھے جن کے اندر میلے کپڑے بھرے ہوئے تھے۔ فرش پر خون کا دھبا تو کیا چھینٹا بھی نظر نہیں آیا۔ میں نے بڑے غور سے اور غیر محسوس انداز سے دیکھا تھا۔“

پہلا افسر ہنسنے لگا۔ اس نے اپنے ساتھی کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر خوش دلی سے بولا۔

”ٹھیک ہے داس......! ٹھیک ہے۔ گرم ہونے کی ضرورت نہیں۔ یوں سمجھ لو کہ آج تمہاری ورزش ہوگئی...... سیر و تفریح ہوگئی۔ بسا اوقات کچھ فوراً ہوجاتا ہے۔ ہمارا شعبہ اور ہمارا کام ہی کچھ ایسا ہے۔ زیادہ جذباتی مت بنو۔“

”ورزش سپاٹ اور ہموار زمین پر ہوتی ہے...... کبھی چھ منزلہ عمارت کی سیڑھیاں چڑھ کر دیکھو...... تب پتا چلے گا ورزش کسے کہتے ہیں۔“

داس غصے سے پیچ وتاب کھاتا اور گوپی کو قہر آلود نظروں سے گھورتا کمرے سے باہر نکل گیا۔ باہر نکلتے اس نے بڑے زور سے دروازہ بند کیا۔ اس کا بس چلتا تو گوپی کی وہ حجامت بنا کر رکھ دیتا۔

وہ دونوں کمرے میں تنہا رہ گئے۔ پولیس افسر نے داخلی مواصلاتی آلے کا بٹن دبایا۔ دوسری طرف سے آواز آئی تو اس نے کہا۔

”ذرا سدھیر کو بھیجنا......“

اس مرتبہ اندر داخل ہونے والا پولیس سرکاری وردی میں ملبوس تھا۔ گوپی کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ وہ سمجھا کہ اسے جھوٹ بولنے کے الزام میں گرفتار کیا جارہا ہے۔

”اس لڑکے کو اس کے گھر چھوڑ آؤ۔“ پولیس افسر نے سدھیر کانسٹیبل سے کہا۔ ”پھر مجھے آکر رپورٹ کرنا۔“

”نہیں...... نہیں، میں خود ہی چلا جاؤں گا۔“ گوپی گھبرا گیا۔ ”میں اکیلا آیا تھا اور اکیلا جا بھی سکتا ہوں۔“

اسے معلوم تھا کہ اگر وہ اس کانسٹیبل کے ساتھ گیا تو اس کے پتاجی کو سارے واقعے کا علم ہوجائے گا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ وہ جس راستے سے آیا ہے چپ چاپ اسی راستے سے واپس جاکر اپنے کمرے میں بند ہوجائے گا۔ کسی کو بھی پتا نہیں چلے گا کہ وہ کب اور کہاں گیا تھا۔ کس سے واپس آیا ہے۔ اس کا راز کھل نہ سکے گا۔

”نہیں بیٹے...... تم گھبراؤ نہیں...... سدھیر تمہیں چھوڑ آئے گا۔ اس طرح تم راستہ بھول کر گم نہ ہوسکو گے۔“

پولیس افسر نے ہاتھ ہلا کر سدھیر کانسٹیبل کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور میز پر جو کاغذات بکھرے ہوئے تھے انہیں سمیٹ کر درست کرنے لگا۔

سدھیر کانسٹیبل نے نرمی لیکن مضبوطی سے گوپی کا کاندھا پکڑا اور اسے باہر چلنے کا اشارہ کیا۔ گوپی کو اس بات کا علم تھا کہ پولیس سے مزاحمت کا نتیجہ بہت خراب ہوتا ہے۔ وہ کچھ بھی کارروائی کرسکتے ہیں۔ وہ سر جھکائے چپ چاپ باہر نکل آیا۔

وہ عمارت کے صدر دروازے سے داخل ہوکر سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اس نے سدھیر کانسٹیبل سے کہا کہ وہ اب چلا جائے۔ اس کا گھر آگیا ہے۔ لیکن وہ اس کے گھر کے دروازے تک پہنچانے پر مصر تھا۔ کیوں کہ اسے اپنے افسر اعلیٰ کو رپورٹ بھی دینا تھی۔ اسے یہ بتانا تھا کہ گھر کے دروازے پر پہنچا کر آیا ہے۔ دوسری منزل کے فلیٹ کا دروازہ کھلا اور ایک گنجے کا سر باہر آیا۔ اس نے پہلے تو غور سے کانسٹیبل کو دیکھا اور پھر گوپی کو دیکھا۔

”اوئے......“ وہ زور سے چیخا۔ ”دیدی جلدی سے باہر آؤ۔ دیکھو پولیس نے گوپی کو گرفتار کرلیا ہے۔“

”نہیں......“ گوپی نے فوراً ہی پرزور لہجے میں تردید کی۔ ”مجھے گرفتار نہیں کیا گیا ہے۔ وہ خاص طور پر مجھے گھر چھوڑنے آئے ہیں۔“

”ہاں۔“ سدھیر کانسٹیبل نے سر ہلا کر گوپی کی تائید کی۔ ”تمہارا دوست ٹھیک کہہ رہا ہے۔“

پانچویں منزل پر پہنچ کر گوپی کے قدم آپ ہی آپ رک گئے۔

”یہ ہے تمہارا گھر بیٹے!“ کانسٹیبل نے نرمی سے پوچھا۔

گوپی نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی نظروں کے سامنے اپنے باپ کا ہاتھ گھومنے لگا جس کی آستینیں چڑھی ہوئی تھیں۔ وہ خود کو چند لمحوں کے بعد رونما ہونے والے دردناک سانحے کو ذہنی طور پر تیار کرنے لگا۔ ابھی سے اس کا ماتھا گھومنے اور خون رگوں میں خشک ہونے لگا۔ کانسٹیبل نے دروازے پر بڑی شائستگی سے دستک دی۔ گوپی نے آنکھیں بند کرلیں۔ لیکن اپنی ماں کی آواز سن کر اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ وہ گھر میں ابھی تک موجود تھی۔ یہ کوئی نئی اور حیرت کی بات نہ تھی۔ کیوں کہ اکثر ایسا ہوتا تھا۔ اس کی ماں کبھی کبھار یا پھر بلاوجہ دیر سے کام پر جاتی تھی۔ اسے دفتر میں کبھی کبھار دیر سے آنے پر سرزنش نہیں ہوتی تھی۔

گوپی کو ایک کانسٹیبل کے ساتھ دیکھ کر اس کی ماں کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ خوف اس کی آنکھوں سے جھانکنے لگا۔ اس کی حیرت پر خوف غالب تھا...... اس نے سوچا۔ کیا گوپی سے ایسا کوئی جرم سرزد ہوا ہے جو پولیس گھر کے دروازے تک آئی ہے......؟

”ڈرنے کی ضرورت نہیں شریمتی جی......!“ کانسٹیبل نے رادھا کا زرد چہرہ اور خوف زدہ آنکھیں دیکھ کر مسکراتے ہوئے اسے دلاسا دیا۔ ”آپ کا لڑکا پولیس اسٹیشن آیا تھا۔ اس نے ہمیں ایک خوفناک ہارر کہانی سنائی تھی۔ انسپکٹر صاحب نے اس خیال سے اسے میرے ہمراہ گھر پہنچانے کے لئے بھیجا ہے کہ کہیں یہ راستہ نہ بھول جائے۔“

”ایں......“ رادھا کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ ”گوپی......! تم......تم پولیس اسٹیشن گئے تھے......تم نے پولیس کو بھی جھوٹی کہانی سنا کر پریشان کیا۔ انہیں تکلیف بھی دی کہ وہ تمہیں یہاں پہنچادیں۔“

”کیا یہ اکثر ایسی حرکتیں کرتا ہے؟“ کانسٹیبل سدھیر نے حیرت سے سوال کیا۔

”یہ ہر وقت لوگوں کو سنسنی پھیلانے اور خوف زدہ کرنے کے لئے جھوٹی کہانیاں گھڑتا ہے۔“ رادھا نے پریشان ہوتے ہوئے جواب دیا۔ ”لیکن آج یہ پہلی بار پولیس اسٹیشن گیا۔ یقین نہیں آتا کہ یہ پولیس کو بھی پریشان کرنے چلا گیا۔“

”شریمتی جی...... میرا ایک مخلصانہ مشورہ مانیں۔“ کانسٹیبل نے ہمدردی کے لہجے میں کہا۔ ”آپ فوراً کسی اچھے ڈاکٹر سے اس کا علاج کروائیں تاکہ ابھی سے اس کی ان حرکتوں کا سدباب کیا جاسکے۔ آگے چل کر آپ کو بہت مشکل ہوجائے گی۔“

چھٹی منزل کی سیڑھیوں پر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ گوپال اور اس کی ماں نے اوپر کی طرف دیکھا۔ اوپر والی فلیٹ میں رہنے والی عورت کانتا نے تعجب بھری نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ اس وقت وہ پرسکون تھی۔ گوپی کے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ گزشتہ شب والی عورت سے وہ یکسر مختلف نظر آرہی تھی۔ گوپی کو یقین نہیں آیا۔

”اچھا اب مجھے اجازت دیجئے۔“ کانسٹیبل نے سر سے ٹوپی اتار کر ہاتھ سے پسینہ پونچھا۔ پھر ٹوپی سر پر جمالی۔ پھر وہ سیڑھیاں اتر گیا۔

”اندر چلو ماں......! جلدی کرو......“ گوپی نے دہشت زدہ لہجے میں کہا۔ وہ اپنی ماں کو ہٹا کر اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگا۔

”نہیں گوپی......!“ اس کی ماں نے گوپی کا کندھا بڑی مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ”اب وہ سامنے آگئی ہیں۔ چلو

...ے معافی مانگو۔“

گوپی نے کاندھا چھڑانے کی کوشش کی لیکن اس کی ماں کی گرفت اور مضبوط ہوگئی۔ اوپر رہنے والی عورت سیڑھیاں اتر کر زینے پر آگئی تھی۔ وہ دوستانہ انداز سے مسکراتی ہوئی ان کے قریب آگئی۔ گوپی کا خون اس کی رگوں میں منجمد ہوگیا۔

”کیا بات ہے......؟ کوئی گڑبڑ ہے؟“ کانتا نے بڑی مٹھاس سے پوچھا۔

”نہیں......نہیں......ایسی کوئی بات نہیں......کوئی گڑبڑ نہیں ہے۔“ اس کی ماں نے معذرت خواہانہ لہجے میں جواب دیا۔

”میں نے ابھی ایک پولیس والے کو کھڑے دیکھا تھا۔“ کانتا نے کہا۔ ”اس نے کیا حرکت کی جو آپ کے بچے کے ساتھ آیا تھا۔“

”یہ لڑکا بہت شیطان ہوگیا ہے۔ ایسی شرارتیں کرتا رہتا ہے۔ جنہیں معاف نہیں کیا جاسکتا...... چلو گوپی!“ اس کی ماں نے اسے بری طرح جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ ”میں کیا کہہ رہی ہوں تم نے سنا نہیں...... چلو ان سے معافی مانگو......“

”کتنا پیارا، معصوم اور سیدھا سادا بچہ نظر آتا ہے...... کیا شرارت کردی؟“ کانتا نے اس کے سر کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

”شرارت......؟ اسے شرارت کہیں گے......؟ پہلے یہ جھوٹی کہانیاں گھڑتا ہے۔ پھر انہیں دوسروں سے منسوب کرکے ہمیں سناتا ہے۔ اس کا ردعمل دیکھنے اور اسے سچ مان لینے کے لئے...... لیکن اب یہ نئی حرکت کی ہے جو ناقابل برداشت ہوگئی ہے۔ اب یہ پڑوسیوں کے بارے میں جھوٹی کہانیاں گھڑنے اور ہانکنے لگا ہے...... آج سے اس نے ایک نئی حرکت کی ہے۔ وہ پولیس کو پریشان کرنے لگا ہے۔ اس نے انہیں جا کر جھوٹی کہانیاں سنائی ہیں۔ پولیس افسر کوئی شریف آدمی تھا۔ اس نے نصیحت کرکے اور سمجھا کر کانسٹیبل کے ہاتھ بھیج دیا۔ یہ زیادہ اچھا ہوتا اگر وہ اسے کچھ دنوں کے لئے حوالات میں بند کردیتا...... اس نے پولیس اسٹیشن جانے کی جو حرکت کی ہے وہ اس پر صبر نہیں کرے گا۔ وہ انہیں الٹی سیدھی باتیں بتائے گا۔ آخر پولیس بھی کب تک برداشت کرے گی۔ ہم بھی اس کے ساتھ مشکل میں پڑ جائیں گے۔ اس طرح ہمارا چین وسکون غارت ہوکر رہ جائے گا۔ ہمارا جینا بھی حرام ہوجائے گا...... ابھی اس کانسٹیبل نے مشورہ دیا ہے کہ ہم اس کا طبی معائنہ کرائیں...... لیکن میں اس کے باپ سے کہوں گی کہ وہ اسے کسی ماہر نفسیات کے پاس لے جا کر اس کا معائنہ کروائیں۔“

وہ اس طرح بولتی چلی گئی تھی جیسے فرفر اپنا سبق سنا رہی ہو۔

عورت کی نگاہیں گوپی کے چہرے پر مرکوز ہوگئیں۔ وہ پرخیال نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے کچھ سوچنے لگی۔ پھر اس کے بدن کو ہلکا سا جھٹکا لگا۔ اس نے بہت غور سے گوپی کو دیکھا۔ ان آنکھوں میں شک کی کیفیت ختم ہوگئی تھی۔ وہاں یقین کی قوت جھلک رہی تھی...... وہ شاید چند لمحے پہلے اس سفید کمبل کے بارے میں سوچ رہی تھی جو گزشتہ شب اس کی خواب گاہ کی کھڑکی سے باہر آہنی کھڑکی پر سوکھ رہا تھا۔

یا پھر شاید وہ اس سیلز مین کے بارے میں سوچ رہی تھی جو آج صبح برتی ریزر فروخت کرنے کے بہانے فلیٹ میں اندر داخل ہوگیا تھا...... پھر اس نے محسوس کیا تھا کہ گہری نظروں سے ایک ایک چیز کا اس طرح جائزہ لے رہا تھا جیسے آثار قدیمہ والے کھدائی سے برآمد ہونے والی چیزوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ سیلز مین بھی عجیب قسم کا آدمی تھا...... ادھر ادھر کی باتیں زیادہ کرتا رہا تھا اور غیر متعلق سوالات کی بوچھار کررہا تھا۔ اس کی ان باتوں سے اسے ایسا لگا تھا کہ سیلز مین کو برتی ریزر فروخت کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ اسے وہ کوئی نیم پاگل سا لگا تھا۔ اس کی ہر بات اور انداز خطرناک سا محسوس ہوا تھا۔

گوپی کو عورت کی سرد نظریں اپنے بدن میں گھستی محسوس ہورہی تھیں۔ تیز اور نوکیلی سوئیوں کی طرح...... وہ نظریں اتنی سرد تھیں کہ اس کی ہڈیوں کا گودا جمنے لگا۔ اور پھر

اسے ایسا لگا تھا کہ اس عورت کی نظریں جیسے اس کے آر پار دیکھ رہی ہوں...... اور اس نے یہ بات بھی محسوس کی تھی کہ وہ عورت جیسے موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے ہو۔ اسے کسی بات کا ڈر اور خوف نہیں ہے۔ قتل جیسے سنگین جرم کا...... کیا قاتل اس قدر پرسکون ہوتے ہیں۔ ان کا ضمیر نہیں ہوتا ہے۔ وہ قانون اور بھگوان سے بھی نہیں ڈرتے ہیں......؟ کیا یہ وحشی درندے ہوتے ہیں......؟ انسان کو قتل کرنے کے بعد پتھر دل بن جاتے ہیں؟ اس کا ننھا ذہن جذباتی ہو رہا تھا۔

پھر اس عورت کے سرخی سے لتھڑے ہوئے ہونٹ مسکرائے۔ لیکن آنکھیں ہونٹوں کا ساتھ نہیں دے رہی تھیں۔ وہ تو گوپی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ موت کی طرح تاریک، سرد اور گہری تھیں اور اس کا چہرہ اس طرح پڑھ رہی تھی جیسے وہ کتاب ہو۔

"یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس عمر کے لڑکے ہمیشہ ایسی حرکتیں کرتے ہیں۔ کیوں کہ کچی عمر اور کچے ذہن کے ہوتے ہیں۔" اس نے گوپی کے سر کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ وہ اس کے سر پر ہاتھ پھیرنا چاہتی تھی اور ساتھ ساتھ اس کی پشت بھی تھپ تھپانا چاہتی تھی۔ گوپی کو ایسا لگا کہ یہ ہاتھ انسانی خون سے رنگا ہوا اور کسی زہریلے سانپ کی طرح ہے جو اسے ڈس لینا چاہتا ہے۔ گوپی ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا۔ اس کا چہرہ سپید پڑا ہوا تھا۔ آنکھیں دہشت سے پھٹی ہوئی تھیں۔

عورت کا ہاتھ جو اٹھا ہوا تھا وہ کسی ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح گر گیا۔ اسے اپنی سبکی کا احساس ہوا۔ وہ اپنی جھینپ مٹانے کے لئے پلٹ کر واپس چل دی۔ لیکن اب اس کا رخ نیچے نہیں تھا۔ وہ واپس اوپر اپنے فلیٹ میں جا رہی تھی۔

"بھولنے کی عادت بہت بری ہے۔" وہ بلند آواز سے بڑبڑاتی جا رہی تھی۔ "مجھے جو خط سپرد ڈاک کرنا تھا وہ تو میں لانا ہی بھول گئی۔"

گوپی نے اس عورت کی یہ بڑبڑاہٹ سنی...... اس کی ماں نے بھی سنی...... اس کی ماں مسکرا دی۔ وہ بھی بڑبڑائی۔ "ہاں...... ایسا ہوتا ہے ہر شخص میں یہ عادت ہوتی ہے......؟ مجھ میں بھی تو ہے۔" لیکن گوپی کا دل ٹھنڈا ہو گیا۔

☆......☆......☆

یہ عورت جو کسی کام سے نیچے جا رہی تھی اس نے دانستہ اپنا ارادہ فوری طور پر ملتوی کر دیا تھا۔ وہ کسی ضروری کام سے جا رہی تھی۔ لیکن اب کوئی بھی ضروری اور اہم کام اس کے نزدیک نہیں رہا تھا۔ اس کام کے مقابلے میں جو وہ کرنا چاہتی تھی۔ جو اسے اب ابھی اسی وقت ہر قیمت پر کرنا تھا۔ اس نے سوچا۔ اچھا ہوا جو اس وقت اس کی مڈبھیڑ اس لڑکے سے ہو گئی۔ اگر سامنا نہ ہوتا تو کتنا برا ہوتا......؟ وہ اندھیرے میں رہتی...... غلط فہمی میں مبتلا رہتے...... نہ صرف وہ بلکہ اس کا پتی بھی کہ معاملہ دب گیا۔ پولیس ساری زندگی اس قتل کا سراغ نہیں لگا سکتی۔ وہ اور اس کا پتی اس لئے مطمئن تھے کہ اس قتل کی ہوا کسی کو نہیں لگی۔ انہوں نے ایسا کوئی نام و نشان اور سراغ نہیں چھوڑا کہ قانون کے ہاتھ پہنچ سکیں...... اس کے شوہر نے اس سے رات متعدد بار کہا تھا کہ ایک نہیں نہ جانے کتنے قتل ایسے ہوتے ہیں جن کے قاتل پکڑے نہیں گئے۔ لیکن اب تو اس کا سکون اور اطمینان غارت ہو گیا تھا۔ اسے اپنی نظروں کے سامنے قانون کا فولادی ہاتھ دکھائی دے رہا تھا...... جرم کبھی بھی نہیں چھپتا...... اس نے سنا تھا۔ اس بات نے اس کے پتی کی ہر بات غلط کر دی تھی۔

وہ فوری طور پر اس معاملے کی اطلاع اپنے شوہر کو دینا چاہتی تھی۔ جس نے گزشتہ شب چاقو کے پے در پے وار کر کے ایک آدمی کو قتل کیا تھا۔ وہ اپنے شوہر سے یہ بھی کہنا چاہتی تھی کہ چوبیس گھنٹے بھی نہیں گزرے...... بلکہ اس کے اندر اندر اس کا جرم عیاں ہو گیا۔

وہ ایک لمحہ ضائع کئے بغیر یہ خبر اپنے شوہر تک پہنچانا چاہتی تھی کہ اس واردات کا ایک عینی گواہ ہے۔

عینی گواہ......؟ اس کے سارے بدن میں لہو خشک ہو رہا تھا...... ایک بارہ برس کا نوعمر لڑکا ہوا تو کیا ہوا...... نابالغ...... قانون اس کی گواہی کو تسلیم کرے گا......؟

...ے یا نہ کرے......؟ لیکن سانپ کا بچہ سنپولیا ہوتا ہے۔ اس سنپولئے کا سر کچل دینا چاہئے...... اس لئے کہ وہ زہریلا ہے۔ ڈس سکتا ہے...... اس لئے وہ جتنا جلد ہو سکے شوہر سے رابطہ کر کے اس صورت حال سے آگاہ کرنا چاہتی تھی کہ وہ فوری طور پر اسے قتل کرنے کا کوئی منصوبہ بنا لیں...... گو کہ اس سنپولئے کے والدین اور پولیس نے اس کی کسی بات اور جو کہانی سنائی اس کا یقین نہیں کیا...... اس موذی کو ایک گھنٹہ بھی زندہ رہنے دیا موت کو دعوت دینے کے مترادف ہے......

گوپی کو اس بات کا علم تھا کہ جب تک وہ زندہ ہے وہ عورت اور اس کا شوہر خود کو کبھی محفوظ نہیں سمجھیں گے۔ وہ دس برس کی عمر سے فلمیں دیکھتا آ رہا تھا۔ اسے رومانی فلموں کے مقابلے میں انگریزی کی جاسوسی فلمیں بہت پسند تھیں۔ ہارر فلمیں بھی شوق سے دیکھتا تھا۔ اسے ہندوستانی اور اپنے ملک کی فلمیں پسند نہیں آتی تھیں۔ جب کہ اس کے لوگ ہندوستانی فلمیں بڑے ذوق و شوق سے دیکھتے تھے۔ اس کے نہ دیکھنے کی وجہ یہ تھی کہ ان فلموں کی کہانی یکساں، سپاٹ اور بے جان ہوتی تھی۔ لچر اور بے ہودہ مناظر اور ڈانس ہوتے تھے۔ جب کہ انگریزی فلموں کی کہانیوں میں نیا پن ہوتا تھا۔ خصوصاً جاسوسی اور ہارر فلمیں اس لئے پسند آتی تھیں ان میں ایک نیا پن اور سسپنس ہوتا تھا۔ جاسوسی فلموں سے اس نے بہت سارا قانون اور بہت ساری باتیں جان لی تھیں۔ اس کی علمیت سے اس کی عمر سے پانچ سات برس بڑے دوست متاثر تھے۔ اسے استاد کہتے تھے۔ اس نے بہت سی جاسوسی فلموں میں دیکھا تھا کہ مجرم اپنے قتل کا ہر ثبوت مٹانے کے لئے سب سے پہلے چشم دید گواہوں کو قتل کر دیتے تھے کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری...... وہ کسی پر ترس نہیں کھاتے تھے۔ چاہے وہ نوعمر لڑکا ہو۔ عورت اور مرد ہی کیوں نہ ہو۔ کیوں کہ چشم دید گواہ کے زندہ رہنے سے ان کا جرم چھپا نہیں رہ سکتا تھا اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے خلاف بیان دینے والا زندہ رہے۔ کئی فلموں میں گواہ مجرموں کی گرفت سے بچ گئے تھے اور عدالت میں ان کی گواہی سے مجرموں کو عدالت نے سزائے موت دی تھی۔

مقتول سے اس کا کوئی رشتہ اور سمبندھ نہ تھا۔ صرف ایک انسانی رشتہ تھا۔ اسے بے گناہ قتل کیا گیا تھا۔ اس لئے وہ مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچا کر دم لینا چاہتا تھا۔ لیکن کوئی اس کی بات سننا اور اس پر یقین کرنے کو تیار نہ تھا۔

پڑوسن اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو اس کی ماں کا rvuh بھی یک سر بدل گیا۔ اس نے گوپی کی کلائی پکڑی اور اسے کسی جانور کی طرح بے رحمی سے گھسیٹتی ہوئی اندر لے گئی۔ باہر کا دروازہ بند کر دیا۔

"ماں......! یہ تم نے کیا کیا...... کیا کر دیا ماں......!" گوپی نے کہا۔ "اب اسے معلوم ہو گیا کہ ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے۔"

اس کی ماں نے اسے کمرے میں دھکیل دیا اور خواب گاہ سے چابی لینے چلی گئی جو اس کے شوہر کے تکیے کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔ پھر وہ آ کر بولی۔ "پہلے میرا ارادہ تھا کہ دفتر جانے سے پہلے تمہیں آزاد کر کے جاؤں۔" اس نے کمرے کا دروازہ مقفل کرنے سے پہلے کہا۔ "لیکن اب تمہیں رات تک یہیں رہنا پڑے گا۔ تمہارے پتا جی ہی دروازہ کھولیں گے۔"

گوپی نے اپنی ماں کا کوئی جملہ سنا نہیں...... اس کا ذہن گول دائرے میں بڑی تیزی سے گھوم رہا تھا۔ وہ خوف زدہ لہجے میں بولا۔

"اب انہیں پتا چل گیا ہے...... اب وہ مجھے کسی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑیں گے۔"

چند لمحوں کے بعد اسے فلیٹ کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ اس کی ماں کام پر چلی گئی تھی۔ اب وہ فلیٹ میں اپنے پتا جی کے ساتھ تنہا رہ گیا تھا۔ ان کے خراٹے لینے کی آواز اسے اپنے کمرے میں بھی سنائی دے رہی تھی۔ وہ چپ چاپ بستر پر دراز ہو کر صورت حال کا جائزہ لینے لگا۔ اس لئے بھی کہ خطرے کی گھنٹی بج چکی تھی۔

جب تک اس کے پتا جی فلیٹ میں موجود تھے وہ

مجرموں کی دست برد سے محفوظ تھا۔ اس کی جان کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ لیکن جب شام کو اس کے پتا جی اپنی ڈیوٹی پر چلے جائیں گے تو حقیقی خطرہ لاحق، جب اس کی ماں کھانا کھا کر سو جائے گی۔ اب اسے سوچنا تھا کہ رات اسے کیا کرنا ہوگا۔ ان تمام باتوں کے پیش نظر اس نے دوبارہ ہنگامی سیڑھیوں کے ذریعے کمرے سے فرار ہونے کی کوشش نہیں کی۔

☆......☆......☆

گرمیوں کا تپتا ہوا دن ڈھلنے لگا۔ سورج مغرب کی وادی کی طرف جھکنے لگا۔ اس کے ساتھ ساتھ گوپی پر خوف و ہراس بڑھتا گیا۔ اس پر ایسی دہشت مسلط ہوگئی تھی کہ اس احساس سے نکلنے کی ایسی کوئی صورت اور کوئی تدبیر نظر نہیں آتی تھی جس سے خود پر قابو پا سکے۔ رات ہونے والی تھی۔ رات اس کی دشمن تھی۔ ایک عفریت تھی۔ اس قاتل کی طرح جس نے ایک آدمی کا خون کیا تھا۔ اس کی بے بسی کی حالت یہ تھی کہ وہ کسی سے بھی مدد طلب نہیں کرسکتا تھا۔ اس کی ماں اسے جھوٹا سمجھتی تھی۔ اس کے پتا جی بھی ماں سے بڑھ کر جھوٹا جانتے تھے۔ یہاں تک کہ پولیس نے بھی اس کی کسی بات کا یقین نہیں کیا تھا۔ جب کہ اسے بڑا اعتماد تھا کہ پولیس اس کی بات پر یقین کر کے کارروائی کرے گی۔ لیکن وہ پولیس اسٹیشن سچ کی جنگ ہار گیا تھا۔ جب اس کے والدین اسے جھوٹا سمجھ رہے تھے تو کسی غیر سے کیا توقع رکھی جاسکتی تھی کہ وہ اس کی بات پر یقین کرے گا۔ پولیس کا رویہ اس کے سامنے تھا۔ وہ کس طرح اس تلخ تجربے کو بھول سکتا تھا۔ جس نے اس کی اپنی جان خطرے میں ڈال دی تھی۔ موت کا فرشتہ جیسے اس کے سامنے کھڑا قہقہہ لگا رہا تھا۔

کیا پولیس کا یہ فرض نہیں ہے کہ وہ بے گناہوں کی حفاظت کرے اور مجرموں کو گرفتار کرے۔ پھر جب پولیس ہی مدد کرنے پر تیار نہ ہو تو پھر کوئی کیا کرسکتا ہے......؟ کس طرح سفاک اور درندہ صفت قاتلوں کا مقابلہ کرسکتا ہے......؟ کیا اسے خود کو دشمن کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا چاہئے......؟ مرنے کے لئے تیار ہو جانا چاہئے؟

اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں۔ وہ کسی بھی طرح ان بڑے آدمیوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا جو ہر قیمت پر اسے قتل کرنے کی کوشش کریں گے۔ گوپی کے دل کے کسی کونے میں بڑی شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ مجرم اسے قتل کردیں...... اسے جان سے مار دیں تاکہ ساری دنیا...... اس کی ماں کو...... اس کے پتا جی کو...... پولیس کو...... سب کو پتا چل جائے کہ وہ جھوٹ نہیں بول رہا تھا...... وہ سچا تھا...... وہ سچ کی جنگ لڑ رہا تھا...... اور پھر سب اپنی غلطی پر کسی طرح دہاڑیں مار مار کر روئیں گے...... پھر اس کی آتما یہ سب کچھ دیکھے گی کہ...... وہ لوگ کہیں گے کہ ہم نے گوپی کو قتل کیا ہے...... اگر ہم گوپی کی بات کا یقین کر لیتے قتل کے مجرم بھی گرفتار ہو جاتے...... گوپال زندہ رہتا...... گوپی عظیم انسان تھا...... وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے امر ہوگیا...... اس نے سچ بولنے کی خاطر اپنی قیمتی جان کی بھینٹ چڑھادی...... لیکن اس نے جھوٹ نہیں بولا۔ سچائی کے راستے پر ثابت قدم رہا۔

اس کی ماں تو یہ صدمہ اور دکھ برداشت نہ کرسکے گی۔ وہ مر جائے گی یا خودکشی کرلے گی...... کیوں کہ وہ اسے بے انتہا چاہتی ہے۔ وہ اکلوتی اولاد جو تھا۔ ماں کو لڑکے سے بہت پیار ہوتا ہے۔ وہ اس کے مستقبل کی خاطر تو ملازمت کر رہی تھی۔ ایک مخصوص رقم ہر ماہ بینک میں جمع کرتی رہتی ہے تاکہ اس کی اعلیٰ تعلیم پر خرچ کرے۔ وہ اسے ڈاکٹر بنانا چاہتی ہے جس پر بہت خرچ آتا ہے...... اگر اس کی ماں اس کی جدائی کا غم سہہ نہ سکی اور مر گئی تو...... ماں کی موت کے خیال سے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ بہت دیر تک سسکیاں لے کر روتا رہا۔ وہ زندگی میں کبھی کسی بات پر اتنا رویا نہیں تھا۔

جب دن ڈوب گیا اور اندھیرا پھیل گیا۔ تب اس کی ماں کام سے واپس آگئی۔ کپڑے بدل کر باورچی خانے میں رات کا کھانا تیار کرنے لگی۔ پھر اس نے آواز دے کر اس کے پتا جی کو جگایا۔ وہ ڈیوٹی پر جانے کی تیاریاں کرنے لگے۔ جب کھانا تیار ہوا اور میز پر چن دیا گیا تب اس نے قفل میں چابی گھومنے کی آواز سنی۔ جب

دروازہ کھلا تو وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔ اس کے پتا جی نے اسے باہر آنے کا اشارہ کیا۔

”اب تو تم آئندہ کبھی بھی جھوٹ نہیں بولو گے؟“ انہوں نے تیز لہجے میں پوچھا۔

گوپی نے بڑی فرماں برداری سے سر ہلا دیا۔ اس کے سوا چارہ بھی نہیں تھا۔

”چلو...... چل کر کھانا کھاؤ۔“ اس کے پتا جی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

پھر وہ تینوں کھانے کی میز پر بیٹھ گئے۔ گوپی کو بڑے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ کیوں کہ وہ صبح سے بھوکا تھا۔ وہ غیر محسوس انداز سے کھانے پر ٹوٹ پڑا تھا۔ کھانا کھاتے وقت اسے بار بار صبح کے واقعے کا خیال آرہا تھا۔ وہ دل میں ڈر رہا تھا کہ کہیں اس کی ماں اس کا ذکر نہ کردے۔ لیکن جب ان کے درمیان رسمی باتوں کا سلسلہ چل پڑا تو اس نے اطمینان کا گہرا سانس لیا کہ بلا ٹلی۔ لیکن اچانک اس کی ماں سے بے دھیانی میں ایک ایسا فقرہ نکل گیا جس نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ کسی بات پر اس کی ماں نے کہا تھا کہ وہ جس کمپنی میں ملازم ہے آج اس کے منیجر نے دیر سے آنے پر بڑی سختی سے باز پرس کی تھی۔

”کیوں......؟ تمہیں دیر کس لئے ہوئی۔“ اس کے پتا جی نے اس کی ماں سے حیرت سے کہا۔ ”تم تو وقت پر تیار ہوگئی تھیں؟“

میں تو تیار ہوگئی تھی...... تمہارے جانے کے بعد نکلتی تو زیادہ سے زیادہ پچیس تیس منٹ کی تاخیر ہو جاتی۔ اتنی تاخیر پر منیجر کچھ نہیں کہتا۔ لیکن ڈیڑھ گھنٹے کی جو تاخیر ہوئی اس نے منیجر کو برہم کردیا تھا۔“ اس نے بتایا۔

”ڈیڑھ گھنٹے کی تاخیر......؟ وہ کس لئے؟“ اس کے پتا جی بولے۔ ”میرا خیال ہے کہ تم کبھی اتنی دیر سے دفتر نہیں پہنچیں......؟“

”ہاں...... کیا کرتی...... اس کانسٹیبل سے گفتگو کرنے میں جو صبح یہاں......“

رادھا اچانک خاموش ہوگئی۔ کیوں کہ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوگیا تھا۔ لیکن اب کیا ہوسکتا تھا۔ دیر ہو چکی تھی۔ کمان سے نکلا تیر واپس نہیں آسکتا تھا۔ گوپی جانتا تھا کہ اس کی ماں کبھی جھوٹ نہیں بولتی ہے۔ اس لئے اب اس کے پتا جی کو سب کچھ پتا چل جائے گا۔

”کون کانسٹیبل......؟“ اس کے پتا جی نے ایک دم سے چونک کر اس کی ماں کی شکل دیکھی۔ پھر وہ تیز لہجے میں بولے۔ ”وہ کس لئے یہاں آیا تھا......؟ پولیس کا یہاں کام تھا......؟“

تب اس کی ماں کو قدرے پس و پیش سے ساری بات اگلنی پڑی۔

پھر اس کے پتا جی کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا۔ انہوں نے اس کا گریبان پکڑ کر ایک جھٹکے سے اس کو کھڑا کردیا۔

”نریش پلیز!“ رادھا نے التجا بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اسے کھانا تو کھانے دو۔ اس نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا ہے۔“

”آج صبح ہی تو میں نے تمہاری دھنائی کی تھی...... آج تم کتنی بار میرے ہاتھ سے پٹو گے...... ایسا لگتا ہے کہ تمہیں پٹنے کا بہت شوق ہو رہا ہے۔“ اس کے پتا جی آپے سے باہر ہو رہے تھے۔ ”تم اس قدر ڈھیٹ اور بے شرم ہوگئے ہو۔“

وہ اسے اس طرح کمرے کی طرف گھسیٹنے لگے جیسے وہ کوئی جانور ہو۔ پھر انہوں نے اسے چھوڑ کر آستینیں چڑھالیں۔ اس وقت غصے کی حالت میں انہیں خیال نہیں رہا کہ کسی نے دروازے پر دستک دی ہے۔ جب انہوں نے اسے دوبارہ پکڑا تو دوسری دستک ہوئی۔ انہوں نے گوپی کو چھوڑ دیا اور دروازے کی طرف بڑھے۔ ان کا خیال تھا کہ پڑوسی گوپی کی شکایت کرنے آیا ہوگا۔ وہ دل میں خجل ہوگئے تھے۔ جب وہ چند لمحوں کے بعد واپس آئے تو ان کا چہرہ سوالیہ نشان بنا ہوا تھا۔

”ایک ٹیلی گرام آیا ہے۔“ اس کے پتا جی نے اس کی ماں سے کہا۔

”ٹیلی گرام......؟ کیسا ٹیلی گرام......؟ کیا آپ کے نام آیا ہے؟“

"میرے نہیں تمہارے نام......!" انہوں نے ٹیلی گرام اس کی طرف بڑھادیا۔

"میرے نام......؟" ایک لمحہ کے لئے رادھا کا چہرہ زرد پڑ گیا۔ "او بھگوان...... خیریت ہو۔"

پھر رادھا نے کانپتی ہوئی انگلیوں سے لفافہ پھاڑا اور اندر سے ٹیلی گرام نکال کر جلدی جلدی اس پر نظر ڈالی، پھر اس کا چہرہ سفید پڑتا چلا گیا۔ جیسے کوئی بری خبر آئی ہو۔

"کیا بات ہے؟" پتا جی بولے۔ "یہ کس کا ٹیلی گرام ہے؟ خیریت تو ہے؟"

"خیریت ہی نہیں ہے۔" رادھا نے پریشان کن لہجے میں جواب دیا۔ "آنٹی اوما کا ٹیلی گرام ہے۔ مجھے فوراً بلایا ہے۔ انہوں نے اس کی کوئی وجہ نہیں لکھی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ ٹیلی گرام ملتے ہی فوراً روانہ ہو جاؤ۔"

اوما اس کی خالہ کا نام تھا جو ماتلے میں رہتی تھیں۔

"معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری بہن کے دونوں بچے ایک ساتھ شدید بیمار ہو گئے ہیں۔" اس کے پتا جی نے فوراً تبصرہ کیا۔ "آج کل ایک وائرس پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے جو بچوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہا ہے۔"

"میرے خیال میں وہ خود بیمار ہو گئی ہے۔" گوپی کی ماں نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ "بچے بیمار ہونے سے وہ بلاتی نہیں...... کاش اس کے ہاں ٹیلی فون ہوتا...... اس کے پڑوس میں بھی تو کسی کے ہاں فون نہیں ہے۔ ورنہ تو گھر جا کر فون کر کے معلوم کر لیتی کہ اس نے کیوں اور کس لئے فوراً بلایا ہے۔"

پھر اس کی ماں فوراً جانے کے لئے تیاریاں کرنے لگی۔

"مت جاؤ ماں...... پلیز مت جاؤ۔" گوپی نے دہشت زدہ ہو کر التجا کی۔ "یہ ان لوگوں کی چال ہے۔"

"کیسی چال......؟" اس کی ماں نے اسے تیز نظروں سے گھورا۔ "یہ ٹیلی گرام دیکھ رہے ہو؟"

"وہ آپ کو یہاں سے ہٹانا چاہتے ہیں تاکہ میں گھر میں اکیلا رہ جاؤں۔" گوپی کو انگریزی جاسوسی فلموں کی کہانیاں یاد آ گئیں۔ قاتل ایسے ہی حربے استعمال کرتے تھے۔ "پھر وہ مجھے جان سے مار دیں۔ ختم کر دیں...... رک جاؤ ماں...... بھگوان کے لئے نہ جاؤ۔ میں آپ کی بنتی کرتا ہوں۔"

"خاموش...... اپنی بکواس بند کرو۔" اس کے پتا جی کرخت لہجے میں بولے۔ "یہ تم کسی جاسوس کی طرح بات کر رہے ہو...... تمہارا دماغ تو میں ابھی درست کرتا ہوں۔" پھر وہ رادھا کی طرف گھوم کر بولے۔ "رادھا اس کی بات پر کان نہ دھرو۔ تم تیاری کرو۔ تمہیں وہاں پہنچنے میں آدھی رات ہو جائے گی۔ آخری بس جانے میں ابھی وقت ہے۔ جلدی سے بس ٹرمینل پہنچو......"

"گوپی...... مجھے جانے سے روک رہا ہے۔ اس کا کیا کریں......؟ کیا اسے رات گھر پر اکیلا چھوڑ دیں؟" رادھا نے فکرمندی سے کہا۔

"تم اس کی چنتا نہ کرو۔" اس کے پتا جی نے اس کی ماں کو دلاسا دیا۔ "مجھے چند کیلیں اور ہتھوڑے دے دو۔ میں کھڑکی بند کر دوں گا۔ پھر دیکھتا ہوں یہ کیسے نکلتا ہے کھڑکی سے...... تم اندر چلو گوپی!" انہوں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

اس کے پتا جی نے کیلیں جڑ کر کھڑکی بند کر دی۔ اب گوپی کھڑکی نہیں کھول سکتا تھا۔ پھر وہ اس سے طنزیہ لہجے میں بولے۔

"اب تم اپنی رام کہانی دیواروں کو مزے لے لے کر سناتے رہنا...... ان کے ساتھ جتنی بکواس کر سکتے ہو کرتے رہنا...... یہ سن لیں گے پھر کچھ نہیں کہیں گے۔ جب تھک جاؤ گے تو پھر سو جانا۔ بہت اچھی نیند آ جائے گی۔"

اس کی ماں نے آنسو پیتے ہوئے بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"گوپی......! میرے لال...... بھگوان کے لئے اپنی یہ حرکتیں چھوڑ دو۔ اب تم بڑے ہو رہے ہو۔"

پھر رادھا نے اس کے ماتھے اور رخسار پر بوسہ ثبت کیا۔ پھر اپنا سفری تھیلا اٹھا کر نکل گئی۔

اب اس کا ایک محافظ رہ گیا وہ اس کے پتا جی تھے لیکن اس وقت وہ اس کے دشمن بنے ہوئے تھے۔

"پتا جی......! پلیز...... مجھے اکیلا نہ چھوڑیں۔ وہ قاتل ہیں۔ انہوں نے اپنے ہاتھ سے ایک انسان کی جان لی ہے۔ انہوں نے ایک جھوٹا ٹیلی گرام بھیج کر ممی کو راستے سے ہٹایا ہے۔ تار گھر جا کر صرف دس روپے کلرک کو دے دیں کہ وہ جھوٹا ٹیلی گرام فوراً بھیج دیں۔ بھیج دیں گے...... آپ مجھے ساتھ لے جائیں۔ میں یہاں اکیلا نہیں رہوں گا۔ میں وعدہ کرتا ہوں کہ آپ کو بالکل تنگ نہیں کروں گا۔ ماں کو بھی ذرا پریشان نہیں کروں گا۔ آپ میری بات کا یقین کریں۔"

"ابھی تمہارے دماغ سے بھوسہ نہیں نکلا۔ یہ جاسوسی فلموں میں، کہانیوں میں جھوٹے ٹیلی گراموں کے بارے میں بتایا جاتا ہے۔" وہ بگڑ کر برہمی سے بولی۔ "ٹھیک ہے...... صبح ڈیوٹی سے آ کر ناشتا کرنے کے لئے تمہیں چھٹی دوں گا۔ پھر تمہیں کسی ڈاکٹر کے پاس لے جاؤں گا۔ فی الحال تم یہاں آرام کرو۔ میں کام پر جا رہا ہوں۔ میرا وقت ہو رہا ہے۔"

انہوں نے کمرے سے باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

"پتا جی......! پتا جی...... دروازہ بند مت کریں۔ پلیز......! میری بات سنیں۔ وہ مجھے مار ڈالیں گے...... دروازہ بند ہو جائے گا تو میں ان سے کیسے اپنی جان بچاؤں گا...... پلیز پتا جی...... آپ میری بات سنتے کیوں نہیں ہیں سمجھتے کیوں نہیں ہیں؟"

اس نے دروازے کا لٹو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کی پتا جی کی قوت کے آگے ایک نہ چلی۔ انہوں نے دروازہ بند کر دیا۔ پھر دوسرے لمحے گوپی کو قفل میں چابی گھومنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے بڑی حسرت بھری نظروں سے دروازے کو دیکھا۔

"گوپی......! تمہیں آزاد نہیں چھوڑا جا سکتا۔ کیوں کہ تم اپنی حرکتوں سے باز نہیں آؤ گے۔ تم پر بھروسا نہیں کیا جا سکتا۔ میں جانتا...... ہوں تم پھر پولیس اسٹیشن چلے جاؤ گے۔ پھر ہمیں شرمندگی اٹھانی پڑے گی۔ تمہیں خوش ہونا چاہئے کہ یہاں بند کر کے جا رہا ہوں۔ اس طرح تم قاتلوں کے ہاتھوں سے محفوظ رہو گے۔ تم پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔"

گوپی نے اپنا منہ دروازے سے لگا دیا۔ پھر اس نے درد بھرے لہجے میں اپنے پتا جی کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"پتا جی......! اگر آپ مجھے بند کرنا ہی چاہتے ہیں تو ایسا کریں کہ آپ چابی بھی اپنے ساتھ لے جائیں۔ اسے دروازے میں مت لگا رہنے دیں۔ ورنہ وہ دروازہ کھول کر اندر گھس آئیں گے۔ پھر مجھے بڑی آسانی سے مار ڈالیں۔ مجھ پر دیا کریں پتا جی......"

"نہیں...... چابی دروازے ہی میں لگی رہے گی۔ میں اسے ساتھ اس لئے نہیں لے جا سکتا کیوں کہ وہ کہیں گر سکتی ہے، کھو سکتی ہے۔ پھر سخت پریشانی ہو گی۔" اس کے پتا جی بولے۔ "زیادہ سوچ کر دماغ خراب مت کرو۔"

گوپی دہشت زدہ ہو کر بری طرح دروازہ پیٹنے لگا۔ "پتا جی......! پتا جی......! واپس آ جائیں...... میں اعتراف کرتا ہوں کہ میں جھوٹ بول رہا تھا...... مجھے اکیلا مت چھوڑیں پتا جی......!" وہ رونے اور گڑگڑانے لگا۔

"ٹھیک ہے...... اب جھوٹ سچ کے موضوع پر کل بات ہو گی۔ مجھے دیر ہو رہی ہے میں جا رہا ہوں۔" اس کے پتا جی نے جواب دیا۔ گوپی دیوانہ وار دروازہ پیٹتا ہوا چیختا رہا۔ اسے اپنے فلیٹ کے باہر کا دروازہ کھلنے اور بند ہونے کی آواز سنائی دی۔ دوسرے لمحے سکوت طاری ہو گیا۔ وہ تنہا رہ گیا تھا۔ اس عفریت کا مقابلہ کرنے کے لئے جو دو انسانوں کی شکل میں تھی۔ یہ عفریت جو موت کا فرشتہ تھی۔

اب اس چیخ و پکار کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ حاصل نہیں تھا۔ اس کے پتا جی اپنے سینے میں پتھر دل لئے چل دیئے تھے۔ اب وہ صبح سے پہلے نہیں آ سکتے تھے۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اس لئے بھی اس کا چیخنا چلانا اسے نقصان

پہنچا سکتا تھا۔ اس کے دشمن گھبرا کر وقت سے پہلے اپنے منصوبے پر عمل کرنے کا فیصلہ کر سکتے تھے۔ اس لئے وہ انہیں ایسا کوئی موقع دینا نہیں چاہتا تھا۔

اس نے کمرے کی روشنی گل کر دی۔ اندھیرا خود خوف کی شکل میں ہوتا ہے...... لیکن گوپی کو معلوم تھا کہ وہ روشنی سے زیادہ اندھیرے میں محفوظ رہے گا۔ ہو سکتا ہے کہ دشمن اندھیرا دیکھ کر غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ مکان میں کوئی نہیں ہے...... لیکن ایک دوسرے خیال نے اس خیال کی تردید کر دی...... انہوں نے ٹیلی گرام بھیجا تھا جو یقینا یقینی طور پر وہ اس فلیٹ کی نگرانی بھی کر رہے ہوں گے۔ انہیں اس بات کا علم ہو گیا ہو گا کہ اس کی ماں پہلے تنہا گئی ہے...... اور اب اس کے پتا جی تنہا فلیٹ سے رخصت ہوئے ہیں۔ اس لئے اس کا اندر موجود ہونا لازمی ہو گا۔

ہر طرف ایک گہرا بھدا سکوت طاری تھا۔ اوپر اور اس کے فلیٹ کے اندر کانوں میں بہت ساری آوازیں آنے لگیں۔ ریڈیو کے بجنے کی آواز...... کسی ہندوستانی فلم کا گیت تھا جس کی آواز اونچی کی ہوئی تھی...... بچوں کی آپس میں شرارتوں اور لڑنے جھگڑنے کی...... برتنوں کے کھنکنے کی آوازیں جیسے انہیں دھویا جا رہا ہو...... ایک فلیٹ میں نیلم اور اس کا شوہر گوش...... وہ اکثر راتوں کو آپس میں کسی نہ کسی بات پر جھگڑتے تھے۔ بعض اوقات اس کا شوہر اپنی بیوی کی پٹائی کر دیتا تھا۔ آج بھی شاید اس نے پٹائی کر دی تھی۔ اس لئے وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر فلیٹ کو سر پر اٹھائے ہوئے تھی...... ابھی بہت وقت تھا۔ اس کے دشمن زیادہ رات ہو جانے کا انتظار کریں گے۔ جب اس عمارت میں خاموشی چھا جائے گی تب وہ کوئی قدم اٹھائیں گے۔

گوپی نے سوچا کہ تاریکی میں بیٹھ کر موت کا انتظار کرنا کس قدر اذیت ناک اور سوہان روح ہوتا ہے، گوپی کو پہلی بار اس کا تجربہ ہو رہا تھا۔ کبھی اس کے ذہن میں یہ بات نہیں آئی تھی کہ وہ کبھی کسی جاسوس فلم کا کردار بن سکتا ہے۔

قریب میں جو مسیحی لوگوں کی آبادی تھی۔ اس کے گرجا بلند آواز میں گھنٹہ بجانے لگا۔ گوپی بڑی توجہ سے اس کے ٹن ٹن کی آواز گننے لگا۔ گھنٹہ دس مرتبہ بج کر خاموش ہو گیا۔ اسے بڑی حیرت ہوئی۔ اندھیرے میں وقت کے اس تیزی سے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو سکا۔ اس کی ماں کو گئے تقریباً پون گھنٹہ ہو گیا تھا۔ سفر دو گھنٹے کا تھا۔ اس کا اندازہ یہ تھا کہ اس کی ماں سوا گیارہ بجے اپنی بہن کے گھر پہنچے گی۔ اس کی ماں کو وہاں پہنچ کر پتا چلے گا کہ ٹیلی گرام جعلی تھا۔ یہ سنتے ہی اس کی ماں کو یقین ہو جائے گا کہ اس کے بیٹے کی کہانی جھوٹی نہیں تھی۔ اوپر رہنے والے پڑوسیوں نے واقعی گزشتہ شب کسی انسان کو قتل کیا تھا۔ اور یہ جعلی ٹیلی گرام انہوں نے ہی بھیجا تھا تاکہ ان کا فلیٹ بھی تنہا رہ جائے اور وہ اسے اطمینان سے موت کی نیند سلا دیں۔ اور پھر انہیں فوراً اس کے بیٹے نے جو کچھ کہا وہ سو فیصد درست تھا...... بیٹے کی جان خطرے میں ہے۔ یہ انکشاف ہوتے ہی وہ فوراً واپس چل پڑیں گی...... پندرہ منٹ گفتگو کے نکال کر ساڑھے گیارہ بج گئے۔ رات ڈیڑھ بجے واپس آئیں گی۔ ماتلے سے کولمبو مسافر بسیں اور کوچز ساری رات آتی رہتی ہیں۔ اسے ڈیڑھ بجے رات تک اپنی حفاظت کسی نہ کسی طرح کرنی ہو گی۔ اس کے بعد وہ محفوظ ہو جائے گا۔ اس کی امی جب گھر واپس آئیں گی تو وہ اکیلی نہیں آئیں گی۔ کسی نہ کسی طرح پولیس کو بھی ساتھ لے آئیں گی۔ پولیس ان کی بات کی سچائی کا یقین کر لیں گی۔ کیوں کہ وہ بڑی عمر کی ہیں۔ تعلیم یافتہ بھی ہیں۔ چوں کہ وہ ایک بڑے دفتر میں کام کرتی ہیں انہیں کس سے کس طرح کی گفتگو کرنا ہے وہ آتا ہے۔ پھر پولیس ان قاتلوں کو گرفتار کر لے گی۔

تب اس کے ذہن میں ایک خیال کوندا بن کر لپکا۔ اوپر والے فلیٹ میں مکمل سکوت طاری تھا۔ کسی کے چلنے پھرنے کی آواز یا آہٹ تک سنائی نہیں دے رہی تھی...... اس کا کیا مطلب ہو سکتا ہے......؟ کیا وہ فلیٹ چھوڑ کر اس خوف اور خیال سے فرار ہو گئے ہیں کہ ایک عینی گواہ اس واردات کا ہے۔ اس کی شہادت پر انہیں گرفتار کیا جا سکتا ہے۔ نہیں...... یہ بات ان کے علم میں

آ گئی ہے کہ اس لڑکے کی شہادت کو نہ اس کے والدین تسلیم کر رہے ہیں اور نہ پولیس والے...... اس لئے کہ یہ لڑکا گپیں ہانکتا ہے۔ جھوٹ بولتا ہے اور پھر اس کی عمر کے بچے بہت جھوٹ بولتے ہیں۔

دوسری بات یہ بھی تو ہو سکتی ہے کہ وہ مناسب وقت کا انتظار کر رہے ہوں تاکہ اس عمارت کے تمام لوگ سو جائیں اور آس پاس کی عمارتوں پر بھی خاموشی چھا جائے۔ پھر وہ اطمینان سے اپنے منصوبے پر عمل کر سکیں۔ انہوں نے اس کی خالہ کی طرف سے ٹیلی گرام بھیجا تھا۔ کیوں کہ انہیں اس بات کا علم تھا کہ اس کی خالہ ماتلے میں رہتی ہے۔ یہ شہر دو گھنٹے کی مسافت پر ہے۔ ان کی رہائش کا علم اس عمارت میں رہنے والے تمام لوگ جانتے تھے۔ کیوں کہ وہ جب کبھی آتی تھی دو ایک ہفتہ قیام کرتی تھیں اور تمام پڑوسیوں سے اس لئے بھی میل جول تھا کہ وہ تین برس پہلے چوتھی منزل پر کرایہ پر ایک برس کرائے پر رہی تھیں۔ جب ان کے شوہر کا تبادلہ ماتلے ہو گیا تو وہ وہاں چلی گئی تھیں...... اور پھر انہوں نے اس کی ماں کو گھر سے نکلتے دیکھ لیا ہو گا۔ واپسی کا وقت بھی نوٹ کیا ہو گا۔ انہوں نے یہ بھی سوچ رکھا ہو گا کہ اپنا کام انہیں ڈیڑھ بجے سے پہلے انجام دے دینا ہے۔ وہ یہ موقع کسی قیمت پر گنوانا پسند نہیں کریں گے۔ یہ ان کے لئے پہلا اور آخری موقع ثابت ہو گا۔ کیوں کہ اس کے بعد وہ انہیں کبھی تنہا نہیں ملے گا۔

گوپی تھوڑی دیر بعد اٹھ کر دروازے کے پاس جاتا تھا اور کان لگا کر آہٹ لینے کی کوشش کرتا تھا۔ باہر گہرا سکوت طاری ہو گیا تھا۔ برابر والے کمرے سے دیوار گیر گھڑی کی ٹک ٹک سنائی دیتی تھی۔ ایک بار وہ اسی طرح دروازے سے کان لگائے گن سن لے رہا تھا کہ ایک خیال کوندا بن کر اس کے ذہن میں لپکا۔ اس نے سوچا۔ کاش! یہ خیال اس کے پتا جی کے دفتر جانے کے فوراً بعد آ جاتا...... خیر کوئی بات نہیں۔ اب بھی وقت اور موقع ہے۔ اب بھی وہ قفل میں لگی ہوئی چابی نیچے گرا دے۔ وہ دروازے کے قریب کرے گی۔ پھر وہ کوٹ ٹانگنے والے ہینگر سے ہولے ہولے [illegible] دروازے کے نیچے سے چابی نکال لے۔ اگر اس طرح وہ عفریت دروازے تک آ بھی گئی تو وہ اس کے کمرے میں داخل نہیں ہو سکے گی۔

پھر اس نے اپنے منصوبے پر عمل کرنے میں لمحہ بھر کی بھی دیر نہیں کی۔ اس نے قفل کے سوراخ میں پنسل کی باریک نوک گھسا کر چابی نیچے گرا دی۔ پھر اس نے الماری میں سے ہینگر نکالا اور دروازے کے نیچے سے کھسکا کر اسے باہر کیا۔ ہینگر کا تار چابی سے ٹکرایا۔ اس نے ہینگر کو اندر کی طرف کھینچا۔ لیکن وہ خالی تھا۔ بہت دیر تک وہ اس کام میں مشغول رہا۔ ایک مرتبہ اندازے کی غلطی نے اس کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔ کیوں کہ چابی ہینگر سے ٹکرا کر دور چلی گئی۔

گرجے کی گھڑیال نے پھر وقت کا اعلان کیا۔ گیارہ بج گئے تھے۔ چہرے پر پسینہ پھوٹ پڑا۔ اس نے قمیض کی آستین سے پسینہ پونچھتے ہوئے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ سامنے والی عمارت کی تمام کھڑکیاں تاریک ہو گئی تھیں۔ ریڈیو خاموش تھے۔ بچے شاید سو گئے تھے۔ اس لئے سناٹا تھا۔ میاں بیوی میں بھی شاید صلح صفائی ہو گئی تھی اس لئے ان کے لڑنے جھگڑنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ ہر طرف بھدا سکوت تھا۔ ان کی اپنی عمارت بھی ایسی ہی خاموشی کی آغوش میں سما گئی تھی۔

"اگر کسی طرح ایک گھنٹہ اور گزر جائے تو وقت اس کا مددگار بن جائے گا......" اس نے سوچا۔ پندرہ بیس منٹ بعد اس کی ماں خالہ کے گھر پہنچ جائے گی۔ بشرطیکہ انہیں راستے میں بس کے خراب ہو جانے کے باعث غیر معمولی تاخیر نہ ہو جائے۔ اکثر بسوں میں کوئی نہ کوئی خرابی پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ رات کے وقت بس والے اس بات کا بڑا خیال کرتے تھے کہ کوئی خرابی پیدا نہ ہو۔ اس بات کا امکان تھا کہ اس کی ماں کو وہاں پہنچ کر صورت حال کا علم ہوتے ہی خطرے کا احساس ہو تو پولیس کو ٹیلی فون کر دیں۔ جب کوئی بڑا آدمی یا عورت پولیس کو ٹیلی فون کر کے اطلاع دیتی ہے تو پولیس یقین کر لیتی ہے۔

پولیس فوراً ہی اس کی حفاظت کے لئے آجائے گی۔ لیکن اس بات کا انحصار اس بات پر ہے کہ اس کی ماں کو سفر میں تاخیر نہ ہو اور وہ فوراً ہی پولیس کو ٹیلی فون بھی کر دیں۔ اس کے علاوہ......

گوپی کے کان کھڑے ہوگئے۔ خیالوں کا تانتا ٹوٹ گیا اور اوپر والے فلیٹ سے ایک ہلکی سی آواز آئی تھی۔ بہت دھیمی...... جیسے کوئی پنجوں کے بل احتیاط سے چل رہا ہو۔ کھڑکی کا دروازہ کھلنے کی آواز سنائی دی۔ چرر...... جیسے کوئی بڑی احتیاط سے کھڑکی کا دروازہ کھول رہا ہو...... وہ کمرے کا دروازہ بھی ہوسکتا تھا...... کسی الماری کا دروازہ بھی...... اس کے بعد مکمل سکوت طاری ہوگیا۔

بہت دیر تک سناٹا فضا پر مسلط رہا۔ گوپی اپنی جگہ ساکت کھڑا ہوا تھا۔ اسے سانس لیتے ہوئے بھی خوف آرہا تھا۔ اس کے تمام حواس سمٹ کر کانوں میں جمع ہوگئے تھے...... پھر ایک اور آواز سنائی دی جو پہلی آواز سے مختلف تھی اور ایک دوسری جگہ سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ آواز لکڑی کی نہیں تھی۔ زنگ خوردہ لوہے کی تھی۔ وہ آواز اوپر سے نہیں کھڑکی کے باہر سے آئی تھی۔

گوپی نے چونک کر کھڑکی کی طرف خوف زدہ نظروں سے دیکھا۔

کھڑکی کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ اس نے سوچا۔ اسے پہلے ہی پردے کھینچ دینے چاہئیں تھے۔ لیکن کمرے کے اندر تاریکی تھی۔ اس لئے باہر سے کوئی بھی کمرے کے اندر نہیں دیکھ سکتا تھا وہ کس جگہ موجود ہے۔ وہ خود بھی کھڑکی سے باہر نہیں دیکھ سکتا۔ باہر روشنی ضرور تھی لیکن گہرے سلیٹی رنگ کی باہر چھائی تاریکی اندر والی تاریکی سے قدرے ہلکی تھی۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے وہ فرق بھی مٹنے لگا۔ جیسے کوئی ٹھوس وجود کھڑکی کے سامنے اوپر سے نیچے کھسک رہا ہو۔

گوپی نے کسی اندیشے کے تحت لمحے بھر کی بھی تاخیر نہیں کی۔ وہ دیوار سے چپک کر فرش پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ اس نے گھٹنوں کے درمیان اپنا چہرہ چھپا لیا اور کاندھے سکیڑ لئے۔ جیسے کچھوا اپنا سر خول کے اندر چھپا لیتا ہے۔

گوپی کو اس تاریکی میں پیلا سا گول دھبا نظر آیا۔ یہ قاتل کا چہرہ جو شیشے کے ساتھ چپکا ہوا تھا اور کمرے کے اندر کا جائزہ لے رہا تھا۔ اچانک کھڑکی کا درمیانی حصہ گول دائرے کی صورت میں روشن ہوگیا۔ وہ دائرہ انڈے کے برابر تھا اور اس کا رنگ انڈے کی طرح سفید تھا۔ روشنی کمرے کے اندر گھس آئی۔ قاتل ٹارچ روشن کرکے اسے تلاش کر رہا تھا۔ گوپی نے چونک کر دیکھا۔ وہ بے حس و حرکت ہی بیٹھا رہا۔

روشنی متحرک تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کمرے کی دیواروں پر سفر کر رہی تھی۔ اس کا زاویہ بار بار تبدیل ہو رہا تھا۔ گوپی یہ دیکھ کر کچھ اور سکڑ گیا۔ اب اس کا بدن ایک بڑی گیند کی شکل اختیار کر گیا تھا...... اچانک روشنی کا دائرہ نیچے آیا اور گوپی کی آنکھیں اس تیز روشنی میں چندھیا گئیں۔ اس کا وجود اس روشنی میں مقید ہوگیا تو فوراً ہی ٹارچ بجھ گئی۔ قاتل کا مقصد پورا ہوگیا تھا۔ وہ جو کچھ معلوم کرنا چاہتا تھا اسے معلوم ہوگیا تھا۔ اسے معلوم ہوگیا تھا کہ وہ فلیٹ میں نہ صرف موجود ہے بلکہ تنہا ہے۔ اس لئے اس نے روشنی بجھا دی تھی۔

قاتل نے چند لمحوں کے بعد کھڑکی کھولنے کی کوشش کی لیکن کیلوں کی وجہ سے وہ اپنی کوشش میں ناکام رہا۔ اس نے پھر سوچا دوبارہ کوشش کی۔ کچھ دیر بعد تھک کر وہ سایہ اوپر بلند ہونے لگا...... قاتل واپس جا رہا تھا۔ کھڑکی کے شیشے پر دوبارہ گہرے سلیٹی رنگ کی روشنی چھا گئی۔ گوپی اب کھڑکی سے باہر چبوترے کی ریلنگ دیکھ سکتا تھا۔ قاتل نے واپس جاتے ہوئے زیادہ احتیاط کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ اب اسے کسی قسم کی احتیاط کی ضرورت بھی نہیں رہی تھی۔ اس نے جان لیا اور سمجھ لیا تھا کہ اس کا شکار بے بس اور اس کی دسترس میں ہے۔ وہ کسی صورت اس جال سے نکل نہیں سکتا تھا۔

اب یہ لوگ کیا کریں گے......؟ ان کا دوسرا اقدام کیا ہوگا......؟ کیا وہ مایوس ہوکر بیٹھ جائیں گے......؟ کیا وہ اسے ہلاک کرنے کا ارادہ ترک کر دیں گے......؟'' ان

خیالات کی یلغار اس کے ذہن میں ہونے لگی۔

گوپی کسی خوش فہمی میں مبتلا ہونا نہیں چاہتا تھا، نہ ہی خود فریبی سے اپنے آپ کو دھوکے میں رکھنا چاہتا تھا...... وہ اس حقیقت کو نظر انداز کرنا نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے مارنے کا ارادہ ہرگز ہرگز ملتوی نہیں کریں گے۔ کیوں کہ ایسا کریں گے تو خود اپنے پیروں پر کلہاڑیاں ماریں گے۔ قاتل نئی چال چل رہا ہے۔ وہ کوئی اور تدبیر کرے گا۔ اس نے تہیہ کر رکھا ہوگا کہ اس عینی گواہ کو زندہ رہنے نہ دے۔ یہ زہریلا سانپ ہے جو اسے ڈس لے گا۔ قاتل نے جعلی ٹیلی گرام بھیج کر انتہائی قدم اٹھالیا تھا۔ اب انہیں آئندہ ایسا سنہرا موقع کہاں نصیب ہوگا۔ یہ صرف آج کی رات ہے۔ اس کے بعد اس کی ماں اور اس کے پتا جی اسے تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ یہ ان کا پہلا اور آخری موقع ہے۔

گرجے کی گھڑیال نے مزید آدھا گھنٹہ گزرنے کا اعلان کیا۔ ساڑھے گیارہ بج گئے تھے۔ گوپی کا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے اس نے میل بھر کا فاصلہ انتہائی تیز رفتاری سے دوڑ کر طے کیا ہو۔

کچھ دیر کے لئے مکمل خاموشی طاری ہوگئی......

یہ سکوت کسی خوفناک طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ گوپی منہ کھولے ہانپ رہا تھا۔ اس کے پھیپھڑوں کو ہوا کی جس قدر ضرورت تھی ناک کے ذریعے اس کی مقدار ناممکن تھی۔ وہ اچانک سانس لینا بھول گیا تھا۔ کہیں کسی قفل میں چابی ڈالی گئی تھی۔ اس کے کان کھڑے ہوگئے۔ وہ آواز باہر سے آرہی تھی۔ سفاک قاتل ان کے فلیٹ کے دروازے میں لگے ہوئے قفل میں گڑبڑ کر رہا تھا۔ وہ دوسری چابیاں جیسے قفل کھولنے کے لئے آزما رہا ہو۔ لیکن وہ آواز بہت دھیمی تھی اور وہ بہت ہی محتاط تھا۔ اس بات کی کوشش کر رہا تھا اس کی حرکت کا علم کمرے میں مقید لڑکے کو نہ ہوجائے۔ چند لمحوں کے بعد دروازہ آہستہ سے چرچرایا...... اور پھر دھیرے دھیرے چرچراتا ہوا کھلنے لگا۔ پھر دروازہ ذرا سا کھل کر بند ہوگیا۔ پھر ایک مرتبہ سکوت طاری ہوگیا۔ لیکن چند لمحوں سے زیادہ طویل ثابت نہیں ہوا۔

قاتل نے گوپی کے انداز کے مطابق اپنے فلیٹ کی چابی استعمال کی تھی اور ان کا قفل کھل گیا تھا۔ اس عمارت کے تمام فلیٹوں کے دروازوں میں تعمیراتی کمپنی نے ایک ہی قسم کے تالے لگائے تھے۔ گو کہ دوسرے فلیٹ کے قفل دوسری چابیوں سے کھل نہیں سکتے تھے۔ لیکن قاتل نے کوشش کی اور وہ کسی نہ کسی طرح قفل کھولنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔

پھر خاموش قدموں کی چاپ بلند ہوئی...... بہت دھیمی...... بہت محتاط جس سے پتا نہیں چلتا تھا کہ ان کی تعداد ایک ہے یا دو...... انہوں نے بتی روشن نہیں کی تھی۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ وہ اس فلیٹ میں اپنی موجودگی کو پوشیدہ رکھنا چاہتے ہیں۔

قدموں کی چاپ اس کے کمرے کے باہر رک گئی۔ چند لمحوں کے بعد دروازے کا لٹو نما ہینڈل گھوما۔ لیکن دروازہ مقفل ہونے کی وجہ سے وہ پورا نہیں گھوم سکا۔ اب انہیں پتا چل گیا تھا کہ اس کمرے کا دروازہ مقفل ہے جس کی چابی اندھیرے میں ان کے قدموں میں پڑی ہوئی تھی...... لیکن گوپی کو خیال آیا کہ وہ اس چابی سے یہ دروازہ بھی کھول سکتے ہیں جس کی مدد سے انہوں نے اس کے فلیٹ کا داخلی دروازہ کھولا تھا۔ شاید انہیں یہ خیال آجائے۔

گوپی کے ذہن میں فوری طور پر ایک تدبیر آئی کہ پنسل کی نوک قفل میں پھنسا کر تالے کو جام کیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ وہ انگریزی کی جاسوسی فلموں میں دیکھ چکا تھا...... اس کا یہ خیال بھی تھا کہ اگر قفل میں پنسل کی نوک پھنسی ہوئی ہوگی تو وہ اپنی چابی تالے کے اندر نہیں ڈال سکیں گے۔ پھر وہ دروازہ کسی صورت میں کھول نہیں سکیں گے۔

اس نے جلدی سے جیبیں ٹٹولیں اور بڑی پھرتی سے پنسل نکالی۔ اس نے کچھ ضرورت سے زیادہ ہی پھرتی دکھا دی تھی۔ پنسل اس کی انگلیوں سے نکل کر نیچے کہیں فرش پر گر گئی تھی۔ وہ چوپائے کی طرح فرش پر چلتے ہوئے اندھیرے میں ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔ پنسل پر

ہاتھ پڑتے ہی اس نے مٹھی بند کرلی اور پھر اچھل کر فرش پر کھڑا ہوگیا۔

اس کی نظر قفل پر پڑی جس کے سوراخ میں سے روشنی کی ایک لکیر پھوٹتی ہوئی داخل ہورہی تھی۔ قاتل تارچ کی روشنی کی مدد سے قفل کا سوراخ تلاش کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ گوپی سرعت سے دروازے کی طرف لپکا۔ اس نے جیسے ہی پنسل کی نوک قفل میں ڈالنے کی کوشش کی اسے دوسری جانب سے چابی گھومنے کی آواز سنائی دی اور اس کے ساتھ ہی روشنی غائب ہوگئی۔

ایک لمحے کی دیر ہوگئی تھی۔ قفل کے اندر چابی گھس چکی تھی۔ اب دروازہ کے کھلنے میں صرف آدھا منٹ لگ سکتا تھا۔

گوپی نے جلدی سے کمرے میں نظریں دوڑائیں۔ وہ کسی ایسی بھاری چیز کی تلاش میں تھا جس کی مدد سے وہ دروازے کے آگے لگا کر اپنی زندگی کو کچھ دیر کے لئے بڑھا سکے...... کمرے میں ایسی کوئی چیز دفاع اور مزاحمت کے لئے نہیں تھی۔ ایک الماری تھی۔ وہ اتنی بھاری تھی کہ وہ اسے اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں سکتا تھا اور ایک مسہری تھی جسے ہلانا تو دور کی بات تھی اسے جنبش تک نہیں دے سکتا تھا۔ لے دے کے ایک کرسی رہ جاتی تھی جس پر وہ کچھ دیر پہلے بیٹھا ہوا تھا...... کرسی کو دروازے کے سامنے اڑانا وقت ضائع کرنے کے مترادف تھا۔

آخر کار قفل میں چابی گھوم گئی۔

گوپی دوڑ کر کرسی کے پاس آیا۔ اس نے کرسی دونوں ہاتھوں میں اٹھائی اور اسے پھینکنے والے انداز میں جھلانے لگا۔ لیکن کرسی کا رخ دروازے کی طرف نہیں بلکہ کھڑکی کی طرف تھا۔ کرسی اس کے ہاتھوں کی گرفت سے نکل کر تیر کی طرح بڑھی پھر ایک زوردار آواز کے ساتھ کھڑکی کا شیشہ ٹوٹ گیا۔ اس کی کرچیاں فرش پر بکھر گئیں۔ وہ بجلی کی سی سرعت سے کھڑکی کی طرف لپکا۔ اس کی برق رفتاری اسے بچا گئی۔ اس کا لباس کھڑکی کے فریم میں اٹکے ہوئے شیشوں کے ٹکڑوں میں الجھ کر کئی جگہ سے پھٹ گیا۔ لیکن اس کا جسم اتفاقی طور پر خراشوں سے بالکل محفوظ رہا۔ اسے لباس کے پھٹ جانے کی فکر نہ رہی۔ اسے اپنی جان کی پرواتھی جو بچ گئی تھی۔

اسے اپنے عقب میں بھاری بھرکم جوتوں کے دوڑنے کی آواز سنائی دی۔ ایک مردانہ ہاتھ نے اسے پکڑنے کی کوشش کی لیکن وہ ایک لمحہ قبل آہنی چبوترے پر چھلانگ لگا چکا تھا۔ قاتل کا بدن بھاری بھرکم تھا۔ اس نے ٹوٹے ہوئے شیشے کے درمیان سے نکلنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ وہ جھجک کر رک گیا۔ لیکن دوسرے لمحے اس نے جیسے ہی گوپی کو آہنی سیڑھیوں کی مدد سے نیچے اترتے دیکھا اس کا جسم بھی حرکت میں آگیا۔ وہ پھرتی سے پلٹا اور فلیٹ سے باہر تیزی سے دوڑنے لگا۔

گوپی گرتا ہوا...... سنبھلتا ہوا اور پھسلتا ہوا آہنی سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ درمیان میں تین چبوترے بھی آئے لیکن وہ ایک لمحے کے لئے بھی نہیں رکا۔ اس نے پلٹ کر اوپر بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس لئے کہ وہ کوئی خطرہ مول لینے اور قاتل کو لحظہ بھر کی مہلت بھی دینا نہیں چاہتا تھا۔ جب وہ چھلانگ لگا کر زمین پر کھڑا ہوا تو اس کا سانس بری طرح پھول رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ جیسے اس کے پھیپھڑے چند لمحوں کے بعد پھٹ جائیں گے۔ کان سائیں سائیں کررہے تھے۔ اسے کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ گوپی دیوار کا سہارا لے کر ہانپ رہا تھا۔ اس کا سر بھی گھوم رہا تھا۔ وہ یقینی موت سے بال بال بچ گیا تھا۔ اب وہ محفوظ تھا۔

ایک لمحے کے بعد جب اس کے حواس قدرے قابو میں آئے اور سانس درست ہوا تو کانوں کو گونجنے والی سن سناہٹ ختم ہوئی۔ سانسوں کی آمدورفت میں توازن پیدا ہوا تو اس نے اپنے گردوپیش نظر ڈالی۔ گلی تاریک اور سنسان تھی۔ گوپال اس گلی کے چپے چپے سے واقف تھا۔ اس لئے تاریکی اس کے لئے پریشانی کا باعث نہیں تھی۔ لیکن اسے سناٹا پسند نہیں آیا۔ وہ انسانوں کے ہجوم میں شامل ہونا چاہتا تھا تاکہ خود کو دوسروں کے درمیان واقعی محفوظ محسوس کرسکے...... جہاں کوئی بھی اس کا کچھ بگاڑ نہ سکے۔

اسے کس طرف کا رخ کرنا چاہئے......؟ کہاں جانا چاہئے......؟ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا......؟ اس کا کوئی دوست ایسا نہیں ہے جو اسے اپنے ہاں پناہ دے سکے...... شاید کوئی دیدے لیکن اس کے گھر والے مشکوک ہوجائیں گے۔ اس پر سوالات کی بوچھاڑ کردیں گے۔ وہ ان کے سوالات کا جواب نہ دے سکے گا اور پھر کوئی بھی اس کی بات کا یقین نہیں کریں گے۔ اسے گھسنے نہیں دیں گے۔ دروازے بند کردیں گے۔

اسے کم از کم صرف دو گھنٹے گزارنے تھے۔ دو گھنٹے بعد اس کی ماں کی واپسی یقینی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اپنے گردوپیش پر نظر ڈالی اور ٹھیک اس وقت اسے ایک سایہ عمارت کے دروازے سے نکل کر اپنی طرف کسی عفریت کی طرح لپکتا ہوا نظر آیا۔ ہیولا بتا رہا تھا کہ وہ قاتل ہے، قد قامت، جسامت اور ڈیل ڈول بالکل اسی طرح تھا۔ وہ دھوکا نہیں کھا سکتا تھا۔

دوسرے لمحے گوپی کے قدموں میں جیسے پر لگ گئے۔ وہ آنکھیں بند کئے اندھا دھند بھاگ رہا تھا۔ اس کا ہلکا پھلکا بدن ہوا میں جیسے اڑ رہا تھا۔ وہ اسکول کے سالانہ کھیلوں کے مقابلے میں دوسو میٹر کی ریس میں اول آتا تھا۔ لیکن اس دوڑ اور اس دوڑ میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ اس دوڑ میں صرف دو فرد دوڑ رہے تھے۔ اس میں ہار کا نتیجہ موت کا تھا...... جب کہ اسکول کے کھیلوں کے مقابلے میں ہارنے سے کچھ نہ تھا۔ زندگی اور بقا کا مقابلہ تھا۔ اس کے تعاقب میں موت تھی۔ قاتل کے قدم بڑے تھے اور اس کے پھیپھڑے گوپی سے بھی بڑے تھے۔ قدموں کی بھاری بھرکم آواز ہر آنے والے لمحے کے ساتھ اس کے نزدیک ہوتی جارہی تھی۔ گوپی کے تین قدم...... قاتل کے ایک قدم کے برابر تھے۔ لیکن وہ اس مختصر وقفے میں تین قدم اٹھا نہیں سکتا تھا۔ موت ایک عورت اور مرد کی شکل میں اس کا تعاقب کررہی تھی۔ عورت کا بدن ہلکا پھلکا تھا۔ اس لئے وہ مرد کے ساتھ ساتھ دوڑ رہی تھی۔

گوپی نے یہ سب کچھ محسوس کرتے ہوئے حوصلہ نہیں ہارا تھا۔ وہ آخری سانس تک موت کا مقابلہ کرنا چاہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ وہ جان کی بازی جیت لے گا۔ وہ تیزی سے ایک موڑ پر مڑا۔ اس نے سامنے پھیلی ہوئی سڑک پر نظر ڈالی۔ سڑک تاحد نظر تک سنسان تھی۔ اسے دور موڑ کے قریب کوڑا کرکٹ ڈالنے کے چھ آہنی ڈرم ایک قطار میں رکھے ہوئے نظر آئے۔ وہ سب کے سب بھرے ہوئے تھے۔ گوپی کو معلوم تھا کہ صبح ہونے سے پہلے کچرا ڈھونے والے ٹرک انہیں خالی کردیں گے۔ اس سے پہلے انہیں خالی نہیں کیا جاتا تھا۔ قدموں کی چاپ قریب سے قریب ہوتی جارہی تھی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا کہ کسی بھی وقت قاتل اس کی قمیض کا کالر پکڑ کر کھینچنے اور اسے دبوچنے والا ہے۔ اور مرد کے ساتھ عورت کے قدموں کی چاپ پیچھے ہوتی جارہی تھی جس سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ بری طرح تھک چکی ہے اور کسی بھی لمحے وہ دوڑنا بند کرکے رک جائے گی۔ لیکن مرد دوڑنے سے لگ رہا تھا کہ وہ تازہ دم ہے...... اور اسے ہر قیمت پر پکڑنے پر تلا ہوا تھا۔ کیوں کہ وہ قاتل کی موت تھا۔ وہ زندہ رہا تو قاتل تختہ دار پر چڑھ جائے گا۔

گوپی نے یک بارگی دوڑتے دوڑتے کسی خیال کے زیر اثر مڑ کے دیکھا۔ اس کے اور قاتل کے درمیان بہ مشکل چھ فٹ کا فاصلہ رہ گیا تھا جسے آدھا حصہ تصور کیا جاسکتا تھا۔ کیوں کہ قاتل نے اسے پکڑنے کے لئے ایک ہاتھ بڑھا کر آدھا فاصلہ کم کردیا تھا۔ گوپال کو احساس ہوگیا تھا چند لمحوں کے بعد اس کی انگلیاں اس کا کالر پکڑ لیں گی۔ عورت کافی پیچھے رہ گئی۔ اسے فوری طور پر اس فاصلے میں اضافہ کرنا تھا۔ اس لئے کہ گوپی نے زور لگایا کہ رفتار اور تیز ہوجائے۔ یہ بہت مشکل لگ رہا تھا کیوں کہ اس کی توانائی گھٹ رہی تھی۔ وہ اس سے زیادہ تیز نہیں دوڑ سکتا تھا۔ اس کے لئے موجودہ رفتار برقرار رکھنا بھی مشکل ثابت ہورہا تھا۔

کوڑے کے آہنی ڈرم تعداد میں کل چھ عدد تھے۔ ان کا قطر تین فٹ اور اونچائی بھی تین فٹ تھی۔ وہ ایک قطار میں رکھے ہوئے تھے۔ ان کے درمیان ایک ایک فٹ کا فاصلہ تھا لیکن درمیانی جگہ بھی کوڑے کرکٹ

سے بھری ہوئی تھی۔ لوگ ڈرم کے بجائے درمیانی جگہ بھی کچرا ڈال گئے تھے۔ یا پھر ڈرم سے کچرا ابل کر گرا ہوا تھا۔ کوئی ایک ڈرم بھی ایسا نہیں تھا جو کچرے سے لبالب بھرا ہوا نہ ہو۔

گوپی نے پہلے ڈرم کا کنارا پکڑا اور اس کے سہارے دوسری طرف گھوم گیا اور فوراً ہی وہ اس قطار کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ قاتل خود کو نہ سنبھال سکا وہ آگے بڑھتا چلا گیا۔ لیکن وہ فوراً ہی پلٹا اور گوپی کی طرف کسی عقاب کی طرح جھپٹا۔ گوپی دوسرے سرے پر گھوم کر واپس آ گیا اور درمیانی حصے میں کھڑے ہو کر قاتل کا انتظار کرنے لگا جیسے ہی وہ اس کے نزدیک پہنچا...... گوپی نے دو ڈرم کے کنارے پکڑے اور چھلانگ مار کر درمیانی خلاء کو عبور کر گیا اور اب وہ دوسری جگہ پہنچ چکا تھا۔ یہ حرکت گوپی کے لئے آسان تھی۔ اسے کوئی مشکل اور دشواری پیش نہ آ سکی۔ کیوں کہ وہ ہلکا پھلکا تھا اور اس میں بلا کی پھرتیلی بھی تھی۔ لیکن قاتل بھاری بھرکم تھا۔ وہ اس طرح درمیانی خلاء کو عبور نہیں کر سکتا تھا اس لئے اسے گھوم کر دوسری طرف سے آنا پڑا۔ گوپی نے پھر وہی چال دہرائی۔ لیکن وہ زیادہ دیر تک یہ حرکت دہرا نہیں سکتا تھا۔ کیوں کہ اس نے دیکھ لیا تھا کہ قاتل کی ساتھی عورت نزدیک آتی جا رہی تھی۔ چند لمحوں کے بعد وہ اسے دونوں طرف سے گھیر لیتے۔ چوہے بلی جیسا کھیل چند لمحے بھی جاری نہیں رہ سکتا تھا۔

گوپی نے ایک ڈرم کے پاس رک کر دونوں ہاتھوں سے ڈرم کے کنارے اس طرح پکڑ لئے جیسے وہ بہت تھک گیا ہو اور تھک کر اب بھی گرنے ہی والا ہو۔ وہ بری طرح ہانپنے بھی لگا تھا۔ قاتل گھوم کر بڑی تیزی سے اس کی طرف آ رہا تھا...... گوپی لڑکھڑاتا ہوا ڈرموں کے درمیان پڑے ہوئے کچرے کے ڈھیر پر چڑھ گیا۔ اس نے اب بھی دونوں ہاتھوں سے ڈرم کے کنارے پکڑے ہوئے تھے۔ جس کی اوپر سطح پر راکھ بکھری ہوئی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ کھسکا کر درمیانی جگہ سے کھسک کر دوسری طرف۔ جا رہا تھا۔ بہت سنبھل سنبھل کر اور محتاط انداز سے...... پھر وہ رک گیا۔ ہانپنے لگا۔ جیسے سانسوں کو قابو کرنے کی کوشش کر رہا ہو اور قاتل کے قریب آنے کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھ ڈرم کے اندر گھسا دیئے تھے۔ چند لمحوں کے بعد قاتل قریب آ گیا۔ اور اس نے گوپی کے گریبان کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ گوپی کے دونوں ہاتھوں نے بڑی تیزی سے حرکت کی جو ڈرم کے اندر راکھ کے نیچے کہنیوں تک دھنسے ہوئے تھے۔

دوسرے لمحے راکھ کے طوفان نے قاتل کے چہرے کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ قاتل کو اس طوفان کا گمان نہ تھا۔

گوپی چھلانگ مار کر دوسری طرف پہنچ گیا...... اور پیچھے دیکھ کر پوری قوت سے دوڑنے لگا۔ قاتل نے فوراً ہی اس کا پیچھا نہیں کیا۔ وہ اس قابل نہیں تھا کہ ایک قدم بھی چل سکے۔ وہ پیٹ پکڑے بری طرح کھانس رہا تھا۔ لڑکھڑا رہا تھا۔ آنکھیں مل رہا تھا۔ جن میں راکھ گھس گئی تھی وہ اسے سخت تکلیف دے رہی تھے اور کبھی پاگلوں کی طرح دونوں ہاتھوں سے راکھ کے مرغولے ہٹانے لگتا تھا۔

گوپی نے اس وقفے سے پورا فائدہ اٹھایا تھا...... اس کے اور موت کے درمیان پھر فاصلہ ایک پوری گلی کے برابر بڑھ گیا تھا۔ نئی سڑک پر داخل ہو کر اس نے سڑک کی لمبائی پر نظریں دوڑائیں۔ اسے کچھ فاصلے پر ایک آدمی دکھائی دیا۔ اس رات سڑکوں پر اسے یہ پہلا آدمی نظر آیا تھا۔ وہ تیر کی طرح اس آدمی کی طرف لپکا اور اس کے ہاتھ پکڑ کر جھول گیا۔

اجنبی نے اس کے ہاتھ کی گرفت سے اپنا ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی تو گوپی نے اس کے ہاتھ کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور سانس بھی بری طرح پھولی ہوئی تھی کہ وہ ایک لفظ ادا کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ ایک منٹ تک سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کرتا رہا۔ اس دوران اس نے بار بار انگلی سے پیچھے کی طرف اشارہ کیا جہاں دو سائے دوڑتے ہوئے تیزی سے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ وہ آدمی گوپال

کا اشارہ سمجھنے سے قاصر رہا۔

”کیا بات ہے......؟ کیا چاہتے ہو......؟“ اس نے زور سے ہاتھ جھٹکتے ہوئے گوپی سے پوچھا۔ ”اس کی آواز لڑکھڑا رہی تھی۔ اور بہت دور سے آتی ہوئی لگ رہی تھی۔ اس کا لہجہ ڈوبا ہوا تھا۔

”سر......! سر......! وہ ...... وہ مجھے...... مارنا چاہتے ہیں...... وہ مجھے......“ گوپی نے اس کے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔ وہ آدمی گوپی کا جھٹکا لینے پر لڑکھڑایا اور اس کے اوپر گرنے لگا۔ گوپی نے اسے فوراً ہی سہارا دیا۔ وہ احمقوں کی طرح اسے گھورنے لگا۔ اس کے چہرے پر خوف کا سایہ آ کر گزر گیا۔

”کیا بات ہے یار...... مجھے کیوں تنگ کرتے ہو......؟“

تب گوپی کو احساس ہوا کہ یہ شخص نشے میں دھت ہے...... ایسا آدمی جو خود کو سنبھال نہ سکے کس طرح اس کی مدد کر سکتا ہے۔ اس کی اس کوشش نے اس کے بے حد قیمتی لمحے ضائع کر دیئے تھے۔ کاش! اس نے یہ بات پہلے ہی محسوس کر لی ہوتی۔ شراب کے بھبکے بھی وہ محسوس کر کے اس لئے خاموش رہا تھا کہ شاید یہ شخص ہوش میں ہو اور اس کی مدد کر سکے۔

موت اس کے سر پر پہنچ گئی تھی۔ درمیانی فاصلہ گھٹ کر چند گز رہ گیا تھا اور تیزی سے کم ہوتا جا رہا تھا۔

گوپی نے پل بھر میں فیصلہ کرتے ہوئے فوراً ہی شرابی کو بڑے زور سے ایک طرف دھکا دیا۔ وہ بری طرح لڑکھڑایا۔ اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔ جس سے سڑک میں وہ رکاوٹ بن گیا۔

قاتل نے خود کو روکنے کی حتیٰ الامکان کوشش کی۔ چوں کہ وہ بہت تیز رفتاری سے اس کا تعاقب کر رہا تھا خود کو روکنے میں بری طرح ناکام رہا۔ اس کے قدم شرابی کے بدن سے ٹکرائے اور پھر بری طرح اوندھے منہ سڑک پر گر گیا۔ عورت...... مرد سے قدرے دور تھی۔ وہ یہ منظر دیکھ کر گھبرا گئی اور اس نے اپنی رفتار دھیمی کر دی۔

گوپی پھر ایک بار زندگی سے مہلت حاصل

اسلم راہی ایم اے کی تحریر کردہ بہترین کتابیں
حضرت ابوبکر صدیقؓ
حضرت عمر فاروقؓ
حضرت عثمان غنیؓ
حضرت علیؓ
حضرت ابوعبیدہ بن جراح
حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ
حضرت سعد بن ابی وقاصؓ
حضرت طلحہ بن عبیداللہؓ
حضرت زبیر بن عوامؓ
حضرت سعید بن زیدؓ
خالد بن ولید
عمر بن عبدالعزیزؒ
حجاج بن یوسف
محمد بن قاسم
طارق بن زیاد
ہارون الرشید
مامون الرشید
رکن الدین بیبرس
سلطان ملک شاہ سلجوقی
سلطان الپ ارسلان
قیمت فی کتاب -/25 روپے
Ph:32773302
شمع بک ایجنسی نوبیلسکوائر اردو بازار کراچی

کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا اور اس نے موت کو جیسے پیچھے دھکیل دیا تھا۔

وہ پوری قوت سے دوڑ رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا اور بدن پسینے میں شرابور ہو رہا تھا۔ اس کے لمبے بال پیشانی سے چپک گئے تھے۔ پھیپھڑوں میں آگ لگی ہوئی تھی۔ زبان سوکھ کر کانٹا ہوگئی تھی...... اس وقت گوپی کے تمام احساسات، ساری قوت ٹانگوں میں سمٹ آئی تھی۔ کبھی کبھی اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ لیکن اسے کسی بات کی کوئی پروانہ تھی۔ اس کی ساری قوت ارادی ٹانگوں کو چلتا رہنے پر مرکوز تھی۔ وہ جانتا تھا کہ قاتل اس کا تعاقب ترک نہیں کریں گے۔ جب تک اسے ٹھکانے نہ لگا دیں چین سے نہیں بیٹھیں گے۔ وہ موت اب بھی اس کا پیچھا کر رہی ہوگی...... اور درمیانی فاصلے گھٹ رہے ہوں گے۔ وہ ابھی بھی پوری قوت سے دوڑ رہا تھا۔ چوراہے پر پہنچ کر اس نے پاگلوں کی طرح چاروں طرف دیکھا۔ دائیں جانب اسے ٹرام کی پٹڑی نظر آئی اور اس کے ساتھ ایک ٹرام مغرب سے جنوب کی طرف مڑتی ہوئی دکھائی دی۔ ٹرام کی رفتار دھیمی تھی۔ فاصلہ بھی کچھ زیادہ نہیں تھا۔ وہ اسے دوڑ کر پکڑ سکتا تھا۔ وہ اکثر ٹرام کے پیچھے چھوٹے سے پائیدان پر لٹک کر مفت سفر کیا کرتا تھا۔ یہ اس کا مشغلہ تھا۔ اس طرح وہ بس کا کرایہ بچا لیتا تھا جو جمع کرتا جاتا تھا تاکہ فلمیں دیکھ سکے۔ کبھی آئس کریم کھانے کے کام میں آ جاتا تھا۔ ایسا کچھ اور لڑکے بھی کرتے تھے۔ اسے معلوم تھا کہ ٹرام آہستہ آہستہ رفتار بڑھاتی ہے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کس طرح چلتی ٹرام کے پائیدان پر کس زاویے سے لٹکا جاتا ہے۔

گوپی نے رخ تبدیل کر دیا اب وہ ٹرام کی طرف لپکا جا رہا تھا جو جنوب کی سمت مڑ چکی تھی اور وہ اب آہستہ آہستہ رفتار پکڑ رہی تھی۔ پھر وہ جلد ہی ٹرام کے قریب پہنچ گیا اور اس کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگا...... پھر صحیح زاویے پر آتے ہی وہ اچھل کر ٹرام کے پائیدان پر چڑھ گیا اور اس سے چمٹ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ پھر اس نے سر موڑ کے پیچھے کی جانب دیکھا۔ قاتل گھوم کر اس چوراہے پر پہنچ گیا تھا اس نے گوپی کو ٹرام پر سوار ہوتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔

اچانک قاتل کے دوڑنے کی رفتار دوگنی ہوگئی۔ گوپی نے آنکھیں پھاڑ کر یہ منظر دیکھا تو دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔ کیوں کہ اس نے کبھی کسی آدمی کو اس تیز رفتاری سے دوڑتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ یہ منظر اس کے لئے ناقابل یقین تھا۔ اس نے کھیلوں کے مقابلوں میں مردوں، لڑکیوں اور عورتوں کو دوڑتے کئی بار دیکھا تھا۔ لیکن ان کی رفتار اس نے اتنی تیز نہیں دیکھی تھی۔

قاتل اپنے شکار کو ہاتھ سے نکلتا دیکھ کر ایک آخری کوشش کر رہا تھا...... لیکن اس کی یہ کوشش فضول تھی۔ کیوں کہ ٹرام اب رفتار پکڑ چکی تھی۔ درمیانی فاصلہ آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا۔ ٹانگیں پیروں کو شکست نہیں دے سکتی تھیں۔ پھیپھڑے بجلی کی قوت کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔ آخر وہ کب تک کتنی دور تک دوڑتا رہے گا۔ پھر تھک کر رک جائے گا۔

لیکن یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ قاتل نے ہمت نہیں ہاری ہے۔ اس کا حوصلہ پست ہونے کے بجائے بڑھتا ہی جا رہا ہے اور پھر اس کے دوڑنے کی رفتار میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ وہ اب بھی اتنے ہی جوش و خروش سے دوڑ رہا تھا اس کے باوجود کہ فاصلہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اسے بڑھتے ہوئے درمیانی فاصلے کو دیکھ کر گوپی نے لمحے کے لئے سوچا کہ قاتل کی رفتار کم ہو جائے گی۔ پھر وہ تھک جائے گا۔ شاید قاتل کو اپنی ناکامی صاف نظر آنے لگی ہے۔ لیکن یہ امر تعجب خیز تھا کہ اس نے اپنی جدوجہد ترک نہیں کی ہے۔ پھر وہ اچانک زور زور سے فضا میں ہاتھ لہرانے لگا۔ وہ چیخ چیخ کر کچھ کہہ رہا تھا۔ گوپی نے دو ایک الفاظ سے غور کیا وہ ٹرام رکنے کے لئے کہہ رہا ہے۔

گوپی کے سانسوں کی آمد و رفت بحال ہوگئی تھی لیکن وہ اب بھی گہرے گہرے سانس لے رہے تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے سے اندھیرا چھٹ گیا تھا۔ پسینہ بھی خشک ہوگیا تھا۔ پھر اس نے سامنے کی طرف

نظریں دوڑائیں۔ کچھ فاصلے پر اسے چند سائے آپس میں گڈمڈ کرتے نظر آئے۔ وہ ٹرام کی پٹڑی کے قریب کھڑے ہوئے تھے۔ اچانک ٹرام کی رفتار ٹوٹ کر دھیمی پڑنے لگی۔ اس نے جلدی سے گھبرا کر پلٹ کر دیکھا۔ قاتل کافی دور رہ گیا تھا لیکن اب بھی وہ ٹرام کے تعاقب میں دوڑ رہا تھا۔ اس کا حوصلہ ناقابل شکست نظر آتا تھا۔ گوپی کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ دراصل موت ان دونوں کے تعاقب میں ہے۔ وہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو نگل لینا چاہتی ہے...... وہ بچ جاتا ہے تو پھر قاتل موت سے نہیں بچ سکتا...... وہ اس کے ہاتھوں موت کا شکار ہو جاتا ہے تو پھر قاتل زندہ رہتا ہے۔ یہ ایک جنگ تھی قاتل اور عینی گواہ کے درمیان...... جیت کس کی ہوگی۔ یہ کچھ کہا نہیں جا سکتا۔

گوپی نے اچانک ایک دم سے محسوس کیا کہ ٹرام کی رفتار دھیمی پڑتی جا رہی ہے۔ وہ ان مسافروں کو لینا چاہتی تھی جو قدرے دور ٹرام کی پٹڑی کے پاس کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے درمیانی فاصلے کا اندازہ لگایا۔ اگر تمام مسافر فوراً چڑھ گئے اور وہ تمام مسافروں کو لے کر چل پڑی تو قاتل اسے پھر بھی پکڑ نہیں سکے گا۔ اس سے پہلے کہ وہ ٹرام کے قریب پہنچے۔ ٹرام دوبارہ رفتار پکڑ چکی ہوگی۔

ٹرام اسٹاپ پر رک گئی۔ وہ تین عورتیں تھیں۔ ان میں ایک معمر اور دو جوان تھیں۔ ٹرام کو رکتا دیکھ کر انہوں نے سر جوڑ کر کوئی مشورہ کیا اور پھر علیحدہ علیحدہ ہوگئیں۔ جوان عورتوں نے معمر عورت کو سہارا دے کر ٹرام میں سوار کرایا اور پھر سامان دینے کی قطار لگ گئی۔ باسکٹ، پرس، مختلف سائزوں کے چھوٹے بڑے پارسل...... گوپی بڑی بے تابی اور اضطراب سے یہ منظر دیکھ رہا تھا۔ وہ بار بار پلٹ کر پیچھے کا منظر بھی دیکھ لیتا تھا۔ زندگی اور موت کا درمیانی فاصلہ تیزی سے کم ہو رہا تھا۔ ٹرام کو رکا دیکھ کر قاتل کی دیوانگی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ وہ پاگلوں کی طرح بے تحاشا ٹرام کی طرف دوڑ رہا تھا۔ گوپی نے جلدی سے آگے دیکھا۔ بڑی بی ٹرام سے نیچے اتر گئی تھیں۔ پھر ان کے اور عورتوں کے درمیان الوداعی بوسوں کا تبادلہ بڑی گرم جوشی سے ہونے لگا۔

"آنٹی...... ! بھگوان نے چاہا تو آپ آرام سے گھر پہنچ جائیں گی۔"

"تمہاری مہمان نوازی کا بہت بہت شکریہ۔" بڑی بی نے ممنون لہجے میں کہا۔ "میں اسے کبھی نہیں بھولوں گی۔"

"آنٹی...... ! آپ بھی کیسی باتیں کرتی ہیں...... نریتا کو میری طرف سے بہت بہت پیار۔"

"ایک منٹ آنٹی...... یہ آپ کی چھتری...... آپ چھتری تو بھولے جا رہی تھیں...... یہ لیجیے!"

"ہاؤ سویٹ...... تم نے میرا اور میری چیزوں کا ہر وقت خیال رکھا۔" بڑی بی نے اس کا بوسہ لے لیا۔

ٹرام کے ڈرائیور نے آن کر گھنٹی بجائی۔ وہ اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

"شکریہ بیٹی......" بڑی بی نے پھر رسمی انداز سے کہا۔

"او کے بائی بائی......" انہوں نے دوبارہ بڑی بی کو ٹرام پر چڑھنے میں مدد کی۔

کنڈیکٹر نے فوراً ہی اس ڈر سے دروازہ بند کر دیا کہ بڑی بی کہیں کسی کام سے پھر اتر نہ جائیں۔ پھر اس نے ڈرائیور کو ٹرام چلانے کا اشارہ دیا۔

گوپی کو ایک جھٹکا سا لگا اور ٹرام آہستہ آہستہ آگے کھسکنے لگی۔ اس نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ قاتل کوئی پچاس گز کے فاصلے پر تھا۔ اس کے دوڑنے کی رفتار میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ وہ پوری قوت سے بدستور دوڑ رہا تھا۔ گوپی نے بے چینی سے پہلو بدلا اور بڑھیا کو دل میں بری طرح کوسنے لگا جس کی وجہ سے غیر معمولی تاخیر ہوئی تھی...... اس چڑیل کو آج ہی اور رات ہی کو سفر کرنا تھا۔ وہ دن میں بھی تو جا سکتی تھی۔ اس کا بس چلتا تو وہ ٹرام کو اسٹاپ پر رکنے نہیں دیتا۔

ٹرام آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ گوپی کا دل مایوسی کے اندھیرے میں ڈوبنے لگا۔ ٹرام آہستہ آہستہ

بڑھ رہی تھی اور موت نزدیک ہوتی جارہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ قاتل کے قریب آنے تک ٹرام رفتار پکڑ لے گی۔ آئندہ چند لمحوں میں اس کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ لمحے اس کی زندگی یا موت کے ہوسکتے تھے۔ وہ بری طرح ٹرام سے چمٹ گیا۔ ٹرام آہستہ آہستہ بڑھ رہی تھی۔ اسے غصہ آرہا تھا کہ وہ رفتار کیوں نہیں پکڑ رہی ہے۔ اس کے مقابلے میں موت اس سے لمحہ بہ لمحہ نزدیک ہوتی جارہی تھی۔ گوپی نے ایسی کوئی چیز تلاش کرنے کی کوشش کی جس کے گرد وہ اپنا بازو حائل کرسکے۔ لیکن وہ ناکام اور نامراد رہا۔ اس کی انگلیوں نے ٹرام کا چھجا پکڑا ہوا تھا۔ جس پر مضبوط گرفت قائم نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں اور خود کو قسمت کی آغوش میں دے دیا۔

چند لمحوں کے بعد قاتل کی فولادی انگلیوں نے اس کی پتلی سی گردن دبوچ لی...... ایک جھٹکا لگتے ہی اس کی ٹرام پر گرفت چھوٹ گئی اور وہ سڑک پر قلابازیاں کھانے لگا۔ جب اس نے آنکھیں کھولیں تو قاتل اس پر جھکا ہوا تھا۔ ٹرام کی روشنیاں دور جاچکی تھیں۔ اب وہ دوڑ کر ٹرام پر چڑھ نہیں سکتا تھا۔ وہ بے بس اور مجبور تھا۔ کیوں کہ وہ رفتار پکڑ چکی تھی۔ پوری سڑک سنسان تھی۔ بڑی بی کو رخصت کرنے والی عورتیں غائب ہوچکی تھیں۔

تعاقب ختم ہوگیا تھا...... زندگی اور موت کا فاصلہ آخر مٹ چکا تھا...... وہ زندگی ہار چکا تھا۔

"شیطان کے بچے...... آخر میں تجھے پکڑنے میں کامیاب ہوگیا...... چوہے کی طرح بھاگ رہا تھا۔ اب تو کہاں جائے گا۔"

قاتل نے پھولے ہوئے سانس کے درمیان پھنکارتے ہوئے کہا۔ پھر اس نے غصے سے اس کی پسلیوں میں ٹھوکر ماری۔

گوپی اس قدر تھک چکا تھا کہ اس ٹھوکر پر اس کے منہ سے چیخ بھی نہیں نکل سکی۔ قاتل کا بدن بھی اس قدر پھولا ہوا تھا کہ اس نے گوپی کو پکڑنے کی کوشش نہیں کی۔ گوپی بڑی سڑک پر پڑا ہوا تھا...... قاتل اس کے سر پر کھڑا اپنی اکھڑی ہوئی سانس جوڑ رہا تھا۔ ادھر ماحول پر گہرا سکوت طاری تھا۔ پھر یہ سکوت دوڑتے ہوئے نسوانی جوتوں سے درہم برہم ہوگیا۔

☆......☆......☆

"یہاں کب تک کھڑے رہو گے نارائن......!"

عورت نے اپنے ساتھی مرد کو ٹوکا۔ "اسے اٹھاؤ اور یہاں سے چل پڑو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی گشتی پولیس والا ادھر آنکلے...... پھر لینے کے دینے پڑجائیں گے۔"

نارائن نے اس کی بات سن کر پل بھر میں سڑک کا جائزہ لیا۔ اس کی سمجھ میں عورت کی بات آگئی تھی۔ اس نے گوپی کی پسلیوں میں ٹھوکر ماری اور پھر تحکمانہ لہجے میں بولا۔ "چوہے کے بچے...... جلدی سے کھڑے ہوجا۔"

گوپی نے قلابازی لگائی اور پھر سے اٹھ کر بھاگنے لگا۔ قاتل کی ٹھوکروں سے جو درد اور تکلیف پسلیوں میں ہوئی تھی وہ بھول گیا۔ اسے زندگی پیاری تھی۔ اس نے ابھی تک اپنی شکست تسلیم نہیں کی تھی۔ قاتل کو اس کی اس حرکت کی توقع تھی۔ وہ پہلے سے تیار تھا۔ اس نے گوپی کے بال مٹھی میں جکڑ لئے۔ گوپی کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ قاتل نے اس کے بال چھوڑ کر اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے موڑ کر پشت پر لے آیا۔

"اب اگر کوئی غلط حرکت کی تو تیرے ہاتھ کی ہڈی توڑ دوں گا۔" قاتل نے غراتے ہوئے دھمکی دی۔ اس کا چہرہ غصے سے تمتمارہا تھا اور آنکھیں کسی وحشی درندے کی طرح انگارے کی طرح دہک رہی تھیں۔ "ہوسکتا ہے کہ تیرا سر بھی پھاڑ دوں اور ٹانگیں بھی توڑ دوں گا...... میں بہت حرامی چیز ہوں۔"

ہاتھ مڑنے سے گوپی کو بہت سخت تکلیف ہورہی تھی۔ اس کے پیش نظر اب وہ کسی غلط حرکت کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔ "چلو......" قاتل نے غرا کر حکم دیا۔

وہ سڑک عبور کرکے فٹ پاتھ پر آگئے۔ حالاں کہ سڑک ویران اور سنسان پڑی تھی۔ کسی سواری کی اور آدمی کی آمد ورفت نہیں تھی۔ فٹ پاتھ محفوظ تھی۔ عورت اس کے دوسری طرف تھی۔ ان دونوں کے درمیان گوپی

تھا۔ مخالف سمت سے آنے والے کسی راہ گیر کو یہ احساس نہیں ہوسکتا تھا کہ ایک بچے کو وہ جبر وزبردستی لے جارہے ہیں۔ وہ دونوں ایک گارڈ کی طرح اور اس پر گہری نظر رکھے ہوئے تھے کہیں وہ انہیں جل دے کر ان کی قید سے نکل بھاگے۔ وہ اس پر لمحے کے لئے بھروسا کرنے کو تیار نہیں تھے۔ ایسا شاطر اور اس قدر چالاک تھا کہ اس پر کسی صحرائی لومڑی کا گمان ہورہا تھا۔ کس قدر مشکل، کوشش اور جدوجہد سے ہاتھ آیا تھا۔ اس نے دونوں ہی کو تگنی کا ناچ نچا کررکھ دیا تھا۔ اس لئے وہ بہت محتاط اور چوکنا بھی تھے۔

کیا اس شہر کا ایک فرد سو رہا ہے......؟ کیا آج کی رات کوئی جاگ نہیں رہا ہے......؟ کیا یہ وہ کسی شمشان گھاٹ سے گزر رہا ہے......؟ اتنا بڑا شہر کولمبو...... اس ملک کا دارالخلافہ...... انٹرنیشنل شہر...... اور پھر کیا رات کو گشت کرنے والی پولیس بھی سوچکی ہے......؟ پولیس کی موبائل وین کا بھی دور دور تک کوئی نام ونشان نہیں ہے...... گوپی نے بے بسی کے عالم میں سوچا۔ وہ اس قدر جذباتی ہوگیا اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ کیا وہ بے موت مارا جائے گا......؟ کیا قاتل اسے بھی اس آدمی کی طرح بربریت اور سفاکی سے چاقو کے پے درپے وار کرکے موت کی نیند سلادے گا...... اس کی جیب میں یقیناً چاقو اور استرا ہوگا......؟ کیا استرے سے اس کی لاش کے ٹکڑے ٹکڑے کردیئے جائیں گے...... یا پھر کوئی اور طریقہ استعمال کریں گے اسے موت کی نیند سلانے کے لئے۔ کیوں کہ عورت کے ہاتھ میں تھیلے نہیں ہیں۔ وہ اس کی لاش کا کیا کریں گے؟

وہ یہ سب کچھ سوچ رہا تھا کہ سامنے والے موڑ سے دو آدمی مڑے۔ ان کا رخ گوپی اور قاتلوں کی طرف تھا۔ گوپی نے محسوس کرلیا تھا کہ وہ شراب کے نشے میں دھت نہیں ہیں۔ وہ بالکل سیدھے چل رہے تھے۔ وہ چہرے سے سنجیدہ اور بردبار نظر آرہے تھے۔ وہ آدمی اچانک ہی سامنے آئے تھے۔ اس لئے اس کے قاتل راستہ تبدیل نہیں کرسکتے تھے۔ اور نہ ہی مڑ کر واپس جاسکتے تھے اور درمیان میں کوئی گلی بھی نہیں تھی۔ جس سے قاتلوں کے لئے پریشانی کی بات تھی۔

گوپی کے دل کو بڑی ڈھارس بندھی۔ اس کا دل امید کی کرن میں نہا گیا۔ اچانک درد کی ایک ٹیس مڑے ہاتھ سے اٹھ کر اس کے وجود میں پھیل گئی۔ قاتل نے بڑی رحمی سے اس کے ہاتھ کو مزید مروڑا تھا۔ اگر وہ اور ذرا سی قوت لگاتا تو گوپی کے ہاتھ کی ہڈی ٹوٹ جاتی۔ قاتل کا ہاتھ فولادی تھا۔ جب کہ اس کا ہاتھ نازک اور پتلا سا تھا۔

اگر تو نے ذرا سی بھی آواز نکالی تو ہاتھ توڑ دوں گا......؟" قاتل نے اپنا منہ اس کے کان کے پاس لاکر سرگوشی میں کہا۔ اس کے لہجے میں دھمکی تھی۔ "ان آدمیوں کو دیکھ کر شیر ہونے کی ضرورت نہیں۔"

گوپی کانپ کر رہ گیا۔ وہ راہ گیروں کے قریب آنے کا شدت سے انتظار کرنے لگا۔ وہ خود کو سر پر نازل ہونے والی تکلیف کے لئے تیار کررہا تھا۔ جب راہ گیر بالکل قریب آگئے تو گوپی نے جلدی سے ایک قدم آگے بڑھایا۔ درد کی ایک زبردست لہر اس کے بدن میں بجلی کی رو کی طرح اتر گئی۔ اس نے تکلیف کو برداشت کرتے ہوئے اپنے جوتے کی ایڑی مرد کے پیر پر لگائی تو اس نے تڑپ کر گوپی کا ہاتھ چھوڑ دیا اور ٹانگ پکڑ کر ناچنے لگا۔

گوپی تیزی سے دوڑ کر ایک راہ گیر کے قدموں سے لپٹ گیا۔ پھر اس نے گڑگڑاتے ہوئے کہا۔

"بچاؤ...... بچاؤ...... بھگوان کے لئے مجھے اس خونی سے بچاؤ...... یہ خونی ہے......"

گوپی نے راہ گیر کی ٹانگیں اس مضبوطی سے پکڑی تھیں کہ وہ ایک قدم بھی آگے بڑھا نہیں سکتا تھا۔ اس کا ساتھی بھی رک گیا۔ وہ حیران و پریشان سے ہوکر انہیں دیکھنے لگے۔

"کیا بات ہے......؟"

"یہ قاتل ہیں...... انہوں نے کل ایک آدمی کو قتل کیا ہے اور اب یہ مجھے جان سے مارنا چاہتے ہیں...... مجھے ان سے بچالو...... بھگوان کے لئے میری مدد کرو۔" گوپی نے روتے ہوئے ان سے فریاد کی۔

نارائن ٹانگ پر پڑنے والی ضرب برداشت کر گیا

تھا۔ عورت اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔ وہ خوف زدہ ہو رہی تھی۔ لیکن راہ گیر اس کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ وہ تو نارائن کو دیکھ رہے تھے۔ جو گوپی کی تمام توقعات کے برعکس پرسکون انداز میں ان کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مجرموں کی طرح فرار ہونے کی مطلق کوشش نہیں کی...... اور پھر اس نے لپک کر گوپی کو پکڑنے کی بھی کوشش نہیں کی۔ اس وقت وہ خونخوار درندہ بھی نظر نہیں آ رہا تھا۔ چند لمحوں میں اس نے اپنے آپ کو یکسر بدل لیا تھا۔

"جب یہ اجنبیوں کے سامنے اپنے والدین کے بارے میں ایسی بہکی بہکی باتیں کرتا ہے تو ہم شرم سے زمین میں گڑ جاتے ہیں......" نارائن نے دھیمے لہجے میں کہا اور اپنا سر جھکا لیا۔ جیسے بڑا نادم ہو رہا ہو۔

عورت نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور رخ موڑ کر سسکیاں لینے لگی۔

"بھگوان جانے آپ ہمارے متعلق کیا سوچ رہے ہوں گے؟" عورت سسکیوں کے درمیان بولی۔ "یہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا ہے۔ اس کی وجہ سے ہمیں لوگوں کے سامنے بڑی ذلت اٹھانا پڑتی ہے۔"

"یہ میرے ماں باپ نہیں ہیں...... آپ ان کی باتوں پر نہ جائیں۔ یہ قاتل ہیں۔ مجرم ہیں۔" گوپال نے چیخ کر ہذیانی لہجے میں کہا۔ "یہ اداکاری کر رہے ہیں۔ آپ کو بے وقوف بنایا جا رہا ہے۔"

"کیا آپ لوگوں نے اسے کسی ماہر نفسیات کو نہیں دکھایا......؟" ایک راہ گیر نے سوال کیا۔

"دکھایا تو تھا......" نارائن نے سر اٹھا کر جواب دیا۔

"کیا اس سے کوئی افاقہ نہیں ہوا......؟" دوسرے راہ گیر کے لہجے میں تاسف تھا۔

غلطی ہماری ہے کہ ہم نے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل نہیں کیا جس کا افسوس اب ہو رہا ہے۔" نارائن نے افسردگی سے کہا۔ "اس نے ہمیں مشورہ دیا تھا کہ اسے کچھ عرصے کے لئے کسی اچھے دماغی امراض کے اسپتال میں داخل کرا دیا جائے تو یہ جلد صحت یاب ہو جائے گا۔ کیوں کہ ابھی بچہ ہے۔ بارہ تیرہ برس کے بچے جلد صحت یاب ہو جاتے ہیں۔"

"کیا اسے جھوٹ بولنے کا مرض ہے؟" پہلے راہ گیر نے دریافت کیا۔ "یہ مرض اسے کب سے لاحق ہے؟"

"یہ جھوٹ نہیں بولتا......" اس نے راہ گیروں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "یہ جب کوئی فلم دیکھتا ہے تو خود کو اس کا کردار سمجھنے لگتا ہے۔ پھر وہ ایسی ہی حرکتیں شروع کر دیتا ہے۔ دوسرے لوگوں کو بھی وحشی، قاتل، خونی اور نہ جانے کیا کچھ کہتا رہتا ہے۔"

"یہ جھوٹ ہے میرے والدین نہیں ہیں...... آپ میری بات کا یقین کریں۔ یہ قاتل ہیں۔ مجھے مار دینا چاہتے ہیں۔" گوپی نے روتے ہوئے کہا۔ "مجھے جھوٹ بولنے کا یا کوئی بھی مرض نہیں ہے۔ یہ جھوٹے مکار اور قاتل ہیں۔"

"آپ اس سے پوچھیں کہ یہ کہاں رہتا ہے؟" نارائن نے راہ گیروں سے کہا۔

"تم کہاں رہتے ہو بیٹے......؟" نارائن کے کہنے پر ایک راہ گیر نے دریافت کیا۔

"شیواجی اسٹریٹ......" گوپی نے اسے بتایا۔

قاتل نے فوراً ہی جیب سے بٹوا نکالا اور شناختی کارڈ اس میں سے نکال کر راہ گیروں کے سامنے پیش کر دیئے۔

"یہ دیکھ لیجیے...... اس میں بھی یہی پتا لکھا ہوا ہے۔ اس پر پھر دورہ پڑا ہے۔ اس لئے بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔"

راہ گیروں نے شناختی کارڈ پر لکھا ہوا پتا غور سے پڑھا۔ پھر ان دونوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"لڑکا...... دراصل نفسیاتی مریض بن گیا ہے۔ عجیب ماں باپ ہیں۔ لڑکے کے علاج پر توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ اگر اس مرض نے شدت اختیار کر لی تو پھر آپ لوگ بعد میں اس کوتاہی پر پچھتائیں گے۔ پشیمان

ہوں گے۔"

"آج اس نے میرے پرس سے پیسے چرا لئے ہیں۔" عورت نے ان کی طرف اپنا رخ پھیرتے ہوئے کہا۔ پھر وہ رومال سے اپنے آنسو خشک کرنے لگی۔ "وہ رقم میں نے گیس بل بھرنے کے لئے رکھی تھی۔ وہ دوپہر سے غائب ہے۔ پتا نہیں اس نے کون سی فلم دیکھی اور باقی رقم کا کیا کیا......؟ ہم نے بڑی تلاش کے بعد اسے کچھ دیر پہلے ہی اسے ڈھونڈ نکالا ہے۔ اگر ہم دوڑ دھوپ نہ کرتے تو اس وقت کوئی اور فلم دیکھ رہا ہوتا......" عورت گوپی کے قریب آ کر جھک گئی۔ پھر پیار سے اس کے بالوں کو سہلانے لگی۔ "گھر چلو بیٹے! دیکھو...... ماں باپ کو اتنا پریشان نہیں کرتے۔ رات بھی زیادہ ہو رہی ہے۔"

باپ کی افسردگی اور ماں کے آنسو دیکھ کر دو راہ گیر بھی گوپی کے مخالف ہو گئے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

"بھگوان کی بڑی کرپا ہے کہ میں نے آج تک شادی نہیں کی...... بچے پالنا بھی ایک جھنجھٹ ہے......"

"میں بھی شادی نہیں کر کے خوش ہوں...... آج کل شادیاں معلوم نہیں کیوں ناکام ہو جاتی ہیں۔"

اس راہ گیر نے جس کے پیروں سے گوپی لپٹا ہوا تھا اس نے جھک کر سختی کے ساتھ گوپی کے ہاتھ جھٹک دیئے اور اپنے پیروں سے علیحدہ کیا۔ "اچھے بچے اپنے والدین کا کہا مانتے ہیں بیٹے......! جاؤ اپنی ماں اور پتاجی کے ساتھ گھر جاؤ۔" اس نے اپنے پتلون کے پائنچے جھاڑتے ہوئے اسے نصیحت کی۔ "اب ہمیں جانے دو۔ ہمیں دیر ہو رہی ہے۔"

پھر وہ دونوں تیزی سے آگے بڑھ گئے۔ گوپی زمین پر بیٹھ گیا۔ اپنی بدنصیبی کو کوسنے لگا۔

عورت گوپی کے پاس اب بھی جھکی ہوئی کھڑی تھی...... نارائن بھی گوپی کے قریب کھڑا ہوا تھا۔ راہ گیروں نے قدرے دور جا کر یک بارگی پلٹ کر ان کی طرف دیکھا تو انہیں اس منظر میں کوئی عجیب بات نظر نہیں آئی۔ بہ ظاہر ماں اپنے بچے کو سمجھا رہی تھی اور باپ تحمل کے ساتھ ان کی [illegible] رہا تھا۔ جب راہ گیر [illegible] چلے گئے اور انہوں نے مڑ کے نہیں دیکھا تو نارائن نے جھک کر گوپی کا ہاتھ پکڑ کر اور بے دردی سے موڑ کر اسے پشت پر لے گیا۔

"شیطان...... خبیث...... اگر تو نے ایسی حرکت کی تو تیری گردن توڑ دوں گا۔" نارائن نے کسی درندے کی طرح غراتے ہوئے کہا اور گوپی کے ہاتھ پر دباؤ بڑھا دیا۔ درد کی شدت سے گوپی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اس طرح سڑک پر چلنا ٹھیک نہیں ہے نارائن......؟ یہ کتے کا پلا ہمارے لئے مشکلات کھڑی کر سکتا ہے۔" عورت نے مشورہ دیا۔ "تم کوئی ٹیکسی پکڑ لو...... ہم اسے کہاں کہاں لئے پھریں گے۔ یہ قدم قدم پر جسے دیکھے گا بھونکنے لگے گا۔"

"تم ٹھیک کہتی ہو......" مرد نے تائیدی لہجے میں کہا۔ "اس میں واقعی کتے کی فطرت موجود ہے اچھا میری بات سنو۔"

پھر ان کے درمیان سرگوشیوں میں تبادلہ خیال ہونے لگا...... گوپی اس گفتگو کا ایک ہی جملہ سن پایا تھا جو مرد کی زبان سے بڑے پراسرار اور خوفناک لہجے میں ادا ہوا تھا۔

"ویران اور کھنڈر نما عمارت ہے...... سنا ہے راتوں کو بدروحوں اور چڑیلوں کا بھی مسکن ہوا کرتا تھا۔ اس کے گرد جو میدان ہے وہ غالباً کھیلنے کا ہے۔ یہاں بچے کھیلتے ہیں اس سے اچھی اور مناسب جگہ کوئی اور نہیں ہو سکتی...... اس کا انتخاب میں نے بہت سوچ سمجھ کر کیا ہے...... ایسی جگہ پورے شہر میں کوئی اور نہیں ہے۔"

عورت نے اتفاق رائے کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ نارائن ٹیکسی کی تلاش میں ادھر ادھر نظریں دوڑانے لگا۔

ان کی باتوں نے گوپی کا خون شریانوں میں منجمد کر دیا...... ان باتوں سے صاف ظاہر تھا کہ وہ اسے ایسی کسی عمارت میں لے جانا چاہتے تھے جہاں کوئی نہیں رہتا وہ سنسان پڑی رہتی تھی۔ وہ خود بھی ایسی بہت ساری

عمارتوں سے واقف تھا جو بے حد شکستہ ہوچکی تھیں۔ جن کے اندر دن کے وقت بھی تاریکی مسلط رہتی تھی اور جہاں انسان بھولے سے بھی قدم نہیں رکھتا تھا۔ کیوں کہ کسی کو بھی ان عمارتوں میں جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی تھی۔ یہ بدھشتوں کی باقیات میں سے تھیں۔ رات تو رات دن میں بھی وہاں کوئی اس لئے نہیں جاتا تھا کہ اس قدر بوسیدہ اور شکستہ ہوتی ہیں کہ کسی بھی لمحے گر سکتی تھیں۔ ان میں کئی عمارتیں طوفان اور بارش سے تباہ ہوچکی تھیں۔

گوپی کو اس لمحے اپنی موت کا یقین ہوگیا۔ اب اس کا کوئی مددگار نہیں رہا تھا۔ کوئی اجنبی مل بھی جائے تو اس کی بات کو جھوٹ سمجھے گا...... قاتل نے اس کے گرد اس قدر مضبوط جال بنا تھا کہ وہ کسی صورت سے نکل نہیں سکتا تھا۔ نہ اس کے ذہن میں کوئی ایسی تدبیر آرہی تھی کہ موت کے منہ سے نکل آئے۔ قاتل کا منصوبہ ناکام بنادے......

یہ عورت بھی مرد کی طرح سفاک اور بے رحم تھی...... وہ یہ چاہتی تھی کہ جتنا جلد ہوسکے اسے ٹھکانے لگادیا جائے۔ اسے وہ عورت نہیں...... ڈائن لگ رہی تھی۔

اس نے پھر بھی ایک آس قائم کرلی تھی موت کے منہ سے بچنے کے لئے...... لیکن اس وقت یہ آس دم توڑ گئی جب اسے دور سے ایک ٹیکسی آتی دکھائی دی۔ جس سڑک پر انسان نہ نظر آتے ہوں وہاں ٹیکسی کا آنا اتفاق نہیں ہوسکتا...... یہ اس کی موت کا پیغام تھا۔ اس کی زندگی ختم ہوگئی تھی۔ کچھ دیر بعد اسے یقینی موت مرنا تھا۔ ٹیکسی ان کے قریب آکر رک گئی۔ قاتل نے تیزی سے آگے بڑھ کر پچھلا دروازہ کھولا۔

"آج میں آخری بار تمہیں ساتھ لائی ہوں...... آئندہ کبھی مجھ سے غلطی نہیں ہوگی" عورت نے ڈانٹتے ہوئے کہا اور کن اکھیوں سے اس نے ٹیکسی ڈرائیور کی طرف دیکھا۔ "چلو...... جلدی سے بیٹھو۔"

قاتل نے اس کے کندھے میں انگلیاں گھسادیں۔ عورت ٹیکسی کے اندر بیٹھ گئی تھی۔ اس نے گوپی کو بڑی قوت سے دھکیلتے ہوئے اندر گھسیڑ دیا تھا۔ پھر خود بھی اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ اب گوپی ان دونوں کے درمیان سینڈوچ بنا بیٹھا تھا۔

"امرناتھ سوامی اسٹریٹ کے نکڑ پر اتار دینا......" قاتل نے ٹیکسی ڈرائیور سے کہا۔ "ذرا جلدی چلنا۔ وہاں ضروری کام ہے۔"

ٹیکسی نے ایک جھٹکا لیا اور تیز رفتاری سے ٹیکسی سڑک پر دوڑنے لگی۔

ذرا آگے ہوکر بیٹھ جاؤ......" مرد نے عورت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مبہم سا اشارہ کیا اور پھر گوپی کی طرف دیکھا۔

وہ اس کا اشارہ سمجھ کر کھسک کر آگے ہوگئی اور نشست کے کنارے پر اس طرح بیٹھ گئی کہ گوپی ڈرائیور کے درمیان بیٹھا ہوا تھا۔ ڈرائیور کی نظروں سے پوشیدہ ہوگیا۔ اب ٹیکسی ڈرائیور سر موڑ کر بھی نہیں دیکھ سکتا تھا...... قاتل نے مٹھی بھینچ کر گوپی کی ٹھوڑی کے نیچے پوری قوت سے گھونسا مارا۔ گوپی کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچ گئے اور کانوں میں سیٹیاں بجنے لگیں۔ اگر قاتل اسے بے ہوش کرنا چاہتا تھا تو وہ اپنے مقصد میں ناکام رہا تھا۔ لیکن اس گھونسے نے گوپی کے ہوش اڑادیئے تھے اور اسے جیسے چھٹی کا دودھ یاد آگیا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ کچھ دیر تک وہ ساکت بیٹھا تھا۔ اس میں اتنی ہمت نہیں رہی تھی کہ اپنی جگہ سے حرکت کرسکے۔

لیکن اس کا ذہن حرکت کررہا تھا۔ گو قاتل نے اس پر قابو پالیا تھا اور اسے مقتل کی طرف لے جارہا تھا۔ لیکن وہ آخری لمحے تک موت کے منہ سے نکلنے کی کوشش اور جدوجہد کرنا چاہتا تھا۔ اسے ایسی بہت ساری فلموں کی کہانیاں اور مناظر یاد تھے جس میں ایک شخص مجرموں کے ہتھے چڑھ جاتا ہے اور اسے موت کی نیند سلانا چاہتا تھے لیکن وہ اپنی تدبیر اور حوصلے سے ان کے چنگل سے نکل جاتا تھا۔ اس میں ابھی جینے کی امنگ اور حوصلہ تھا۔ لیکن اس کے ذہن میں نجات پانے کی تدبیر نہیں آرہی تھی۔

چند لمحوں کے بعد ٹیکسی ایک سگنل پر رک گئی۔ جس کا رنگ سرخ تھا۔ سگنل کے قریب ایک کانسٹیبل ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑا ٹیکسی کی طرف گھور رہا تھا۔ پولیس

والے کو دیکھ کر اسے اپنے سارے بدن میں توانائی دوڑتی محسوس ہوئی۔ یک لخت وہ اپنی تکلیف بھول گیا۔ موت سے بچنے اور قاتل سے نجات پانے کا آخری اور بہترین موقع تھا۔ آج رات اس نے پہلی بار کسی پولیس والے کی صورت دیکھی تھی۔ اسے ایسا لگا تھا کہ گھپ اندھیرے میں کوئی کرن پھوٹی ہو۔

پتا نہیں عورت کو کس طرح اس کے ارادوں کا علم ہوگیا۔ شاید اس نے گوپی کے چہرے پر ہلکی سی خوشی دیکھ کر بھانپ لیا تھا۔ وہ تیزی سے چونک کر سیدھی ہوگئی۔ اس نے ٹٹول کر گوپی کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھنا چاہا لیکن اسے ایک لمحے کی دیر ہوگئی تھی۔ گوپی نے اپنا سر ایک طرف ہٹاتے ہوئے عورت کی انگلیوں میں دانت گاڑ دیئے۔ عورت نے فوراً ہی واپس اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ پھر اس نے بڑی مشکل سے اپنی چیخ روکی جو اس کے حلق میں آگئی تھی۔ وہ تکلیف سے بری طرح بلبلاتے ہوئے اپنی انگلیاں سہلانے لگی۔ اگر وہ اس وقت ٹیکسی میں نہ ہوتی تو تھپڑوں سے نہ صرف اس کا حشر نشر کردیتی بلکہ ناخنوں سے اس کے چہرے پر خراشیں ڈال دیتی۔

گوپی پوری قوت سے ہذیانی لہجے میں چیخا۔ "بچاؤ...... بچاؤ...... مسٹر آفیسر...... مسٹر پولیس مین...... پلیز! بھگوان کے لئے میری مدد کرو...... مجھے ان سے بچاؤ......"

کانسٹیبل چونک کر سیدھا ہوگیا۔ پھر وہ مسکراتا ہوا ٹیکسی کی طرف بڑھا۔ مدد کے لئے ایک بچے کی چیخ وہ تاثر قائم نہیں کرتی جو ایک بڑے کی چیخ کرتی ہے۔ کانسٹیبل کھڑکی پر کہنی ٹیک کر جھک گیا اور پھر وہ اندر جھانک کر دیکھنے لگا۔

"کیا بات ہے......؟ کیوں چیخ رہے ہو لٹل ماسٹر......!" اس نے دوستانہ انداز سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس لئے کہ اسے معلوم ہے کہ گھر پہنچ کر اس کی پٹائی ہوگی۔" اس عورت نے فوراً جواب دیا۔ "تم کتنا ہی چیخو...... کتنا ہی چلاؤ گوپی! آج ضرور تمہاری پٹائی ہوگی۔ کیوں کہ تمہاری شرارتیں روز بروز بڑھتی جارہی ہیں۔"

"کیوں بھئی پٹنے سے ڈرتے ہو......؟" کانسٹیبل نے ہنستے ہوئے کہا۔ "بچوں کے لئے پٹائی اتنی ہی ضروری ہوتی ہے جتنی تعلیم...... کیوں کہ پٹائی اور تعلیم بچوں کا مستقبل بناتے ہیں...... جب میں چھوٹا تھا تو میرے پتا جی میری بھی خوب پٹائی کرتے تھے۔ لیکن......" وہ توقف کرکے ہلکا سا قہقہہ مار کر ہنسا۔ "میں نے آج پہلی بار کسی بچے کو پٹائی سے بچنے کے لئے پولیس کی مدد طلب کرتے دیکھا ہے۔"

"ایک بار اس نے پٹائی سے بچنے کے لئے آگ لگنے کا شور مچادیا تھا...... سارے لوگ گھبرا کر گھروں سے نکل آئے تھے جس سے ہمیں بڑی شرمندگی اٹھانی پڑی تھی۔" نارائن نے پریشان حال باپ کا کردار ادا کرتے ہوئے کہا۔

پولیس والے نے ہونٹ سکیڑ کر سیٹی بجائی۔ اس نے نارائن کے چہرے پر اپنی نظریں مرکوز کرتے ہوئے فلسفیانہ انداز سے کہا۔

"آپ ٹھیک کہتے ہیں...... آج کل کے بچے ٹی وی، فلمیں دیکھ کر اور ریڈیو پر ڈرامے سن کر بڑی بے ہودہ شرارتیں کرنے لگے ہیں...... وہ بہت تنگ اور پریشان کرتے ہیں اپنے والدین کو...... میرے بھی دو بچے ہیں۔ اگر وہ اس قسم کی شرارتیں کریں تو میں ان کی ٹانگیں توڑ دوں۔"

"لیکن یہ بچے اس قدر ڈھیٹ اور سخت ہوتے ہیں کہ ان کی جتنی بھی پٹائی کرو اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے ہیں۔" عورت بولی۔

"آپ...... میری بات نہیں...... ان...... انہوں نے کل رات اپنے فلیٹ میں ایک آدمی کو قتل کیا ہے۔" گوپی نے بے بسی سے کہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ "اس کے ٹکڑے ٹکڑے کرکے اسے تھیلیوں میں بند کردیا اور۔" اس کی آواز ہچکیوں میں ڈوب گئی۔

"یہ بہت ہی شیطان صفت بچہ ہے۔" پولیس والے نے کہا۔ پھر اس نے چونک کر غور سے گوپی کو

دیکھا۔ ”ٹھہرو...... میں نے تمہیں دیکھا ہے...... یاد نہیں آرہا ہے کہاں دیکھا ہے......؟“ وہ ذہن پر زور ڈالتے ہوئے سوچنے لگا۔

چند لمحوں کے بعد...... چند لمحوں کے لئے کائنات کی گردش رک گئی۔ وقت کی رفتار تھم گئی۔ گوپی رونا دھونا بھول گیا۔ اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ اس پر سرشاری سی طاری ہونے لگی۔ آخرکار......

”ہاں...... یاد آیا......“ کانسٹیبل نے کہا۔ ”آج صبح تم پولیس اسٹیشن آئے تھے...... وہاں بھی تم نے یہی کہانی سنا کر ہم سب کو پریشان کیا تھا...... ہمارا وقت ضائع کیا تھا...... انسپکٹر صاحب نے ایک سراغ رساں انسپکٹر کو اس معاملے کی تفتیش کے لئے بھیجا تھا...... تو تم وہی ہو...... میں نے تمہیں دیکھا تھا۔ بعد میں تمہیں گھر چھوڑنے کے لئے مجھے ساتھ بھیجا گیا تھا۔ آپ اس لڑکے کے والدین ہیں؟“

”ہم اگر اس کے والدین نہ ہوتے تو اس وقت بڑے سکون سے اپنے گھر میں سو رہے ہوتے۔“ نارائن نے تلخ لہجے میں کہا۔

”مجھے آپ لوگوں سے ہمدردی ہے جناب! اسے گھر لے جائیں اور اس کی اتنی پٹائی کریں کہ وہ آئندہ کسی کو تنگ اور پریشان نہ کرے۔ کس قدر بے خوف اور ڈھیٹ پن ہے اور اس نے تو پولیس اسٹیشن آکر ہمارے بڑے افسر کو بھی نہیں بخشا۔ اگر یہ بچہ نہ ہوتا تو صاحب اسے حوالات میں بند کردیتے...... اس کا دماغ درست کرنا بہت ضروری ہے۔“ کانسٹیبل نے کہا۔

پولیس والا اتنا کہہ کر پیچھے ہٹ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے گیئر بدلا۔ تیزی سے گاڑی چلاتا ہوا سگنل عبور کرگیا۔

گوپی کا دل ٹوٹ گیا...... اس نے بڑے دکھ اور کرب سے سوچا...... کیا اس دنیا میں اس کی بات کا یقین کرنے والا ایک شخص بھی نہیں...... آخر ہر کوئی اس کی بات کا یقین کیوں کر رہا ہے...... کوئی بھی تو کرسکتا ہے۔ کیا اس دنیا میں بڑے کی باتوں پر یقین کیا جاتا ہے...... کیا بڑے جھوٹ نہیں بولتے ہیں۔ یہ بات ساری دنیا کہتی ہے کہ بچے جھوٹ نہیں بولتے ہیں۔ تو پھر اسے ہر کوئی جھوٹا کیوں سمجھ رہا ہے......؟

پھر اس نے دوبارہ کسی کو مدد کے لئے نہیں پکارا۔ کیوں کہ اس سے کوئی فائدہ اور کچھ حاصل نہ تھا۔ کوئی اس کی مدد کرے گا اور نہ اس بات پر یقین...... اپنی بے بسی کا احساس کرکے اس کا دل بھر آیا۔ وہ اس قدر دکھی اور جذباتی ہوگیا کہ اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی۔ وہ خاموشی سے روتا رہا۔ اس کے حلق سے کوئی آواز نہیں نکلی۔ اس نے سوچا۔ وہ قاتل کے ہاتھوں سے بچ نہیں سکتا۔ اس قاتل کے ہاتھوں اس کی اذیت ناک موت لکھی ہے۔

”لیجئے...... آپ کا علاقہ آگیا ہے۔“ ٹیکسی ڈرائیور نے اطلاع دی۔ ”بتائیں۔ کس گلی کس عمارت پر روکوں۔“

”بس نکڑ پر ہمیں اتار دو......“ نارائن نے جواب دیا۔ ”ہم اپنے فلیٹ پیدل ہی جائیں گے۔ سامنے ہی تو ہے۔“

”ٹیکسی کی رفتار دھیمی ہوگئی۔ اس نے نکڑ پر لے جا کر ٹیکسی کو روک دیا۔ نارائن نے ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے ہی کرایہ ادا کیا تاکہ جب وہ باہر نکلیں تو گوپی کو پکڑنے کے لئے اس کے دونوں ہاتھ آزاد ہوں۔ پھر وہ تینوں ایک ایک کرکے ٹیکسی سے اتر گئے۔ ٹیکسی اس طرف روانہ ہوگئی جدھر سے آئی تھی۔

”نارائن......! تمہارا کیا خیال ہے......؟ کیا ٹیکسی ڈرائیور کو ہمارے چہرے یاد رہیں گے؟“ عورت نے تشویش بھرے لہجے میں پوچھا۔

”تم پریشان اور اس قدر ہراساں کیوں ہو رہی ہو......“ نارائن نے اس کا سفید پڑتا ہوا چہرہ دیکھ کر دلاسا دیا۔ ”ہمارے چہروں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔“ اس نے توقف کرکے گوپی کو نفرت، غصے اور حقارت بھری نظروں سے گھورا۔ ”البتہ اس سور کا چہرہ اہم ہے۔ اس حرامی کو آئندہ کوئی بھی دیکھ نہیں سکے گا......“ اس کا لہجہ بڑا سفاک ہوگیا۔

جیسے ٹیکسی ان کی نظروں سے اوجھل ہوئی انہوں نے اپنا رخ تبدیل کردیا اور مخالف سمت میں واقع ایک گلی میں مڑ گئے۔

☆......☆......☆

وہ ایک پانچ منزلہ بوسیدہ اور ویران عمارت تھی جس میں کبھی انسانوں کی بود و باش ہوا کرتی تھی۔ لیکن اب اس کی شکستگی دیکھتے ہوئے کوئی بھی اس میں رہنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ اس کا مالک مفت میں بھی رہائش دے تو تیار نہیں ہوسکتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اس عمارت کو توڑ کر اس کی جگہ نئی عمارت بنانے کا منصوبہ زیرغور تھا۔ پوری عمارت تاریک تھی۔ پھر وہ عمارت کے داخلی دروازے کے قریب آکھڑے ہوئے۔

”دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا۔“ مرد نے عورت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”میدان بالکل صاف ہے۔“ ”یہ اچھی علامت ہے۔“

پھر وہ گوپی کا ہاتھ پکڑ کر بے رحمی سے اسے موڑنے لگا۔ گوپی درد کی شدت سے دہرا ہوگیا۔ اس نے اپنا دوسرا ہاتھ پوری قوت سے گوپی کے منہ پر جمادیا۔ گوپی اس کے ہاتھ کو کاٹ نہیں سکتا تھا۔ قاتل کے سخت کھردرے ہاتھ نے اس سختی سے اس کا منہ بند کیا ہوا تھا کہ وہ اپنا منہ کھول بھی نہیں سکتا تھا۔ اس نے گوپی کے مڑے ہوئے ہاتھ پر دباؤ کم کردیا۔ گوپی کی کمر سیدھی ہوگئی۔

”اندر چلو......“ اس نے پھنکارتے ہوئے نفرت بھرے لہجے میں حکم دیا۔ پھر وہ اسے پھنکارتے ہوئے آگے کی طرف دھکیلنے لگا۔

عورت نے آگے بڑھ کر عمارت کا داخلی دروازہ کھول دیا۔ وہ اندر داخل ہوگئے۔ پھر دروازہ بند کردیا گیا۔ اندر اس قدر تاریکی تھی کہ وہ ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے تھے اور نہ ہی ہاتھ سجھائی دے رہے تھے۔ عمارت کی فضا میں سیلن کے ساتھ جو بدبو رچی ہوئی تھی۔ قاتل نے اس کے منہ پر سے ہاتھ ہٹالیا تھا اور پھر جیب میں سے ٹارچ نکال کر روشن کی۔

”تمہیں کیسے پتا چلا کہ یہ عمارت ویران ہے......؟“ عورت نے اپنے مرد ساتھی سے حیرت سے سوال کیا۔

”کیسے پتا چلا......؟“ تلاش کرنا پڑتا ہے...... تلاش کرنے سے ہی پتا چلتا ہے۔ کل رات میں نے یہ عمارت تلاش کی تھی۔“

”تو...... تو یہاں تم نے......“ عورت اپنا جملہ نامکمل چھوڑ کر خاموش ہوگئی جیسے اسے اپنی غلطی کا احساس ہو۔

گوپی بڑے زور سے کانپا۔ اب اسے احساس ہوا کہ عمارت کی فضا میں سیلن کے ساتھ بدبو رچی ہوئی ہے...... وہ انسانی لاش کے سڑنے کی بدبو ہے۔ جانے وہ لاش کہاں تھی۔ لیکن بدبو یہاں بھی آرہی تھی۔

مرد نے ٹارچ کی روشنی اوپر جانے والی سیڑھیوں پر پھینکی اور لمحے تک سیڑھیوں کا جائزہ لینے کے بعد ٹارچ بجھادی۔ عمارت کی طرح سیڑھیاں بھی شکستہ تھیں۔ لیکن وہ اتنی کمزور بھی نظر نہیں آتی تھیں کہ دو چار انسانوں کا بوجھ نہ سنبھال سکیں۔

”تم یہیں ٹھہرو...... میں اوپر جارہا ہوں۔“ قاتل نے عورت سے کہا۔ ”ہاں تم سگریٹ مت پینا۔ یہیں میری واپسی کا انتظار کرو۔“

”تم...... تم اوپر کیوں جارہے ہو نارائن......؟“ عورت نے پوچھا تو اس کے لہجے میں سراسیمگی تھی۔

”اس لئے کہ میں نے منصوبے میں ذرا سی تبدیلی کردی ہے۔“ نارائن نے جواب دیا۔ ”یہ تبدیلی ہمارے لئے زیادہ بہتر ہے۔“

”لیکن تم مجھے اس مقصد کے بارے میں اور نہ ہی کوئی مشورہ کیا؟“ عورت نے شکایتی لہجے میں کہا۔

”ٹیکسی میں بیٹھے بیٹھے مجھے اس تبدیلی کا خیال آیا......؟“ قاتل بولا۔

عورت خاموش ہوگئی۔ وہ گوپی کو بے رحمی اور پوری طاقت سے دھکیلتا ہوا اوپر لے جانے لگا۔ گوپی آنے والی موت کے خیال سے اس قدر دہشت زدہ تھا کہ اس نے ذرا سی بھی مزاحمت نہیں کی...... اگر وہ اس عمارت میں چیختا تب بھی کوئی اس کی آواز سننے والا نہیں

تھا۔ اس کی فریاد در و دیوار سے ٹکرا کر واپس آجاتی۔ جب لوگوں نے باہر روشن سڑکوں پر اس کی مدد نہیں کی تو اب یہاں کون اس کی مدد کے لئے آئے گا...... شاید یہاں بھوت پریت ہوتے تو اس پر رحم کھا جاتے...... لیکن یہ بھوتوں کا مسکن تو نہیں لگ رہا تھا۔

قاتل کبھی کبھار ٹارچ روشن کرکے بجھا دیتا تھا۔ جب ایک سیڑھی ختم ہو جاتی تو دوسری چڑھنے سے پہلے وہ ٹارچ کی روشنی میں اس کا جائزہ ضرور لیتا تھا۔ لیکن اس نے ٹارچ مستقل روشن رکھنے کا خطرہ مول نہیں لیا۔ وہ بے حد محتاط تھا۔

آخر کار تمام سیڑھیاں ختم ہوگئیں۔ وہ چند لمحوں کے لئے رک گئے اور سانس درست کرنے لگے۔ قاتل نے ٹارچ روشن کرکے دائیں جانب روشنی پھینکی۔ اس کمرے کا دروازہ غائب تھا اور مکڑیوں کے جالے تنے ہوئے تھے۔ کمرے کے دوسری طرف ایک بالکونی تھی۔ جس کا دروازہ بھی غائب تھا اور آسمان پر کچھ ستارے ٹمٹماتے ہوئے نظر آرہے تھے۔ اس مرتبہ اس نے ٹارچ بند نہیں کی۔ اسے فرش پر رکھ دیا۔ وہ جو کام کرنا چاہتا تھا اس کے لئے روشنی کی ضرورت تھی۔ ٹارچ فرش پر رکھنے کی وجہ سے اس کا ایک ہاتھ خالی ہوگیا تھا۔ پھر اس نے جیب سے رومال نکالا۔

"منہ کھولو......" قاتل نے بھیانک لہجے میں کہا اور مڑے ہوئے ہاتھ پر دباؤ بڑھا دیا۔ گوپی نے سحر زدہ انداز میں منہ کھول دیا۔ اس نے رومال گوپی کے منہ میں ٹھونس دیا اور ٹارچ فرش پر سے اٹھالی۔ پھر وہ گوپی کو دھکیلتا ہوا کمرے کے اندر لے گیا اور اس کا رخ بالکونی کی طرف تھا۔

بالکونی خاصی کشادہ تھی۔ وہاں کمرے کی نسبت کم تاریکی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو آرام سے دیکھ سکتے تھے۔ آسمان پر ستارے کہیں کہیں دھیمی روشنی میں ٹمٹما رہے تھے۔ بالکونی کے سامنے تاریک خلا تھا اور نیچے کھلا میدان تھا۔ رہائشی عمارتیں کافی فاصلے پر تھیں لیکن وہ سب تاریکی میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ ہر طرف موت کا سکوت طاری تھا...... قاتل نے گوپی کی پشت دیوار کے ساتھ لگا دی اور ایک گھونسا مضبوطی سے اس کی پیٹھ پر جما دیا...... ایک منٹ...... یا آدھے منٹ بعد سب کچھ ختم ہو جاتا ہے۔ کبھی کبھی زندگی جسم کا ساتھ تیزی سے چھوڑ جاتی ہے۔ جیسے کوئی قیدی جیل کی چار دیواری پھلانگ کر فرار ہو جاتا ہے۔

"آخری بار آسمان کی طرف دیکھ لو گوپی اور ایک فرماں بردار بچے کی طرح اپنے باپ کو گڈ بائی کہہ دو۔" قاتل نے بے رحمی سے قہقہہ لگا کر استہزائیہ لہجے میں کہا۔

"جب کوئی مرتا ہے تو وہ آخری بار مرنے سے پہلے ضرور مزاحمت کرتا ہے...... زندگی کی خواہش ہر جاندار میں ہوتی ہے اور یہ خواہش اسے آخری لمحے تک موت سے نبرد آزما ہونے پر اکساتی ہے۔

گوپی اپنے حلق پر سے اس فولادی گرفت کو کمزور نہیں کرسکتا تھا۔ اپنی گردن کو ان آہنی انگلیوں کے شکنجے سے آزاد نہیں کرسکتا تھا...... لیکن اس کی ٹانگیں آزاد تھیں۔ گوپی اس بات کو بہت اچھی طرح جانتا تھا کہ ہر شخص کا پیٹ نرم ہوتا ہے۔ وہ جسم کا نرم ترین حصہ ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں پڑنے والی ضرب زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔ اس نے کئی فلموں میں دیکھا تھا کہ مجرم کے پیٹ پر لات مار کر اسے کمزور اور بے بس کر دیا جاتا ہے۔ وہ بے جان سا ہو جاتا ہے۔

وہ اچھل کر کسی ہیرو کی طرح قاتل کے پیٹ پر ٹانگ نہیں مار سکتا تھا۔ کیوں کہ وہ اس سے زیادہ نزدیک تھا۔ لیکن وہ اپنے گھٹنے نہایت آزادی کے ساتھ استعمال تو کرسکتا تھا۔ اس نے ایک گہرا سانس لیا۔ پھیپھڑوں میں تازہ ہوا بھری۔ دیوار سے پشت جما کر پوری قوت سے ایک گھٹنا اٹھا کر قاتل کے پیٹ میں پوری قوت سے مارا۔ اس کا گھٹنا نرم نرم پیٹ کی سطح میں اندر تک گھس گیا۔

موت کا آہنی شکنجہ اس کے حلق پر سے ہٹ گیا۔

قاتل کے منہ سے ایک عجیب سی آواز نکلی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ دبا کر دوہرا ہوگیا۔ یہ موت کا بہت ہی خطرناک اور سفاکانہ کھیل تھا جس میں ذرا سی غفلت شکست کا باعث بن جاتی ہے۔ حریف پل بھر کی مہلت

بھی سنبھلنے نہیں دیتا ہے۔ قاتل کے پیچھے ہٹ جانے کی وجہ سے گوپی کو لات چلانے کی جگہ مل گئی...... اس نے ایک لمحہ ضائع کئے بغیر ترچھا ہو کر پوری قوت سے قاتل کے پیٹ میں لات ماری...... گوپی کا جوتا قاتل کی انگلیوں کو کچلتا ہوا پیٹ پر پڑا۔ قاتل لڑکھڑاتا ہوا پیچھے ہٹا اور پیچھے...... پھر اس کا بدن بالکونی کی ریلنگ سے ٹکرایا اور جو لکڑی کی بنی ہوئی تھی۔ لکڑی چٹختی ہوئی ٹوٹ گئی۔ ایک لمحے کے لئے قاتل نے سنبھلنے کی کوشش کی۔ اس نے پیٹ پر سے ہاتھ ہٹالئے اور سمندر میں ڈوبتے ہوئے شخص کی طرح ادھر ادھر سہارے کے لئے ہاتھ مارنے لگا۔ اس کوشش نے اس کا توازن بگاڑ دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ تاریک خلا میں گر کر گوپی کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اس کی آخری چیخ بہت طویل اور دل دہلا دینے والی تھی۔ جو بڑی سرعت سے دور ہوتی جارہی تھی۔ پھر ایک دھماکا ہوا اور اس کے بعد ایک سکوت چھا گیا...... لیکن چند لمحوں کے بعد اس کی چیخ نے خاموشی کا طلسم درہم برہم کردیا۔

"نارائن......!" عورت کی چیخ گوپی کو پانچ ویں منزل پر سنائی دی۔ اس نے ٹوٹی ہوئی بالکونی سے نیچے جھانکنے کی کوشش نہیں کی۔ دہشت سے اس کا بدن ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ قاتل کی آخری چیخ نے اس کے رونگٹے کھڑے کردیئے تھے۔ اس جگہ پر وہ ساکت کھڑا ہوا تھا۔ اسے سانس لیتے ہوئے بھی خوف آرہا تھا۔ کہ کہیں پوری بالکونی ہل کر ٹوٹ نہ جائے۔

پتا نہیں وہ کب تک اسی طرح بالکونی میں کھڑا رہا۔ ایک منٹ...... دو منٹ...... یا شاید پانچ منٹ......

اچانک نیچے بہت ساری آوازوں کا شور بلند ہوا۔ اندھیرے میں ٹارچوں سے نکلنے والی روشنی کی دھاریں ادھر ادھر تڑپ رہی تھیں۔ پھر روشنیوں کا رخ اوپر کی طرف [illegible] گیا [illegible] لمحوں کے بعد اسے لکڑیوں کی سیڑھیوں پر بھاری بھرکم قدموں کی آواز سنائی دیں۔ کچھ لوگ [illegible] آرہے تھے۔ گوپی کو جیسے ایک دم ہوش آگیا۔ اس نے منہ میں پھنسا ہوا رومال نکالا اور گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

قدموں کی آوازیں قریب ہونے کے ساتھ ساتھ بلند بھی ہوتی جارہی تھیں۔ یہ پولیس کے جوتوں کی آوازیں تھیں۔ گوپی انہیں پہچان گیا تھا۔ ایسے بھاری بھرکم جوتے پولیس ہی پہنتی تھی۔ پھر وہ آوازیں کمرے میں داخل ہوئیں۔ گوپی کا چہرہ ٹارچ کی روشنی میں نہا گیا۔ کسی نے اطمینان کا گہرا سانس لیا۔

"اوہ بھگوان...... تیرا شکر ہے کہ لڑکا محفوظ ہے...... اگر یہ مر جاتا تو میں خود کو کبھی معاف نہیں کرتا......"

گوپی وہ آواز پہچان گیا۔ یہ سادہ لباس والے سراغ رساں کی آواز تھی جس کا نام داس تھا جو اپنے افسر کے حکم پر صبح اس معاملے کی تفتیش کرنے ان کے اوپر گھر میں ایک سیلز مین کا بہروپ بھر کر گیا تھا۔

گوپی نے اپنے سر پر ایک شفقت بھرا ہاتھ محسوس کیا۔ "آؤ گوپی! نیچے چلیں۔ میں تم سے بہت شرمندہ ہوں...... کیا اپنے دوست کو معاف نہیں کرو گے......؟"

گوپی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ پتا نہیں کیوں...... گوپی نے جلدی سے آنسو صاف کئے۔ "میں رو نہیں رہا ہوں سر......! میری آنکھوں میں شاید کچھ گر گیا تھا......"

"میری آنکھوں میں بھی کچھ گر گیا ہے گوپی......!" داس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

"گوپی اس سادہ لباس سراغ رساں کا ہاتھ پکڑ کر سیڑھیاں اترنے لگا۔ ان کی رہنمائی کے لئے ایک طاقت ور ٹارچ روشن تھی۔ اسے نیچے کچھ لوگ ٹارچوں کی روشنی میں کچھ کام کرتے ہوئے نظر آئے۔

"آپ کا بہت بہت شکریہ سر! آپ نے میری جان بچائی!" گوپی نے تشکر کے لہجے میں کہا۔

"ہم نے تمہاری جان نہیں بچائی گوپی......! تم نے خود اپنی جان بچائی ہے۔ ہم لوگ احمقوں کا ایک گروہ ہیں جسے پولیس فورس کہا جاتا ہے۔ ہمیں یہاں پہنچنے میں کچھ دیر ہوگئی۔ یہ نوبت نہ آتی اور ہم اسے زندہ گرفتار کرلیتے...... اگر وہ تمہیں اوپر سے دھکا دے کر ہلاک کرنے میں کامیاب ہو جاتا تب بھی ہم انہیں پکڑ لیتے۔

لیکن ہم تمہیں بچا نہیں سکتے تھے اور میں زندگی بھر خود کو معاف نہیں کرتا۔"

"لیکن سر......! آپ لوگ یہاں کیسے پہنچے......؟ آپ کو اس بات کا علم کیسے اور کس طرح سے ہوا کہ ہم یہاں ہوں گے؟"

"ایک مرتبہ حرکت میں آنے کے بعد اس جگہ کا سراغ لگانا ہمارے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا...... جیسے ہی تمہاری ماں کا فون ملا ہم حرکت میں آگئے...... وائرلیس پر پورے شہر کے تھانوں اور گشتی گاڑیوں کو تمہارے اور مجرموں کے حلئے سے آگاہ کیا گیا۔ فوراً ہی ایک کانسٹیبل نے اطلاع دی کہ اس نے تمہیں مجرموں کے ساتھ ایک ٹیکسی میں دیکھا تھا۔ اس ٹیکسی ڈرائیور نے بتایا کہ اس نے کس جگہ سواریوں کو اتارا تھا...... بس تشویش ناک بات یہ تھی کہ ہم بہت تاخیر سے حرکت میں آئے تھے۔"

وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر آئے۔ سادہ لباس میں ملبوس میں ایک سپاہی نے انہیں دیکھا تو ان کی طرف بڑھا۔

"داس! ہمیں سیڑھیوں کے نیچے پلاسٹک کے دو تھیلے ملے ہیں۔"

"انہیں کھول کر مت دیکھنا......" داس نے اسے خبردار کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن میں...... اوغ...... میں دیکھ چکا ہوں۔" وہ پیٹ دبا کر باہر کی طرف بھاگ کھڑا ہوا۔

"آؤ چلو۔ یہاں بڑی گھٹن ہے۔ باہر کھلی ہوا میں چلتے ہیں۔"

وہ عمارت سے باہر نکل آئے۔ قاتل کی لاش کے گرد کئی پولیس والے اور چند سادہ ملباس کے پولیس والے کھڑے تھے۔ لاش کا سر پاش پاش ہوگیا تھا۔ اس کے قریب ہی اس کی بیوی بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ جسے اسٹریچر پر لادنے کی تیاری ہو رہی تھی۔

"آؤ ہم چلتے ہیں۔" داس نے کہا۔ "تمہاری امی بہت پریشان ہوں گی۔ میں پہلے تمہیں تمہارے گھر چھوڑ دوں۔"

گوپی...... داس کے ساتھ پولیس کی کار میں بیٹھ گیا جس کی چھت پر گھومنے والی سرخ بتی لگی ہوئی تھی۔

گوپی کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ دس منٹ کے بعد وہ منزل مقصود پر پہنچ گئے۔ عمارت کا صرف ایک فلیٹ روشن تھا۔ وہ پانچویں منزل کا فلیٹ تھا۔ جب وہ اوپر پہنچے تو اس کی ماں راہ حال اپنے بیٹے کی منتظر تھی۔ اس نے کھڑکی سے پولی کار رکتے ہوئے دیکھ لی تھی۔ اس کا چہرہ سفید پڑا ہوا تھا۔ گوپی پر نگاہ پڑتے ہی چہرہ دمک اٹھا اور سرخی دوڑ گئی۔ وہ دوڑ کر بیٹے سے لپٹ گئی۔ پھر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ پتا نہیں کیوں بڑوں کو روتا دیکھ کر بچے بھی رونے لگتے ہیں۔ گوپی کا دل بھر آیا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ کچھ دیر بعد اس نے نظر اٹھا کر دیکھی تو اس کی نظر اپنے بھاجی پر پڑی جو مجرمانہ انداز سے سر جھکائے ایک طرف کھڑے ہوئے تھے۔ گوپی دوڑ کر ان کے چرنوں سے لپٹ گیا۔

"بھا جی......! آپ کیسے ہیں......؟ آپ تو فیکٹری چلے گئے تھے؟" گوپی نے حیرانی سے پوچھا۔

"تمہاری ماں نے فون کیا تھا بیٹے!" انہوں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا اور محبت سے اس کے بالوں کو سہلانے لگے۔

"گوپی! ہم سے ہاتھ نہیں ملاؤ گے ہم جا رہے ہیں۔" داس نے کہا۔

گوپی نے دوڑ کر بڑی گرم جوشی سے مصافحہ کیا۔ داس نے جاتے ہوئے اسے سیلوٹ کیا...... پھر وہ مسکراتا ہوا سیڑھیاں اترنے لگا۔ اس کی آنکھوں کے کنائیوں میں آنسو تھے کہ ایک بچے نے اسے سدا کے لئے ضمیر کی اذیت اور ایک خلش سے بچا لیا تھا......

زیر زمین دنیا کا بے تاج بادشاہ جس کے کارناموں سے بھرپور ایسی کہانی جو بار بار نہیں لکھی جاتی۔

ایم الیاس کی تحریر کردہ **"بلیک ٹائیگر"**

آئندہ ماہ ضرور پڑھئے۔